الانور

شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری کی سوانح حیات اور کمالات و تجلیات

از

عبدالرحمن کوندو

ندوۃ المصنفین دہلی

يهدي الله لنوره من يشاء ط ويضرب الله الأمثال للناس

الانور

شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی سوانح حیات اور کمالات و تجلیات

از

عبد الرحمٰن کوندو

ندوۃ المصنفین دہلی

الانور

مصنف و مؤلف : عبدالرحمٰن کوندو

ناشر : ندوۃ المصنفین اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

صفحات : ۲۴ + ۷۲۶ = ۷۵۰

طباعت : جے کے آفسیٹ پریس، دہلی ۶

کتابت : محمد امین واجدی

طبع اول : دسمبر ۱۹۷۶ء

طبع دوم : فروری ۱۹۷۸ء

قیمت : چالیس ۴۰ روپے

ترتیب

سوانحِ حیات

مقالات ومضامین

اکابر و معاصرین کیساتھ

حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وطن میں

نمونہائے ملفوظات و منظومات

مراثی

تتمات

کتابیات

تعارُف

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

"ندوۃ المصنّفین" کے قیام کے وقت سے ہی میری تمنّا تھی کہ علمی دُنیا کی بے مثال شخصیت شیخ الاسلام حضرت الاُستاذ علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری قُدِّسَ سِرُّہٗ کی سیرت اور کمالاتِ علمی پر حضرت کی شخصیت کے شایانِ شان کوئی معیاری کتاب شایع کی جائے، کیونکہ "ندوۃ المصنّفین" کے تمام بُنیادی رُفقاء اور خُدّام نہ صرف براہِ راست حضرت کے دامنِ فیض سے وابستہ ہیں بلکہ ان کی علمی زندگی کا وجود ہی اُس آفتابِ علم وعمل اور ماہتابِ تقدّس وتقوٰی کی ضیا پاشیوں اور ضوا فگنیوں کا عکس ہے اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے اسی گنجینۂ علم وفضل کے فیضِ صحبت سے حاصل کیا ہُوا ہے۔ لیکن وقت گذرتا گیا اور اڑتیس ۳۸ سال کی یہ مدّت ایک خواب کی طرح گزر گئی ۔ ادارہ ۱۹۴۷ء کے انقلاب کی لپیٹ میں آگیا اور اس کے ارادوں کی بساط اُلٹ کر رہ گئی۔ بکھرے ہوئے تنکوں کو دوبارہ یکجا کرنا شروع کیا تو یہ دردناک صورت پیش آئی کہ خاص خاص رُفقاء جن کی حیثیت ادارے کے جسم وروح میں ریڑھ کی ہڈی کی تھی دُنیا سے رخصت ہوگئے" پہلے "قصص القرآن" کے مؤلف مولٰینا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی اور چند سال کے بعد "ترجمان السُّنۃ" کے مرتب مولٰینا محمد بدر عالم صاحب اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے گئے، ایک مولٰینا سعید احمد اکبر آبادی صاحب رہ گئے جو یہ خدمت نہایت قابلیت اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ اور مجھے اس میں ذرا بھی تردّد نہیں کہ اکبر آبادی صاحب کا قلم حرکت میں آگیا تو کم سے کم مولٰینا الطاف حسین حالی کی "حیاتِ جاوید" اور مولٰینا سید سلیمان ندوی کی "حیاتِ شبلی" کی یاد تازہ ہوجائیگی اور اس آئینے میں حضرت الاُستاذ کے سوانح حیات اور اس دَور کے حالات وخصوصیات

کا عکس صاف طور پر دیکھا جا سکے گا۔

قدرت کی کارفرمائیوں کے عجیب و غریب نمونے ہر وقت دُنیا کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ زیر نظر تالیف "اَلْاَنْوَرْ" کا وجود میں آنا بھی قدرت کی کارفرمائی کا ایک ایسا ہی کرشمہ ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ جو کام مُسلسل ارادے اور تمنّا کے باوجود "ندوۃ المصنّفین" کے ذریعہ سے نہ ہو سکا وہ کشمیر کے ایک سیماب صفت نوجوان عبدالرحمٰن صاحب کوندو کے واسطے سے عالمِ شہود میں آئے گا۔ گزشتہ چالیس پینتالیس سال میں حضرت الاستاذ کی سیرت اور علمی کمالات و خصوصیات پر مختلف زبانوں میں مُتعدد کتابیں شایع ہوئی ہیں اور بے شمار مضامین رسالوں اور اخباروں میں نکلے ہیں۔ لیکن یہ کہنا شاید مُبالغہ نہیں ہے کہ "الانور" کے وجود میں آجانے سے ایک اہم اور قابلِ قدر تالیف کا اضافہ ہُوا ہے۔ اتنی معلومات کا ذخیرہ اگر کسی منجھے ہوئے اور کہنہ مشق مُصنّف کو میسّر ہو جاتا تو وہ اپنے زورِ قلم اور تصنیفی تجربے سے اس تالیف کو بامِ عرش پر پہنچانے کی کوشش کرتا۔ مگر خاندانِ انوری کے ایک مایۂ ناز عالم اور بزرگ اور میرے قابلِ احترام مخلص دوست مولینا محمد سعید صاحب مسعودی کے فیضِ تربیت نے نوجوان کوندو صاحب کے قلب و دماغ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ ہر چیز سے بے خبر ہو کر اس خدمت میں محو ہو گئے۔ اور شب و روز کی عرق ریز جد و جہد کے بعد اعلیٰ درجے کا نکھرا ہوا یہ ضخیم مجموعہ مُرتّب کر لیا۔

کوندو صاحب نے اپنی غیر معمولی لگن سے جس کو جذبہ بیتاب بھی کہا جا سکتا ہے ثابت کر دیا کہ وہ اس خدمت کے پوری طرح اہل تھے۔ دیگر مباحث سے قطعِ نظر "الانور" کا وہ حصہ جس کا تعلق حضرتؒ کے خاندان اور ذاتی حالات و کوائف سے ہے کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے، مؤلف نے اس کے لئے قابلِ رشک محنت اور جد و جہد کی ہے اور انکی اس محنت کی وجہ سے کتاب کا پایۂ اعتبار نہایت بلند ہو گیا ہے۔ اب جب کبھی حضرتؒ الاستاذ کی سوانح حیات پر کوئی بڑی تحقیقی کتاب لکھی جائیگی کوندو صاحب کی یہ تالیف اس کے لئے نشانِ راہ کا کام دے گی ؎

عتیقُ الرحمٰن عُثمانی
ندوۃ المصنّفین دہلی
یکم فروری ۱۹۷۸ء

پیش لفظ

از حضرت العلام پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی (مدظلہ العالی)
سابق ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی شخصیت اس زمانے میں آیۃ" مِنۡ آیاتِ اللہ اور حُجَۃ" مِنۡ حُجَجِ الٰہیۃ تھی۔ یوں تو آپ کی عام شہرت ایک محدثِ جلیل القدر کی حیثیت سے تھی۔ لیکن درحقیقت علوم و فنونِ متداولہ میں کوئی علم اور فن ایسا نہیں تھا جس میں آپ کو کمالِ بلوغِ نظر اور دقتِ نگاہ حاصل نہ ہو، چنانچہ جن حضرات کو حضرت موصوف کے درسِ بخاری میں باقاعدہ اور باضابطہ شرکت کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ درس ایک دریائے بیکراں کی مانند ہوتا تھا۔ جس کی موجیں پابند ساحل و کنار نہیں رہ سکتی تھیں۔ بلکہ اپنی گزرگاہ کے ہر پست و بلند وادی اور قرب و جوار کے ہر نشیب و فراز سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی آگے بڑھتی تھی۔ پھر حضرت شاہ صاحب کی سب سے بڑی نمایاں اور علمی خصوصیت یہ تھی کہ مبدأ فیاض نے آپکو رسوخ فی العلم کے ساتھ ہر علم و فن کے مباحث و مسائل پر اجتہادی اور ناقدانہ و مبصرانہ نظر عطا فرمائی تھی۔ حضرت موصوف کی تصنیفات و تالیفات اور صحیح بخاری اور سنن ترمذی کی درسی تقریروں کے مجموعے جو مختلف حضرات نے شایع کئے ہیں، انہیں ملاحظہ فرمائیے آپ پر خود یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی۔ اس حیثیت سے حضرت الاستاذ ایک فردِ واحد نہیں، بلکہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ حدیقۂ علم و فضل کے گلِ سرسبد ہی نہیں بلکہ سرتاسر یک گلشن ہزار لالہ و گل بکنار تھے۔ وہ بیک وقت حافظ ابنِ حجر بھی تھے اور ابنِ جریر طبری بھی، ابنِ دقیق العید بھی تھے، اور شیخ ابنِ ہمام بھی،

ادب اور بلاغت میں جاحظ بھی اور عبد القاہر جرجانی بھی۔ فارسی شعر و شاعری میں اگر وہ انوری اور خاقانی کے ہم رنگ تھے تو عربی شاعری میں ابو العتاہیہ اور بحتری کے ہم پایہ نظر آتے تھے۔ وَقِسْ عَلیٰ ذَالِكَ ۔

ہر انسان کو اپنے نفس کا علم حضوری ہوتا ہے۔ علوم و فنون پر اپنی اجتہادی نظر کا احساس و اعتراف خود حضرت شاہ صاحبؒ کو تھا۔ جب کبھی موقع ہوتا تھا آپ اسکا ذکر کرتے تھے بلکہ متعدد بار یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض علوم و فنون آپ نے ایجاد بھی کئے ہیں جو افسوس ہے کہ مدوّن نہیں ہو سکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی شہرت کا غلغلہ برصغیر ہند و پاک سے باہر اسی زمانے سے پہنچنا شروع ہو گیا تھا جب کہ ابھی آپکا عہد شباب تھا اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی موجودگی میں دار العلوم دیوبند سے بحیثیت مدرّس کے آپکا تعلق ابھی قائم ہوا ہی تھا، چنانچہ ۱۵، اپریل ۱۹۱۲ء کو علامہ سید رشید رضا مصری صاحب المنار دار العلوم دیوبند میں تشریف لائے۔ اُن کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے عربی میں دیوبند کے مسلک علمی و فقہی پر کم و بیش ایک گھنٹہ ایسی فصیح و بلیغ تقریر کی کہ علامہ مصری اس سے حد درجہ متاثر اور محظوظ ہوئے۔ چنانچہ مراجعت وطن کے بعد موصوف نے المنار میں اپنے سفر ہند کی روئداد شائع کی تو اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے علم و فضل کی کھلے لفظوں میں داد دی۔

اس واقعہ کے بعد جب مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تہذیب و ترتیب اور مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ اور مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے اہتمام و انتظام سے حضرت شاہ صاحبؒ کی تقاریر بخاری کا مجموعہ فیض الباری کے نام سے قاہرہ میں شائع ہوا اور ممالک عربیہ کے علماء اعلام اور محققین کرام کو براہ راست حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم سے استفادہ کا موقع ملا تو وہاں کے علمی ایوانوں کے بام و در حضرت الاستاذ کی علمی اور تحقیقی ژرف نگاہی کی صدا سے گونج اٹھے جسکا سب سے بڑا مظہر وہ مقالہ ہے جو علامہ شیخ محمد زاہد کوثری نے حضرت موصوف پر لکھا اور جو مقالات زاہد کوثری میں موجود ہے۔ علاوہ ازیں شیخ عبد المنعم النمر نے دار العلوم دیوبند میں مندوب کی حیثیت سے دو برس تک قیام کرنے کے بعد علماء ہند پر دو جلدوں میں ایک بلند پایہ اور

تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ اس میں شیخ النمر نے جس طرح حضرت شاہ صاحبؒ کو خراجِ عقیدت و ارادت پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصر کے علمی اور دینی حلقے گنجینۂ دیوبند کے اس گوہرِ گرانمایہ کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

پھر اسی کے قریب زمانے میں شام کے نہایت فاضل اور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نے حضرت الاستاذؒ کی دو معرکۃ الآراء کتابیں **عقیدۃ الاسلام** اور **اِکفارُ المُلحدین** اپنے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ بڑے اہتمام وانتظام سے اپنے ادارہ کی طرف سے دمشق سے شایع کیں، تو اب حضرت شاہ صاحبؒ کی شہرت اور تعارُف کا حلقہ ممالکِ عربیہ میں قاہرہ سے مراکو تک وسیع ہوگیا۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں جب میں مراکو گیا اور ایک اجتماع میں تقریر کر کے فارغ ہوا تو ایک سن رسیدہ عالم نے دریافت کیا کہ میں نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ میں نے کہا دیوبند میں۔ یہ سُنتے ہی انہوں نے پوچھا کیا تم شیخ السید انور شاہ الکشمیری کو جانتے ہو؟ میں نے کہا، کیوں نہیں! مجھ کو تو اُن سے شرفِ تلمّذ حاصل ہے۔ یہ سُننا تھا کہ شیخ پر عالمِ وجد طاری ہوگیا۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا۔ ہاتھ چومے اور مجھے ایک کونے میں لیکر بیٹھ گئے اور بولے: اچھا! اب تم مجھ کو اپنے اُستاد کے حالات سُناؤ کہ صورت شکل کیسی تھی، لباس کیا تھا، عادات وخصائل کیا تھے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ تھا، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ خود اپنے وطن میں عملاً گمنام رہے، نہ یہاں کبھی حضرت موصوفؒ پر کوئی کتاب شایع ہوئی، نہ یہاں آپکے نام پر کسی اکادمی کا قیام عمل میں آیا۔ اور نہ یہاں حضرت کی کوئی یادگار قائم ہوئی، خوشی کی بات ہے کہ کشمیر کے ایک ہونہار اور پُرجوش نوجوان عبدالرحمٰن صاحب کوندو نے یہ المناک حقیقت محسوس کی اور بقدرِ ہمت و استطاعت تلافیٔ مافات کے لئے کمرِ ہمت باندھ لی۔ یہ کتاب موصوف کی اسی جدّ وجہد اور سعیِ پیہم کا ثمرِ خوش اثر ہے۔ اس کتاب کے لئے مضامین کی فراہم آوری انکی ترتیب و تہذیب اور انکی کتابت وطباعت کے سلسلے میں انہوں نے جو تکالیفِ شاقّہ دل کی لگن اور دُھن کے ساتھ برداشت کی ہیں اُنہیں وہی لوگ اچھی طرح سے محسوس کر سکتے ہیں جنہیں ان کاموں کا تجربہ ہو۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عبدالرحمٰن صاحب کوندو نے صرف کتاب کے ایک مُرتّب اور ناشر کا رول ادا نہیں کیا بلکہ خود کمالِ تحقیق وجستجو سے محنت ومشقّتِ بسیار کے بعد حضرت الاستاذ

رحمۃ اللہ علیہ کے خاندانی، مقامی اور ذاتی سوانح حیات کا پورا حصہ خود مُرتّب کیا۔ اور اس جامعیت سے کہ موضوع زیرِ بحث کا کوئی گوشہ اور پہلو تشنہ نہیں رہا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور تحقیقی کمالات کا معاملہ تو یہ ہے کہ اہلِ علم حضرات نے اس پر بہت کچھ لکھا اور آیندہ بھی لکھا جائے گا اور تحقیق کا قدم جتنا آگے بڑھتا جائے گا اسی قدر حضرتُ الاُستاذ کے علمی اور تحقیقی امتیازات وخصائص نکھر کر سامنے آتے رہیں گے۔ البتہ جہاں تک ذاتی احوال وسوانح کا تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ عبدالرحمٰن صاحب کونڈوؔ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں جُزوی طور پر کوئی ترمیم یا اضافہ ہوسکتا ہے لیکن بنیادی طور پر اس میں نہ اضافہ ہوسکے گا اور نہ تغیرُ اور تبدّل اور اسکی وجہ یہ ہے کہ نوجوان مُرتّب نے نہایت مُستند اور معتبر ذرائع معلومات میں سے کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس سے براہِ راست اِستفادہ نہ کیا ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مواقع ہر شخص کو کہاں حاصل ہوسکتے ہیں! اس مجموعہ میں مشاہیر علماء وارباب قلم کے مقالات جو اچھے سے اچھے اور مُفید ہیں، شریکِ اشاعت ہیں۔ اُمّید ہے کہ ایک نوجوان کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور اربابِ ذوق اسکے مُطالعہ سے شادکام ومحظوظ ہونگے۔

سعید احمد اکبر آبادی

نئی دھلی

۲ر اکتوبر ۱۹۷۶ء

تقریظ

از حکیم الاسلام حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب (دامت برکاتہم)
(مہتمم دار العلوم دیوبند)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حضرت مولٰینا محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ آپ اس زمانہ میں آیۃٌ مِن آیاتِ اللہ تھے۔ اگرچہ آپکی شہرتِ ایک محدّث کی حیثیت سے ہے لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ اللہ نے آپکی ذات میں ایک عالَم جمع کر دیا تھا ؎

لَیْسَ عَلَے اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ ٭ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

اسلامی علوم وفنون کے دائرے کا شاید ہی کوئی علم یا فن ایسا ہو جس سے حضرت شاہ صاحبؒ واقف نہ ہوں اور اسکے مسائل کے متعلق خاص تحقیقی نظر نہ رکھتے ہوں، بلکہ بیشتر عصری علوم پر بھی آپکو عبور حاصل تھا اور جدید مسائل میں بھی مجتہدانہ رائے رکھتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وُسعتِ نظر، کثرتِ مطالعہ، اِستحضار اور رسوخ فی العلم کی مثال گذشتہ کئی صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ آپکا تعلّق کشمیر کی وادیٔ لولاب سے تھا۔ کشمیر سے ہر دور میں سینکڑوں عُلماء اور مُحدّثین پیدا ہوئے ہیں۔ بعض ان میں سے اپنی عظمت اور شہرت میں ساتویں آسمان تک پہونچے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ اپنی خصوصیات اور خدمات کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

مجھے جس پہلو پر سب سے زیادہ افسوس رہا وہ یہ ہے کہ کشمیر نے اپنے اِس مایۂ ناز فرزند کی کماحقہٗ قدر نہ کی، ضرورت اس کی تھی کہ کشمیر اپنے علمی اور دینی اِرتقاء کے سَفر میں حضرت شاہ صاحبؒ کے نقوش پا سے رہنمائی حاصل کرتا، لیکن افسوس اور حیرت اس پر ہے کہ جس شخصیت کے علم کے چرچے ہند وپاک کی سرحدوں سے گزر کر عالَمِ عرب کی علمی مجلسوں تک جا پہنچے ہوں اور وہاں کے مُمتاز عُلماء اس شخصیت کے والہ وشیدا نظر آتے ہیں وہ خود اپنے وطن میں اس حد تک گمنام ہو کہ اس کا تعارُف بس پُرانے زمانے کے ان بوڑھوں تک محدود ہو جنہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھا

ہے اور انکی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

ضرورت تھی کہ کشمیر اپنے اسلاف کو پہچانتا اور وہاں کی نوجوان نسل کے قلوب اپنے آباواجداد کے علوم کی روشنی سے لبریز ہوتے۔ الحمدللہ اب یہ رجحان پیدا ہو رہا ہے اور یہ بات لائقِ تحسین ہے کہ وادی کے ایک ہونہار اور لائق نوجوان عبدالرحمن صاحب کوندو نے اپنے فرض کا احساس کیا ہے انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کا اسمِ گرامی سنا اور اس عظیم المرتبت شخصیت کے تمام علمی و روحانی پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ "الانور" دراصل اسی مبارک احساس کا نتیجہ ہے اور اس تفصیلی مطالعہ کا خوب صورت مرقع۔ فاضل مؤلف نے "الانور" کی ترتیب و تالیف کے سلسلہ میں بڑی تگ و دو کی ہے۔ خاص طور پر وہ حصہ جو انہوں نے خاندانِ انوری کے حالات کے سلسلے میں سپردِ قلم کیا ہے، بلاشبہ انتہائی محققانہ ہے۔ اپنے اسلوب بیان اور استدلال کی قوت کی بنا پر "الانور" حضرت شاہ صاحبؒ سے متعلق لکھی گئی کتابوں میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

اللہ تعالیٰ مؤلف کو جزائے خیر دے اور انہیں علومِ انوری سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین)

محمد طیب

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۲۴ محرم ۱۳۹۸ھ

عرضِ حال

پیش نامۂ طبعِ ثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ وَسَائِرِ عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیۡنَ اِلٰی یَوۡمِ الدِّیۡنِ۔ اَمَّا بَعۡدُ فَقَدۡ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ: وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَعۡمٰی وَالۡبَصِیۡرُ ۙ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوۡرُ ۙ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الۡحَرُوۡرُ ۚ وَمَا یَسۡتَوِی الۡاَحۡیَآءُ وَلَا الۡاَمۡوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُسۡمِعُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَمَاۤ اَنۡتَ بِمُسۡمِعٍ مَّنۡ فِی الۡقُبُوۡرِ ۝ (الفاطر)۔ وَقَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الۡعَالِمَ یَسۡتَغۡفِرُ لَہٗ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ وَالۡحِیۡتَانُ فِیۡ جَوۡفِ الۡمَآءِ۔ وَاِنَّ فَضۡلَ الۡعَالِمِ عَلَی الۡعَابِدِ کَفَضۡلِ الۡقَمَرِ لَیۡلَۃَ الۡبَدۡرِ عَلٰی سَائِرِ الۡکَوَاکِبِ وَاِنَّ الۡعُلَمَآءَ وَرَثَۃُ الۡاَنۡبِیَآءِ۔

(احمد، ترمذی، ابو داؤد، ابن ماجہ، دارمی)

اَخُو الۡعِلۡمِ حَیٌّ خَالِدٌ بَعۡدَ مَوۡتِہٖ ٭ وَاَوۡصَالُہٗ تَحۡتَ التُّرَابِ رَمِیۡمٗ
وَذُو الۡجَھۡلِ مَیِّتٌ وَھُوَ مَاشٍ عَلَی الثَّرٰی ٭ یُظَنُّ مِنَ الۡاَحۡیَآءِ وَھُوَ عَدِیۡمٗ

اس کتاب کی پہلی اشاعت کے پیش نامہ میں، میں نے لکھا تھا کہ شیخ الحدیث حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے سبق آموز سوانح حیات پر قلم اُٹھانا میرے علم اور تجربے کی محدودیت اور موضوع کی وُسعت و فخامت کے لحاظ سے ایک جسارت ہی تصوّر ہوگی۔ لیکن کیا کیا جائے بقول حضرت ترجمان الحقائق ع "کچھ کام نہیں بنتا بے جراتِ رندانہ"۔ خداوند کریم کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ اہلِ علم و بصیرت بالخصوص حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات کے وارثوں اور آپکی عبقریت کے قدرشناسوں نے اس جُراتِ رندانہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا جس کا نتیجہ

یہ ہے کہ کتاب کا پہلا ایڈیشن چند ماہ کے اندر اندر ختم ہوگیا اور اب شائقین کے اصرار سے میں دوسری طباعت کے مراحل طے کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ الحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

ایک ضخیم کتاب جو ایک دینی پیشوا اور عالم کے مخصوص حالات پر مشتمل ہے اسکو سمجھنے اور اس سے کما حقّہٗ استفادہ کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کی تعداد رفتارِ زمانہ کی وجہ سے روز بروز محدود سے محدود تر ہوتی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود "الانور" کو جدید و قدیم ہر قسم کے اہلِ علم کے ہاں قبولیت کی جو سند حاصل ہوئی ہے یہ محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا فضل و کرم ہے جسکے لئے مجھے عمر بھر بارگاہِ ایزدی میں شکر گزار رہنا چاہیئے۔

"الانور" کے پہلے ایڈیشن کا ملاحظہ کرنے کے بعد آسمانِ علم و فضل کے جن روشن ستاروں نے میری کوششوں کی تحسین کی اور میری "بضاعتِ مزجاۃ" کو سعیِ مشکور کا رتبہ عطا کیا ان سب کے نام یہاں درج کرنا مشکل ہے۔ تاہم ان میں حکیم الاسلام حضرت مولینا قاری محمد طیب (مہتمم دار العلوم دیوبند) حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ناظمِ اعلیٰ ندوۃ المصنّفین دہلی)، حضرت مولینا محمد منظور نعمانی (مدیر "الفرقان" لکھنو)، حضرت مولینا سعید احمد اکبرآبادی (سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)، صاحبِ انوار الباری حضرت مولینا سید احمد رضا بجنوری اور حضرت اقدس مولینا سید ابو الحسن علی ندوی (ناظمِ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) کے اسماءِ گرامی سرِ فہرست ہیں۔ میں ان کا فرداً فرداً ممنونِ احسان ہوں۔ جزاھم اللہ خیر الجزاء

ریاستِ جموّں و کشمیر کے اہلِ علم اور اربابِ فکر و نظر میں سے جن حضرات نے الانور کی پذیرائی میں دل کھول کر میری ہمّت بڑھائی، اُن میں مندرجۂ ذیل اصحاب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں:-

جناب شیخ محمّد عبد اللہ (وزیرِ اعلیٰ جموّں و کشمیر)، حضرت مولینا محمّد سعید مسعودی، جناب سیّد میر قاسم (ایم۔پی)، مولینا محمّد فاروق (میر واعظِ کشمیر)، پروفیسر غلام رسول بچہ (چیئرمین مُسلم ایجوکیشنل ٹرسٹ، سوپور)، جناب غلام احمد (سکریٹری وزیرِ اعلیٰ) جناب محمّد یوسف ٹینگ (سکریٹری جموّں و کشمیر کالچرل اکادمی)، جناب غلام علی بخشی (ناظمِ اطلاعات

جموں و کشمیر)، پروفیسر غلام محی الدین حاجنی، جناب جی۔ ایم میر (ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن کشمیر) جناب ایم، ایم کاظم (ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن ایڈمنسٹریشن)۔

میں ان سب حضرات کا درجہ بدرجہ شکریہ ادا کرتا ہوں اور صدقِ دل سے دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ جزیل سے نوازے۔

عربی مقولہ ہے کہ "مَنْ صَنَّفَ فَقَدْ اِسْتَهْدَفَ" مُصنّفین کے زمرے میں شامل ہونا جرح و قدح اور تنقید کے تیروں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے رہنا ہے۔ "اَلْاَنْوَرْ" مرتّب کرنے والا اس کلیہ سے مُستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ امر موجبِ مسرّت ہے کہ اکثر و بیشتر ناقدین نے مُوافقانہ اور مُؤیّدانہ تبصرے لکھے اور ان تبصرہ نگاروں میں بڑی صاحبِ علم و فضل ہستیاں ہیں۔ اخبارات اور رسائل نے بھی "اَلْاَنْوَرْ" کے اپنے موضوع پر جامع ترین ہونے کا اعتراف پوری فراخدلی سے کیا ہے۔ اس زمرے میں کشمیر کے قریباً تمام جراید کے نام اور بیرونِ ریاست کے مُوقّر جراید میں سے ماہنامہ "مَعَارِف" "اعظم گڈھ"، ماہنامہ "بُرھَان" دھلی اور دارُالعلوم دیوبند کا عربی ترجمان "اَلدَّاعِیْ" وغیرہ شامل ہیں۔ فرداً فرداً بھی درجنوں قارئین نے "اَلْاَنْوَرْ" کے مُطالعہ کے بعد اپنے تأثرات پریس میں شایع کرائے۔ کچھ مُدّت تک "اَلْاَنْوَرْ میری نظر میں" کے مُستقل عنوان کے تحت کشمیر کے پریس میں مختلف قارئین کے تبصرے چھپتے رہے جن میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی سب لکھنے والوں نے "اَلْاَنْوَرْ" کی خوبیاں بیان کی ہیں، اور مُصنّف کی مساعی کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ کتاب شایع کرنے کے وقت ایسا ہوا کہ صفحات کی تعداد جب بہت زیادہ ہوگئی تو بہت سے مقالات اور دیگر جمع شُدہ مواد کے لئے گُنجائش نہ نکل سکی۔ کتاب شایع ہو جانے کے بعد مزید تاریخی معلومات فراہم ہوگئے جو کتاب کے مختلف ابواب میں جگہ حاصل کرنے کے مُستحق ہیں۔ یہ دیکھ کر ارادہ ہُوا کہ کتاب کی ایک اور جلد مرتّب کی جائے جس میں یہ بقایات سمیٹ لئے جائیں لیکن اخراجات کا سوال ایک لاجواب سوال ہے جو

ہر ارادے کے راستے میں آہنی دیوار بن کر حائل ہوجاتا ہے۔ اسی دوران میں جب اشاعتِ اوّل کا ذخیرہ ختم ہوگیا اور دوسری اشاعت کی نوبت آگئی تو مزید حاصل شدہ معلومات کو شاملِ کتاب کر دینے کا اچھا موقعہ نکل آیا تھا لیکن اس سے پورا استفادہ نہ کیا جاسکا۔ کیونکہ دوسری اشاعت کے لئے تقاضے شدید ہیں اور وقت کی تنگی ازسرنو مُسودہ تیار کرنے اور نئے سرے سے کتابت وغیرہ کے مراحل سے گذرنے کی مُتحمّل نہیں ہوسکتی اور اس لئے اس اشاعت میں ترمیمات و اِضافات بہت خفیف ہیں۔ نہایت معمولی ترمیمات اور تصحیحات کے ساتھ یہ دوسری اشاعت قارئین کی خدمت میں پیش کر کے قسم بہ قسم مزید معلومات کے ساتھ کتاب کا تیسرا ایڈیشن اِن شاءاللہ عن قریب ھدیۂ ناظرین ہوگا۔

وجہِ تالیف ابتداءً اِس جسارت کا مُحرّک حضرت شاہ صاحبؒ اور دیگر عُلماء وعُرفائے زمانۂ حال کی زندگیوں کا سرسری سا مطالعہ ہُوا۔ کچھ مُدّت سے دینی اور تاریخی کتابوں سے اِستفادہ کر کے میں نے اپنے حاصلِ مطالعہ کو حَسبَۃً لِلّٰہ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے فائدہ کے لیے انگریزی اور اُردو میں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں (مثلاً (DIVINE COMMANDMENTS) احکامِ الٰہی، ارشاداتِ (SAYING'S OF PROPHET MOHAMMAD s. a.) رسولؐ، فرموداتِ علیؓ اور ملفوظاتِ حضرت پیرؒ وغیرہ) ہزاروں کی تعداد میں چھاپکر کے تقسیم کرنے کا سِلسِلہ جاری کیا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات سے اجمالاً باخبر ہونے کے بعد اِرادہ ہوا کہ شاہ صاحبؒ پر ایک رسالہ لِکھ کر کشمیر کے ان لِکھے پڑھے لوگوں کو بتاؤں کہ ان کے اَسلاف جب علم کے سمندروں میں شناوری کرنے اُترتے تھے تو تیرتے تیرتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے تھے۔ اسی اَثناء میں اپنی مُروّجہ تعلیم سے فراغت کے بعد "جامعہ دینیات دیوبند" کے نصاب کی تکمیل کر کے "فاضِلِ دینیات" کا امتحان پاس کیا اور دیوبند جاکر دارالعلوم اور اس کے اکابر کی تاریخ سے قریبی واقفیّت حاصِل کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ

کا تعارف نامہ لکھنے کا ارادہ پختہ تر ہوگیا اور کشمیر واپس آکر اپنے ایک جلیلُ القدر رفیق الحاجّ خواجہ عبدالمجید صاحب لون (آئی، پی، ایس) نے اس سلسلے میں مجھے اپنے بھرپُور تعاوُن کی پیش کش کی اور اپنی تمامتر شفقتوں سے نوازا۔

یوں تو اس مقصد کے لئے ایک چھوٹا سا کتابچہ یا ڈیڑھ سو دو سو صفحات کی ایک متوسط درجے کی کتاب مُرتّب کر دینا ہی کافی تھا۔ اور ذہن میں کام کا پہلا خاکہ بھی کچھ ایسا ہی تھا لیکن جب کام شروع کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی کمالات اور شخصی کوائف و ذاتی صِفات و حُسنات کا ایک بحرِ بے کنار آنکھوں کے سامنے موجزن ہوگیا۔ ہرچند اس ساگر کو گاگر میں سمیٹ لینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے مگر اختصار کی تمام کوششوں کے باوجود کتاب کا حجمُ اُمید و ارادہ سے مُتجاوز ہوتا گیا۔ پھر بھی موضوع کے بے شمار گوشے تشنۂ تکمیل رہ گئے۔ اور خُدا تعالیٰ کو منظور ہُوا تو تیسری اِشاعت میں کتاب کو نقشِ ثانی سے بہتر بنانے کی کوشِش کی جائے گی۔ ورنہ ہمارے بعد کسی اور کو خدا تعالیٰ توفیق ارزانی کرے گا کہ وہ تلافیٔ مافات کر دے۔ کیا عجب ہے کہ

"مَردے از غیب بروں آید و کارے بکُند"

حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تاریخ وفات ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء ہے تب سے آج چھیالیسواں (۴۶) سال چل رہا ہے۔ تقریبًا نصف صدی کی اس طویل مُدّت میں وہ لوگ جو آپ کے ہم عصر تھے۔ یا آپ کے براہِ راست فیض یافتہ تھے اور جن کے سینے آپ کے تفصیلی حالات کا خزینہ تھے (معدودے چند مُستثنیات کو چھوڑ کر) اس دُنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ اس لئے آپ کے حالات کے خاص خاص پہلو جن پر سوانح نِگار اپنی تخلیق کی بنیاد قائم کرتا ہے دست رس کی حدود سے باہر ہو چکے ہیں۔ اور عام حالات کے مآخذ کا دائرہ بھی تنگ ہوتے ہوتے آج تک شایع شدہ تحریرات تک محدود ہوکر رہ گیا ہے اور یہ تحریرات بھی آسانی سے ہاتھ آجانے والی جنس تو ہیں نہیں، ان کا سب سے بڑا حِصّہ وہ مضامین ہیں جو آپ کی

وفات کے وقت سے ۴۶ سال کی اس طویل مُدت میں غیر منقسم ہند میں اور برِّ صغیر کی تقسیم کے بعد ہند و پاکستان اور بنگلہ دیش میں آپ کے مدّاحین اور قدر شناس اہلِ علم کے قلم سے نکلتے رہے ہیں۔ ایسے مضامین عربی، فارسی، اُردو، انگریزی، بنگالی، سندھی، گجراتی، پشتو اور بعض افریقی زبانوں میں بے حد و حساب شائع ہوئے ہیں اور اگر کوئی ان کا بالاستیعاب مُطالعہ کرنا چاہے تو اس کو حجاز، مصر، شام، ایران، افغانستان، افریقہ، ڈھاکہ، کلکتہ، پٹنہ، اعظم گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ، علی گڈھ، مراد آباد، بجنور، احمد آباد، سورت، ڈابھیل، دہلی، دیوبند، سہارنپور، لدھیانہ، لاہور، راولپنڈی، پشاور ملتان، حیدر آباد اور کراچی وغیرہ شہروں سے لے کر جموّں و سرینگر تک کی تمام لائبریریوں میں محفوظ ادبی اور علمی رسالوں کی ورق گردانی کے مرحلوں سے گذرنا اور ان تمام مضامین کا جائزہ لینا چاہیئے جن کو اگر ترتیب دیکر کتابی شکل میں چھاپا جائے تو کئی ضخیم مجلّدات تیار ہو جائیں لیکن ایسا کام تو کوئی اکادمی ہی انجام دے سکتی ہے جو شاہ صاحبؒ کے نام سے قائم کی جائے۔ مجھ جیسے فردِ واحد کے لئے بحالاتِ موجودہ چاند اور مریخ پہ جا اُترنا شاید آسان ہو مگر یہ کام بہت مُشکل ہے۔ ان صعبُ الحصول مآخذ کے بعد جو کچھ رسائی کی حدود میں ہے، وہ ہے عربی زبان میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک شاگردِ رشید مولینا سیّد محمّد یوسف بنوریؒ کی تالیفِ لطیف "نَفْحَةُ الْعَنْبَرِ مِنْ هَدْيِ الشَّيْخِ الْأَنْوَرْ" مطبوعہ ۱۹۳۶ء۔ اور اُردو زبان میں شاہ صاحبؒ کے خَلفِ اکبر مولینا محمد ازہر شاہ قیصرؒ کا مُرتّب کردہ مجموعۂ مقالات بعنوانِ "حیاتِ انور" (مطبوعۂ دیوبند ۱۹۵۵ء)۔ یہ دو ایسے شاہکار رہ جاتے ہیں جن کو حضرت شاہ صاحبؒ کی جدید سوانح حیات کا مأخذ بنایا جا سکتا ہے۔ اور لُطف یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں بھی اب نایاب ہو چکی ہیں۔ میرے لئے ان کا حصول بھی جوئے شیر کاٹ لینے سے کم نہ تھا البتہ دار العلوم دیوبند کا آفیشل آرگن ماہنامہ "دار العلوم" ایک مُفید اور

سہل الحصول اور معلوماتی ماخذ ہے جس میں دیگر بزرگانِ دیوبند کی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات پر بھی وقتاً فوقتاً مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جس کے مکرّرات سے قطع نظر حیات و کمالاتِ انوریہ پر قابلِ قدر معلومات کا ذخیرہ ہاتھ آ سکتا ہے۔

ہند میں علی العموم مضامین "دار العلوم" سے ہی استفادہ کر کے بعض اہلِ قلم نے حضرت شاہ صاحبؒ کی حیات اور کارناموں پر کچھ چیزیں شائع کی ہیں، جو کہ میرے مُطالعہ سے گزریں۔ لیکن یہ تحریریں یا تو اس قدر سرسری ہیں کہ ان سے کوئی مُدد مِل ہی نہیں سکتی، یا طالبعلمانہ مشق ہیں۔ جن میں "دُرست" کے پہلو بہ پہلو "نادُرست" بھی کھڑی ہیں۔ البتہ معلوم ہوا تھا کہ پاکستان میں مرحوم مولینا محمد انوری لائیلپوری نے "انوارِ انوری" نام سے حیاتِ انور پر مُستقل کتاب لکھی ہے۔ اور مصنّفِ نَفْحَةُ الْعَنْبَرْ مولینا بنوریؒ نے اپنی کتاب کو نظرِ ثانی کے بعد کچھ اضافے کر کے مُرتّب کیا ہے لیکن ان کتابوں تک رسائی آسان نہ تھی۔ میں نے رسالہ "دار العلوم" اور نَفْحَةُ الْعَنْبَرْ (قدیم ایڈیشن) سے استفادہ کرنے کے علاوہ مولینا محمد ازہر شاہ صاحب قیصر کی مُشفقانہ اجازت سے "حَیَاتِ اَنْوَرْ" میں چھپے ہوئے متعدد ایسے مقالات جو حضرت شاہ صاحبؒ کے اَرشَد و اَخَصّ تلامذۂ کرام کا ہدیۂ عقیدت تھے، جُزوِ کتاب بنائے ہیں، حضرتِ موصوف کے علمی کمالات، آپ کا فلسفۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم، قوّتِ حفظ و استحضار ذہانت و فطانت اور عبقریت کی دیگر خصائص کا جو نقشہ ان مضامین کے طفیل پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔ اس تک کسی دوسرے ذریعہ سے رسائی ممکن نہ تھی۔ مگر ان سرچشموں سے اپنے موضوع کے گلشن کی آبیاری کرنے کے بعد بھی سوانحاتِ انور کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں۔ اور آپ کی زندگی کے بعض اہم واقعات کے متعلق مُطالعہ کنندہ کے بہت سے سوالات کا جواب متذکرۂ بالا ماٰخذ سے حاصل نہ ہو سکتا تھا، اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے مجھے ہندوستان کے بہتیرے شہروں کا سفر کرنا پڑا۔ متعدد کتب خانوں میں جا کر سینکڑوں کتابوں، رسائل و جرائد اور مخطوطات کی ورق گردانی کرنی پڑی۔ کشمیر کی گذشتہ پانچ سو سال کے تاریخی واقعات

کی جھیلوں میں غوطے لگانے پڑے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت الشیخ بابا مسعود نوریؒ کے حالات کا گہرا مطالعہ کرنا پڑا اور اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ کے ہم وطنوں اور ہم قبیلہ لوگوں کے معلومات سے بھی گھر گھر جاکر مدد لینی پڑی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ بہت کچھ کنج کاوی اور خاک چھاننے کے بعد اکثر حل طلب سوالات کے شافی و کافی جوابات حاصل ہو گئے، جس کے بعد جو کچھ لکھا گیا علیٰ وجہ البصیرت لکھا گیا۔ اپنی بساط کی حد تک کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودہ پیڑھی اور نئی نسل حضرت شیخ الحدیث علّامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ذاتِ بابرکات سے متعارف ہو جائے تاکہ آپ کی پاکیزہ سیرت کو اپنے لئے نمونۂ کردار بنا سکے۔ کیونکہ یہی امر اس کتاب کی تحریر کا مقصدِ اوّلین ہے۔

مالکِ ارض و سماوات سے دعا ہے کہ وہ میرے ارادے اور کوشش کو قبول فرمائے اور میری اس ٹوٹی پھوٹی تحریر کو پڑھنے والوں کے لئے حصولِ فیض و برکت کا موجب بنائے (آمین)۔

تحریر یکم مارچ ۱۹۷۸ء

عبدالرحمٰن کوندو

کوکر باغ، نوشہرہ، سرینگر ۱۱ کشمیر

تصویرِ انور

از محمد ضیاء الرحمٰن ضیاؔ

۱۔ گلستانِ وادیٔ لولاب کا تازہ گلاب
چہرۂ انور تھا شرحِ آئینہ نور و کتاب

۲۔ تھا جبینِ پاک پہ سیمائے مِن اَثَرِ السُّجُود
دیکھ کر حلقہ بگوشِ دیں ہوئے اہلِ جحود

۳۔ سلکِ قرنِ اوّلیں کا گم شدہ دُرِّ فرید
جانِ محمودُ الحسنؒ، نورِ دلِ احمد رشیدؒ

۴۔ قالبِ روحِ بخاریؒ ہمسرِ ابنُ الحجرؒ
جانشینِ بو حنیفہؒ، رشکِ یعقوبؒ و زفرؒ

۵۔ چلتا پھرتا وہ کتب خانہ تھا مثلِ زیلعیؒ
نکتہ دانِ فقہ و میرا ذکیاء و ترمذی

۶۔ تھا لبیدؓ و سعدیؒ پُرگو نظیرِ بو نواس
خوش اداء و خوش مزاج و باجمال و خوش لباس

۷۔ بوعلیٔ وقت فخرُ الدّین رازیٔ زماں
شہ ولیُ اللہؒ دوراں و غزالیِ زماں

۸۔ فلسفی و آشنائے رمزِ قرآنِ مُبیں
شارحِ علمِ حدیثِ پاک و نکتہ آفریں

۹۔ دین[ا] کی حقانیت کا حُجّت و بُرہاں رہا
تھا فرشتہ اور گمانِ حضرتِ انساں رہا

۱۰۔ "قولِ مرداں جان میدارد"، کی جو تفسیر تھی
فرقۂ باطل کے آگے وہ زباں شمشیر تھی

۱۱۔ بے نیازِ خانۂ و جاہ و جلال و سیم و زر
محو تھا درس و بیان و وعظ میں شام و سحر

۱۲۔ تھا دلِ شیشہ میں انوارِ جمالِ کبریا
اشرف و اَوْرَع سراپا دانش و حلم و حیا

۱۳۔ عِلم کے چرخِ چہارم پر ضیا افشاں رہا
ہر ستارہ کاسب انوارِ بے پایاں رہا

۱۴۔ نفحۃُ العنبر مکمل داستاں ہے آپ کی
فیض باری بارگاہِ جاوداں ہے آپ کی

۱۵۔ آپ ہی کی ذات تو صد نازشِ کشمیر ہے
فخر کے قابل ازل سے آپ کی تقدیر ہے

۱۶۔ اے خوشا دیوبند جلوہ زارِ حسنِ عالماں
مکّۂ ہندی، زیارت گاہِ اربابِ دِلاں

ا۔ صفحۂ آئندہ پر دیکھئے۔

۱۷. بوئے علمِ آسمانی، تجھ سے آئی تھی کبھی
چھتۂ مسجد میں شانِ دلربائی تھی کبھی

۱۸. آج بھی دارالعلوم پُرشکوہ سینہ پہ ہے
بارشِ انوار و رحمت جس کے ہر زینہ پہ ہے

۱۹. تیرے دامن میں گلاب و لالہ چیدہ چیدہ ہیں
قاسم و محمود و انورؒ یاں پہ آرامیدہ ہیں

مرکزِ نورِ الٰہ و وارثانِ مصطفیٰؐ
گویا ظلمت گاہ میں خورشیدِ انور کی ضیا

*

(حاشیہ متعلقہ صفحۂ گذشتہ) ؎ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے جس میں آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی عبقریت

آئینۂ آراءِ اکابرین

★ "خداوند تعالیٰ نے مولینا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہنِ ثاقب کو جمع کر دیا ہے۔"

حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسنؒ

★ "مَا رَأَیْتُ مِثْلَ هٰذَا الْأُسْتَاذِ الْجَلِیْلِ"[1]

علامہ سید رشید رضا مصری مدیر "المنار" قاہرہ

★ "ایک عیسائی فلسفی نے اسلام کی حقانیت کی یہ دلیل دی ہے کہ غزالیؒ جیسا محقق اور مفکر مذہب اسلام کی صداقت کا علمبردار تھا۔ اس زمانہ میں میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولینا محمد انور شاہؒ کا محافظ اسلام ہونا ہے۔ اگر اسلام

---

[1] ترجمہ:- "میں نے (آج تک) اس جیسا عالم جلیل نہیں دیکھا۔" کوندو

میں کوئی کجی یا کمی ہوتی تو (زمانۂ حاضرہ کی ذہین ترین شخصیت) مولینا انور شاہؒ دینِ اسلام سے کنارہ کش ہو جاتے۔"

حکیم الامت مجددِ ملت مولینا اشرف علی تھانویؒ

★ "اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحبؒ کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔"

ترجمانُ الحقائق علامہ اقبالؒ

★ "مولینا محمد انور شاہ مرحوم وُسعت نظر، قوّتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علومِ ادب میں بُلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نوازشوں کی جنّت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے، کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قَالَ اللہُ وَقَالَ الرَّسُولُ کا نعرہ بُلند کیا۔"

(ملتقطاً و مختصراً) وکیلِ اسلام علامہ سید سلیمان ندویؒ

★ "حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات بِلا شُبہ وقت حاضر کے کامل ترین عالمِ ربانی کی وفات ہے جن کی نظیر مستقبل (قریب) میں متوقع نہیں۔ طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحب

کا تبحّر، کمال فضل، ورع و تقویٰ، جامعیت و استغنا مُسلّم تھا۔ موافق ہو یا مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے گردن جُھکا دیتا تھا۔"

مُفتیٔ اعظم ہند علّامہ مولٰینا مُفتی محمّد کفایت اللہ دہلوی رح

★ "مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تُم نے حافظ ابنِ حجر عسقلانی رح، شیخ تقی الدّین بن دقیق العید اور سُلطان العلماء حضرت شیخ عزّ الدین عبدالسّلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا کہ "ہاں! دیکھا ہے" کیونکہ صرف زمانہ کا تقدّم و تأخّر ہے، ورنہ اگر حضرت شاہ صاحبؒ بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپؒ کے مناقب و محامد بھی اوراقِ تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہوتے، میں محسوس کرتا ہوں کہ حافظ ابن حجر رح، شیخ تقی الدینؒ اور سُلطانُ العلماءؒ کا آج انتقال ہو رہا ہے۔"

شیخ الاسلام علّامہ شبیر احمد عثمانی رح

★ "بے نظیر عالمِ دین رخصت ہوگیا۔"

فاتحِ قادیان امامُ المناظرین شیخ الاسلام مولٰینا ثناء اللہ امرتسری رح

★ "مولٰینا محمّد انور شاہ صاحبؒ چمنِ ولیُ اللّٰہی کے ایک بارآور اور ثمردار درخت تھے۔ جو اپنے گنجان سایہ

سے تمام عالم کو مستفید کر رہے تھے اور جس درخت کے شیریں پھلوں سے ایک عالم اپنی گرسنگی کو دور کر رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ ایک فیض جاری کے ایسے سرد اور شیریں چشمہ تھے جس کے پانی کا بہاؤ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ تمام عالمِ اسلامی اس چشمہ سے سیراب ہو رہا تھا۔ اس کا منبع اگرچہ دیوبند میں تھا لیکن اس کا دھارا چین، بخارا، جاوا، مصر اور ٹرکی میں پڑتا تھا۔"

سحبانُ الہند مولینا احمد سعید دہلوی مرحوم

★ "میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالِم کہ کتب خانہ کا کتب خانہ ہی جس کے سینے میں محفوظ ہو سوائے حضرت مولینا انور شاہ کے کوئی نہیں دیکھا۔

میں نے ہندوستان، حجاز، عراق اور شام وغیرہ ممالکِ اسلامیہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائلِ علمیہ میں ان سے گفتگو کی۔ لیکن تبحّرِ علمی، وسعتِ معلومات اور علومِ نقلیہ (یعنی قرآنِ کریم و حدیثِ رسولِ اکرمؐ) اور علوم عقلیہ (یعنی فلسفہ، تاریخ اور ہیئت وغیرہ) کے احاطہ میں شاہ صاحبؒ کا کوئی نظیر نہیں پایا۔"

شیخُ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنیؒ

★ "حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ کی نظیر علوم میں خصوصاً علمِ حدیث میں پیش کرنے سے تمام ایشیا عاجز ہے۔ جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کے چہرے کو دیکھتا ہی رہوں۔"

بابائے صحافت مولینا ظفر علی خان مرحوم

★ "اِس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پر کھائی جائے کہ مولینا انور شاہؒ اس زمانے میں بے نظیر عالِم ہیں۔"

امامِ انقلاب مولینا عبیدُ اللہ سندھیؒ

★ "صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا، یہ پیچھے رہ گئے تھے۔"

خطیبُ العصر رئیسُ الاحرار مولینا سید عطاءُ اللہ شاہ بخاریؒ

★ "شاہ صاحبؒ سلفِ صالحین کا نمونہ ہیں اور علم کا ایک چلتا پھرتا کتب خانہ ہیں۔"

مولینا حبیبُ الرحمٰن صاحب عثمانیؒ

★ "اَلشَّیْخُ الْفَاضِلُ الْعَلَّامَۃ اَنْوَرْ شَاہ اَحَدُ کِبَارِ الْفُقَہَاءِ الحنفیۃ و (علماء الحدیث الاجلاء)[1]"

ابن خلکانِ ہند حضرت مولینا سید عبد الحی لکھنویؒ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۸۔ (خطوطِ وحدانی میں حضرت کے فرزند ارجمند مولینا علی میاں صاحب مدظلہ العالی کی عبارت ہے۔ جیسا کہ انہوں نے خود تصریح فرمائی ہے) کو ندو [illegible]

★ "مجھے جب کبھی کسی مسئلہ میں کوئی دشواری پیش آتی تو کتب خانہ دار العلوم کی طرف رجوع کرتا، اگر کوئی چیز مل جاتی تو فبہا ورنہ پھر حضرت شاہ صاحبؒ سے رجوع کرتا، شاہ صاحب جو جواب دیتے اُسے آخری اور تحقیقی پاتا، اور اگر حضرت شاہ صاحبؒ نے کبھی یہ فرمایا کہ میں نے کتابوں میں یہ مسئلہ نہیں دیکھا تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب یہ مسئلہ کہیں نہیں ملیگا اور تحقیق کے بعد ایسا ہی ثابت ہوتا۔"

مولانا سید اصغر حسین دیوبندیؒ

★ "اگر مجسّم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولانا انور شاہ کو دیکھ لے۔"
مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ

★ "میں نے شاہ صاحبؒ کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جو امام بخاریؒ، حافظ ابن حجرؒ، ابن تیمیہؒ، ابن حزمؒ اور شوکانیؒ وغیرہ کے نظریات پر تنقیدی نظر و محاکمہ کر سکتا ہو اور ان حضرات کی جلالتِ قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث و تحقیق کا حق ادا کر سکے۔"

علامہ محدث علی حنبلی مصریؒ

★ "علامہ ابن الہمام (صاحبِ فتح القدیر متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحبؒ کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متنِ احادیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحبؒ اور ابنِ ہمامؒ کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے"۔

محدث و مفسر علامہ زاہد بن الحسن الکوثریؒ۔

★ سلطنت ٹرکی کے سابق شیخُ الاسلام مصطفیٰ صبری نے حضرت شاہ صاحبؒ کی تصنیف "مِرقاۃُ الطارم" دیکھ کر فرمایا کہ:۔
"میں نہیں سمجھتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس اطرز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دنیا میں موجود ہے۔ جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اسفار اربعہ شیرازیؒ کی ان چار مجلداتِ کبیرہ پر بھی"۔

شیخُ الاسلام مصطفیٰ صبری

★ "واقعی حضرت شاہ صاحبؒ آیۃٌ مِّن آیاتِ اللہ تھے"۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ

★ "چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیان
جلوہ فرماست در آغوشِ زبانِ انورؒ"

مولانا غلام قادر گرامی مرحوم

★ "علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ متاخرین میں جس پائے کے محدث گذرے ہیں وہ اونچے اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ حق یہ ہے کہ حدیث کے وسیع و دقیق فن کی مہارت کا جو سلسلۃ الذہب قرونِ اولیٰ سے چلا تھا موصوف اس کی آخری کڑی تھے۔ اور آپ کے بعد پوری دنیائے اسلام میں اس شان کے محدث اور حافظ حدیث کم از کم ہماری معلومات کی حد تک عنقا کے درجے میں ہیں۔ حدیث کو سمجھنے والے، اس پر عمدگی سے کلام کرنے والے اور اس کے مطالب و مفاہیم کو دلنشین پیرائے میں بیان کرنے والے تو بفضلہ تعالیٰ اب بھی ہیں اور فنی نزاکتوں پر عبور رکھنے والے بھی مفقود نہیں، لیکن جلیل القدر حفاظِ حدیث کی یہ مخصوص شان کہ صدہا احادیث لفظ بہ لفظ حافظے میں محفوظ ہو اور بر وقت ان کا استحضار بھی ہو، علامہ انور شاہ صاحبؒ کے بعد کہیں نظر نہیں آتی۔"

مشہور نقاد مولانا عامر عثمانی مرحوم

★ "میں حضرت شاہ صاحبؒ کے یگانہ کمالات اور ان کے تبحرِ علمی، محیر العقول حافظہ اور فنِ حدیث میں ان کے علوِ مرتبہ، نیز ان کی حیرت انگیز وسعتِ نظر سے نہ صرف واقف بلکہ اس کا معتقد ہوں لیکن مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہیں، میری واقفیت بالواسطہ اور ان کے تلامذہ کے ذریعہ سے ہے۔"

فخرِ ملتِ اسلامیہ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم

★ "حنفیوں میں علامہ انور شاہ کاشمیریؒ علم و فضل خصوصاً علم حدیث میں اپنی نظیر بس آپ ہی تھے۔"

مفسر قرآن مولٰینا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی

★ "قاسم العلوم والخیرات مولٰینا محمد قاسم صاحب نانوتوی (بانیٔ دارالعلوم) اپنے عہد میں جس طرح اپنے وہبی علوم و افکار کے لئے ممتاز تھے، کہ امامتِ عصر ان کے حصہ میں آئی تھی، ٹھیک اسی طرح شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے کسبی علوم و افکار کی وجہ سے امام العصر ہو کر رہے۔ میرا یقین ہے کہ ماحول اور عمر نے اگر وفا کی ہوتی تو وہ اس صدی کے مجدد ہوتے، اپنی علمی جامعیت اور تبحر کی وجہ سے وہ بجا طور پر عبقری (GENIUS) اور نابغۂ عصر تھے۔"

مولٰینا شمس تبریز خان آروی مدظلہ العالی

★ "لَمَّا رَأَيْتُ وَجْهَهُ عَرَفْتُ اَنَّهُ عَالِمٌ مُتَوَرِّعٌ مُتَشَرِّعٌ جَامِعٌ لِعُلُومِ الْاٰلِيَةِ وَالْاِلٰهِيَّةِ"[۱]

میرواعظ المحدث مولٰینا غلام نبی مبارکی کشمیری مدظلہ العالی

---

۱ ترجمہ:- "جونہی میری نظر پہلی بار ان کے چہرۂ مبارک پر پڑی میرے دل پر یہی عکس پڑا کہ یہ ایک پرہیزگار، پابندِ شریعت اور علومِ عقلیہ و نقلیہ کے جامع عالم ہیں۔" کوندو

★ "ہر چند مرحوم ہر فن میں مہارتِ تامّہ رکھتے تھے لیکن حدیث اور فقہ میں بلا شبہ تمام دُنیائے اسلام میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہ تھا۔"

(شارحِ کلامِ اقبالؒ) پروفیسر یوسف سلیم چشتی

★ "AMONG THE 'ULMA OF KASHMIR ORIGIN, THE NAME OF THE LATE SHAIKH-UL-HADITH MAULAVI MUHAMMAD ANWAR SHAH OF THE LOLAB VALLEY IS WORTH MENTIONING, ON ACCOUNT OF HIS EMINENCE IN MUSLIM THEOLOGY.
WITH HIM DIED, PERHAPS, THE GREATEST SCHOLAR OF HADITH OF THE DAY".

Ghulam Mohi-ul-Din Sufi (M A D Litt).
**KASHIR* Vol 2nd. Page 383 (1974).*

❖

ؔ ترجمہ:۔ "کشمیری الاصل علماء میں سے وادئ لولاب کے (رہنے والے) شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ مرحوم کا نام نامی علومِ اسلامیہ میں ان کے علوِّ مرتبہ کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہے۔
ان کی رحلت زمانۂ حاضرہ کے عظیم ترین مُحدّث کی وفات ہے۔"
(ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی، مصنّفِ "کشیر")

تاریخ کشمیر کا دورِ ظلمت

(از گوندو)

حضرت شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی کی حیات مجموعۂ کمالات کی حکایت شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کے اُس دورِ ظلمت کی تھوڑی سی نقاب کشائی کردی جائے جو آپ کے زمانۂ پیدائش اور اس سے قبل اور متصل مابعد وادئ کشمیر پر مسلط تھا۔

جنّت پر جہنم کا تسلّط

حضرتِ محدث کشمیری مولانا انور شاہ صاحبؒ انیسویں صدی عیسوی کی چوتھی چوتھائی کی ابتداء یعنی ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ اس انیسویں صدی کا قریبًا سارا زمانہ کشمیری عوام کے لئے ظلم وتشدّد قحط و وبا اور بدترین سیاسی انقلابات کے بے پناہ طوفانوں سے گذرنے کا زمانہ تھا۔ جب یہ صدی شروع ہوئی تو وادئ کشمیر کابل کے زیرنگین تھی اور اس خطۂ جنّت نظیر کی بے بس مخلوق کی تقدیر کے فیصلے سرینگر کے بدلے کابل اور قندھار میں کئے جاتے تھے اور وہاں سے جو حاکم آتے تھے ان کے نام تو بے شک مسلمانوں کے سے تھے اور وہ کلمہ گو ہونے کے مُدعی

بھی تھے، مگر وہ کشمیر میں آنے ہی اپنے عمل سے چنگیز اور ہلاکو کی بے رحمی، درندگی اور انسان کشی کے مکمل نمائندے بن جانا لازمۂ حکمرانی تصور کرتے تھے۔ ظلم کو پائیداری نصیب نہیں۔ یہ کابلی حکمران بھی جب ایک طرف اپنے پیشۂ ستمگری کے صدقے میں عوام کی تائید سے محروم ہوتے گئے اور دوسری طرف اپنے مراکز کابل، قندھار اور ہرات میں تاج و تخت کے لئے سازشوں اور برادر کشی کی وجہ سے آپ اپنے ہاتھوں بیخ کنی کرتے گئے، تو پہلے لاہور میں اس کے بعد کشمیر میں اور بالآخر پشاور میں بھی ان کے قدم اُکھڑ گئے اور انھوں نے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اسکے جانشینوں کی تازہ دم اُبھرتی ہوئی طاقت کو پنجاب، کشمیر اور صوبۂ سرحد سونپ کر اپنا دامن کوہِ سلیمان کے اُس پار سمیٹ لیا۔

طوفانِ تعصبات

خطۂ کشمیر جنت نظیر پر سکھوں کا تسلط ۱۸۱۹ء میں ہوا جو ۱۸۴۶ء یعنی خالصہ راج کے خاتمہ تک جاری رہا۔ اہلِ کشمیر کے لئے افغانوں کا جانا اور سکھوں کا آنا ایک ظالم کے پنجے سے نکل کر دوسرے اظلم کے چنگل میں گرفتار ہو جانے کے مترادف تھا۔ جان و مال تو پہلے کے ہاتھ سے بھی محفوظ نہ تھے، مگر نیا ظالم چونکہ کشمیریوں کے دین اور مذہب پر بھی ٹیڑھی نظر رکھتا تھا اس لئے اس کے ہاتھ سے درسگاہیں، عبادت گاہیں اور زیارات و مساجد بھی نہ بچ سکیں۔

لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اگرچہ اپنی بے تعصبی کے نقارے بجا رہا تھا لیکن کشمیر میں اس کے کارندوں نے مذہبی تعصب کا جو

ننگا ناچ ناچا، اس کا ادنیٰ سا نمونہ یہ ہے کہ کشمیر پر قابض ہوتے ہی جامع مسجد سرینگر میں پہلے گھوڑے باندھے گئے اور اس کے بعد سالہا سال تک اس کے دروازے مُقفّل کر کے اذان، نماز، درس و تدریس اور مسجد کی تعمیر و تقدیس کے ہر کام کو ناممکن بنا ڈالا۔ اور جو چھوٹی مسجدیں شہر و قصبات میں دربندی سے بچ گئیں ان میں اذان دینے کی ممانعت ہو گئی اور بارہا بے چارے مؤذّن اسی خطا پر گرفتاری اور مار پیٹ کا نشانہ بنے کہ کسی "سردار صاحب" کے کان میں صدائے "اللہ اکبر" ہل چل کا موجب بن گئی تھی۔ لاقانونیت اور دہشت گردی کے اس دَور میں کشمیر کے اکثر دینی مدارس اور ہر قسم کی تعلیم کے دوسرے ادارے جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے۔ اور کشمیر کے لوگوں میں افغانی ظلم کے خاتمہ تک بھی اگر زندگی کی کوئی رمق بچ گئی تھی تو سکھ حکومت کے اہل کاروں نے اس کو کچل ڈالنے میں اپنی پوری طاقت صَرف کر ڈالی اور وادی کشمیر کی پوری آبادی خاصکر مسلم آبادی کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ مظلومیت، محکومیت اور زندگی کے ہر اختیار سے محرومیت کو اپنی قسمتِ ازلی یقین کر کے اپنے قول و فعل سے ہی نہیں بلکہ اپنے تصوّر اور خیال سے بھی اس کی مخالفت نہ کرے۔

ڈوگرہ دَور کی پیدائش

۱۸۴۶ء میں جب رنجیت سنگھ کے جانشینوں کی خانہ جنگیوں نے بھائیوں کے ہاتھوں بھائیوں کا گلا کاٹ کر انگریزی امپریلزم

کو دلی سے درۂ خیبر تک اور ملتان سے سرینگر تک سارا شمالی ہندوستان سونپ دیا، تو انگریزوں نے سکھ حکومت کے ہی ایک سابق رکن اعلیٰ راجہ گلاب سنگھ کو پچھتر لاکھ روپے میں پوری ریاست جموں و کشمیر فروخت کر ڈالی۔

چوراسی ہزار چار سو اکہتر (۸۴۴۷۱) مربع میل کا رقبہ، اونچے اونچے پہاڑ، سینکڑوں ندیاں، نالے اور دریا، ہزارہا چشمے، مرغزار اور گلزار، سیبوں، ناشپاتیوں، انگوروں، اخروٹوں، باداموں، شفتالوؤں، زردالوؤں، گلاسوں، آلوچوں اور دیگر درجنوں اقسام کے میوؤں سے بھرپور باغات، شالی اور دیگر اقسام کے غلّہ کے سونا اُگلنے والے کھیت اور سب سے بڑھ کر لاکھوں زن و مرد اور ان کے بچے، ان کے مال و مویشی گھر بار، دیہات و شہر، مکان و دکان اور بازار غرضیکہ جو داشت و نداشت تھی، انگریز امپیریلزم نے اپنے ایک منظورِ نظر کے ہاتھ صرف پچھتر لاکھ روپیہ میں بیچ ڈالی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ صرف حکمرانی میں سکھوں کا جانشین نہ تھا بلکہ کشمیر پر تشدد و تعصب اور حکمرانی بشکلِ ستمرانی میں بھی دربارِ لاہور کا وارث تھا۔

افغانوں کی خوں ریزی اور سکھوں کی بے رحمانہ لوٹ کھسوٹ کے بعد ڈوگرہ راج میں خاصکر اس کے ابتدائی دور میں کشمیر کے مسلم عوام کی قسمت میں سیاسی غلامی، بے بسی، محکومیت اور مظلومیت کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

۷۵ لاکھ روپیہ والے اس سودے پر قریباً ۷۵ سال کا زمانہ گذر جانے کے بعد ترجمان الحقائق حضرت اقبالؒ کے حساس دل سے یہ درد بھری اور پُر اثر صدا بلند ہوئی۔

ہ باد صبا اگر بہ جینوا گذر کنی ☆ حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گو
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

ہم اس مرحلے پر صرف انیسویں صدی کے واقعات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ شاعر مشرق اقبالؒ مرحوم کا یہ جانگاہ نالہ جو بیسویں صدی کی چیز ہے اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطور گذشتہ میں عرض کیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی پیدائش کا سال اس انیسویں صدی کا پچتھرواں سال (۱۸۷۵ء) ہے اور یہ دوسرے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دور ہے۔ (مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۵ء تک جموں وکشمیر پر حکومت کی) اس مہاراجہ کی حکومت کا اٹھارہواں سال تھا جب حضرت شاہ صاحبؒ پیدا ہوئے اور جب مہاراجہ مرا تو اس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔

شاہ صاحبؒ کے ہوش سنبھالنے اور تعلیم کے مختلف مراحل طے کرنے کا زمانہ رنبیر سنگھ کے آخری دور اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے ابتدائی دور کے واقعات ہیں اور یہ سب واقعات ۱۹۰۰ء کے خاتمہ سے ماقبل کے ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ڈوگرہ راج کے پہلے پچپن سال یعنی ۱۸۴۶ء سے ۱۹۰۱ء تک نصف صدی سے زائد مدّت کا دَور کشمیری عوام کے حق میں عذابِ شدید کا دَور تھا۔ اس دَور میں حکومت کے ظلم و تشدّد کے علاوہ حسبِ ذیل واقعات بھی وادیٔ کشمیر کے لوگوں کی تباہ حالی، ترکِ وطن اور خانہ خرابی کا موجب بنتے رہے۔ ان واقعات سے تاریخ کے صفحات پُر ہیں، یہاں پر چند حادثات کی طرف اشارہ کافی ہوگا:۔

ہر طرف آگ ہی آگ

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہدِ حکومت میں کثرت سے بستیوں کے نذرِ آتش ہو جانے کے حادثات سے شہر سرینگر کا بیشتر حصّہ بار بار تباہ ہو گیا، محلے اور بازار ملبے اور راکھ کے ڈھیر بن گئے۔ مؤرخ حسن اپنی مشہور تاریخ "تاریخِ حسن" کے حصّۂ اوّل صـ۹۷۴ پر لکھتا ہے کہ:۔

"۱۸۵۰ء ۱۲۶۷ھ میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ کی حکمرانی تھی، محلہ ٹینکی پورہ سے آگ شروع ہوئی تو محلہ زینہ دار صاحب وغیرہ (آجکل کے پورے وارڈ ۲) کے محلوں کو خاکستر میں تبدیل کر گئی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانہ میں آتشزدگی کے واقعات شہر و دیہات میں اس کثرت سے ہونے لگے کہ توہّم زدہ لوگ اس کو پُر اسرار حوادثات یقین کرنے لگے۔ خاصکر سال ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ کے دوران شہر و قصبات اور گاؤں میں آگ کی جو وارداتیں ہوئیں اُن سے محلوں

کے محلے ختم ہو گئے اور اپنے ساکنین کو زمانہ کے ناسازگار حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔"

مورخ حسن جو زمانہ رنبیر سنگھ کا چشم دید گواہ ہے اور کسی حد تک مہاراجہ مذکور کا مدّاح بھی ہے۔ ۱۸۷۸ء کی آتشزدگیوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ:۔

"در حکومتِ رنبیر سنگھ در ۱۲۹۵ھ در ملکِ کشمیر قحط واقع شدہ بود مدت شش ماہ بارش و باران موقوف شد۔ در شہر و دِہ ہزارہا خانہ سوختہ شدند۔ ہیچ روزے بغیر آتش نہ بود۔ بتاریخ ۲۲ ماہِ بہادون ۱۹۳۵ب از جبہ کدل آتش شعلہ ور گشتہ تا سدِ قاضی زادہ (موجودہ محلہ سھتو بربرشاہ) یک ہزار خانہ در یک دو ساعت افروخت"۔

لکڑی سے بنی ہوئی عمارتوں کو لگی ہوئی اور ہوا کی مدد سے محلے پر محلہ ختم کرتی ہوئی آگ پر قابو پانے کا اس زمانہ میں کوئی ادنیٰ سا انتظام بھی نہ تھا۔ لوگوں کے گھر بار اور موروثی داشت و نداشت منٹوں میں دہکتے انگاروں اور اُڑتی ہوئی راکھ میں تبدیل ہوتی جاتی تھی۔ اس طرح اُجڑے ہوئے عوام کو ازسرِ نو آباد کرنا تو کجا ان کی کسی وقتی اور معمولی ہمدردی کو بھی حکومت اپنا فرض نہ سمجھتی تھی۔ یہ بدقسمت آبادیاں جہاں سینگ سمائی چلی جاتی تھیں اور اکثر حاکمانِ وقت مکمل بے پروائی سے ان کی تباہی و بربادی کا تماشہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔

مہاراج گنج بازار کیسے ایجاد ہوا؟

مہاراجہ رنبیر سنگھ کی تخت نشینی سے پہلے

بھی اس صدی کے دوران سولہ بار[16] آگ کی وارداتوں سے سرینگر تباہ ہوگیا تھا۔ تازہ آتشزدگیوں سے شہر کے علاوہ علاقوں کے علاقے ختم ہوگئے۔ رنبیر سنگھ نے ایک بڑی آتشزدگی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے شہر سرینگر کا وہ مرکزی بازار بھی ختم کردیا جو جامع مسجد کے قریب واقع تھا اور جس کا نشیبی حصّہ مُلّا عراقی ہٹہ (موجودہ ملارٹہ) کے نام سے اور بالائی حِصّہ نوہٹہ کے نام سے مشہور تھا۔

ملارٹہ اور نوہٹہ کی تاریخی اہمیت

یہ کوئی معمولی بازار نہ تھا بلکہ ایک مرکزی منڈی تھی۔ جُمعہ کے دِن جامع مسجد کے چاروں طرف خراسانی رواج اور طرز کے مُطابق "ہفتہ وار بازار" لگتا تھا۔ جہاں گاؤں سے آئے ہوئے لوگ اپنی دیہاتی پیداوار غلّہ، گھی، شہد، سبزیاں، لکڑی اور گھاس وغیرہ فروخت کرتے تھے اور اس کے بدلے اپنی ہفتہ بھر کی ضروریات شہر سے لے جاتے تھے۔

ملارٹہ اور نوہٹہ کا یہ بازار شہر سرینگر کا ایک تاریخی بازار تھا اور اس کی حیثیت لاہور کے انارکلی بازار اور دہلی کے چاندنی چوک کے بازار کی سی تھی۔ جس طرح شاہجہاں نے دہلی کو آباد کرنے کے وقت چاندنی چوک کی تعمیر کو ماسٹر پلان میں شامل رکھ کر خاص مقصد اور خاص نقشے کے مُطابق تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح جب حضرت میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کے مُطابق سُلطان زین العابدین بڈشاہ کے والد بزرگوار سلطان سکندر شہمیری نے ۸۰۰ھ میں سرینگر کی جامع مسجد تعمیر کی تو اس مسجد کو مسلمانانِ وادیٔ کشمیر کے لئے دینی

اور علمی مرکز بن جانے کی وجہ سے اس کے ماحول کو ملک بھر کی تجارت کے لئے مرکزی منڈی بنا دینے کی غرض سے یہ دونوں بازار سرکاری حکم سے تعمیر ہوئے اور بڑے بڑے تاجروں نے سرکاری احکام سے ہی یہاں اپنے کاروبار شروع کئے۔ اس بازار نے شہر کو دیہات سے اور دیہات کو شہر سے ایک ایسی وابستگی عطا کر دی تھی جو اپنی مثال آپ تھی اور پورے معاشرے کی زندگی پر اس ہفتہ وار بازار کا گہرا اثر تھا۔ بڑے بڑے مدرسے اور کتب خانے بھی اسی کے آس پاس واقع تھے اور اس طرح جامع مسجد کا یہ ماحول ملکی ترقی، تجارت اور پوری اسلامی تہذیب و تمدن کی آئینہ داری کرتا تھا۔

تجارتِ کشمیر پر حاسدانہ حملہ

ڈوگرہ حکومت چاہتی تھی کہ کشمیر کی تجارت پر پنجاب کے ان مہاجنوں کی قوم کا تصرف ہو جائے جنہوں نے کشمیر کی خریداری کے وقت مہاراجہ گلاب سنگھ کو لاکھوں روپیہ قرض دیا تھا۔ مگر اس ارادہ کو عملی شکل دینے کا کوئی موقعہ نہ ملتا تھا۔ آج کل جہاں مہاراج گنج بازار ہے، یہ علاقہ جب آتشزدگیوں کے صدقے میں خالی ہو گیا تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

پنجابی مہاجن حکماً ٹھونسے گئے

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے وہاں اپنے نام سے ایک منڈی اور بازار قائم کیا اور پنجاب سے بڑے بڑے مہاجن بیوپاری لاکر تھوک بیوپار کا کاروبار ان کے حوالہ کر دیا مگر اندیشہ تھا کہ سابق مقامی تاجروں کے مقابلے میں کہیں وہ ناکام نہ رہ جائیں۔

اس لئے ۱۲۸۵ھ میں سرکاری حکم اور اعلان کے ذریعہ لونہٹہ، ملارٹہ اور جامع مسجد کے مضافات کے بازار بند کرا دئے گئے۔

الغرض چار سو اٹھاسی (۴۸۸) سال تک یہ بازار نہ صرف سرینگر بلکہ پوری وادیٔ کشمیر کی مرکزی تجارت گاہ رہنے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ آج ان کی حیثیت معمولی گذرگاہوں کی سی ہے۔ اور اب بھی یہ علاقے سرینگر کے سلم ایریا (SLUM AREA) میں شمار ہوتے ہیں۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کو صرف رنبیر گنج پر مہاجنوں کا تسلّط جمانے سے ہی تسلّی نہ ہوئی۔ اس نے امیرا کدل پل کے دونوں طرف بھی پنجابی مہاجنوں کی دکانیں قائم کرائیں اور سرائے بالا کی نشست پر مہاراج بازار کے نام سے ایک اور نیا بازار قائم کر کے اپنے منظورِ نظر سود خواروں کو وہاں لا کر آباد کیا۔

قیامت خیز زلزلے

علامہ اقبالؒ نے عالمگیر حادثات اور بنی نوع انسان کی عمومی مصائب بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے ؎

بجلیاں ہیں، زلزلے ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں\
کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایّام ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کا کشمیر حضرت موصوف کے اس شعر کا پورا مرقع تھا۔ آتش ہائے ناگہانی کی خرمن سوزی اور قحط و آلام سے جو کچھ بچ جاتا تھا وہ مسلسل اور شدید زلزلوں کی نذر ہو کر رہ جاتا تھا۔

اس انیسویں صدی میں کشمیر میں چار بہت بڑے بھونچال آئے لیکن ان میں سے آخری دو (۱۲۸۰ھ ۱۸۶۳ء اور ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۵ء) زلزلوں سے کشمیر کی تباہی اِنتہا کو پہنچ گئی۔ بے شمار مکان آنکھ جھپکنے میں زمین بوس ہو گئے۔ ناقص

سرکاری اندازہ کے مطابق ساڑھے تین ہزار انسان لقمۂ اجل ہو گئے۔ جو لوگ ملبے کے نیچے دب کر مرجانے سے بچ گئے وہ خوف و ہراس کے مارے مدت تک اپنے مکانوں سے باہر دور میدانوں میں جاکر سوتے رہے۔ ۱۸۸۴ء ۱۳۰۲ھ کا زلزلہ جو ماہِ شعبان میں ٹھیک شب برات کو آیا (اور جس کا مادۂ تاریخ بھی "زلزلۂ شدید شب برات" رہا) اس قدر تباہ کن تھا کہ کئی جگہ زمین پھٹ گئی اور مکان اپنے مکینوں کو لیکر "فخسفنا بہ وبدارہ الارض" کے مصداق بن گئے۔ جس علاقے پر زلزلہ کا زیادہ اثر پڑا تھا وہاں اس سے ہلاک ہونے والے انسانوں کی تعداد دس ہزار پانچسو شمار میں آئی اور گائے، بیل اور دیگر مواشی کا کوئی شمار نہیں ہو سکا۔

آبادیوں کا خاتمہ کر دینے والا قحط

۷۸-۱۸۷۷ء میں کشمیر میں قحطِ عظیم پڑا۔ جس میں انسانوں نے انسانوں کا گوشت کھایا۔ لوگ مُردوں کو دفنانے کے بدلے ان کو اپنے تنورِ شکم کے حوالے کر دیتے تھے۔ بے شمار لوگ موت کا شکار ہوئے اور اس طرح سے گاؤں کے گاؤں خالی ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت وادی کی آبادی جو قحط سے پہلے آٹھ لاکھ تھی، کم ہو کر صرف دو لاکھ رہ گئی اور باقی چھ لاکھ یا تو ملک چھوڑ کر بھاگ گئے یا بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر گئے۔ اکثر ایسا ہوا کہ جن لوگوں نے کشمیر سے بھاگ کر آس پاس کے علاقوں ہزارہ سرحد اور پنجاب وغیرہ میں پناہ لینے کی کوشش کی، وہ منزلِ مقصود تک شاذ و نادر ہی پہنچ پائے۔ راستوں کے دائیں بائیں ان کی ہڈیوں کے ڈھیر

برسوں تک ان کے دردناک انجام کی یاد دلاتے تھے۔

مہلک وبائیں

قحطوں کے ساتھ ساتھ وبائی امراض کا یہ حال تھا کہ انیسویں صدی میں دس بار کشمیر میں سخت کالرا پھوٹ پڑا، جس علاقہ میں وبا پہنچی وہاں چھ چھ مہینے تک قدم جما کر انسانی آبادی کا خاتمہ کرتی رہی۔

کالیرے کا ٹیکہ جیسے علاج تب تک کشمیر میں کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اس وبا کا قدیم طب میں جو علاج تھا حکومت نے کبھی اسکی پروا بھی نہ کی۔ سب سے زیادہ تباہ کُن کالرا ۱۸۹۲ء کا بیان کیا جاتا ہے جس میں لگ بھگ بارہ ہزار افراد چند دنوں میں جان بحق ہو گئے۔

سیلاب ہائے کشمیر

جس زمانے کا حال بیان ہو رہا ہے، یہ دَور سیلابوں کے لحاظ سے بھی دورِ تباہی تھا۔ یوں تو کشمیر میں سیلاب اکثر آتے ہی رہتے ہیں لیکن ۱۸۹۲ء کے سیلاب کو مؤرخینِ کشمیر نے "اِبتلائے عظیم" سے تعبیر کیا ہے۔ اس ریکارڈ توڑ سیلاب کی تباہ کاریاں کتنی زیادہ تھیں، اس میں کمر توڑ مہنگائی اور ضروریاتِ زندگی خصوصاً غذا کی نایابی سے لوگوں کی کیا حالت ہو گئی، کتنے مکان گر گئے، فصلوں اور مویشی کا کیا حال ہُوا اور کتنی جانیں تلف ہوئیں، یہ بجائے خود ایک المناک داستان ہے۔

سرلارنس کے تاثّرات:۔

ان مصائب و شدائد کا مارا ہُوا کشمیر تھا جس کی دیہاتی زمینوں کا بندوبست کرنے جب سٹلمنٹ کمشنر مسٹر والٹر، آر لارنس آئے تو عوام کے

خوں چکاں حالات اور ان کی حیوانوں سے بھی پست تر زندگی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے۔ چنانچہ مسٹر لارنس نے اپنی مشہور کتاب "دی ویلی آف کشمیر" (مطبوعہ لندن ۱۸۹۵ء) میں اپنے "تاثرات اس طرح بیان کئے ہیں :-

"When I first came to Kashmir in 1889' I found the people sullen, desperate and suspicious. They had been taught for many years that they were serfs without any rights but with many disabilities. They were called "ZULM PARAST", or worshippers of tyranny, and every facility was afforded to their cult. They were forced by soldiers to plough and sow, and the same soldiers attended at harvest time. They were dragged away from their houses to carry loads to Gilgit, and every official had a right to their labour and their property.
When I commenced the work of inspecting Villages in 1889, there was hardly a village where I did not see deserted houses and abandoned fields, the owners of which had perished in the great famine of 1878".

Ref. Page 2 & 216.
THE VALLEY OF KASHMIR
BY
WALTER R. LAWRENCE, (London 1895).

مفہوم :-

"۱۸۸۹ء میں پہلی دفعہ جب میں کشمیر آیا تو یہاں کے لوگوں کو میں نے اس، ناامید اور ہر ایک پر شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے پایا۔ سالہا سال سے انہیں (عملاً) یہی ذہن نشین کرا دیا گیا تھا کہ وہ محض غلام بے

دام ہیں جن کا کوئی حق نہیں ہے، البتہ ان میں بہت سی نالائقیاں ہیں۔ انہیں "ظلمت پرست" (یعنی ظلم اور ناانصافی کے سامنے جھکنے والے) کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اور ان کی عادت ذلت پرستی کو بڑھاوا دینے اور اسی پر قائم رہنے کے لئے ان کی ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ (اور چونکہ زمین کی پیداوار کو حکومت ان سے جبراً چھین لیتی تھی اس لئے) زمین جوتنے اور بیج بونے کے لئے انہیں سرکاری پولیس سے مجبور کیا جاتا تھا اور جب فصل پک کر تیار ہو جاتی تھی تو اس اناج کو چھیننے کے لئے یہی سپاہی ان کے پاس پھر آن موجود ہوتے تھے۔ انہیں گلگت تک (سرکاری) بوجھ اُٹھانے کے لئے اپنے گھروں سے گھسیٹ کر (بطور بے گار) لیا جاتا تھا۔ اور ہر سرکاری کارندے کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان سے بغیر معاوضہ کے کوئی بھی خدمت لے اور ان کی کمائی میں سے بھی جو چاہے بغیر قیمت کے لے لے۔ (اور) جب ۱۸۸۹ء میں (بندوبست اراضی کا عملی کام شروع کرنے سے پہلے) میں نے دیہات کا جائزہ لینا شروع کیا تو شاذونادر ہی کوئی گاؤں ایسا تھا جہاں میں نے اُجڑے ہوئے مکان اور بنجر پڑے ہوئے کھیت نہ دیکھے، جن کے مالک ۱۸۷۸ء کے قحط عظیم میں (مر کھپ کر) ختم ہو چکے تھے۔"

سر بنرجی کی شہادت

مسٹر لارنس نے ۱۸۹۵ء میں کشمیر کے لوگوں کی جس تباہ حالی کا رونا رویا تھا وہ تیس بتیس سال بعد تک بھی اسی طرح جاری تھی۔ چنانچہ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنی تخت نشینی کے بعد ۱۹۲۷ء میں بطور پولیٹکل اور فارین منسٹر کے بنگال کے ایک بڑے قابل انسان سر البین بنرجی (SIR ALBION BANNERJEE) کو یہاں لایا تو وہ یہاں کے عوام کی مصائب کو دیکھ کر کانپ اٹھا اور دو سال تک اپنے عہدے پر رہ کر تبدیلیٔ حالات کی کوشش کرتا رہا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو استعفیٰ دے کر گھر کو روانہ ہو گیا اور جاتے جاتے اس نے ریاست کی بدحالی کی عبرت انگیز تصویر ایک اخباری بیان میں بالفاظ ذیل کھینچی۔

"Jammu & Kashmir State is labouring under many disadvantages, With a large Mohammadan Population absolutely illiterate, labouring under poverty and very low economic conditions of living in the Villages and practically governed like dumb driven Cattle"

Ref: Page 650 A History of Kashmir.
by P. N. Kaul Bamzai-Delhi-1962.

مفہوم:۔

"ریاست جموں و کشمیر کے عوام قسم قسم کی محرومیوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ اس ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو بالکل ناخواندہ ہیں اور مختلف مصائب کا شکار ہیں، وہ غربت و افلاس کے پنجے میں گرفتار ہیں اور ان کی معاشی حالت بہت ہی پست ہے، یہ لوگ زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں (ان پر مہذب طریقے سے حکومت نہیں کی جاتی ہے) بلکہ عملاً انہیں چوپایوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔" الخ

سوانح حیات

ٹائم چارٹ
ولادت سے وفات تک

- ولادت ـــــــ ۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ (۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء)
- حصولِ علم کے لیے سفرِ ہزارہ ـــــــ ۱۳۰۵ھ
- ہزارہ سے واپسی ـــــــ ۱۳۰۸ھ
- دار العلوم دیوبند میں داخلہ ـــــــ ۱۳۱۰ھ
- دار العلوم سے فراغت ـــــــ ۱۳۱۴ھ
- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے شرفِ بیعت و تلمذ ـــــــ ۱۳۱۵ھ
- مدرسہ امینیہ دہلی کی صدر مدرسی ـــــــ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ۸ ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک
- سفرِ حرمین ـــــــ ۱۳۲۳ھ
- بارہ مولہ کشمیر میں مدرسہ فیضِ عام کا قیام ـــــــ ۱۳۲۴ھ
- فیضِ عام میں تدریسی خدمات ـــــــ ۱۳۲۴ھ سے ربیع الاول ۱۳۲۸ھ تک
- دار العلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت ـــــــ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ
- دار العلوم میں بحیثیتِ مدرسِ حدیث ـــــــ ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک
- دار العلوم کی صدر مدرسی اور حضرت شیخ الہندؒ کی جانشینی ـــــــ شوال ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء سے ربیع الاول ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء تک
- تأہل ـــــــ ۱۳۳۶ھ
- دار العلوم کی مستقل صدر مدرسی ـــــــ ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء سے ۱۳۴۶ھ تک
- جمعیۃ العلماء ہند کے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کی صدارت ـــــــ دسمبر ۱۹۲۷ء / ۱۳۴۵ھ
- دار العلوم دیوبند سے ترکِ تعلق ـــــــ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء
- جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں تدریسی خدمات ـــــــ ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء سے ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء
- مقدمۂ بہاولپور میں شہادت اور لاہور کا آخری سفر ـــــــ اگست ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء
- وفات حسرت آیات ـــــــ ۳ صفر ۱۳۵۲ھ / ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء

ولادتِ باسعادت

۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ ـ ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء

شیخ الحدیث علامہ محمد انور شاہ صاحب کشمیری (رحمہ اللہ تعالیٰ) ۲۷ ماہِ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ بوقتِ سحر اپنے ننہال موضع "دودھ واں"ؔ علاقہ لولاب (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔

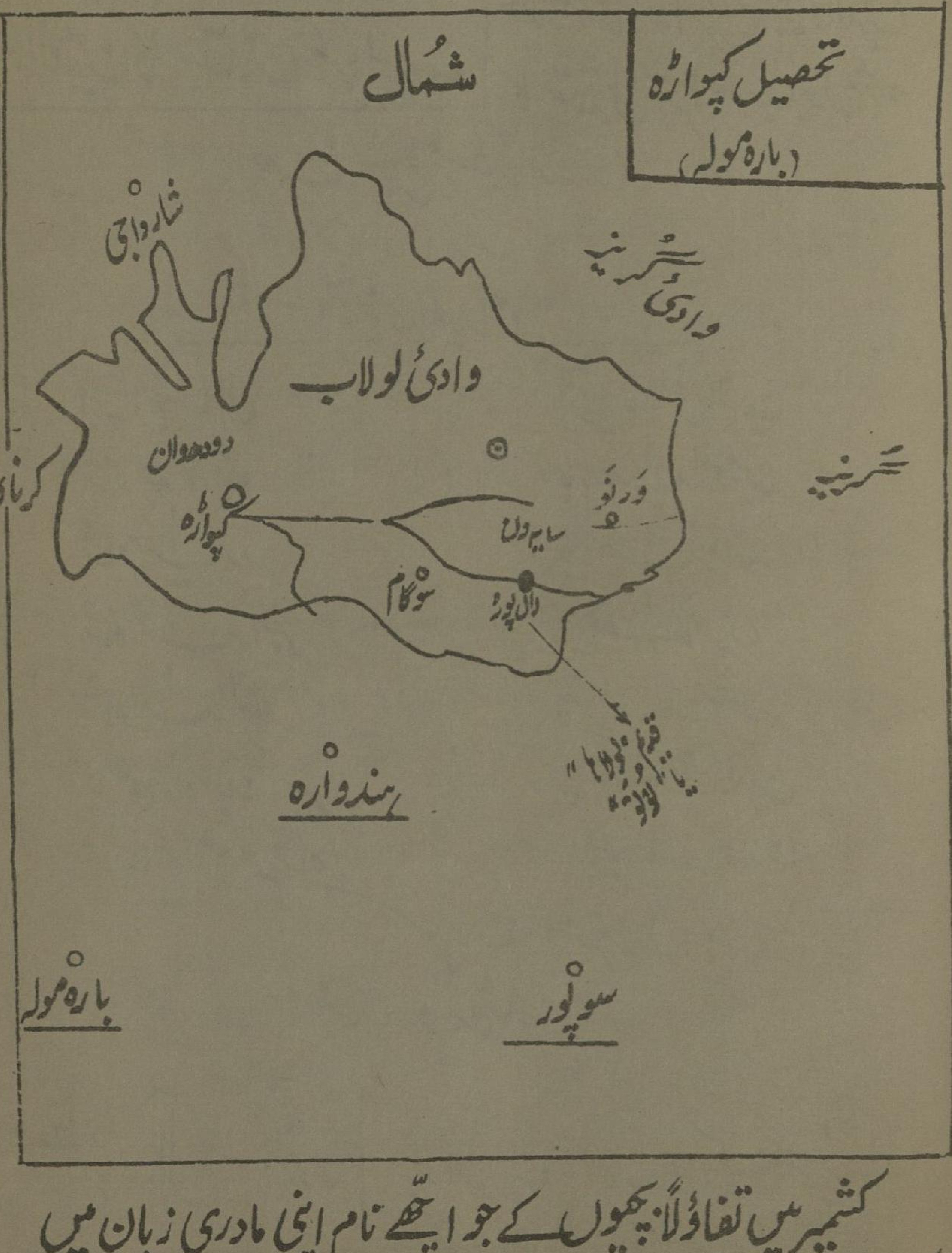
آپ کے والدِ بزرگوار عوام میں پیر محمد معظم شاہؒ کے نام سے معروف تھے اور آپ کی والدۂ محترمہ کا اسمِ گرامی "بی بی مال دیدی" تھا۔

بی بی مال دیدی

کشمیری زبان میں "مال" کے معنی "پہاڑ کی اونچی چوٹی" ہے۔ اور "دیدی" کا لفظ کشمیری زبان میں عزت و احترام کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بڑا جامع لفظ ہے۔ جس کے معنی ماں بھی ہیں اور بڑی بہن بھی۔ یوں بھی اگر کسی خاتون کا عزت یا عمر کے لحاظ سے ادب کرنا ہو تو ان کو بھی "دیدی" کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔ بنابراں "مال دیدی" کا

ؔ "دودھ وان" در اصل "دُوۃِ وَنْ" ہے۔ اور اس کا مفہوم بزبانِ کشمیری ہے:۔ "دودھ سے بھرپور جنگل"۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس گاؤں کے شمال مشرق کیطرف نہایت سرسبز چراگاہ تھی جس میں گائے، بھینس خوب نشوونما پاکر وافر مقدار میں دودھ دیتی تھیں۔ اس لئے مقامی لوگوں نے اس چراگاہ کو "دُوۃِ وَنْ" کا نام دیا تھا اور بعد ازاں یہ گاؤں "دُودھوان" کے نام سے موسوم ہوا۔

مفہوم ہے "پہاڑ کی اونچی چوٹی کی طرح بُلند رُتبہ خاتون"۔ یعنی "سر بُلند اور پُر وقار ہستی"۔



کشمیر میں تعاؤُلاً بچیوں کے جو اچھّے نام اپنی مادری زبان میں رکھے جاتے ہیں، اُن میں سے "مال" ایک پسندیدہ نام ہے۔ نسب کے لحاظ سے محمد انور شاہ کے باپ مولینا معظم شاہ کی طرح آپ

کی والدۂ ماجدہ محترمہ بی بی مال زیدی مرحومہ بھی چند پشتیں اُوپر جاکر الشیخ بابا مسعود نروری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھیں۔

والدین کا مُتقابل شجرۂ نسب

حضرت شاہ صاحبؒ کے والدین کا متقابل شجرۂ نسب یوں ہے:۔

حضرت الشیخ مسعودؒ نروری

الشیخ بابا عبداللہ

الشیخ بابا علی	الشیخ بابا تقی الدین
شاہ محمد عارف	بابا عبدالمومن
شاہ حیدر	بابا عبداللہ
شاہ محمد اکبر	پیر غلام نبی
شاہ عبدالخالق	پیر عبدالشکور
قاضی شاہ عبدالکبیر	پیر نورالدین
مولینا محمد معظم شاہؒ	بابا پیر سیف اللہ شاہ
	محترمہ مال زیدی مرحومہ

محمد انور شاہ

معظم ، مال ، انور

ذرا ان تین ناموں پر ایک نگاہ ڈال لیجئے معظم۔ مال۔ انور۔ یعنی عظمت سربلندی اور نورانیت۔ آگے چل کر حضرت مولینا محمد انور شاہ صاحبؒ

کو جو درجاتِ عالیہ نصیب ہوتے وہ ان تینوں ناموں کے دُعائیہ پہلو کا قبولیت یافتہ عکس معلوم ہوتے ہیں اور اَلْاَسْمَاءُ تُنَزَّلُ مِنَ السَّمَاءِ کی تصدیق کرتے ہیں۔

محترمہ مال دیدی کے خدادوست والد پیر سیف اللہ شاہ نے اپنی اس دخترِ نیک اختر کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ صرف کی تھی اور یہ بچّی جس کو قدرت نے نابغۂ عصر علامہ انور شاہؒ اور آپ کے دیگر پانچ ذہین اور حسین و جمیل بھائیوں کی ماں بننے کے لئے پیدا کیا تھا، زمانۂ طفولیت سے ہی صوم و صلوٰۃ اور تلاوتِ قرآنِ مجید سے والہانہ شغف رکھتی تھی اور خواتین کی مُروّجہ زیب و زینت سے ان کی بے نیازی ضرب المثل تھی۔ اس پارسا اور پاکباز خاتون میں حضرت رابعۂ بصریّہ کے اوصاف نُمایاں تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی ولادت کے زمانے میں آپ کی والدۂ محترمہ اپنے والدین کے ہاں موضع دُودھ وان میں وقتی طور تشریف فرما تھیں، ورنہ اُن دِنوں مولانا محمد معظّم شاہ مُستقل طور ضلع مظفر آباد کی وادیٔ نیلم کے موضع لَوات میں بود و باش رکھتے تھے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ کی پیدائش کے بعد آپ کی والدۂ صاحبہ نومولود لیکر واپس اپنے گھر لوات چلی گئیں۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بچپن کا زمانہ تھا جب مولانا معظّم شاہ صاحب کچھ قلبی شوق سے اور کچھ اپنی زوجۂ محترمہ کے برادر پیر اکبر شاہ کے اِصرار کے باعث وادیٔ نیلم سے منتقل ہوکر پہلے دودھ وان میں آکر مُقیم ہوئے اور اس کے بعد پرگنۂ لولاب کے موضع ورنو کو اپنا مسکن بنالیا۔ جہاں آپ کی ذُرّیت پھیلی اور اب تک موجود ہے۔

وَرنَوْ ہی وہ خوش قسمت گاؤں ہے جس کے کھیتوں میں چل پھر کر اور جس کے چشموں کا پانی پی کر شاہ صاحبؒ سنِ رُشد کو پہنچے وَرنَوْ کی اس شانِ امتیازی پر آج تک بھی اس گاؤں کا بچّہ بچّہ مُتفخر ہے۔

موضع وَرنَوْ دودھ وان سے تقریباً دس بارہ میل کی دوری پر شمال مشرق کی طرف واقع ہے اور قصبۂ کپواڑہ جہاں آجکل تحصیل کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کی آبادی بڑھتے بڑھتے موضع دودھ وان سے مُلحق ہو گئی ہے، اب کپواڑہ اور دودھ وان میں کوئی خاص درمیانی فاصلہ باقی نہیں رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا سلسلۂ نسب

حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ نے اپنا سلسلۂ نسب اپنی کئی تصانیف خاصکر نیلُ الفرقدین اور کشفُ السّتر کے آخر میں خود تحریر فرمایا ہے جو اس طرح ہے:۔

"محمّد انور شاہ بن مولینا محمّد معظّم شاہ بن شاہ عبدالکبیر بن شاہ عبدالخالق بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر ابن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شاہ عبداللہ بن الشیخ مسعود النروری الکشمیری الحنفی۔

وفی المکتوبات الخطیہ عن خلفِ الشیخ ان سَلفہٗ جاءوا مِن بغداد الیٰ الھند ودخلوا مُلتان ثُمّ ارتحلوا الیٰ بلدۃ لاھور، ثُمّ الی الکشمیر۔ واللہُ اعلم۔"[1]

ا۔ بر صفحۂ آئندہ

حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندانی کاغذات کے مطابق مذکورہ بالا سلسلۂ نسب اس کی اپنی شاخ اور حضرت شیخ مسعود نرویؒ کی اولاد کی دوسری شاخوں کے خاندان کا متواتر دستاویزات سے ثابت شدہ شجرۂ نسب ہے۔ اور حضرت شیخ مسعود نرویؒ (وفات قریباً ۸۰۱ھ ہے۔) سے حضرت شاہ صاحبؒ تک جن اشخاص کا نام آتا ہے، ان میں سے اکثر مشہور و معروف اور تاریخی ہستیاں ہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ شجرۂ نسب کا یہ حصہ جو قریباً چارسو سال سے آج تک کی مدت پر حاوی ہے، یہ روایاتِ متواترہ ثابت شدہ ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ جیسے اعاظم رجال اور مشہور شخصیتوں کے حسب و نسب کا چارسو سال تک پیش نظر ہو جانا سیرت نگاری کے مقاصد کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے ہونے کی شہرت

حضرت شیخ مسعود نرویؒ کے ساتھ نسبی تعلق رکھنے والے اکثر اہل علم میں حضرت مسعودؒ کے از اولادِ امام ابو حنیفہؒ ہونے کی شہرت اس کثرت سے ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا قرینِ انصاف نہ ہوگا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو حضرت امام اعظمؒ کی اولاد سے ہونے پر بعض تاریخی کتب کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ گو کشمیر کی مطبوعہ تاریخیں اس مسئلے پر قریب قریب خاموش ہیں۔ ان تاریخوں میں حضرت شیخ مسعودؒ کے تصوف اختیار کرنے سے قبل ایک بڑے تاجر ہونے اور تلاشِ حق میں حضرت میر سید احمد کرمانیؒ تک رسائی

(صفحہ گذشتہ) ۱؎ ملاحظہ ہو ۲؎ نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین ص۱۲ ۳؎ کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر ص۲ ۛ

حاصل کرنے اور پھر دُنیا کو ترک کر کے ریاضت وعبادت اور خدمت اسلام کے لئے وقف ہو جانے اور کمالاتِ عالیہ تک پہنچنے کی مفصل کہانی موجود ہے۔ لیکن سلسلۂ نسب کی طرف اُن مصنفین نے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ مسعودیوں میں سے بعضوں کے پاس کچھ شجرہ ہائے نسب بھی ہیں مگر اِن شجروں میں مذکورہ نام بُردہ اشخاص اور ان کے زمان و مکان کے متعلق تاریخی مواد کی تائید دستیاب نہیں ہے۔

خود حضرت شاہ صاحبؒ کے والدِ ماجد مولینا معظّم شاہ صاحبؒ کے پاس بھی اپنے قدیمی کاغذات میں حضرت مسعودؒ سے حضرت امام اعظمؒ تک ایک شجرۂ نسب تھا جس کو موصوف نے کسی وقت تفریح طبع کے طور فارسی زبان میں نظم کر ڈالا تھا۔ اس شجرے سے ملتا جلتا ایک شجرہ نرورہ میں زیارتِ عَلَمؔ صاحبؒ کے سجادہ نشین بھی پیش کرتے ہیں۔ اس شجرے کی موجودگی سے علی الاقل یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ زمانہ قدیم ہی سے بعض اہلِ علم حضرات ایسے چلے آئے ہیں جو حضرت شیخ مسعود نروریؒ کے متعلق اس بات کے قائل تھے کہ آپ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی اولاد سے تھے۔

نام کے ساتھ حنفی

حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ نے حضرت شیخ مسعودؒ کے نسب کے بارے میں کوئی تصریح نہیں کی، البتہ اپنی تصانیف "نیلُ الفرقدین" اور "کشفُ الستر" کے خاتمہ پر اپنے نسب نامہ کو حضرت شیخ مسعودؒ تک پہنچانے کے بعد اپنے نام کے ساتھ "حنفی" لکھا ہے۔ اس میں دو احتمال

ہو سکتے ہیں :- (۱) ہو سکتا ہے کہ اس سے آپ کی مراد "حنفی نسباً" ہو- جیساکہ آپ کے والد صاحب اس کے قائل تھے- (۲) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لفظ سے فقہی مسلک کے لحاظ سے "حنفی" مراد ہو- اور آپ نے آگے چل کر اس موقعہ پر جو "واللہُ اعلم" تحریر فرمایا ہے اس سے تو متبادر ہوتا ہے کہ "حنفی" سے نسباً حنفی مراد ہے، لیکن اس مسئلے پر آپ کے سامنے کوئی تنقیح شدہ تاریخی مواد دستیاب نہیں تھا- اس لئے تقویٰ اور احتیاط کے تقاضوں کے پیش نظر آپ نے "واللہُ اعلم" لکھ کر معاملہ اللہ کو سونپ دیا ہے- آپ ہی کی پیروی کرتے ہوئے اس مرحلہ پر ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ - وَاللہُ اَعلَمُ -

مزید تفصیلات تتمہ میں حضرت شیخ مسعود نروری رح سے اوپر آپ کے سلسلۂ نسب اور شجرۂ نسب کے متعلق اس مرحلہ پر ہم صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں اور مفصل بحث کتاب ہٰذا کے تتمہ ع۲ میں آجائے گی- یہاں حضرت مسعود رح کا اس قدر تعارف کافی ہے کہ :-

"دسویں صدی ہجری کے مشائخ کشمیر میں سے حضرت شیخ مسعود نروری رح اپنے معاصرین میں مراتب عالیہ پر فائز تھے اور کیا بلحاظ دولت و ثروت ظاہری، اور کیا بلحاظ علم و عمل اور تقویٰ و طہارت باطنی، اپنے زمانہ کے عوام تک آپ کی فیض رسانی کی نہریں جاری تھیں- آپ کے مرشد حضرت میر سید احمد کرمانی رح اور آپ کے ہم عصر اولیاء حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ رح حضرت جامع الکمالات علامہ شیخ یعقوب


صرفیؒ، محدث، حضرت مخدوم احمد قاریؒ، حضرت مولینا بابا داؤد خاکیؒ اور حضرت سید محمد مسافرؒ وغیرہ آپ کے علوِ مراتب کے معترف تھے۔ اور اس کے بعد تمام کشمیری تاریخیں آپ کے مناقب میں رطب اللسان ہیں۔ مُلا بہاؤ الدین متو (م ۱۲۴۸ھ) اپنی منظوم تاریخ "خمسۂ بہاؤ الدین" میں حضرت مسعودؒ کا تذکرہ شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

آنکہ بر تخت سروری زیبد
شیخ مسعود نوری زیبد

یہاں صرف یہ حقیقت جان لینے سے ہمارا مقصد پورا ہو جاتا ہے کہ فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ حضرت مسعودؒ کے آٹھویں پشت میں خلف الصدق ہیں۔ اور جب خود حضرت شاہ صاحبؒ صرف ان آٹھ پشتوں تک نسب نامہ تحریر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، تو ہم کو بھی آپ ہی کے قدم بقدم چلکر اسی کو کافی سمجھنا چاہیئے اور اگلا قدم اُٹھانا چاہیئے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللہ۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے اسلاف کا وطن

وطن؟ وطن کے سوال کو بنظر غور دیکھا جائے تو حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے آباء و اجداد کا "وطن" کوئی واحد متعین مقام نہیں رہا۔ "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" کے مطابق صدیوں سے اس خاندان کے لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں اور ایک مقام سے دوسرے مقام


کشمیر۔ مظفرآباد ہزارہ
شمال
گلگت
پکھلی
گڑھی حبیب اللہ
بالاکوٹ
مانسہرہ
ہزارہ
ہری پور
کاکول
ایبٹ آباد
دومیل
کوہالہ
راولپنڈی
مری
دوارییال
مظفرآباد
دریائے کشن گنگا
کرناہ
لولاب
گریز
بانڈی پورہ
ہندوارہ
سوپور
بارہمولہ
پٹن
گلمرگ
سری نگر
کشمیر
سونامرگ
زوجی لا
لیہہ لداخ
پہلگام
اسلام آباد
اوڑی
پونچھ
میرپور
صوبہ جموں

میں منتقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ کشمیر کی تاریخی کتابوں کی ورق گردانی سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان کے مورثِ اعلیٰ حضرت الشیخ مسعود صاحبؒ ۹۵۰ھ یا اس سے بھی کچھ مدّت پہلے واردِ سرینگر ہوئے اور گذشتہ چار سو یا ساڑھے چار سو سال کی مدّت میں حضرت مسعودؒ کے خاندان نے کشمیر کے مختلف مقامات میں توطّن کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔ ۹۵۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک اس خاندان کے بزرگ شہر سرینگر کے علاقۂ "نرورہ" میں پہلے بحیثیت تاجر (اور تاجر بھی معمولی درجہ کے نہیں بلکہ اپنے وقت کے "مَلِکُ التُّجّار") اور بعد ازاں بحیثیتِ مُرشدِ روحانی و مُبلّغِ دینِ اسلام سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد بارہویں صدی ہجری کے دوران اولادِ حضرتِ مسعودؒ کی وہ شاخ جس کے گلِ سرسبد مولینا انور شاہ صاحبؒ ہیں، وادیٔ کشمیر کے شمالی حصہ یعنی علاقۂ کامراج اور خاصکر "لولاب" کے گُل بداماں احاطے کو اپنا ٹھکانہ بنا لیتی ہے۔"

وادیٔ نیلم کی طرف ہجرت

تیرہویں صدی ہجری میں ۱۲۴۴ھ جب ریاستِ جموں و کشمیر پر لاہور کی رنجیت سنگھی حکومت کا قبضہ ہوجاتا ہے تو لاہور سے کشمیر پر ایسے حاکم بھیجے جاتے ہیں جن کا مذہبی تعصّب جنون کی حدوں سے بھی تجاوز کرتا ہے، ان گورنروں کے ہاتھوں ظلم و تشدّد کے ایسے واقعات سرزد ہوتے ہیں جو مسلمانانِ کشمیر کو اپنے گھر بار اور وطن سے ہی بیزار کردیتے ہیں۔ ہزاروں باشندے بھاگ کر

وادی سے باہر سر چھپانے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بقولِ مسٹر لارنس "گاؤں کے گاؤں اُجاڑ اور کھیت بنجر بن جاتے ہیں"۔ اِس سکھا شاہی دور میں لولاب وکامراج کے دیگر ہزاروں تارکینِ وطن کی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کے جدِ امجد شاہ عبدالکبیر اور مسعودی قبیلہ کی دوسری شاخ کے رُکنِ اعلیٰ شاہ محمد صالحؒ اور اس خاندان کے دوسرے کئی گھرانے لولاب کے لہلہاتے گلزاروں، سیماب گوں چشموں، سونا اگلتی ہوئی زمینوں اور سَو سال سے جمع کی ہوئی جائیدادوں کو چھوڑ کر ہمہ گیر ظلم سے پناہ مانگتے ہوئے لولاب جیسے محبوب وطن کو ترک کر دیتے ہیں اور شمالی دروں کو عبور کر کے وادیٔ نیلم کے اونچے پہاڑوں کے اُس پار دیودار کے جنگلات سے گھری ہوئی سرسبز وادیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں کے مواضعات کوٹن، کواٹ اور دواریاں وغیرہ میں مقیم ہو کر اپنی محنت اور قابلیت سے اس نئے وطن میں دینی پیشواؤں کی حیثیت میں باعزت زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں۔ اس وقت وادیٔ نیلم کا حاکم راجہ منصور علی خان ہوتا ہے جو ان تارکانِ وطن کو فراخ دلی اور احترام سے جگہ دیتا ہے اور یہ بھی خوشی سے اُس کی رعایا بن کر اشاعتِ اسلام کا فریضہ جاری رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے بہت سے گھرانے اب بھی وادیٔ نیلم میں آباد ہیں اور بہت سے واپس وادیٔ کشمیر کی حدود میں آ گئے ہیں۔

لولاب کی طرف واپسی

زمانہ چند مزید کروٹیں بدلتا ہے۔ سکھ حکومت اپنا سارا پارٹ ادا کر کے تاریخ

کے سٹیج سے ہٹ چکی ہوتی ہے۔ کشمیر پر ڈوگرہ راج مسلط ہوچکا ہوتا ہے اور ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ راجہ منصور خان اور اسکے جانشین راجہ شیر علی خان کی وہ چھوٹی سی پہاڑی سلطنت جو پچاس ساٹھ پہاڑی دیہات پر مشتمل ہزاروں مظلوموں کی پناہ گاہ تھی، ڈوگرہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے اور شکست سے دوچار ہوجانے کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کے ہاتھوں ختم ہوجاتی ہے۔ اور وادئ لولاب اور وادئ نیلم کے نظامِ حکومت میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ جب کشمیر سے سکھا شاہی کے اثرات کم ہوجاتے ہیں، مہاراجہ رنبیر سنگھ کا نسبتاً کم متشددانہ زمانہ آجاتا ہے۔ یعنی تیرہویں صدی ہجری کا آخری اور چودھویں صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ آتا ہے، تو اس تبدیل شدہ فضا میں مولٰنا معظم شاہ صاحب اپنے باپ اور دادا کے وطن لولاب کی کشش سے اور اپنے سسرال والوں کے اصرار سے واپس وادئ لولاب میں آجاتے ہیں، کچھ مدت تک موضع دودھ وان میں قیام فرمانے کے بعد، وادئ لولاب کے موضع ورنو میں ایک تیز رفتار اور شور مچاتی ہوئی چھوٹی سی ندی کے کنارے دامنِ کوہ میں قیام پذیر ہوجاتے ہیں۔

موضع ورنو لولاب کے اس گمنام موضع ورنو کی قسمت میں لکھا گیا تھا کہ شہرت کے آسمان پر ستارہ بن کر چمکے مگر اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے والد ماجد مولٰنا معظم شاہ صاحبؒ کے حسنِ انتخاب کا بھی دخل ہے۔ جن لوگوں نے جناب معظم شاہ صاحبؒ کو دیکھا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ جہاں ایک

بڑے عالم و فاضل، ایک سحر بیان واعظ اور زاہد شب زندہ دار تھے، وہاں فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر اور مناظر قدرت کے رمز شناس اور دلدادہ بھی تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ذیل کے اشعار میں نہ صرف اپنے احساسات کی بلکہ مولانا معظم شاہ جیسے عاشقانِ جلوہ ہائے فطرت کے جذبات کی بھی ترجمانی کی ہے۔ ؎

دُنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب!
کیا لُطف انجمن کا جب دِل ہی بُجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دِل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فِدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عُزلت میں دِن گذاروں
دُنیا کے غم کا دِل سے کانٹا نِکل گیا ہو
لذّت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گُل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نُما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانہ، سبزے کا ہو بچھونا!
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننّھے سے دِل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو، جھک جھک کے گُل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج، جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری، ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو!

بجلی چمک کے اُن کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن!
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہم نوا ہو۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو۔

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بُلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا میرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انہیں جگا دے

وَرنُو کی دِل کشی

یہ منظر کشی محض خیالی اور تصوراتی نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کے ایک شاہکار اور ایک جیتی جاگتی حقیقت کی تصویر ہے۔ اور وَرنُو وہ مقام ہے جس کو زندگی بھر کی قیام گاہ بنا کر مولٰینا مُعظم شاہ صاحبؒ اُس کی رعنائیوں سے لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماہِ مئی، جون اور جولائی کے ایّام میں کوئی شخص مُعظم صاحب کے وَرنُو میں چلا جائے اور اس ندی کے کنارے بیٹھ جائے جو مولٰینا موصوف کی قیام گاہ، آپ کی مسجد اور مزار کے سامنے سے پتھروں کے ساتھ سر ٹکراتی، جھاگ اُڑاتی اور اونچی سروں میں نہ جانے کیا کچھ گاتی اور شور مچاتی ہوئی گذر رہی ہے۔ ندی کے ایک طرف لہلہاتے کھیت ہیں اور دوسری طرف پہاڑ کی ڈھلوان میں دیودار اور چیل کا دلکش جنگل ہے، بیچ میں ایک چھوٹا سا ٹیلہ ہے جو اب حضرت معظم شاہ صاحبؒ اور ان کے فوت شدہ فرزندوں کی آخری آرام گاہ ہے۔ یہ سارا نظارہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کو متاثر کر لینے اور ترجمانِ فطرت اقبال مرحوم کے مُندرجہ صدر اشعار گنگنانے پر مجبور کر دینے کے لئے کافی ہے۔

نویں صدی ہجری سے پہلے کا وطن

الغرض کشمیر کی حدود میں حضرت شاہ صاحبؒ

کے خاندان کا وطن سری نگر کے محلہ نروورہ سے ضلع بارہمولہ تک پھیلا ہُوا ہے، اور اس سے بھی ماقبل یعنی نویں صدی ہجری اور اس سے بھی پہلے آپ کے آبائی وطن کو تلاش کریں تو تاریخیں بتاتی ہیں کہ "اس خاندان کے بزرگ کوفہ سے بغداد اور بغداد سے مُلتان آکر بسے اور پھر لاہور کو وطن بنایا اور بالآخر لاہور سے کشمیر چلے آئے۔[1]" چنانچہ خود حضرت شاہ صاحبؒ بھی کشمیر میں اس خاندان کے بانیٔ اوّل حضرت شیخ مسعود نرورہیؒ تک اپنے سلسلۂ نسب کو بیان کرنے کے بعد موصوف کے وطن کے متعلّق یوں رقمطراز ہیں کہ :-

"وفی المکتوبات الخطّیۃ عن خلف الشیخ (مسعود) انّ سلفہٗ جاءوا من بغداد الی الھند ودخلوا ملتان ثمّ ارتحلوا الی بلدۃ لاھور ثم الی الکشمیر۔ واللّٰہ اعلم[2]۔"

(یعنی حضرت شیخ (مسعودؒ) کے اخلاف کے پاس قدیم قلمی تحریرات میں درج ہے کہ موصوف کے اسلافِ کرام بغداد سے ہندوستان گئے اور مُلتان میں وارد ہوئے پھر وہاں سے شہر لاہور میں آبسے اور بعد ازاں کشمیر کی طرف منتقل ہوئے۔ واللّٰہ اعلم۔)

جہاں تک کوفہ، بغداد، ملتان اور لاہور کا تعلق ہے یہ چاروں دُنیائے تاریخ وجغرافیہ کے جانے پہچانے اور مشہور ومعروف مقامات

---

[1] ملاحظہ ہو :-

(۱) فیض الباری جلد ۱ ص ۱۷ ۔ مولینا بدر عالم میرٹھی۔ (مطبع حجازی قاہرہ مصر ۱۹۳۸ء)

(۲) مقدمۂ انوار الباری حصّۂ دوم مولینا سیّد احمد رضا بجنوری ص ۲۳۷ (طبع سوم ۱۹۶۹ء)

[2] ملاحظہ ہو خاتمہ کتاب "کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر" مولینا انور شاہ کشمیری۔

ہیں جن پر تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

نروره، لولاب اور نیلم

البتہ شاہ صاحبؒ کے تذکرہ میں تین دیگر مقامات کا نام بار بار آتا ہے جو کسی حد تک غیر معروف مقامات ہیں اور وہ ہیں۔ نروره[1]، لولاب[2]، اور وادیٔ نیلم[3]۔

ہم محسوس کرتے ہیں کہ آگے بڑھنے سے پہلے قارئینِ کرام کو نروره، لولاب اور نیلم سے متعارف کر دیا جائے کیونکہ ان مقامات کی نقاب کشائی شاہ صاحبؒ کی زندگی کے بہت سے گوشوں تک رسائی حاصل کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔

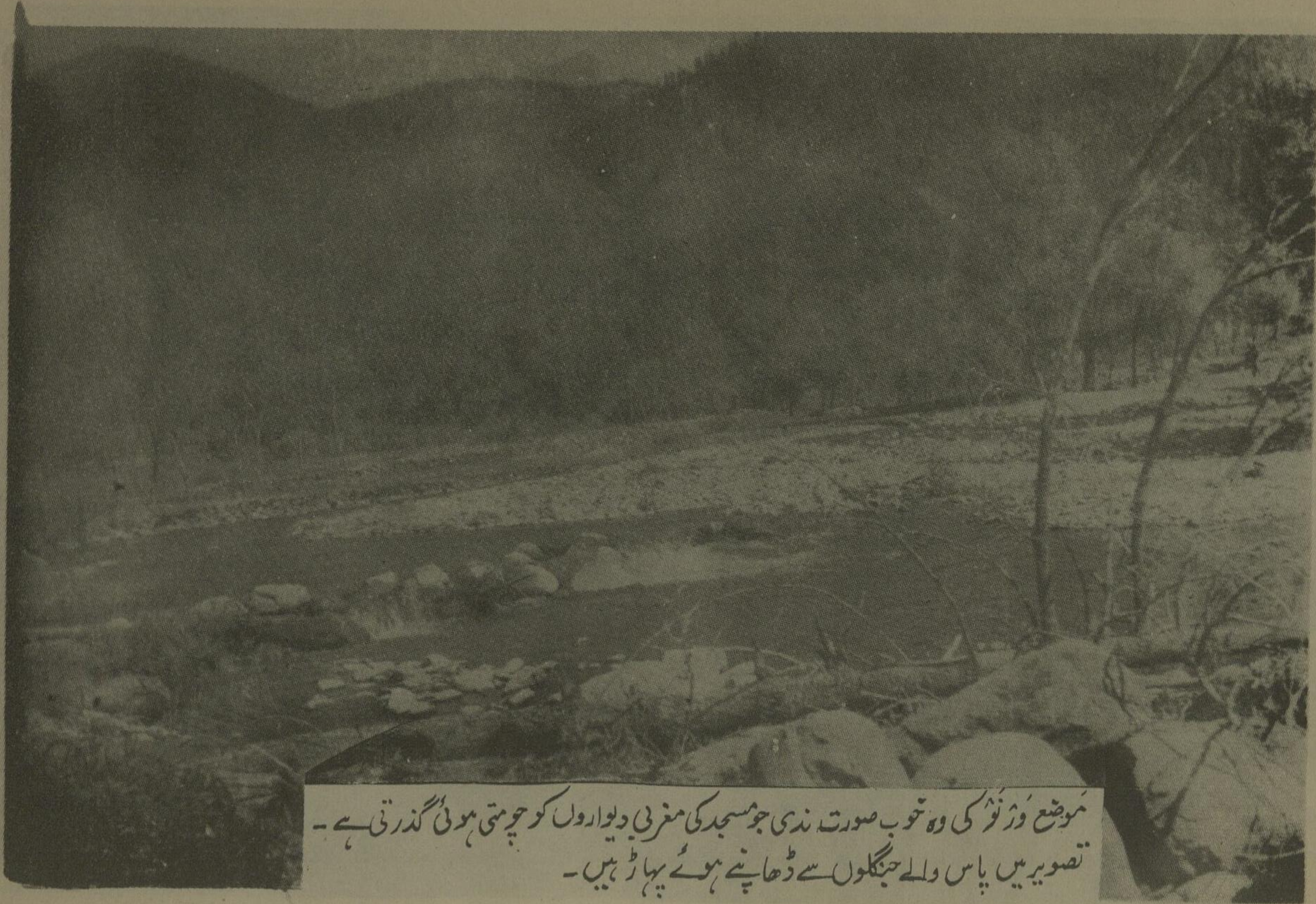
نروره

کشتیوں کے ذریعہ باربرداری اور سفر کی سہولتوں کے لئے کشمیر کے محسن حکمران سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ (دورِ حکومت ۱۴۲۳ء تا ۱۴۷۴ء) نے سرینگر شہر کے وسط میں سے ایک گہری نہر کھدوا کر جھیل ڈل اور جھیل آنچار سر کے پانیوں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ اس نہر کو "نالۂ مار" کہتے ہیں۔ شہر کے شمال مغربی کنارے سے یہ نالہ جب جھیل آنچار سر میں جانے سے پہلے "جھیلِ خوش حال سر" کا رُخ کرتا ہے تو وہاں عیدگاہ کے بالمقابل پُرانے وقتوں میں نالہ کے آس پاس خالی میدان تھے، جن میں نالے کا پانی جذب ہو کر سرکنڈے اور دیگر ان نباتات کا مرکز ہو گیا تھا جو مسلسل گیلی رہنے والی زمین میں اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔ سرکنڈے کو کشمیری زبان میں "نڑ" کہتے ہیں۔ چونکہ یہاں دور دور تک اسی گھاس کے پلاٹ دکھائی دیتے تھے اس لئے عوام اس جگہ کو "نڑوور"

یعنی "نرگھاس کا کھیت" کے نام سے پکارتے تھے اور بعد ازاں یہ جگہ "نروره" کے نام سے موسوم ہو گئی۔ فارسی زبان میں "نرورہ" کا معنی خیز ترجمہ کیا جائے تو "نیستان" ہو گا۔

حضرتِ مسعود کا نروره میں ورود

مشائخ کشمیر میں ایک مشہور بزرگ حضرت بابا مسعود نروری تھے۔ جن کے والد جناب جُنید (اور غالباً دادا جناب قاسم بھی) مُلتان سے آ کر لاہور میں ٹھہرے اور کچھ عرصہ کے بعد لاہور سے کشمیر میں بطورِ تاجر وارد ہوئے۔ یہ سُلطان زینُ العابدین اور اس کے جانشینوں کا دورِ حکومت تھا، جن کی راجدھانی سرینگر کے شمال میں وہاں تھی، جہاں آجکل سرینگر کا محلہ نوشہرہ ہے۔ چونکہ قدیم زمانہ کے بادشاہوں کا دستور تھا کہ وہ دوسرے ملکوں سے آنے والے نامی گرامی تاجروں کو اپنے محلات کے قُرب وجوار میں جائے رہائش مہیا کرتے تھے، اس لئے علاقۂ نروره یا نیستان جو نوشہرہ سے تھوڑے سے فاصلہ پر واقع ہے" نووارد تاجروں کی بود و باش اور تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے لئے مُنتخب ہُوا جو رفتہ رفتہ ایک بستی بن گئی۔ حضرت شیخ مسعودؒ جن کو اپنے ہمعصر تاجر ملکُ التّجار کہتے تھے، نروره کی اس بستی کے اوّلین آباد کاروں میں سے تھے۔ آجکل نروره کا جغرافیہ یہ ہے کہ نالۂ مار کے مغرب میں عیدگاہ ہے اور اسکے مشرق میں محلۂ نروره ہے۔ اس محلہ کے ڈیڑھ سو یا دو سو گھروں میں سے آج بھی کوئی ۲۵ یا ۳۰ گھر حضرت بابا مسعودؒ کی اولاد کے آباد ہیں۔ اور اسی محلے میں حضرت موصوف کا مزار ہے۔ نیز آپ کے جن فرزندوں



موضع وُڑنُو کی وہ خوب صورت ندی جو مسجد کی مغربی دیواروں کو چومتی ہوئی گذرتی ہے۔
تصویر میں پاس والے جنگلوں سے ڈھانپے ہوئے پہاڑ ہیں۔



فوٹو: لولاب کی وہ یادگار مسجد جس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مسجد کے مشرق میں مولانا معظم شاہ صاحبؒ اور آپکے دیگر متعلقین کا مزار ہے۔

اور پوتوں کا تذکرہ تواریخ میں ہے وہ بھی آپ کے پہلو بہ پہلو مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسجد اور وہ خانقاہ بھی اسی نروورہ میں واقع ہے جو "زیارتِ علم صاحب" کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں وہ تاریخی تبرکات محفوظ ہیں جو حضرت مسعودؒ کے مُرشد حضرت میر سیّد احمد کرمانیؒ مُلتان سے اپنے ہمراہ لائے تھے اور جو آپ کے فرزند میر سیّد محمدؒ مُسافر کرمانی نے سنہ ۹۷۱ھ میں حضرت مسعودؒ کے حوالے کئے تھے۔

اولادِ مسعودؒ کی کثرت و تعداد

پچھلے چار سو سال سے اسی نروورہ یا نیلستان سے نکل نکل کر حضرت مسعودؒ کی اولاد کے عُلماء اور فُقراء ہر طرف مُنتشر ہوتے گئے، اور وادیٔ کشمیر کے اطراف و اکناف کے علاوہ دوسرے ممالک تک پھیل گئے۔ ریاست کے اندر صوبۂ کشمیر کے چاروں اضلاع سری نگر، اسلام آباد، بارہ مولہ اور مظفر آباد۔ اور صوبۂ جموں میں پونچھ، باہہال ہر ایک علاقہ میں کہیں کم اور کہیں زیادہ، حضرت بابا مسعود نروری کی نسل کے لوگ جا کر بس گئے ہیں اور تعلیم و تدریس اور پیری و مُریدی کے علاوہ تجارت، زراعت، ملازمت وغیرہ زندگی کے تمام مشاغل میں مقامی لوگوں کے دوش بدوش چل رہے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر سے باہر لاہور، دیو بند، کراچی (اور اب امریکہ کی ریاست انڈیانا میں بھی) فرزندانِ شیخ مسعود نروریؒ مستقل باشندوں کی حیثیت سے بس گئے ہیں۔ وادیٔ کشمیر میں اندازاً ان کی مجموعی تعداد پانچ ہزار سے کچھ اوپر تصوّر کی جاتی ہے۔ جوہرِ ذہانت و فطانت کے ساتھ ساتھ تعلیم کو خاص کر عربی اور فارسی

زبانوں کی تعلیم کو ان لوگوں کے ہاں موروثی دولت کا درجہ حاصل ہے اور اب سیاست میں بھی ان کا حصہ بہت نمایاں ہے۔

نزورہ سے مسعودیوں کا لگاؤ

اولادِ شیخ مسعودؒ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کہیں بھی چلے جائیں محلہ نزورہ کے ساتھ اپنے قلبی تعلق کو کم نہیں ہونے دیتے۔ اپنے ناموں کے ساتھ مسعودی کے علاوہ نزوری اور اکثر اوقات صرف مسعودی لکھ کر اس تعلق کا اظہار کرتے ہیں۔ خود حضرت شاہ صاحبؒ نزورہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو بڑی اہمیت دیتے تھے اور آخر عمر تک عادت شریف یہی تھی کہ سرینگر میں آئیں تو نزورہ ضرور جاتے تھے۔ اپنے جدِ بزرگوار حضرت الشیخ مسعودؒ کے مقبرہ پر فاتحہ اور پھر خانقاہِ نزورہ یعنی مسجد علم صاحب میں داخل ہو کر تبرکاً کچھ نہ کچھ بطورِ وعظ بیان کرنا آپ کا معمول تھا۔ آپ کے شاگردِ رشید مرحوم مولینا سید میرک شاہ اندرابی (کشمیری) نے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر لکھے ہوئے مرثیہ[1] کے آخر میں محلہ نزورہ کے ساتھ شاہ صاحب کے اسی تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

"فَيَا فخرَ هِنْدٍ ثُمَّ دِيُوبَنْدَ مَرْقَدًا
يُبَاهِي بِكَ الكَشمِيرُ ثُمَّتَ نَزْوَرُ
عَلَيْكَ سَلامُ اللهِ مَا عَاشَ عَائِشٌ
وَمَا دَارَتِ الأَفْلاكُ أَوْ نَارَ نَيِّرٌ"

---

[1] ملاحظہ ہو "نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور" از مولینا سید محمد یوسف بنوریؒ

لولاب ضلع بارہ مولہ کے شمالی حصّہ میں جنگلات سے ڈھاپنے ہوئے پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک نہایت حسین وادی ہے، جس کو لولاب کہتے ہیں۔ اندرونی حصّے میں یہ وادی دو شاخوں میں بٹ جاتی ہے ایک شاخ ورنو شاخ ہے اور دوسری لال پور شاخ۔ دو میں سے ہر ایک تقریباً ۱۶ میل لمبی اور ۳ میل چوڑی ہے، مشہور انگریز مؤرخ فریڈیرک ڈریو (Frederic Drew) اپنی کتاب "دی جموں اینڈ کشمیر ٹریٹریز" میں سطحِ سمندر سے اس کی بلندی پر لکھتا ہے کہ:-

"I do not know surely its altitude: Probably it is near 6000 feet". The J & K Territories" (London 1875).

"مجھے پورے وثوق کے ساتھ سطحِ سمندر سے اس کی بلندی کا علم نہیں ہے، غالباً چھ ہزار فٹ کے قریب ہوگی۔"

لولاب یا لُولَو یہ امر قابل ذکر ہے کہ لولاب کا قدیم نام "لُولَو" تھا چناں چہ لولاب کے باشندے (جو پچاس ہزار کے قریب ہیں) اب بھی اس علاقے کو لولاب کے بدلے "لُولَو" ہی کہتے ہیں، لیکن فارسی اور اردو کی تحریرات میں چونکہ "لولاب" لکھا جاتا رہا، اس لئے اب لکھنے میں لولاب ہی لکھا جا رہا ہے۔ اور کشمیر سے باہر اب نام کا یہی تلفظ مشہور ہو چکا ہے۔

لولاب کی وجہ تسمیہ لُولَو یا لولاب کی وجہ تسمیہ کے بارے میں کلام کو طول دینے کا یہ موقعہ نہیں

ہے۔ مختصراً کچھ اس طرح عرض کیا جا سکتا ہے:۔

مورخ حسن شاہ کھویہامی کے بیان کے مطابق شہر "لولو" راجہ لو نے آباد کیا تھا جو ۱۰۵۹ ق م ک میں تخت پر بیٹھا اور ۶۰ سال حکومت کی۔

"ڈاکٹر سنیل چندر رائے" اپنی کتاب "ارلی ہسٹری اینڈ کلچر آف کشمیر" کے ص۱۳۱ پر لکھتے ہیں:۔

"Laulaha of Kalhana seems to preserve the old name of the present Lolab".

یعنی "مورخ کلہن نے موجودہ لولاب کو "لولاہا" لکھ کر اس کے قدیم نام کو گویا محفوظ کر دیا ہے۔"

مسٹر جیمس پی، فرگیوسن **(James P. Ferguson)** اپنی کتاب "کشمیر این ہسٹوریکل انٹروڈکشن **(Kashmir an Historical Introduction)**. (مطبوعہ لندن ۱۹۶۱ء) کے ص۱۱۵ پر رقمطراز ہیں:۔

"The Lolab is the ancient Laulaha, but has no historical sites".

یعنی:۔ لولاب وہی قدیم زمانہ کا "لولاہا" ہے لیکن اس میں تاریخی آثار نہیں ملتے۔

مسٹر جیمس کا اشارہ اسی روایتی قدیم شہر "لولاہا" کی طرف ہے جس کی آبادی راج ترنگنی وغیرہ قدیم کشمیری تاریخوں میں لاکھوں تک بیان کی گئی ہے[1]۔ رہی آثار نہ ملنے کی بات تو اس پر حیرت نہ ہونی

---

[1] ویسے شہر کی کثرت آبادی کے بارے میں کلہن پنڈت اور رتناکر دونوں ہی مبالغہ آمیزی سے

چاہیئے کیونکہ لولاب کے آس پاس کثرت سے جنگلات ہونے کے باعث اس شہر کی عمارات لکڑی کی ہوں گی، اور آتشزدگیوں سے ایسے شہر جب تباہ ہوجائیں تو ان کا نشان نہیں رہا کرتا۔ یہی معاملہ اس شہر کو بھی پیش آیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

لولاب قدرت کا ایک شاہکار

بہر حال وادیٔ لولاب سرزمینِ کشمیر پر قدرت کی کاریگری اور صناعی کا ایک دل آویز شاہکار ہے، صاف و شفاف قدرتی چشموں، آبشاروں اور کوہساروں میں آباد اس مینو سواد حسین وادی کی جتنی تعریفیں کی گئی ہیں وہ اس کے حسن کو بیان کرنے کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

حفیظ جالندھری کی منظر کشی

مشہور شاعر حضرت حفیظ جالندھری نے ایک منظر کشی کی ہے جو وادیٔ لولاب پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے:۔

دور انسان کی نگاہ سے دور — دور دنیا کی شاہراہ سے دور
ایک وادی ہے کوہساروں میں — حسن کی فطرتی بہاروں میں
نغمہ زن آبشار چار طرف — ندیاں بے شمار چار طرف

(متعلق صفحہ گذشتہ) کام لینے کے باوجود باہم مختلف ہیں۔ کلہن کے نزدیک شہر کے مکانات کی تعداد اسّی لاکھ اور رتناگر کے قول کے مطابق اسّی ہزار تھی۔ چنانچہ مورخ حسن لکھتے ہیں:۔
"ناچہ لو...... درمیان درۂ لولاب شہر لو لو بعمارات کثیر و اسواق و دکاکین دلپذیر معمور ساخت کہ تعداد عماراتِ آں بقول کلہن پنڈت ہشتاد لک خانہ و بروایتِ رتناگر ہشتاد ہزار خانہ مشہور است۔" تاریخ حسن ج ۲ ص ۳۰

پھول اور لالہ زار چار طرف ایک خود رو بہار چار طرف
پھوٹتے ہیں ہزارہا چشمے سرد و شفاف و خوشنما چشمے
لپٹ گئی ہے زمین پھولوں سے بن گئی نازنین پھولوں سے
سرخ پھولوں سے، زرد پھولوں سے اور کہیں لاجورد پھولوں سے
جھاڑیاں ہیں تمام پھول ہی پھول نہیں کانٹے کا نام پھول ہی پھول

علامہ شبلیؒ کا قصیدۂ کشمیریہ

حضرت علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ ماہِ جون ۱۸۹۸ء کے آخری ہفتہ میں وارد کشمیر ہوئے۔ وہ چونکہ ملیریا تپ کے مزمن مریض تھے، آب و ہوا تبدیل ہوتے ہی ان کا بخار عود کر آیا اور جتنی مدت کشمیر میں رہے اکثر بیمار ہی رہے۔ تندرست رہتے تو نہ جانے نظم و نثر میں ان کی کون کون سی علمی تخلیقات کے ساتھ "در کشمیر نوشتہ شد" کے الفاظ نظر نواز ہوتے۔ اس کے باوجود ان کی ایک مایۂ ناز کتاب "الفاروق" کو کشمیر کے ساتھ یہ تعلق پیدا ہو گیا کہ بقول مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ الفاروق جلد دوم کا خاتمہ کشمیر میں ہی لکھا اور "۵ جولائی ۱۸۹۸ء مقام کشمیر" لکھ کر جب قلم ہاتھ سے رکھا تو بستر پر بے ہوش پڑ گئے۔ (حیات شبلیؒ صہ ۲۴۴)

تپ اور ضعف نے آپ کو وادی کشمیر کے حقیقی نظارے دیکھنے کی اجازت نہ دی، شکارہ میں لیٹے لیٹے ایک آدھ بار مشکل سے ڈل اور اس کے ارد گرد کے باغات پر نظر ڈال سکے اور صحت سے مایوس ہو کر ماہِ جولائی کے اندر اندر ہی کشمیر سے واپس چلے جانے پر مجبور ہو گئے۔

قریباً اس کے دو سال بعد تک آپ کی صحت اور مرض کے درمیان جنگ جاری رہی اور کام بھی ہوتے رہے۔ اسی اثنا میں عارضی حصول صحت کے

بعد ایک موقعہ پر آپ نے "قصیدۂ کشمیرہ" کے عنوان سے پچتہر[۷۵] اشعار کی طویل فارسی نظم میں اپنی علالت کے واقعات بیان کئے ہیں۔ اس نظم میں "خلدِ کشمیر" پر آپ کی گلکاری اس قابل ہے کہ لولابد کے تذکرے میں اپنا مقام حاصل کرے ۔

دوستان! ایکہ رہ ورسم وفاکیش شماست
ہیچ دانید کہ شبلی بچہ حال ست وکجاست
ورندانید و نہ دارید زحالش خبرے
باید البتہ پژوہش کہ پژوہش زوفاست
از سیہ کاری ایّام وز خود رائی خویش
ہست یک سال کہ بے چارہ گرفتار بلاست
بود در گوشۂ تنہائی خود فارغ وشاد
کہ بہ ناگاہ بہ عزم سفر از جا برخاست
سوی کشمیر روان گشت بدان گرم روی
کہ نمی خواست دران رہ نفسی کردن راست
ہیچ شک نیست کہ آن ناحیہ در زیبائی
گر تنزّل بکنم خُلد برین را ماناست
بسکہ جوشید زہر سوی گل ولالہ بدشت
از کران تابہ کران ۔ روی زمین ناپیداست
ہیچ جائے زگل ولالہ تہی نتوان یافت
پلئے دیوار اگر ہست ۔ وگر سقف سراست

جادہ را خود ز خیابان نتوان کرد تمیز
بسکہ گل صف زدہ سرتاسر او از چپ و راست

جام گلرنگ کہ در بزم بآئین چنند
ہم بدان گونہ گل، از پہلوی گل جلوہ نماست

نقشبندِ چمن طبع ز تر دستی فیض
دشت را ہم بہ گل و لالہ و شمشاد آراست

سبزہ بر کوہ فرو ریختہ از سر تا بن
یا قبائے ست کہ بر قامتِ شخص آید راست

راہرو را ندید دل کہ نہد گام بہ راہ
بسکہ بر ہر قدمش لالہ و گل در تہِ پاست

دیدۂ طفل کہ بر دامنِ مادر غلطد
جنبشِ باد۔ بدان گونہ بروی صحراست

گل بہ ہر شاخ ز برگ ست فزون تر گوئی
ہمہ برگ گل بفزود انچہ کہ از برگ بکاست

سرو اگر پای بدامن نکشد خود چہ کند
زانکہ از جوشِ گل و لالہ چمن تنگ فضاست

بسکہ بر ہر قدم از لالہ چراغے بنہند
در شبِ تار کسے گم نشود از رہِ راست

آنگیرے* کہ بکشمیر ست و بود نامش ڈل
گوئیا آینہ در دستِ عروسے زیباست

---

* جھیل تالاب

سینۂ صاف دلان ست ہمانا کز لطف
ہر چہ در بُن بود، از صفحۂ رویش پیداست
گِرد بر گردِ ڈل آں صف زدن لالہ و گُل
چون طراز لیست کہ بر دامن شوخی رعناست
شالمارست و نشاط ست و نگین ست و نسیم
باغہائے کہ بہ پیراہن ڈل غالیہ ساست
شالمارست ازان جُملہ فزون تر بجمال
کز چونہ چرخ طبق بر طبق و تا بر تاست
آب بالائے زمین باشد و اینجا بینی
کہ زمین بر سرِ آبست و ہماں پا بر جاست
در بنِ آب دمد سبزہ و نیلوفر و گُل
قوّت نامیہ بنگر زکجا تا بہ کجاست
گرچہ دانم کہ سخن خود بہ درازی بکشید
چہ توان کرد سخن ہم زسر نشو و نماست"[1]

مولینا حالی مرحوم کی "سیر کشمیر"

مولینا الطاف حسین حالی کی نظم "سیر کشمیر" بھی اگرچہ پوری وادئ کشمیر سے متعلق ہے لیکن مولینا شبلی نعمانی کے "قصیدۂ کشمیریہ" کی طرح آپ کی اس نظم میں بھی لولاب کی جھلکیاں کشمیر کے دوسرے مناظر کے ساتھ صف بستہ کھڑی دِکھائی دیتی ہیں، اس لئے اس کے چند اشعار بھی ہدیۂ ناظرین ہیں:-

---

[1] ملاحظہ ہو "کلیاتِ شبلی" ص ۲۵ و ۲۶ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۳۰ء

ہر چمن یاں پھول سے اور پھل سے مالا مال ہے
ہر چمن میں یاں مہیا ہیں مکان بہرِ مکین

ان مکانوں اور خیابانوں سے جب آگے بڑھے
پھر وہ عالم ہے جہاں غیر از خموشی کچھ نہیں

جیسے ہوتا ہے ابد پر وقت جا کر منتہی
ختم ہو جاتی ہے دُنیا بھی یہاں آ کر یونہی

یعنی اقلیم ابد اور یہ جہانِ خامشی
طاقتِ انساں کی حد سے ہیں پرے دونوں کہیں

طُرفہ سناٹا ہے اس سنسان کوہستان پر
جس کی دُنیا میں نہیں تمثیل کوئی دلنشین

اے وادئ لولاب

علامہ اقبالؒ کی دورِ آخری کی ایک مرصّع نظم ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف تلمیحات اور اشارات سے لبریز ہے، اس میں آپ فرماتے ہیں ؎

"پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہُوا سیماب
اے وادئ لولاب!" الخ

اولادِ مسعودؒ کا لولاب

حضرت بابا مسعود نروریؒ کے سب سے بڑے فرزند (جو مؤرخین کشمیر کی شہادت کے مطابق علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا پیکر تھے) بابا عبداللہ کے ایک پوتے بابا عارف (بن بابا علی بن بابا عبداللہ) کی اولاد جنّت کشمیر کے اس فردوس بداماں احاطے یعنی وادئ لولاب میں تبلیغ

دین کرتے کرتے ماحول کی دلکشی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے وہیں بس گئی اور مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہاں شاخ در شاخ پھیل کر لولاب کے مواضعات سایہ وان، شاٹھ مقام، کانٹھ پورہ، گنگ بوگ، دار پورہ، سونہ نار، دودھ وان، ہیری، گلگام، لال پورہ اور لولاب سے باہر علاقہ کامراج میں ترگہ پورہ، چک شتلو ہر اور سوپور تک متوطن ہو گئے۔ اور نئے دور میں موضع ورنو بھی نہ صرف اس طویل فہرست میں شامل ہو گیا بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات بابرکات کی وجہ سے اس کی شہرت کے سامنے باقی سب ماند پڑ گئے۔

خلاصہ یہ کہ ریاست بھر میں جتنے مسعودی ہیں ان کا نصف سے زیادہ حصہ صرف سوپور سے آگے کامراج اور لولاب میں مجتمع ہے۔

وادیٔ نیلم

علاقہ لولاب کے پہاڑوں کے دروں کو شمال مغربی سمت میں عبور کریں تو دریائے کشن گنگا کی وادی پاؤں کے نیچے آجاتی ہے۔ جو اس دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ قصبۂ مظفر آباد سے ذرا آگے بڑھ کر دومیل نام کے اس مقام پر ختم ہوتی ہے جو دریائے جہلم اور دریائے کشن گنگا کا سنگم ہے۔ خود قصبۂ مظفر آباد بھی کشن گنگا میں واقع ہے۔ اس دریا کے دائیں بائیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر درجنوں شاخ در شاخ چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں جن سے بہہ کر آنے والی ندیاں دریا کے بڑے ریلے میں شامل ہو جاتی ہیں۔ پہاڑوں، جنگلوں اور سرسبز چراگاہوں سے گھرے ہوئے متعدد گاؤں ان وادیوں میں پھیلے پڑے ہیں۔

مرکزی وادی کا نصف اعلیٰ زیادہ خوبصورت زرخیز اور جنگلات کی دولت سے مالامال ہے۔ قدیم زمانہ میں اس علاقہ کو "دراوہ" کہتے تھے اور آجکل اس کو وادیٔ نیلم کے نام سے پکارتے ہیں۔ دراوہ کے علاقہ پر بمبہ قوم کے مورثِ اعلیٰ راجہ مظفر خان بانیٔ شہر مظفر آباد کے اخلاف بارہویں صدی ہجری سے طویل مدت تک حکمران رہے ہیں۔ آج سے کوئی سو سال پہلے راجہ مظفر خان کا پوتا راجہ منصور خان اور بعد ازاں اس خاندان کا آخری حکمران راجہ شیر احمد خان یہاں راج کرتا تھا۔ یہ خود مختار راجے جو کبھی سلطان اور کبھی راجہ کے خطاب سے مخاطب ہوتے تھے، برائے نام حد تک دربارِ کشمیر کے تابع اور ماتحت تصوّر ہوتے تھے مگر عملاً ان کو اپنے علاقہ کے سیاہ و سفید میں آزادیٔ کامل حاصل تھی۔

راجہ شیر احمد خان کی بغاوت

۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں جب مہاراجہ رنبیر سنگھ والیٔ کشمیر تھا تو راجہ شیر احمد خان نے سرینگر راج کی اس برائے نام ماتحتی سے بھی آزاد ہو جانے کی کوشش میں بغاوت کی، مگر اس کی فوجی قوت ریاست کشمیر کی منظم اور مکمل مسلح افواج کے مقابلہ میں بہت کم تھی، اس لئے اس کی یہ جرأتِ رندانہ کامیاب نہ رہی۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے نہ صرف علاقہ دراوہ ہی راجہ شیر احمد خان سے چھین لیا بلکہ اس کو وہاں کے گھر بار سے محروم کر کے کلگام (ضلع اننت ناگ) کے قریب "باری پورہ" نامی گاؤں میں نظر بند رکھا، اور گذارہ کے لئے دو تین گاؤں کی آمدنی بطورِ جاگیر دے دی۔ چنانچہ راجہ شیر احمد خان موصوف کی اولاد کے لوگ اب تک وہاں موجود ہیں۔

الغرض ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء سے وادئ نیلم مکمل طور سے سرینگر کے ماتحت علاقہ بن گیا اور ۱۹۴۷ء میں کشمیر پر جھگڑے کی وجہ سے از سرِ نو اس کا انقطاع ہو گیا اور سیز فائر لائن کے معاہدات کے نتیجے میں آج اس کا اکثر حصہ "آزاد کشمیر" کی تحصیل آٹھمقام میں شامل ہے۔ البتہ دریائے کشن گنگا کے مشرق میں جو چند گاؤں واقع ہیں، وہ اس وقت بھی سرینگر کے تصرّف میں ہیں۔

قاضی شاہ عبدالکبیر

ڈوگرہ راج سے قبل سکھ راج کے زمانہ میں لولاب سے نکل کر حضرت شاہ صاحبؒ کے دادا مولانا شاہ عبدالکبیر جب وادئ نیلم کے موضع لوات میں مقیم تھے، تو راجہ منصور خان نے آپ کے علم و فضل اور عوام پر اثر و رسوخ کو دیکھ کر آپ کو اپنی سلطنت کا قاضی مقرر کیا تھا۔ جنہوں نے راجہ شیر احمد خان کے وقت وہیں وفات پائی۔ اس واقعہ سے کچھ سال قبل لولابی مسعودیوں کی دوسری شاخ کے ایک بزرگ شاہ محمد صالحؒ بھی لولاب کے موضع سایہ ون سے گھر بار ترک کر کے وادئ نیلم کے موضع لوات میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں کی اولاد کو اس علاقہ میں بہت کچھ عروج نصیب ہوا اور علاقہ بھر میں اشاعتِ اسلام اور تعلیمِ دین کے کام میں شاہ عبدالکبیر اور شاہ محمد صالح کی اولاد و احفاد کو پیشوائی کا رتبہ حاصل رہا اور آخری دور میں یعنی ۱۹۳۱ء کی تحریک کے بعد نہ صرف وادئ نیلم کے علاقوں اور ضلع مظفر آباد میں بلکہ ریاستِ کشمیر کے دیگر اضلاع میں بھی سیاسی بیداری پھیلانے کا سہرا جن لوگوں کے سر باندھا جا سکتا ہے ان میں ان دونوں بزرگوں کی ذریات میں سے ایسے لیڈر دستیاب ہوئے جن کے شاندار کارنامے اور

قربانیاں تاریخ کے صفحات پر نمایاں مقام حاصل کر چکی ہیں۔

بچہ نامت خوانم؟

حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ اور آپ کے اسلاف کے بارے میں یہ تفصیلات امید ہے کہ کافی متصوّر ہونگی۔ آخر میں یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے چونکہ دیوبند میں مستقل قیام فرمالیا اور آپ ہمیشہ کے لئے وُہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس لئے اب حضرت شاہ صاحبؒ کے وطن کے بارے میں ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق سرینگر کے محلہ نروره، شمالی کشمیر کے علاقہ دُرنگ لولاب، ضلع مظفر آباد کی وادئ نیلم کے موضع لوات اور یو۔ پی کے ضلع سہارنپور کے قصبۂ دیوبند میں سے جس مقام کو چاہیں آپ کا وطن قرار دے دیں۔ نروری، لولابی، مظفر آبادی، کشمیری اور دیوبندی، جس وطنی نسبت کو آپ کے اسمِ گرامی کے ساتھ پیوند کرنا چاہیں، کرلیں۔ ع

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم"

شاہ صاحبؒ کی ابتدائی تعلیم و تربیت

بالائے سرش زہوشمندی

اللہ تعالیٰ کے ہاں سے حضرت شاہ صاحبؒ دل و دماغ کے غیر معمولی کمالات ساتھ لیکر پیدا ہوئے تھے۔ آپ ایامِ طفولیت سے ہی نہایت ذہین تھے اور اپنے ہم عمر بچوں کے مقابلہ میں غیر معمولی ذکاوت و فطانت کے مالک تھے اور شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے

ضربُ المثل اور بار بار تکرار شدہ اس شعر کے آپ اصدقُ المصداق تھے۔

؎ "بالائے سرش ز ہوش مندی ٭ می تافت ستارۂ بُلندی"

ان خداداد اوصاف کو صحیح نشوونُما دینے کے لئے آپ کے ماہرِ نفسیات اور علمِ فراست کے نور سے مُنوّر والدِ ماجد نے ایامِ رضاعت سے ہی آپ کی ذہنی تربیت کا خاص خیال رکھا۔ جونہی گویائی شروع ہوئی تو آپ کو کلمات طیّبات اور تہلیل و تسبیح یاد کرائے گئے۔ جب آپ تین چار سال کی عمر کو پہنچے تو اکثر اوقات اپنے والدِ بزرگوار کے اذکار و اوراد اور درود خوانی کے اوقات میں موصوف کی جائے نماز کے پاس بٹھائے جاتے تھے۔ جو الفاظ آپ کے کان سُنتے وہ آپ کی زبان سے جاری ہو جاتے۔

بسم اللہ خوانی

خاندانی رواج کے مطابق ٹھیک چار سال، چار ماہ اور چار دن کی عمر میں بسم اللہ خوانی کی تقریب کے ساتھ آپ کو والد صاحب نے قرآنِ شریف پڑھانا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی عنایات و عطیات کی ایسی بارش ہوئی کہ چھ برس کی عمر کو پہنچتے پہنچتے آپ نے قرآنِ شریف کی ناظرہ تعلیم کے علاوہ فارسی زبان کے اس زمانہ میں مُروّج نصاب کی ابتدائی کتابیں نامِ حق، کریما و پند نامہ شیخ عطّار اور ایسے ہی چند چھوٹے بڑے رسالے اور فارسی کی صرف و نحو کے قواعد "دستور الصبیان" وغیرہ ختم کر لئے۔ اور اس کے بعد عربی زبان میں علم فقہ کی ابتدائی کتابیں مُنیۃ المصلّی اور قدوری وغیرہ کے ساتھ فارسی میں گلستان و بوستان وغیرہ پڑھنے لگے۔ اور آپ کی تعلیم کے ابتدائی مراحل نہایت تیز رفتاری کے ساتھ طے ہونے

لگے۔ پڑھانے والا پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتا مگر آپ کا مُطالبہ "ھَلْ مِنْ مَزِیْد" جاری رہتا اور جو کچھ ایک بار پڑھ لیا وہ ہمیشہ کے لئے حافظہ میں کالنقش فی الحجر" محفوظ ہو جاتا۔ جس دَور میں دوسرے بچّے کتاب کے متن اور اصل الفاظ کا بھی پورا پورا ساتھ نہیں دے سکتے، آپ عبارت سے پیدا ہونے والے نُکات اور کتاب کے حواشی پر غور و خوض میں مصروف پائے جاتے۔

فطری عادتِ موشگافی

آپ کے والدِ ماجد مولٰینا معظم صاحبؒ کا بیان ہے کہ:-

"جب انور شاہ نے حنفی فقہ کی مشہور و معروف کتاب "مختصر القدوری" مجھ سے پڑھنی شروع کی تو مجھ سے بدورانِ درس بعض ایسے مسائل کے متعلق سوالات پوچھتے تھے کہ مبسوط کتابوں کے مُطالعہ کے بغیر جن کا جواب دینا مشکل ہوتا ہے۔ ہر چند میں انہیں ان موشگافیوں سے روک کر صرف کتاب کے متن کو قابو میں لانے کی تلقین کرتا تھا، لیکن محض اپنی کتاب کی عبارت کے مفہوم تک محدود رہ کر چلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔"

نونہال "انور" اکابرِ عصر کی نظر میں

(مولٰینا معظم صاحب ہی سے منقول ہے کہ

"اُس زمانہ میں تبلیغ دین اور وعظ خوانی کو میرے مشاغل میں اوّلیت حاصل تھی۔ علاقوں میں دَورہ کر کے گاؤں گاؤں وعظ پڑھنے اور پیری و مُریدی کے لوازمات سر انجام دینے میں میرے اوقات کا بیشتر حصّہ صرف ہو جاتا تھا اور میرے پاس انور شاہ جیسے ذہین طالب علم کی حق ادائیگی کے

لیئے وقت نہ بچتا تھا اور اندیشہ تھا کہ بچے کی تعلیم کو نقصان نہ پہنچے۔ اِس لیئے میں نے اس کے شوقِ حصولِ علم اور خداداد ذکائت و ذہانت کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اس کی تعلیم کی ذمہ داریاں اپنے ایک بے حد متقی دوست اور جید عالِم کے سپرد کر دیں مگر ان کو بھی انور شاہ سے یہی شکایت رہی کہ وہ اپنے سبق کے اصل مسائل تو سرسری اشاروں سے ہی سمجھ لیتے ہیں، اور اس کے بعد اندیشہ ہائے دور و دراز کی دُنیا میں پہنچکر بعض اوقات اپنے سوالات سے مُعلّم کو پریشان کر ڈالتے ہیں۔"

۲۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک بھائی یٰسین شاہ بھی شاہ صاحبؒ کے شریکِ درس تھے جو عُمر میں آپ سے دو تین سال بڑے تھے اور ذہانت و فطانت میں بڑی حد تک آپ ہی کی طرح تھے۔ وادیٔ نیلم کے ایک گاؤں "گیاں" میں اس زمانہ میں ایک بڑے خدادوست اور مشہور عارف حضرت میاں نظامُ الدّین صاحبؒ نقشبندی و مُجدّدی رہتے تھے۔ جو نقشبندی اکابر کے دستور کے مُطابق نہایت مُتشرع، محتاط اور مُتّقی بزرگ تھے۔

میاں نظامُ الدّین صاحبؒ اپنے مُرشد خواجہ محمّد صدیق صاحب مجدّدی کے مزار واقع موضع ماگام ہندوارہ (علاقہ کامراج) میں حصولِ فیض کے لیئے کبھی کبھی آیا جایا کرتے تھے۔ کسی ایسے ہی موقعہ پر آپ اس علاقہ کے مُبلّغ اسلام اور سلسلۂ سہروردیہ کرمانیہ کے پیر مولٰینا معظّم شاہ صاحب سے بھی مُلاقی ہوئے۔ بدورانِ ملاقات مولٰینا معظّم صاحبؒ نے اپنے دونوں بچوں یٰسین شاہ اور انور شاہ کو اشارہ کیا

کہ وہ عارفِ وقت جناب میاں نظام الدین صاحبؒ کی خدمت میں سلام اور تعظیم بجالائیں اور آپ کی دعائیں لیں۔ عارف نے دونوں کے سر پر اپنی محبت و شفقت کا ہاتھ پھیرا اور دونوں سے ان کے اسباق کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میاں صاحب اپنے سوالات کے برجستہ جوابات پاکر بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد مولینا معظم صاحب سے مخاطب ہوکر دو میں سے چھوٹے یعنے انور شاہ کے بارے میں یہ خوش خبری سُنائی کہ "اِن شاءَ اللہ یہ اپنے وقت کے اُن علماء میں سے ہونگے جن سے دُنیائے اسلام کو فیض پہنچیگا اور سُنّتِ نبوی علٰی صاحبہا الصلوٰۃ والسّلام کو فروغ ملے گا۔"

۲۔ اسی طرح آپ کے عہدِ طفولیت کے زمانہ کا ایک اور واقعہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ منطق اور نحو کے بعض ابتدائی رسائل مثلاً ایساغوجی، قال اقول، مرقات اور میزان منطق وغیرہ کا مطالعہ کر رہے تھے، اتّفاقاً ایک بڑے عالم اس وقت آپ کے والد صاحب کے پاس ملاقات کے لئے آ گئے۔ ان عالم صاحب نے شاہ صاحب کی کتابوں کو اُٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گئے کہ ان کتابوں پر خود اس ننّھے سے طالب علم (یعنی انور شاہ) نے نہایت برجستہ قسم کے حواشی لکھ رکھے تھے۔ اس نونہال کی یہ ذکاوت، تیزیٔ طبع اور فہم رسا کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے اور بے اختیار پکار اُٹھے کہ "نظرِ بد دور! یہ بچّہ تو اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔"

مہدویت کا چرچا

العرض علم حاصل کرنے کا شوق و ذوق اور عطیۂ الٰہی بشکلِ فہم، ذکاوت و ذہانت اور قوتِ

حافظہ کے ساتھ سلامتیٔ طبع، حُسنِ اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی دولتیں بھی شروع ہی سے آپ کو وافر مقدار میں نصیب ہو گئی تھیں اور ان غیر معمولی اوصاف کی شہرت بھی اُن دِنوں ہر طرف پھیل گئی۔ ایک نوعمر بچے میں ایسے بُلند خصائل کو دیکھ کر کشمیر کے بعض وہ لوگ جو ظُلماتِ زمانہ سے نجات کے لئے امام مہدی کے انتظار میں رہتے ہیں عام طور پر یہ شُبہ کرتے تھے کہ "کہیں آپ ہی مہدئ موعُود نہ ہوں"۔

چونکہ اس قسم کی شہرت خلافِ حقیقت ہونے کے علاوہ فوری نقصانات اور نادیدہ مصائب کا موجب بھی بن سکتی تھی اس لئے آپ کے والدِ محترم اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کو عوام کی اس غلط فہمی کی تردید میں بہت کچھ محنت کرنی پڑتی تھی اور پھر بھی خوف لگا رہتا تھا کہ یہ مہدویت کی شہرت کسی نامعلوم پریشانی کا سبب نہ بن جائے۔ اور کہیں ہونہار بچے کے علمی اور عملی کمالات کی طرف سفر جاری رکھنے کا راستہ ہی مسدود نہ ہو جائے۔ چونکہ مشیتِ ازلی یہی تھی کہ آپ سے اسلام کی خدمت اور احیائے سُنّتِ نبویؐ کا ہی کام لیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ سب خطرے ٹل گئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود ایک موقعہ پر فرمایا تھا کہ "میں بارہ سال کی عمر میں فتویٰ دینے پر قادر ہو گیا تھا۔ اور نو سال کی عمر میں علمِ فقہ و علمِ نحو کی مطوّلات کا مطالعہ کر کے استاد کی مدد کے بغیر بعض مسائل کو حل کر لیتا تھا"۔ سچ ہے کہ:

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ابتدائی تعلیم کی تکمیل

زمانۂ طفولیت کے بارے میں مختلف روایات کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

بارہ[۱] سال کی عمر تک اپنے گھر میں اپنے شفیق اور فاضلِ اجل والدِ ماجد سے اور گھر کے قرب و جوار میں ان خوش قسمت عُلماء سے جن کو آپ کے اساتذہ کی فہرست میں شمار ہونے کا فخر ملنے والا تھا، آپ نے زبان فارسی، گلستان و بوستانِ سعدی اور پنج گنج نظامی اور عربی کی بنیادی صَرف و نحو اور علمِ فقہ کی ابتدائی کتابیں ختم کرلیں۔ تعلیم کے اس درجے تک جن اساتذہ سے آپؒ نے اِستفادہ کیا ان میں سے اکثر کے نام اب کسی کو معلوم تک نہیں۔ البتہ مولینا معظّم صاحبؒ کے علاوہ اساتذہ کے زُمرے میں مولوی عبدالجبّار صاحبؒ اور مولوی غلام محمد صاحبؒ (المعروف مولوی محمد جندل ساکن سہیپورہ متصل کپواڑہ) دو[۲] ایسے بزرگ ہیں جن کا تذکرہ تو کہیں کہیں ملتا ہے مگر پوری طرح یہ تفصیل دستیاب نہیں ہوئی کہ ان میں کس نے آپ کو فارسی اور صَرف و نحو کی کونسی کتابیں پڑھائیں۔ البتہ مؤرخ منشی محمّد الدین فوق کی "تاریخ اقوام کشمیر" اور "مشاہیر کشمیر" وغیرہ کی ورق گردانی سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ "مولوی عبدالجبّار صاحب موصوف علاقہ کامراج میں فارسی کے بڑے ماہر اور زبردست عالِم تھے۔" اس تاریخی اطلاع سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہ صاحبؒ نے فارسی زبان کی تعلیم مولوی عبدالجبار صاحب سے حاصل کی ہوگی اور مولوی غلام محمّد صاحب سے صَرف و نحو کی کتابیں پڑھی ہونگی۔ واللّٰہُ اعلم وعلمہٗ اتمّ واحکم۔

لیکن جہاں تک علمِ فقہ کا تعلّق ہے، چونکہ مولینا مُعظّم شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے مُفتی، واعظ اور مُبلّغ تھے، آپ کو اگرچہ علمِ حدیث سے مزاولت کم تھی، لیکن تفسیرِ قرآن اور کُتبِ فقہ حنفی پر آپ کی نظر وسیع تھی، اس لئے اُس وقت تک فقہ کی جس قدر بھی تعلیم شاہ صاحب کو میسّر

ہوئی تھی وہ زیادہ تر والد ماجد ہی کا فیضانِ نظر تھا۔

رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا بارہ سال کی عمر میں جو کچھ آپ کو حاصل ہو گیا تھا وہ اگرچہ اُس زمانہ میں آپ کے ہم عصر پیر زادوں اور مولوی زادوں کے معیارِ ضرورت کے مطابق کافی تصوّر ہو سکتا تھا لیکن آپ کی ہمتِ بلند اس پر اکتفا کرنا کب گوارا کر سکتی اس لئے آپ کی نگاہ میں اور آپ سے بھی زیادہ آپ کے عالی دماغ والدِ بزرگوار کی نگاہ میں یہ اس سمندر میں سے چند قطرات تھے جس کو سینۂ ہم چوں آئینہ میں سمیٹ لینے کی استعداد خدائے علیم و قدیر نے شاہ صاحب رح کو ارزانی فرما رکھی تھی۔ بنا براں یہ طے ہو گیا کہ آپ کی تعلیم جاری رکھی جائے اور جہاں تک حدِ امکان میں ہے حصولِ علم کا سلسلہ درجۂ اکملیت تک پہنچنے سے پہلے کاٹا نہ جائے۔

حصولِ علم کیلئے سفرِ ہزارہ

(۱۳۰۵ھ)

مگر اب سب کے سامنے یہ سوال درپیش تھا کہ باپ کی فاضلانہ تمناؤں اور بیٹے کے عبقریانہ دل و دماغ کے امکانات کے مطابق سلسلۂ تعلیم کو اونچے درجے تک جاری رکھنے کے لئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے؟

یہ ۱۳۰۵ھ کا زمانہ ہے اور وادیٔ کشمیر اس زمانہ میں غلامی کے مارے اپنی باقاعدہ دینی درسگاہوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی،

کہیں کہیں انقلاباتِ زمانہ سے بچا ہوا کوئی صاحب علم اگر تعلیم دے رہا تھا تو وہ اس کی شخصی کوشش تھی، جو پڑھنے والوں کی ضروریات کتاب کاغذ اور خوراک و رہائش کا بندوبست کرنے کی حد تک جانے سے عاجز تھی، وادئ لولاب اور آس پاس کے دوسرے مقامات کا تو ذکر ہی کیا، کشمیر کا مایۂ ناز شہر "سرینگر" جو کسی زمانہ میں علوم و فنون کا گہوارہ تھا، اب مدتوں سے سونا پڑا تھا، تیرہویں صدی ہجری کے پیہم سیاسی انقلابات اور آئے دن کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے سرینگر کی قدیم دانشگاہوں کے چشمہ ہائے صافی یا تو خشک ہو گئے تھے یا کس مپرسی کے اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ لے دے کر اب کشمیر کے مشتاقانِ علم و عرفان کے لئے خطۂ کشمیر سے باہر پکھلی اور ہزارہ میں علم و دانش کے چشمے تھے جن کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ ریاستِ کشمیر کا مغربی کنارہ ضلع ہزارہ کے ساتھ ملحق ہے اور ہزارہ کشمیر کے مغرب میں بلکہ کسی حد تک جنوب مغرب میں واقع ہے، موجودہ صوبۂ سرحد کے اس ضلع کی علمی درسگاہیں اس زمانہ میں اہلِ کشمیر کے لئے کشش کا موجب تھیں. چنانچہ اپنے حصولِ تعلیم کے وقت خود مولینا محمد معظم شاہ صاحب نے بھی، وادئ نیلم ضلع مظفر آباد سے نکل کر علاقۂ ہزارہ ہی کی درسگاہوں سے علم حاصل کیا تھا۔ (ضلع ہزارہ اور ضلع مظفر آباد جغرافیائی لحاظ سے آپس میں متصل ہیں اور مشترک رسم و رواج ایک جیسی زبان اور ملتی جلتی آب و ہوا کے علاقے ہیں۔)

ضلع ہزارہ جانے کا خاص سبب

تعلیم کے لئے سرینگر پر ہزارہ کو
ترجیح دینے کی متعدد وجوہات

کے علاوہ سب سے مؤثر وجہ یہ تھی کہ جس وقت حضرت شاہ صاحبؒ کو حصولِ
تعلیم کے لئے گھر سے باہر بھیجنے کی تدبیر ہو رہی تھی اس وقت آپ کے چار
قریبی رشتہ دار، آپ کے ~~پھوپھی زاد بھائی~~ حیدر شاہ[۱]، آپ کے چچا زاد
بھائی عبدالمجید شاہ[۲] اور دیگر دو رشتہ دار پیر مختار شاہ[۳] اور عبدالاحد شاہ[۴]
فرزندانِ شاہ محمد صالحؒ ضلع ہزارہ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

نوعمر انور شاہ کے والدین اپنے بچے کی دیکھ بال اور رفاقت
کے معاملہ میں ان پر بھروسہ کر سکتے کیونکہ یہ چار رشتہ دار عمر اور تعلیم
میں شاہ صاحب سے سینئر تھے اور ان کو ہزارہ کے مدارس کا بہت کچھ
تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ ان چاروں میں سے بھی مولوی عبدالمجید شاہ
(فرزندِ پیر موسیٰ شاہ) جو شاہ صاحب کے چچا زاد بھائی تھے اور سب
میں سینئر تھے اور اپنی تعلیمی مسافت کے طویل تجربہ کے لحاظ سے اس
قابل تھے کہ گھر سے دور ضلع ہزارہ کی اوّلین بے وطنی کے دور میں اپنے
نوعمر بھائی انور شاہ کی سرپرستی کر سکیں۔ ان امور کو پیشِ نظر رکھنے
کے بعد مولانا معظم شاہ صاحب کو انور شاہ کی آئندہ تعلیم کے بارے میں یہ
فیصلہ لینے میں کوئی زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی کہ آپ کو ہزارہ بھیج
دیا جائے۔ چنانچہ ۱۳۰۵ھ میں بعمر (۱۳ سال) "اُطلبوا العلمَ ولو کانَ
بالصِّین" کے اس عملی مصداق کو اپنے والدِ گرامی مولانا معظم صاحب
نے ہزارہ روانہ کر دیا اور اپنے بھتیجے مولوی عبدالمجید شاہ کو تاکید
کر دی کہ وہ انور شاہ کی ہر طرح حفاظت اور نگہداشت رکھیں۔ اس طرح سے
شاہ صاحب نے لولاب کے دلکش نظاروں، بلند آہنگ آبشاروں اور بے نظیر مرغزاروں پر
ہزارہ کی تعلیمی مسافت کو ترجیح دی

ہزارہ کی درسگاہیں اور حضرت سیّد احمد شہیدؒ

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ضلع ہزارہ کے کثیر التعداد دینی مدارس کا مختصر سا تعارف کرا دیا جائے اور جن باتوں نے اُس زمانہ میں ہزارہ کو ایک قسم کا یونان بنا ڈالا تھا۔ انکی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت سیّد احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہادت کے واقعہ مئی ۱۸۳۱ء سے متصل قبل ۱۸۲۷ء میں صوبۂ سرحد کے آزاد علاقہ میں اپنی تحریک کے مراکز قائم کر کے جو انقلابی کام شروع کیا تھا، کفّار کے ساتھ جہاد بالسّیف اس کا ایک حلقہ تھا اصل کام اس پسماندہ علاقے میں دینی تعلیم اور روحانی و اخلاقی تربیت کو فروغ دینے کا تھا اور تحریک کے یہ سب کام پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ پشاور میں غدّارانِ وقت کی دغابازی کے باعث حضرت سیّد اور آپ کے رُفقاء کو آزاد یا غستانی علاقہ کے پہاڑوں کی طرف پسپا ہونا پڑا۔ یہ علاقہ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کے شمال مغرب میں تھا۔ (سوات، تنیر انب دربند، شنکیاری اور بالاکوٹ تک تمام پہاڑی وادیاں اور کوہستانی بستیاں مِل کر یاغستان کہلاتی تھیں) اس لئے حضرت شہید کی تحریک کے آخری دَور کا ہزارہ کے ان حصّوں پر گہرا اثر پڑا جو پکھلی، مانسہرہ، ایبٹ آباد اور ہری پور سے ہوتے ہوئے چھچھ کے بھوئی گاڑان اور تربیلہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں کے ہزارہا لوگ آپ کے مجاہدین کے ساتھ جا کر شامل ہو جاتے رہے۔ معرکۂ بالاکوٹ میں یہی خام تربیت یافتہ اور

نو وارد رضا کار، مجاہدین کے دوش بدوش تھے، ان کے اخلاص کے باوجود تربیت میں ان کی خامی کمزوری کا باعث ثابت ہوئی، جس کا افسوسناک نتیجہ حضرت سیّد احمدؒ اور مولینا شاہ اسماعیلؒ اور دیگر رُفقاء کی شہادت کی صورت میں برآمد ہُوا۔

الغرض مجاہدین میں مولینا شاہ اسماعیلؒ اور مولینا عبدالحیؒ اور دوسرے درجنوں عُلماء شامل تھے جو رات دِن وعظ و تبلیغ اور درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ اس لئے ان سے اس علاقہ کے اہل علم کو فیض حاصل ہوتا رہا اور ایک نئی فضا پیدا ہو گئی اور ہر طرف قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر دینی علوم کا چرچا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ ہر بڑے قصبے میں تعلیم دین کی درس گاہیں قائم ہو گئیں.

معرکۂ بالاکوٹ جب ۶ مئی ۱۸۳۱ء (۱۲۴۶ھ) کو بالاکوٹ کی لڑائی میں حضرت سیّد احمدؒ، مولینا شاہ اسماعیلؒ اور مِلّت کے دیگر بڑے بڑے رہنماؤں کی شہادت مقدرہ کا واقعہ پیش آیا، تو جہاد بالسّیف کے کام کو دل ہلا دینے والا صدمہ پہنچا لیکن تبلیغ دین اور درس و تدریس کا کام پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ شروع ہو گیا اور خدا کے فضل و کرم سے اس علاقہ میں تعلیم دین اور تربیتِ روحانی (جس کی ابتداء حضرت سیّد شہید کے طفیل ہو چکی تھی) نہ صرف جاری رہی بلکہ وہ جوش جو اب تک جہاد کے لئے مالی و جانی قربانیوں کی صورت میں وقف تھا اب المضاعف ہو کر بطور تلافی مافات تعلیم دین و تربیتِ روحانی پر صرف ہونے لگا اور چند برسوں کے اندر اندر جابجا درس گاہیں قائم ہو گئیں جو سَو سال سے زائد مدّت تک پورے انہماک کے ساتھ اپنا کام

کرتی رہیں۔

صوبۂ سرحد کا یونان

یہی وجہ ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف ثانی سے چودھویں صدی ہجری کے نصف اوّل تک ضلع ہزارہ، یو۔پی کے اضلاع سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ کی طرح عربی و دینی مدارس کی کثرت کے لئے دور دور تک مشہور و معروف اور انگشت نما رہا ہے۔ خاصکر اس ضلع کی تحصیلات ایبٹ آباد اور مانسہرہ اور وادی پکھلی کے درجنوں قصبات اور بڑے قریئے علمِ دین کی درسگاہوں اور علوم و فنون کے ماہر علماء پر فخر کرتے تھے۔ ان عجیب و غریب درسگاہوں کو یونان کے مشائین کی درسگاہوں سے ایک خاص مشابہت تھی اور یہاں علوم کو زبانی یاد کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔

ہزارہ کی دانش گاہوں میں سے (۱) قصبۂ مانسہرہ (۲) بفہ (۳) خاکی (۴) کوائی (۵) بالاکوٹ (۶) شنکیاری (۷) داتہ (۸) بانڈی ڈھونڈاں (۹) دھمتوڑ (۱۰) کاکول (۱۱) نواں شہر وغیرہ میں ایسی مشہور درس گاہیں قائم تھیں جن کی اپنی اپنی خصوصیات تھیں۔ کہیں صرف و نحو کا چرچا تھا اور کہیں منطق اور فلسفہ کا، کسی جگہ فقہ اور اصول کی شہرت تھی اور کسی جگہ تفسیر و حدیث کی۔ چونکہ تحصیلِ مانسہرہ کی سرحدیں کشمیر کے ضلع مظفر آباد کے ساتھ ملی ہوئی ہیں اس لئے کشمیر کے طلباء اور خاصکر ضلع مظفر آباد کے تشنگانِ علم ان درسگاہوں سے اپنی علمی پیاس بجھانے میں پیش پیش تھے۔ اور چونکہ یہ درسگاہیں اپنی پیدائش کے لحاظ سے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریکِ اصلاح کی پیداوار تھیں،

اس لئے ان کا ماحول بے حد متقیانہ تھا۔ کیا اساتذہ اور کیا طالب علم، سبھی لوگ جدوجہد، صبر و قناعت اور ایثار کے مجسمے اور حق کی حمایت اور باطل کی مخالفت میں "لا یخافون لومۃ لائم" کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آتے تھے۔

ایک فروگذاشت

ضلع ہزارہ کے ان درجنوں مدارس میں سے حضرت شاہ صاحبؒ نے کس مدرسے میں تعلیم حاصل کی اور کن اساتذہ سے استفادہ کیا، اس کی تفصیلات معلوم کرنا حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے فوراً بعد اور تقسیم ملک سے ماقبل تک آسان کام تھا مگر بدقسمتی سے اس طرف آپ کی سوانحات پر قلم اٹھانے والے بزرگوں میں سے کسی نے بھی مناسب وقت پر توجہ نہیں دی اور اب اس راستے میں زمان و مکان کا دوگونہ بُعد حائل ہو چکا ہے۔ اگر اس سمت میں اب کوئی کوشش کی بھی جائے تو لاحاصل ہے۔ اگر ۱۹۳۳ء یعنی حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان معلومات کے حصول کی کوشش کی گئی ہوتی تو کامیابی چنداں مشکل نہ تھی کیونکہ آپ کی وفات کے بعد بھی قریباً پندرہ سال تک ہندوستان ایک متحدہ ملک تھا اور خود ضلع ہزارہ میں بھی شاہ صاحبؒ کے فاضل شاگردوں کی خاص تعداد تھی جن میں مولانا عبدالحنان اور مولانا غلام غوث جیسے لائق و فائق اشخاص شامل تھے، یہ حضرات ہزارہ کی قدیم درسگاہوں اور اُن درسگاہوں کے معلمین کا پتہ چلا سکتے تھے اور شاہ صاحب کے ہزارہ والے اساتذہ کے متعلق تحقیقی مواد فراہم کر سکتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد جو مزید زمانہ بیت گیا اس نئے دور میں وہاں کیا گزری، اور دینی مدارس پر کیا بیتی اس کا تو ہم کو علم ہی نہیں ہو سکتا اور

جن لوگوں سے یہ حقائق جاننے کی امیدیں کی جا سکتی تھیں وہ اب وہاں بھی کہاں باقی رہے ہوں گے اور اس راستے میں حائل سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تقسیم ملک کے بعد ہندوستان اور پاکستان دو ملکوں کے وجود میں آتے ہی ان دو کے درمیان اختلافات کی جو خلیج حائل ہو گئی (اور جو بدقسمتی سے آج تک حائل چلی آتی ہے) اس نے ان دو ملکوں کے عوام کے لئے یہاں اور وہاں سے تبادلۂ معلومات کے دروازے ہی بند کر دئے۔ تقسیم ملک سے کسی دوسرے مقصد کو ممکن ہے کوئی فائدہ پہنچا ہو لیکن جہاں تک علم بحیثیتِ علم کا تعلق ہے اسکا یہاں بھی اور وہاں بھی نقصان ہی نقصان رہا۔

ایک قیاس اور قرینہ

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحبؒ نے ہزارہ کے کسی ایک ہی مدرسہ سے فایدہ نہیں اُٹھایا ہوگا کیونکہ وہاں کی درسگاہیں مختلف علوم کی سپیشلسٹ (Specialist) درسگاہیں تھیں۔

طریقۂ تعلیم کی خصوصیات

جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں عرض کیا کہ ان میں سے کسی درسگاہ میں عربی کی صرف و نحو کے ماہرین تھے اور کسی میں فقہ اور اصول فقہ کے باکمال لوگ تھے، کہیں منطق اور فلسفہ کا چرچا تھا اور کہیں فقہ، اصولِ فقہ اور حدیث و تفسیر کا۔ اس لئے طالبانِ علم ایک فن کو ایک درس گاہ میں حاصل کر کے دوسرے فن کے لئے دوسری درس گاہ میں چلے جاتے تھے۔ لازمی بات ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی ایسا ہی کرنا پڑا ہوگا۔ کیونکہ آپ نے قیام ہزارہ کے دوران صرف، نحو، بلاغت، منطق، فلسفہ، فقہ اور

اصولِ فقہ وغیرہ علوم کی درمیانہ اور اونچے درجوں کی مُروّجہ اور اہم کتابیں جو ہزارہ کی درس گاہوں کے نصاب میں شامل تھیں، پڑھ ڈالی تھیں۔ مثلاً علمِ صرف میں مراحُ الارواح اور شافیہ، علمِ نحو میں ہدایۃُ النحو، کافیہ، الفیۂ ابن مالک اور شرحِ مُلّا جامی، علمِ بلاغت میں مختصرُ المعانی اور غالباً مُطوّل بھی۔ منطق میں شرحِ تہذیب، قطبی اور سُلّمُ العلوم، فلسفہ میں ہدیۂ سعدیہ، میبذی اور صدرا، فقہ میں کنزُ الدقائق اور شرحِ وقایہ، علمِ اصولِ فقہ میں اصولِ شاشی اور نورالانوار اور حدیث میں مشکوٰۃِ شریف۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کے پہلے سال آپ نے جن کتابوں کا امتحان دیا اُن پر نظر ڈالنے سے درسِ نظامی کے نصاب کی واقفیت رکھنے والوں پر خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ درسیات کی مشکل ترین اور محنت طلب کتابیں شاہ صاحب نے ضلع ہزارہ کی درسگاہوں ہی میں مکمل کر لی تھیں۔ اور یہ کتابیں اور یہ فنون چونکہ ہزارہ میں مُروّج دستور العمل کے لحاظ سے کسی واحد درسگاہ میں نہیں بلکہ مختلف درسگاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ اس لئے وہاں کے ہر طالب علم کی طرح شاہ صاحب کے لئے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر فن کو اس کے خاص ماہرین سے حاصل کرنے کے لئے مختلف درسگاہوں میں داخل ہو کر استفادہ کریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا ہوگا مگر زمانہ کی رفتار ہزار ہا واقعات کی طرح ہماری مطلوبہ معلومات کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گئی ہے۔ جو لوگ ان گم گشتہ نشانات کا کچھ اتا پتہ بتا سکتے وہ ایک ایک کر کے اس دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں کون بتائے کہ

ضلع ہزارہ کے کِس کِس مدرسہ سے اور کِس کِس اُستاد سے حضرت شاہ صاحبؒ نے کِن کِن علوم میں استفادہ کیا۔ شاہ صاحب کے یہ اساتذہ یقیناً ان علماء میں سے ہونگے جن کے اپنے اساتذہ کا سلسلۂ تلمذ حضرت مولٰینا شاہ اسماعیلؒ، حضرت مولٰینا عبدالحیؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے دیگر رفیق عُلماء تک پہنچتا ہو گا۔ کاش کہ ان حقائق کی نقاب کُشائی ہو سکتی۔

کاکول کی درس گاہ اور مولٰینا فضل الدّین صاحب

بہت کچھ کد و کاوش کے بعد ہزارہ کے اساتذہ میں سے ہمیں حضرت شاہ صاحبؒ کے صرف ایک اُستاد مولٰینا فضلُ الدین صاحبؒ کا اسمِ گرامی ہاتھ آیا جو اس علاقہ کے استاذُ الاساتذہ تصوّر ہوتے تھے اور مزید یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مولٰینا فضلُ الدّین صاحب قصبۂ کاکول کی درسگاہ میں اکثر علمِ فقہ اور علمِ اصول کا درس دیتے تھے اور ان علوم کے شائقین دور دور سے ہدایہ اور توضیح و تلویح اور فخرُ الاسلام بزدوی کی کتابُ الاصول کے مشکل مقامات حل کرنے کے لئے ان کے پاس پہنچتے تھے اسلئے یہ راز اس حد تک مُنکشف ہو جاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کو علمِ فقہ اور علمِ اصول کے ساتھ جو گہرا تعلق تھا وہ مولٰینا فضلُ الدین صاحبؒ کا فیض تھا۔

دارالعلوم دیوبند کی ۱۳۱۱ھ کی روئیداد بتاتی ہے کہ دارالعلوم میں داخل ہونے اور سال بھر تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو پہلا سالانہ امتحان شاہ صاحبؒ نے دیا اس میں علمِ فقہ کی ہدایہ اوّلین اور علمِ اصول

کی حسامی شامل تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرح وقایہ جو ہدایہ سے پہلے پڑھائی جاتی تھی اور نورُ الانوار جو حسامی کی پیش رو ہوتی تھی، ان تک درسِ نظامی کی کتابیں شاہ صاحبؒ نے درسگاہِ کاکول اور ہزارہ کی دیگر درسگاہوں میں پڑھ لی تھیں۔

علمِ فقہ اور اصولِ فقہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کو جو غیر معمولی رسوخ حاصل تھا وہ آپ کی مہارت وحذاقتِ علمِ حدیث سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ اور یہ امر واضح ہو چکا کہ یہ فیض آپ کو مولینا فضلُ الدین صاحبؒ سے اور ضلع ہزارہ کے دوسرے فقہی و اصُولی عُلماء سے پہنچا تھا۔

مدارسِ ہزارہ کا طرزِ تعلیم

طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے ہزارہ کے مدارِس بالکُل نرالے تھے۔ وہاں "العلمُ فی الصدور لافی الکُتب" کا مشہور جُملہ آئینِ تعلیم کی بنیاد قرار دیا جاتا تھا اور کتاب کو بالائے طاق رکھ کر مسائلِ فن ازحفظ کرائے جاتے تھے۔ اگر ہزارہ کی کسی درس گاہ کے قریب سے رات کے وقت کوئی گذرتا تو اس کے کانوں میں طلباء کا اپنا اپنا آموختہ اونچی آواز سے دھرانے، اور یاد کرنے کا شور ایک عجیب قسم کی موسیقی بن کر پہنچتا۔ بعض طلباء کسی گوشے میں بیٹھ کر آموختہ یاد کرنے کے بدلے مدرسے یا مسجد کے صحن میں چلتے رہتے اور اسی گردش میں اپنا سبق باآوازِ بُلند دھراتے جاتے تاکہ نیند پر قابُو

پا سکیں اور اپنا کام بھی پورا کر لیں۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ طریقِ کار "مشائینِ یونان" کی اِس عادت سے کتنا مِلتا جُلتا اور ہم رنگ تھا جس کی وجہ سے ان کا نام ہی "مشائین" پڑ گیا۔

مدارسِ ہزارہ میں یہ بھی دستور تھا کہ کسی فن کی اونچی تعلیم دینے سے پہلے اس فن کی ایک مختصر کتاب کی عبارت طالب علم کو زبانی حفظ کرادی جاتی تھی۔ مثلاً علمِ صَرف میں صرف میر زبانی یاد کرنی ہوتی تھی۔ (یہ مسائلِ صَرف پر مشتمل میر سیّد شریف جرجانی کا مشہور رسالہ ہے۔ مقامی زبان میں اس کا ترجمہ قانونچۂ کھیوالی' کے نام سے حفظ کرایا جاتا تھا۔ یہ قانونچہ قوانینِ صَرف کا نہایت جامع مجموعہ تھا)۔ اسی طرح علمِ نحو میں کافیۂ ابن حاجب اور علمِ فقہ میں ابوالبرکات نسفیؒ کی کنز الدقائق کا حصۂ عبادات لفظاً و معناً حفظ کرایا جاتا تھا۔ درجۂ حفظ ہی ان مدارس میں مشکل ترین مرحلہ تھا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا تھا تو اس کے بعد اس فن کی مُطوّلات اور شروح کی تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ بہت مُفید طرز تھا

اس طریقِ تعلیم کا فائدہ یہ تھا کہ مُتعلقہ فن کے مسائل پر ہر سمجھدار اور اوسط درجہ کے فہیم طالب علم کو اچھی خاصی دسترس حاصل ہو جاتی تھی۔ اور وہ اکثر صورتوں میں اس فن کی مُطوّلات و شروح کے سرسری مطالعہ سے ہی پورے فن کے مسائل پر حاوی ہو جاتا تھا۔

یوں تو شاہ صاحبؒ کی معجز نما قوتِ حافظہ مختصرات و مُطوّلات سب کو ایک بار پڑھ لینے کے بعد آپ کے دماغ میں محفوظ کر لیتی تھی دوسروں کو اگر صرف متن کے الفاظ رالتوں کو جاگنے اور لفظ بلفظ اور

جملہ بجملہ سو سو بار تکرار کرنے سے یاد ہو جاتے تھے تو آپ کو متن اور اس کی شروح و حواشی دلائل کے ساتھ نظرِ اوّل میں ہی مُستحضر ہو جاتے تھے۔ مگر مدارسِ ہزارہ کا ہر فن کے ایک مختصر متن کو لازمی طور حفظ کرنے کا طریقِ تعلیم اس سونے پر سُہاگے کا کام دے گیا اور اس نے آپ کی قوّتِ استحضارِ فنون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ جس کے نتائج و ثمرات آپ کی مُعلّمانہ حیات میں ہمیشہ نمایاں رہے۔

کاکول

قصبہ "کاکول" جس کا تذکرہ گذشتہ سطور میں متعدد بار آیا، ضلع ہزارہ کی تحصیل "ایبٹ آباد" کا ایک پُر فضا اور قدیم قصبہ ہے، جو اس علاقہ کے ایک دوسرے تاریخی مقام دھمتوڑ اور نوشہرہ کے قریب واقع ہے۔ کاکول اور ایبٹ آباد کے درمیان ایک کفِ دست سر سبز میدان ہے جو قریباً آٹھ دس میل تک چلا گیا ہے۔ بجائے خود ایبٹ آباد بھی اپنی عُمدہ آب و ہوا کے لحاظ سے کشمیر کا ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔ موسمِ گرما میں یہاں کی آب و ہوا قریباً کشمیر کی طرح صحت بخش اور خوشگوار رہتی ہے جس سے لُطف اندوز ہونے کے لئے پشاور، راولپنڈی اور لاہور تک کے سیّاح آجاتے ہیں۔ اور سردیوں میں کشمیر سے کسی قدر کم مقدار میں سہی مگر یہاں بھی برف باری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقہ ہزارہ کے مدارس میں کشمیری طلباء موسمِ گرما کے دنوں میں تکلیف محسوس نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب بھی نازک اور نو عمر ہونے کے باوجود ہزارہ کے ان مدارس میں بغیر کسی دِقّت کے کئی سال تک اپنی تعلیم جاری رکھ سکے اور جب واپس کشمیر گئے تو صحت کے بارے میں آپ کو آب و ہوا کی اجنبیت کے متعلق کوئی شکایت نہ تھی۔

ایبٹ آباد خود "ایبٹ آباد" متحدہ ہندوستان کے اُن نئے شہروں میں سے ہے جو انگریزی حکومت کے دور میں عالمِ وجود میں آئے۔ ۱۸۴۷ء میں جب لاہور کی سکھ حکومت کے خاتمہ پر ضلع ہزارہ اور صوبہ سرحد کے دیگر اضلاع انگریزوں کے قبضہ میں آئے تو شہر ایبٹ آباد کا اُس وقت تک نام و نشان بھی نہ تھا۔ چونکہ سرحد پر قبضہ کے بعد انگریزی حکومت کو آزاد قبائلی علاقوں اور خاصکر "ستھانہ" کے مقام پر حضرت سیّد احمد شہیدؒ کے بچے ہوئے مجاہدین کے عوام پر اثر و رسُوخ کا خوف لگا رہتا تھا۔ اس لئے برٹش راج کے کارپردازوں نے سرحد کے مقبوضہ علاقہ میں بہت سی فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ ان چھاونیوں میں سے ایک چھاؤنی کاکول اور دھمتوڑ کے جنوب مغرب میں اس خوشنما خطہ میں قائم کی گئی جہاں ایک طرف کھلا میدان ہے اور دوسری طرف جنگل، پہاڑ اور چشمے ہیں۔ بعد میں صوبے کے ایک انگریز حاکم مسٹر ایبٹ (Mr. Abbot) کے نام پر اس جگہ کا نام "ایبٹ آباد" رکھ دیا گیا۔ جو اب تک مروج و مشہور ہے۔ ابتداء میں ایبٹ آباد ایک بازار اور اہلِ بازار کے چند گھروں، فوجی چھاؤنی میں کام کرنے والے بیروں اور مزدوروں کے کوارٹروں پر مشتمل تھا۔ لیکن ۱۸۴۷ء سے ۱۹۴۷ء تک (یعنی پورے سو سال میں) یہ بازار اور چھوٹی سی بستی ترقی کرتے کرتے آج ایک بہت بڑا خوبصورت شہر بن گیا ہے۔

پہلے ہزارہ ضلع کے ڈی، سی وغیرہ حاکموں کے دفاترِ کا مرکز۔ قصبہ "ہری پور ہزارہ" ہوا کرتا تھا۔ مگر اب ایبٹ آباد ہی ضلع کا صدر مقام ہے۔

آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد ایبٹ آباد کی اہمیت اور بھی

بڑھ گئی ہے، اب پہلے سے زیادہ مستحکم فوجی چھاؤنی اور ضلع کی کچہریوں کے دفاتر کے علاوہ یہاں بڑے بڑے ہسپتال، مخصوص صحت خانے (Health Centre). ہر قسم کے کالج اور کئی ایک کارخانے بھی قائم ہو گئے ہیں۔ اور کاکول تک سارا میدان ان اداروں سے پُر ہو گیا ہے۔ اب ایبٹ آباد کاکول تک پھیل گیا ہے اور کاکول جو پہلے دینی علوم کی درسگاہ کے لئے مشہور تھا آج اس کی شہرت اس ملٹری اکیڈیمی کی وجہ سے ہے جس سے ہر سال فوجی افسروں کی نئی کھیپ اپنی تعلیم و تربیت مکمل کر کے برآمد ہوتی ہے۔ وہاں کی وہ عربی درس گاہ جو فقہ اور اصولِ فقہ کے لئے مشہور تھی آج کل اس کا کیا حال ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے بد قسمتی سے ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

ہزارہ سے واپسی

اور انقطاعِ تعلیم کا سال

بہر حال ضلع ہزارہ کے مدارس میں تین۳ سال تک کچھ اپنے ذہن اور کچھ ہر فن کے ماہر اور حاذق اساتذہ کی شفقت سے مولینا انور شاہ صاحبؒ نے اپنے علمی مدارج طے کر لئے جو دوسرے طلباء چھ سات سال میں بھی نہیں کر سکتے اور ۱۳۰۵ھ میں آپ کافی حد تک اپنی علمی پیاس بجھا کر لولاب واپس آگئے۔ اب آپ جہاں علوم و فنون سے بہرہ وافی حاصل کر چکے وہاں عمر شریف سولہ۱۶ سال سے متجاوز ہو چکی تھی اور ذہنی و جسمانی ہر اعتبار سے اب آپ کی شخصیت میں پختگی آچکی تھی اور مستقبل کے بارے میں

ضروری اقدامات میں اب آپ کو اعزّہ و اقرباء میں سے کسی کی دیکھ بھال کا احتیاج باقی نہ رہا تھا۔ با ایں ہمہ اپنے والدِ گرامی کی ہدایات و ارشادات کو اب بھی آپ حرزِ جان تصوّر کرتے تھے۔

مولوی عبد المجید شاہ

ضلع ہزارہ میں شاہ صاحب کے دیگر رُفقاءِ سفر اور رشتہ داروں میں سے تین صاحب حیدر شاہ، مختار شاہ اور عبد الاحد شاہ تو آپ کی واپسی سے بھی قبل ہی تعلیم ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ البتہ آپ کے چچا زاد بھائی مولوی عبد المجید شاہ ہزارہ سے اپنی واپسی تک آپ کے ساتھ رہے اور واپسی کے بعد گھر جانے کے بدلے تکمیلِ تعلیم کے شوق میں اسی سال یعنی ۱۳۰۸ھ ہی میں ہزارہ سے سیدھے دیوبند پہنچکر دار العلوم میں داخل ہو گئے۔ چناں چہ ۱۳۰۹ھ میں مولوی عبد المجید صاحب موصوف نے تفسیر جلالین و بیضاوی، مختصر المعانی و مطوّل اور مُلا حسن و میبذی پڑھ کر ۱۳۱۰ھ میں ان کتابوں کا امتحان دیا۔ (ملاحظہ ہو روداد دار العلوم دیوبند ۱۳۱۰ھ)

چونکہ مولوی عبد المجید شاہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مُشفق بھائی، رفیقِ سفر اور نہایت ہی خیر خواہ تھے۔ اور دار العلوم دیوبند میں آپ کے پیشرو اور اپنے خاندان میں سے پہلے فاضلِ دیوبند تھے اس لئے مولوی عبد المجید شاہ کے تذکرہ کے بغیر مولانا انور شاہ کا تذکرہ مُکمل نہیں ہو سکتا۔ ہزارہ سے واپسی کے بعد اگرچہ ۱۳۰۹ھ کا سال شاہ صاحبؒ نے اپنے وطن میں ہی بسر کیا لیکن مولوی عبد المجید شاہ کی مؤثر تحریرات نے آخر کار آپ کو بھی دیوبند پہنچا کر ہی چھوڑا اور ۱۳۱۱ھ میں شاہ صاحبؒ نے دیوبند میں

جب پہلا امتحان دیا تو یہ سال عبدالمجید صاحب کے لئے دارالعلوم سے فراغت کا سال تھا۔

مولوی عبدالمجید صاحب نے جیسا کہ اوپر آچکا ۱۳۰۹ھ میں ہزارہ سے دیوبند پہنچکر ۱۳۱۰ھ میں پہلا امتحان دیا اور اس کے بعد ۱۳۱۱ھ میں دورۂ حدیث میں شامل ہو گئے اور جامع ترمذی، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابوداؤد نسائی، ابن ماجہ اور ہدایہ نامی کتابیں پڑھیں اور صحاح ستّہ میں تکمیل کا امتحان ۱۳۱۱ھ میں امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور حضرت شیخ الہند مولینا محمودالحسنؒ اور دیگر اساتذہ دارالعلوم سے سندات حاصل کیں۔ مگر چونکہ صاحب عیال تھے (ہزارہ اور دیوبند کی تعلیم سے بھی پہلے آپ دو بیٹوں اور ایک دختر کے باپ بن چکے تھے) اس لئے تکمیل کے فوراً بعد حضرت شاہصاحبؒ کو اللہ کے حوالے کر کے اسی سال واپس اپنے وطن موضع لوات وادیٔ نیلم میں پہنچ گئے۔ اور وہاں کی آبائی درسگاہ کی مسند پر بیٹھ کر علمی فیوض و برکات کے دریا بہانے لگے۔ اور مختصر سی ہی مدّت میں اپنے کمالات کی وجہ سے مرجع خلائق بن گئے۔ اور اگر زندہ رہتے تو بڑے بڑے کارنامے کر دکھاتے۔ لیکن بدقسمتی سے آپکی عمر نے وفا نہ کی اور دو تین سال کے اندر اندر انتقال کر گئے اور اپنے والد ماجد پیر موسیٰ شاہ اور دیگر اقرباء کو بادیدہ گریان و دلِ بریان چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ وبرّد مضجعہ۔ (قاضی شاہ عبدالکبیر کے سب سے چھوٹے دو فرزند تھے: پیر موسیٰ شاہ اور مولینا معظم شاہ۔ دونوں کے متعدد فرزندوں میں سے ایک ایک فرزند۔ مولوی عبدالمجید شاہ اور مولینا انور شاہ نے کمالات علمی کی سرحدات کو پار کیا اور دارالعلوم دیوبند سے سندات فضیلت حاصل کیں۔

دو بھائیوں کے یہ "لائق فرزندان" اپنے اپنے باپ کی حیات میں ہی فوت ہوکر دونوں کو صبر و استقلال کے مُشکل ترین امتحان میں ڈالکر چلے گئے۔ مولینا معظم صاحب حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہے اور پیر موسیٰ شاہ مولوی عبد المجید صاحب کے بعد اٹھارہ سال زندہ رہ کر ۱۳۲۹ھ میں انتقال کر گئے۔)

نام کے ساتھ مظفر آبادی

چونکہ مولوی عبدُ المجید صاحب موصوف جب دارُ العلوم دیوبند میں داخل ہوئے، آپ کا دولت خانہ موضع لوات ضلع مظفر آباد میں تھا، اس لئے آپ کے نام کے ساتھ دار العلوم کے رجسٹر کے سکونت اور وطنیت کے خانے میں "مظفر آبادی" لکھا ہُوا ہے۔ اور عام حالات میں یہی دُرست بھی ہے لیکن قابل توجہ اور معنیٰ خیز بات یہ ہے کہ جب شاہ صاحبؒ کا اسمِ گرامی دارُ العلوم کے رجسٹر داخلہ کی زینت بنا تو آپ کو بھی "انور شاہ مظفر آبادی" لکھا گیا۔ حالانکہ دار العلوم میں داخل ہونے کے وقت آپ کشمیر کے موضع وَدْوَنْ علاقہ لولاب ضلع بارہ مولہ سے گئے تھے۔ اور مُناسب یہ تھا کہ آپ کو "لولابی کشمیری" لکھا جاتا۔ مگر چونکہ آپکی نشوونما موضع لوات ضلع مظفر آباد میں ہوئی تھی اور آپ کے بھائی نے آپ سے قبل اپنے نام کا اندراج بطور "مظفر آبادی" کر رکھا تھا اور تاریخی واقعات اور برادرانہ یگانگت کے لحاظ سے لولاب اور لوات ان کی نظر میں کسی بڑے فرق کا موجب نہ تھے۔ اس لئے آپ نے بھی "مظفر آبادی" لکھوانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ اور بلا تردّد ساکن ضلع مُظفر آباد لکھوا دیا۔ اغلبًا شاہ صاحب کے اندراج نام کے وقت آپ کے بھائی مولوی عبد المجید

صاحبؒ بھی دفترِ دارُ العلوم میں موجود ہونگے جنہوں نے بتایا ہوگا کہ ہیں تے اپنی وطنیت مُظفر آبادی لکھوائی ہوئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحبؒ نے بھی اپنے برادرِ مُکرم کی مُوافقت کرتے ہوئے اپنے آپ کو "مُظفّر آبادی" تحریر کروایا ہے۔

۱۳۰۹ھ کا سال انقطاعِ تعلیم کا برس

شاہ صاحب ہزارہ سے ۱۳۰۸ھ کے آخر میں واپس آگئے اور دارُ العلوم دیوبند میں آپ کا داخلہ ۱۳۱۰ھ میں ہوا، جس سے ظاہر ہے کہ آپ سال بھر گھر میں ہی مقیم رہے اور اس طرح سے ایک سال سے کچھ زیادہ مُدت تک آپ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس انقطاع کے اسباب و وجوہات تلاش کرنے سے پتہ چلا ہے کہ اس زمانہ میں کشمیر میں زمینوں کا پہلا قانونی بندوبست ہو رہا تھا اور یہ وہ سال تھا جب علاقۂ لولاب میں بھی زمینوں کی پیمائش ہو رہی تھی، پیمائشِ زمین علمِ ہندسہ و حساب اور مساحتِ ارض کے بہت سے علمی اصولوں پر مبنی ہے۔ چونکہ ہر نئے علم کے حصول کی تڑپ حضرت شاہ صاحبؒ کے متلاشی حقائق دل میں ازل سے ودیعت ہو چکی تھی۔ اس لئے بندوبستی کام کو ذرا قریب سے مُلاحظہ کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کو علمِ مساحت، علمِ ہندسہ و حساب اور پیمائش سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپ نے سال بھر کے لئے سب کام مُلتوی کر کے اپنی تمام دلچسپیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔

ان واقعات کی مزید تفصیل یوں ہے کہ ۱۳۰۶ھ / ۱۸۸۹ء سے ہی وادیٔ کشمیر کے مختلف اضلاع میں ریاست کے برطانوی ہند سے اُدھار لائے

ہوئے ایک لائق انگریز آفیسر مسٹر والٹر، آر لارنس نے بحیثیتِ "سٹلمنٹ کمشنر" بندوبستِ اراضی کا کام جاری کر رکھا تھا اور اس سال یعنی ۱۸۹۱ء / ۱۳۰۹ھ میں یہ کام تحصیلِ ہندوارہ اور خاص کر وادئی لولاب میں جاری تھا۔ جابجا بندوبست کے تحصیلدار، گرداور، پٹواری، منصرم اور شجرہ کش زمینوں کی پیمائش کر رہے تھے۔ اور شجرے خسرے مرتّب کرتے تھے اور حقیقتِ قابضان و تشخیصِ پیداوار جیسے فنّی محنت اور باریک بینی کے کام انجام دے رہے تھے۔ جس سے ایک نئی فضا جنم لے رہی تھی۔ شاہ صاحب کے لئے بندوبست کے اس کام میں اس لئے بھی دلچسپی تھی کہ کوئی سَو سال کے بعد پہلی بار کشمیر کے دیہاتی باشندوں کے حقوق کی کسی حد تک ظالموں اور جابروں کے ہاتھ سے محفوظ ہو جانے کی سبیل پیدا ہو رہی تھی۔ اور ہندسہ، حساب اور مساحت کا علمی پہلو بجائے خود آپ کے دلِ پُر جستجو کو اپنی طرف متوجّہ کر رہا تھا۔ اور یہ شاہ صاحبؒ جیسی فنا فی العلم ہستی کے لئے دلچسپی کا باعث رہا تھا۔ مزید براں بندوبست کے بعض علم دوست افسر جو شاہ صاحبؒ کی ملاقاتوں کے وقت آپ کے علم و دانش سے آگاہ ہو گئے تھے، ان سے بے تکلّفانہ روابط تازہ رجحان کو بڑھا رہے تھے۔

بندوبست کے ان ماہر افسران میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کو مسٹر لارنس پنجاب کی برطانوی حکومت سے عاریتاً لائے تھے۔ اور ان مسلمان پنجابی افسروں اور خود مسٹر لارنس کو بھی مسلمانانِ کشمیر میں تعلیم کے فقدان کا بہت دکھ تھا۔ جب ان کی نظر حضرت شاہ صاحبؒ جیسی ہمہ دان ہستی پر پڑتی تھی تو ان کو ایک قسم کی تسکینِ قلب حاصل ہوتی تھی اور یہ شاہ صاحبؒ کو اپنی طرف کھینچ لینے کی کوشش میں لگ جاتے تھے۔

مسلمانانِ کشمیر کی بے علمی

وادیٔ کشمیر میں اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی حالت کیا تھی اس کا اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے، جو مسٹر لارنس نے اپنی کتاب "دی ویلی آف کشمیر" کے صفحہ ۲۲۴ پر تحریر کئے ہیں:-

مردم شماری ۱۸۹۱ء

وادیٔ کشمیر کی کُل آبادی	مسلمان	ہندو	سکھ	متفرق (عیسائی اور پارسی وغیرہ)
۸۱۴۲۴۱	۷۵۷۴۳۳	۵۲۵۷۶	۴۰۹۲	۱۴۰
	(زائد از ۹۳ فیصدی)	(۷ فیصدی سے کم)		

سرکاری مدارس میں زیرِ تعلیم طلباء کی کُل تعداد	مسلمان	ہندو	سکھ	متفرق
۱۵۸۵	۲۳۳	۱۳۲۷	۲۱	۴

واضح ہے کہ کُل آبادی یعنی ۸۱۴۲۴۱ افراد میں سے ۱۱۸۹۶۰ شہر سرینگر میں رہتے تھے اور اسی طرح ۱۵۸۵ طلباء میں سے ۱۲۲۰ شہر سرینگر میں زیرِ تعلیم تھے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شہر کا تعلیمی نقشہ یہ تھا تو دیہات میں تعلیمی حالت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بہر حال جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے کہ مسٹر لارنس اور اس کے ساتھ دیگر افسروں کو کشمیر کے مسلمانوں کے فقدانِ تعلیم کا احساس اور دُکھ تھا جیسا کہ موصوف نے بار بار اپنی رپورٹوں اور اپنی کتاب "دی ویلی آف کاشمیر" میں لکھا ہے۔

عُنقا را بلند است آشیانہ

اس لئے اب وہ یہ چاہتے تھے کہ عربی اور فارسی کی تعلیم کشمیر

میں جن گنے چنے لوگوں کو حاصل ہے ان کو سرکاری ملازمت کی ترغیب دیں۔ کشمیر میں تب تک دفتری زبان فارسی ہی تھی، اور اچھی فارسی جاننے والوں کے لئے ترقی کے اچھے مواقع تھے۔ ان پنجابی افسروں نے چند سرسری ملاقاتوں میں جب شاہ صاحبؒ کے علم و فضل اور خاصکر فارسی زبان پر آپ کے تصرّف کا اندازہ کیا تو آپ کو محکمۂ بندوبست میں شامل ہونے پر راغب کرنا چاہا اور انہیں تحصیلداری اور اس سے بھی آگے کے عہدوں کی امیدیں دلانے لگے۔ لیکن شاہ صاحبؒ نے ان پر واضح کر دیا کہ آپ سرکاری ملازمت سے تو طبعًا بے زار ہیں۔ البتہ محض علمی شوق پورا کرنے کے لئے بندوبستِ اراضی کا علم اور اس کے نکات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر آپ نے ان بندوبستی دوستوں پر واضح کر دیا کہ ؎

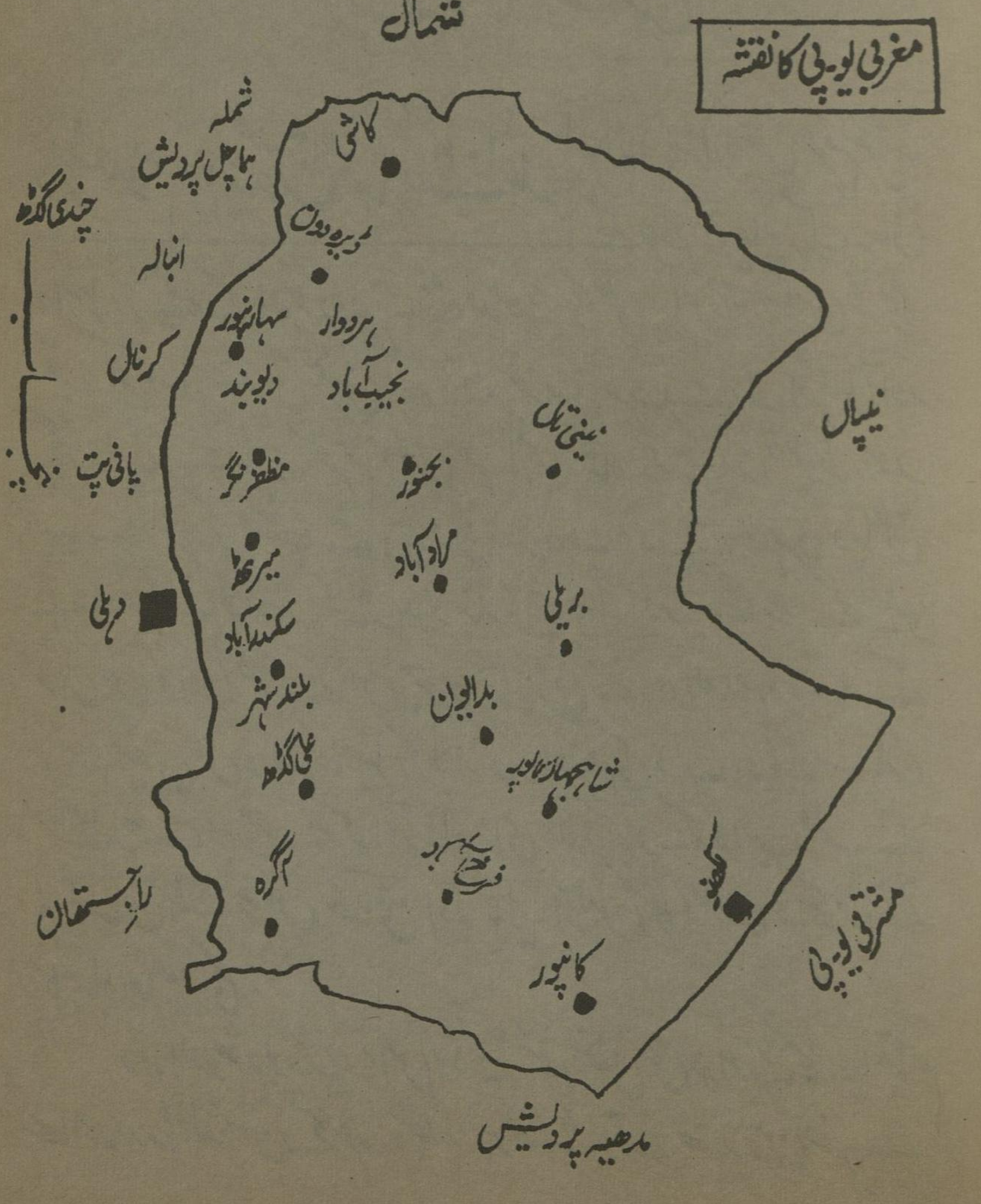
برو ایں دام بر مرغے دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

چنانچہ وہ لوگ بھی ذہنی بلندیوں کو دیکھ کر اپنے اصرار سے باز آگئے اور کچھ مدّت تک آپ پیمائش و مساحتِ ارض اور طریقۂ بندوبست کے دیگر لوازمات سے محض فنّی اور علمی دلچسپی لیتے رہے اور آپ کا یہ شغل ایک معصومانہ علمی شغل بن کر صرف یادگار رہ گیا۔ مگر اس کی وجہ سے ۱۳۰۹ھ کا سال آپ کی اصلی تعلیم کے حق میں انقطاع کا سال ثابت ہوا۔

روانگی دیوبند

آپ کا یہ نیا شغل عزیز و اقارب کے لئے موجبِ تعجّب تو تھا اور شاید کسی کو یہ غلط فہمی بھی ہوئی ہو گی کہ شاہ صاحب سرکاری ملازمت کی طرف مائل ہو رہے ہیں اور رفتہ رفتہ یہ افواہ آپ کے برادرِ بزرگوار مولوی عبدالمجید صاحب تک دیوبند

میں پہنچی جس سے ان کا بے چین ہو جانا قدرتی تھا۔ وہ پہلے ہی آپ کو دیوبند
بلانے پر مُصِر تھے، اب انہوں نے شاہ صاحبؒ کی تعلیم کے انقطاع کا خطرہ
محسوس کر کے شاہ صاحبؒ کے بزرگوں اور خود شاہ صاحب کو زیادہ مؤثر خطوط
لکھے جن کا خاطر خواہ اثر ہوا اور شاہ صاحبؒ بندوبستی علوم کی دلچسپیوں کو
خیرباد کہہ کر روانۂ دیوبند ہو گئے۔



دار العلوم دیوبند میں تکمیل

(۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۴ھ)

دار العلوم دیوبند میں شاہ صاحب کا داخلہ مدارس ہزارہ میں علوم مروجہ کے مدارج عالیہ تک رسائی حاصل کر لینے کے باوجود حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی پیاس کو تسکین نہ ملی تھی۔ کچھ اپنا اشتیاقِ تکمیل، کچھ والدِ محترم کی طرف سے ہمت افزائی اور کچھ دیوبند سے برادرِ محترم مولوی عبد المجید شاہ کے تاکیدی خطوط اور سب سے بڑھ کر مشیّتِ ایزدی۔ ان سب مسببات ظاہری و باطنی نے شاہ صاحب کو کشاں کشاں دیوبند پہنچا دیا۔ اور ۱۳۱۰ھ کے تعلیمی سال میں وادی کشمیر کے اس جوہر تاباں نے دار العلوم دیوبند کے چشمۂ فیض میں داخلہ حاصل کر لیا۔ دار العلوم کی کتاب روداد سال ۱۳۱۱ھ سے واضح ہے کہ انور شاہ نامی مظفر آباد کے طالب علم نے ماہِ شعبان ۱۳۱۱ھ میں حسامی اور ہدایہ اولین کا امتحان دیکر شاندار کامیابی حاصل کی۔

دار العلوم دیوبند میں اس وقت منشی فضل حق صاحبؒ کا دورِ اہتمام تھا اور صدر المدرسین کے عہدہ جلیلہ پر محدثِ وقت جُنیدِ زمن حضرت

شیخ الہند مولانا محمود الحسن جیسی باکمال ہستی رونق افروز تھی۔ حضرت ممدوح علیہ الرحمۃ حجۃ الاسلام قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی (بانیٔ دارالعلوم دیوبند) اور قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی (قدس اللہ اسرارہما) کے شاگردِ خاص اور جانشینِ با اختصاص تھے۔

دیوبند میں شاہ صاحب کا ابتدائی قیام وطعام

جس زمانے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم میں داخلہ لیا ان دنوں ابھی دارالعلوم میں مطبخ سے طلباء کو پکا پکایا کھانا مہیا کرنے کا انتظام بہت محدود تھا۔ امداد کے مستحق طلباءؔ کو دارالعلوم سے نقد وظیفہ ملتا تھا اور مستطیع طلبہ اپنے کھانے کا خرچ خود برداشت کرتے تھے۔ یہ سب لوگ اپنے طور پر کسی مقامی نان پز کے یہاں کھانے پینے کا انتظام کر لیتے تھے۔

دوسری دِقت رہائش گاہ کی تھی۔ طلبہ کی کثرتِ تعداد کی وجہ سے دارالاقامہ (HOSTEL) میں کمروں کی قلت کے سبب تمام طلبہ کو جائے قیام مہیا کرنا منتظمین کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔ اس لئے اس تنگ دامنی کی تکلیف ہر نو وارد کی طرح ابتداء میں اس غریب الوطن طالب علم کو بھی برداشت کرنی پڑی۔ منتظمین دارالعلوم نے یہ دستور رائج کر رکھا تھا کہ جن طلباء کو دارالاقامۃ میں جگہ نہ ملتی تھی وہ دیوبند کی مساجد کے ملحق طلباء کی رہائش کے لئے تعمیر کردہ کمروں میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحبؒ کو بھی ایک عرصہ تک دارالاقامۃ میں جگہ نہ ملنے کی وجہ سے مولوی مشیت اللہ صاحب بجنوری نام کے ایک دوسرے طالب علم کے ساتھ دیوبند کی ایک مسجد کے حجرے میں قیام کرنا پڑا۔

مولوی مشیت اللہ اور شاہ صاحب کی دوستی

یہ مشیت قدرتِ الٰہی تھی کہ مولوی مشیت اللہ صاحب موصوف حضرت شاہ صاحب کے محض وقتی اور عارضی ساتھی ثابت ہونے کے بدلے زندگی بھر کے دوست اور رفیق بن گئے، پہلے ہی دن سے وہ آپ کے اخلاق و عادات پاکیزہ سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے آپ کے عقیدت مند بھی بن چکے تھے۔ یہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا اور تادم آخر قائم رہا۔ زمانۂ تعلیم کے ایامِ تعطیلات میں اکثر حضرت شاہ صاحبؒ مولانا موصوف کے ہاں بجنور بھی جاتے تھے۔

مولانا مشیت اللہ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ جن دنوں بحیثیتِ طالب علم شاہ صاحب اور میں دیوبند کی ایک مسجد کے حجرے میں قیام پذیر تھے، میں نے مشاہدہ کیا کہ میرا یہ ہم عمر کشمیری نوجوان رات گئے تک کتب بینی میں محو رہتا اور نصف شب کے بعد نیند کا غلبہ ہوا تو وہیں کنڈلی مار کر لیٹ جاتا اور تھوڑی دیر آنکھ جھپک کر پھر اٹھ بیٹھتا اور وضو کر کے نوافل تہجد میں مشغول ہو جاتا، تہجد سے فراغت ہوئی تو پھر مطالعہ میں مشغول۔

درسی کتابیں اور ان کی ترتیب

"دار العلوم دیوبند کے عربی درجات میں درجہ بندی کا قاعدہ کبھی بھی رائج نہیں ہوا۔ دار العلوم کے نصاب میں ہر ایک فن کی خاص خاص کتابیں متعین ہیں جو طالب علم کو پڑھنی پڑتی ہیں۔ کچھ فنون اور کچھ کتابیں اعطاء سند کے لئے لازمی ہیں۔ باقی

فنون اور کتابوں کے پڑھنے نہ پڑھنے کا طالب علم کو اختیار ہوتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود اپنی رائے سے یا اپنے اساتذہ کے مشورہ سے جس ترتیب سے کتابیں پڑھیں وہ دورِ حاضر کے طلبہ کے لئے حیرت انگیز ہے۔ دار العلوم کی سالانہ رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دار العلوم میں داخلہ سے اگلے سال یعنی ۱۳۱۱-۱۲ھ میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔ حدیث کی ان کتابوں کے ساتھ ہی آپ نے تفسیر میں جلالین شریف اور فقہ میں ہدایہ جلد ثانی پڑھی۔ اور اسی سال منطق میں قاضی مبارک پڑھا۔ (روداد ۱۳۱۲ھ)

بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھ چکنے کے بعد آمدہ سال یعنی ۱۳۱۳ھ میں آپؒ نے حدیث میں ابوداؤد شریف اور مسلم شریف پڑھی۔ تفسیر میں بیضاوی شریف، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح، شرح چغمینی اور صدرا پڑھا۔ امتحانات میں درجۂ اول کی کامیابی حاصل کی۔

(روداد ۱۳۱۳ھ)

۱۳۱۴ھ میں آپ نے (کتب احادیث میں) مؤطا امام مالک، سنن نسائی شریف اور سنن ابن ماجہ پڑھیں۔ اور فلسفہ میں شمس بازغہ کا اور علم طب میں نفیسی کا امتحان دیا۔ (روداد ۱۳۱۴ھ)[1]

اسی امتحان پر شاہ صاحبؒ کے حصولِ تعلیم کی تکمیل ہوگئی اور آپ کو دار العلوم کے اساتذہ نے سندِ فراغت عطا فرمادی، دورۂ حدیث سے فراغت کی ایک سند صدر المدرسین حضرت شیخ الہند مولانا

---

[1] حیاتِ انور ص ۲۷۲ و ص ۲۷۳

محمود الحسنؒ نے دی تھی اور دوسری مولینا رشید احمد گنگوہیؒ نے دی جس کا ذکر دوسری جگہ آتا ہے۔ یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ دار العلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے پر فضلاءِ دیوبند کو جو سند دی جاتی ہے اس میں اساتذۂ کرام اپنے شاگرد کی نسبت اپنے تاثرات بھی قلمبند کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے شاگرد رشید حضرت شاہ صاحبؒ کو جو سندِ فضیلت اور سندِ اجازت عطا فرمائی تھی اس میں اپنے تاثراتِ عالیہ کو ان الفاظ میں تحریر فرمایا تھا کہ "خداوند تعالیٰ نے مولینا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہنِ ثاقب کو جمع کر دیا ہے۔"

شاہ صاحبؒ کے اساتذۂ کرام

دار العلوم دیوبند میں جن اساتذۂ کرام سے حضرت شاہ صاحب کو شرفِ تلمذ رہا ہے ان میں مندرجۂ ذیل حضرات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

قدوۃ العلماء، شیخ الہند، الحاج مولینا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ، حضرت مولینا الحاج الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمہ اللہ۔ حضرت مولینا محمد اسحاق صاحب امرتسری (مہاجر مدنی) رحمہ اللہ حضرت مولینا غلام رسول صاحب ہزاروی الدیوبندی رحمۃ اللہ علیہ۔

ان سبھی حضرات علماء میں سے آپ نے سب سے زیادہ استفادہ حضرت شیخ الہندؒ سے کیا ہے۔

دار العلوم میں معاصر طلبہ

جس دوران (۱۳۱۰ھ تا ۱۳۱۴ھ) حضرت شاہ صاحبؒ دار العلوم میں بحیثیتِ

طالب علمی مُقیم رہے، اس مُدّت میں ایک محتاط اندازہ کے مُطابق ڈیڑھ ہزار طلبہ نے دارُالعلوم میں داخلہ لیکر تعلیم حاصل کی۔ شاہصاحبؒ کے ان معاصر طلبہ میں چند ممتاز طالبعلم ایسے بھی نکلے جو اپنے مستقبل میں علم وعمل کے آفتاب وماہتاب بن کر روشن ہوئے۔ چند ایک کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:۔

حضرت علامہ مولٰینا مفتی محمّد کفایتُ اللہ۔ مفتیِ اعظم ہند وصدر جمعیۃُ العُلماء ہند، قدس اللہ سرہ العزیز۔

امامِ انقلاب حضرت مولٰینا عبیداللہ سندھی رحمۃُ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت مولٰینا امین الدّین صاحبؒ بانیٔ مدرسہ امینیہ دہلی۔

حضرت مولٰینا ضرغام الدّین صاحبؒ صدر مدرّس وبانیٔ مدرسہ حنفیہ فیض آباد۔

حضرت مولٰینا محمّد صادق صاحبؒ بانیٔ مدرسہ اسلامیہ کراچی۔

حضرت مولٰینا محمّد شفیع صاحبؒ صدرُالمدرّسین مدرسہ عبدالرّبؒ دہلی۔

حضرت مولٰینا سیّد صدیق احمد صاحبؒ (مہاجر مدینہ)

حضرت مولٰینا سیّد احمد صاحب مہاجر بانیٔ مدرسہ الشرع مدینہ منورہ[لہ]

دارالعلوم سے فراغت

بہر حال دارُالعلوم دیوبند کی نورانی وادی میں چار سال رہ کر مشاہیرِ وقت اور یگانۂ روزگار عُلماءِ کرام سے علومِ متداولہ کی تکمیل سے حضرت شاہ صاحب ۱۳۱۴ھ میں فارغ ہو گئے، اس سفرِ حیات کی یہ پہلی منزل تھی جو یہاں پر ختم ہو گئی۔ اور اس کا راستہ وادیٔ لولاب

لہ یہ دونوں حضرات شیخ الاسلام مولٰینا سیّد حسین احمد مدنیؒ کے بڑے بھائی تھے۔

سے مدارسِ ہزارہ اور ہزارہ سے ہوتا ہوا دیوبند تک پہنچا تھا۔
جہاں تک علم بحیثیتِ علم کا تعلّق ہے، اب تک آپ نے جو کچھ حاصل کر لیا وہ بہت کچھ ہونے کے باوجود اس علم کا ایک جزوِ قلیل ہے جو آگے چل کر اپنی ذاتی محنت سے آپ نے حاصل کیا، آپ کا وہ علم و فضل جس کو دیکھ کر مصر و ہندوستان اور حجاز و شام کے ممتاز و مقتدر عُلماء حیرت زدہ ہو جاتے تھے اور آپ کی فوقیتِ علمی کا پورے ایقان اور خلوص کے ساتھ اعتراف کرتے تھے امتحانات کے لئے مُقرر شدہ کورسوں کے اسباق و دروس سے ماوراکوئی اور ہی حقیقت تھی۔

دیوبند کی مُروّجہ تعلیم کی تکمیل پر جو سندات آپ کو ملیں وہ سب کو ملتی تھیں اور آیندہ بھی ملتی رہیں گی۔ لیکن جس بات نے آپ کو اپنے اقران میں امتیازِ خاص کے ساتھ "انور شاہ کاشمیری" کی حیثیت میں عالمِ اسلام کا چمکتا ہوا ستارہ بنا کر پیش کیا وہ آپ کی اَن تھک محنت، بے نظیر شوق مُطالعہ اور خداداد قوّتِ اخذ و تحفّظ اور بے پناہ مَلکۂ استحضار کی برکت تھی۔ جس کے بعض گوشوں سے نقاب سَرکانے کی کوشش اس کتاب کی تحریر کا مقصدِ اوّلین ہے۔

دیوبند کے بعد گنگوہ

(۱۳۱۴ھ)

ہندوستان میں عُلماءِ حقّانی کا یہ دستور چلا آیا ہے کہ علم کے اونچے درجات سے فارغ ہو جانے کے بعد فارغ شدہ اشخاص کی کسی شیخ وقت اور مُرشِد کی نگرانی میں ذِکر و اذکار کی ریاضت کے ذریعے ذہنی تربیت کی جائے تاکہ اگر ان میں غرورِ علم، حُبِ جاہ اور حرصِ اموال کے امراض پیدا ہو گئے ہوں تو ان سے نجات دلائی جائے اور وہ علم و عمل اور تقویٰ و طہارت کے جامع ہو کر اہلُ اللہ کے زُمرے میں داخِل ہو جائیں اور اسلام اور اہل اسلام کے حق میں رحمت بن جائیں۔ کیونکہ ہادیِ برحق محمّد رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ "علم بغیر عمل کے وبال ہے"۔ اور بے علمی کا وبال ایسا ہی وبال ہے کہ یہ محض بے عمل عالم کی ذات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ مُتجاوز ہو کر ان تمام لوگوں کے ضلال کا موجب بن جاتا ہے جن کا واسطہ عالمِ بے عمل سے پڑتا ہے۔ اس لئے حضرت مُجدّدِ الف ثانی رح اور حضرت شاہ ولیُ اللہ رح سے لیکر بانیانِ دارالعلوم دیوبند تک اور ان کے بعد آج تک بھی اس تربیت کا سِلسلہ جاری رہا ہے۔ اور دارُالعلوم سے علومِ دین کی تکمیل کرنے والوں کو برابر اس امر کی

ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ عملی زندگی کے دائرے میں قدم رکھنے سے پہلے کسی روحانی پیشوا کے پاس رہ کر اپنی عملی تربیت و ریاضت کا مرحلہ طے کرلیں تاکہ حصولِ علم کا جو اصلی مقصد ہے وہ پورا ہو جائے اور ان کا وجود اسلام اور اہلِ اسلام کے لئے ایک قیمتی وجود بن جائے۔

حضرت گنگوہیؒ کی جامعیت

دارالعلوم کے قیام کے زمانے میں اہلُ اللہ کی کثرت تھی اور اس کے بانی حضرات مثلاً مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندیؒ، شیخ حاجی عابد حسین دیوبندیؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، مولانا فضلُ الرحمٰن دیوبندیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ تو سب کے سب اپنے مراتب کے مطابق ایسے بزرگ تھے جن کے ہاتھ پر لوگ مختلف سلسلہ ہائے تصوف میں بیعت ہوتے تھے۔

جس زمانہ میں حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ نے تعلیم سے فراغت حاصل کی، دارُ العلوم کے سرپرست قطبُ الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز تھے جو شریعت و طریقت کے جامع اور مرجع عُلماءِ حقانی تھے۔ آپ منطق اور فلسفہ کے بغیر تمام درسی کتابوں کا درس دیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۱۳ھ تک صرف کُتبِ حدیث کا درس دیا ہے۔ آپ کا درسِ حدیث نہایت ہی مُحقّقانہ، مُحدِّثانہ اور فقیہانہ ہوتا تھا اور ہر کتاب کا درس علمِ سلوک کا درس ہوتا تھا۔ عادتِ شریف یہ تھی کہ ماہِ شوال سے ماہِ شعبان کے آخر تک صحاحِ ستّہ کا درس دیتے تھے۔ ماہِ رمضان کو ریاضات اور قرآنِ پاک کی تلاوت کے لئے خالی رکھتے تھے۔ لیکن ۱۳۱۳ھ کے بعد درس کا مشغلہ بالکل ترک

فرما دیا تھا اور پھر آخر عمر تک صرف افاداتِ باطنیہ اور تربیتِ نفوس کی طرف توجہ فرمائی۔

دارالعلوم دیوبند سے تکمیلِ علوم کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر صحیح الخیال سند یافتہ ضروری سمجھتا تھا کہ وہ قصبۂ گنگوہ میں جا کر سال چھ ماہ یا جس قدر بھی وقت میسّر ہو جائے، حضرت گنگوہیؒ کی تربیت میں بسر کرے۔ ایسے طالبین کو حضرت گنگوہی سلسلہ ہائے قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں کسی نہ کسی سلسلہ میں بیعت بھی کر لیتے تھے۔ اور در اثناءِ تربیت تفسیر یا حدیث یا علی الاقل فقہ کی کسی کتاب کے درس میں بھی شامل رکھتے تھے۔ کچھ وقت کے بعد طالب کو اس کی استعداد کے مطابق مستقبل کے بارے میں نصیحت فرما کر رخصت کر دیتے تھے۔

سلوک میں شاہ صاحبؒ کا قدم راسخ

حضرت مولینا انور شاہ صاحبؒ نے بھی جب ۱۳۱۴ھ میں دورۂ حدیث مکمّل کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تو حسبِ دستور آپ بھی گنگوہ چلے گئے۔ اور وہاں حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں فیضیاب ہونا شروع کیا۔ یہ کہنا ہمارے لئے وثوق کے ساتھ مشکل ہے کہ شاہ صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ سے کوئی کتاب وہاں پڑھی ہے یا آپ نے شاہ صاحبؒ کے علمی استعداد کو دیکھ کر ہی آپ کو روایتِ حدیث کی اجازت دی۔ البتہ یہ امر مسلّمہ ہے کہ سندِ حدیث عطا فرمانے کے علاوہ حضرت گنگوہیؒ نے آپ کو تصوّف کے ایک مشہور سلسلہ "سلسلۂ چشتیہ" میں بیعت کر کے رخصت کر دیا۔ سلسلۂ سہروردیہ کرمانیہ

کے اذکار و اوراد کا وِرد زمانۂ طفولیت سے ہی حضرت شاہ صاحبؒ کے وظائف میں شامل تھا، ہوش سنبھالتے ہی آپ نے اپنے والدِ بزرگوار کو جن اذکار و اوراد میں مصروف پایا تھا وہ آپ نے بھی اختیار کر لئے تھے۔ لیکن باقاعدہ بیعت انابت کا تعلّق آپ نے حضرت گنگوہیؒ سے ہی مربُوط کیا اور بعد ازاں ہمیشہ اُن ہی کے تلقین کردہ اشغال پر کاربند رہے۔ دہلی اور کشمیر کے قیامِ طویل کے دوران آپ نے سلوک میں محنت و ریاضت کی بہت سی منازل طے کیں۔ خاص کر کشمیر میں قیام (۱۳۲۰ھ ۔ ۱۳۲۷ھ) کے زمانہ میں اعمالِ باطنی اور زہد و تقویٰ میں آپ کے قدمِ راسخ کی وجہ سے کئی موقعوں پر آپ سے بے ارادہ کرامات کا ظہور ہوتا رہا۔ یہی سبب تھا کہ کشمیر کے عوام جو آپ کے علوم کی وُسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنے سے قاصر تھے، آپ کو صرف ولیٔ کامل سمجھ کر آپ پر فدا ہونا چاہتے تھے، مگر آپ نے چونکہ اشاعتِ علم اور تبلیغ دین کو نصبُ العین بنا رکھا تھا، اس لئے "پیری مُریدی" قسم کے اس تعلّق کی آپ ہمّت شکنی کرتے تھے۔

آپ کے علم اور آپ کی تدریس و تعلیم میں جن برکات کا ظہور رہا اس کو اگر آپ کی سالکانہ ریاضتوں کا ثمرہ قرار دیا جائے تو بعید از حقیقت نہ ہوگا۔

حضرت گنگوہیؒ نے شاہ صاحبؒ کی مُرشدانہ صلاحیت کا اندازہ کرنے کے بعد آپ کو دوسروں سے بیعتِ انابت لینے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اور حضرت شیخ الہندؒ نے بھی جس وقت آپ کو اپنا جانشین بنا کر سفرِ حجاز کا عزم کیا تو اپنے چند مُسترشد علماء (جو حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت

ہو کر سلوک کی منازل طے کر رہے تھے) کو تربیت و سلوک کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے سپرد کیا تھا۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ ارشد حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدّ ظلّہٗ، تحریر فرماتے ہیں کہ:

"(حضرت شاہ صاحبؒ کے) درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بیعت بھی فرما لیتے تھے۔ اپنے اکابر سے سُنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرّہٗ کی طرف سے مجازِ بیعت بھی تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ آپ سے بیعت تھے۔ الٰہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمہُ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھے، حضرت ممدوح ہی سے بیعت تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃُ اللہ علیہ کے وِصال کے بعد میں نے اور جناب مولانا مُفتی محمد شفیع صاحب مُفتی اعظمِ پاکستان مُقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجُوع کیا۔ ہمیں طریقِ چشتیہ کے مُطابق اذکار تلقین فرمائے، اور ہم اس میں کھُلی تاثیر و تصرُّف محسوس کرتے تھے۔"[1]

مُرشدِ گنگوہیؒ کے ساتھ شیفتگی

شیخِ یگانہ، محدّثِ کبیر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی علمی و روحانی قدر و منزلت حضرت شاہ صاحبؒ کے دل میں کتنی تھی، اس کا اندازہ اس امر سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ صاحب پوری زندگی کے دَوران اکثر و بیشتر اپنے مواعظِ حسنہ اور درس و تدریس میں بھی حضرت گنگوہیؒ کے ارشاداتِ عالیہ کو بطورِ حُجت پیش فرماتے تھے

---

[1] مولانا محمد منظور نعمانی بحوالہ مکتوب مولانا سیّد احمد رضا بجنوری مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۷۰ء۔

مؤلف انوار الباری مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرتِ علامہ مولینا محمد انور شاہ کشمیری رح فرمایا کرتے تھے کہ امامِ ربانی (حضرت گنگوہی رح) نہ صرف مذہب حنفی کے ماہر تھے بلکہ چاروں مذاہب کے فقیہہ تھے۔ میں نے ان کے سوا کسی کو نہیں دیکھا جو چاروں مذاہب کا ماہر ہو۔" یہ بھی فرماتے تھے کہ "حضرت گنگوہی کو فقیہہ فی النفس کا رتبہ حاصل تھا۔" (مقدمۂ انوار الباری ج ۲ صلہ ۲۳۱)

مولینا محمد منظور نعمانی صاحب کا بیان ہے کہ درس ہی میں کسی سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے ایک بار فرمایا:

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہی رح کے پاس دیکھا۔ اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہند رح) اور حضرت رائے پوری (یعنی شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رح) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولینا اشرف علی صاحب رح کے یہاں جا کر دیکھے۔"

۱۳۴۲ھ میں جب حضرت شاہ صاحب کشمیر تشریف لائے تو شہر سری نگر کے متعدد مقامات پر عامۃ المسلمین کے اجتماعات سے خطاب فرمایا۔ سری نگر کے خانقاہِ نقشبندیہ میں موعظہ کے دوران جب قرأت خلف الامام پر تقریر فرما رہے تھے تو حضرت امام بخاری عطر اللہ مرقدہٗ کے ذکرِ جمیل کے بعد فرمایا:

"حضرت امام بخاری رح نے "جزء القرأت" کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا اکثر حصہ قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر حاوی ہے۔ میرے استاذ الاساتذہ، زبدۃ المحدثین حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی رح نے ایک

رسالہ میں اس کا جواب باصواب لکھا ہے اور مضامینِ رسالہ پر محدثانہ کلام فرمایا ہے۔"

حضرت گنگوہیؒ کی شان میں شاہ صاحبؒ نے ایک عربی قصیدہ بھی رقم فرمایا ہے، جب ۱۳۳۰ھ/۱۹۱۲ء میں علامہ رشید رضا مصری دارالعلوم دیوبند کو دیکھنے کے لئے آئے تو جلسۂ استقبالیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے جو مشہور و معروف تقریر کی اس میں اکابر و بانیانِ دارالعلوم کے تذکرہ کی تقریب سے حضرت گنگوہیؒ کے علمی و روحانی کمالات کے بارے میں لکھا ہوا اپنا یہی قصیدہ پڑھا۔

اہلِ علم حضرت شاہ صاحبؒ کو صرف مولانا محمود الحسنؒ ہی کے علوم کا خازن نہیں سمجھتے بلکہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے کمالات کا بھی وارث یقین کرتے ہیں۔ متعدد شعراءِ کرام نے حضرت شاہ صاحبؒ کی شان میں جو نظمیں اور ان کی وفات پر جو مرثیے لکھے ہیں ان میں حضرت شاہ صاحبؒ کے استاذ اعلیٰ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے اسم گرامی کے ساتھ ساتھ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی طرف بھی تلمیحات ہیں! مثلاً جناب محمد ضیاءُ الرحمٰن ضیاءؔ لکھتے ہیں :

سالکِ قرنِ اولین کا گم شدہ دُرِّ فرید
جانِ محمود الحسن نورِ دلِ احمد رشید

کشمیر کے مشہور فارسی شاعر مرحوم پیر عبدالقادر اثمؔ (ملاریٔ) حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر لکھے ہوئے مرثیہ میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں :

خلقِ محمود حسن داشت آں رُشدِ رشید
یافت زاں قاسم فیضِ نبوی دین تجدید

مدرسۂ امینیہ دہلی اور شاہ صاحبؒ

(ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تک)

گنگوہ سے بجنور

دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل اور گنگوہ جاکر حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ سے مستفید ہونے کے بعد شاہ صاحبؒ نے دیوبند کی طالب علمی کے وقت کے اپنے اولین رفیق اور گہرے دوست مولانا مشیت اللہ صاحب بجنوری (مرحوم) کے اصرار پر بجنور میں کچھ عرصہ قیام فرمایا اور وہاں پوری یکسوئی اور گوشۂ تنہائی کا فائدہ اٹھاکر مرشدِ گنگوہیؒ سے حاصل کردہ فیض باطنی کی عملی مشق کرنے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا مشیت اللہ صاحب موصوف کے پاس ایک عمدہ کتب خانہ تھا جس میں کچھ موروثی اور کچھ ذاتی کوشش سے جمع کردہ کتابیں اچھی خاصی تعداد میں تھیں، اس لئے بجنور میں مطالعہ میں محویت بھی حضرت شاہ صاحب کے لئے وہاں کے قیام کا ایک خاص سبب تھی۔

مولانا امین الدین کی نظرِ انتخاب

اسی اثناء میں شاہ صاحبؒ کے ایک اور ہم درس اور مخلص دوست مولانا امین الدین صاحبؒ نے بعدِ فراغتِ تحصیلِ علم اس خاندار اقدام کا عزم کیا کہ ہندوستان کے دِل شہرِ دہلی میں دینی

وعربی علوم کی تعلیم وتدریس کے لئے دیوبند کے طرز پر ایک موزون دانشگاہ کا قیام عمل میں لایا جائے. سب سے پہلے اس کام میں رفاقت کے لئے مولانا امین الدین صاحب کی نظر حضرت شاہ صاحبؒ پر پڑی اور آپ نے طے کیا کہ شاہ صاحب کو بھی اس مہم میں اپنے ساتھ شامل کرکے تدریس کی ذمہ داری ان پر ڈال دی جائے اور خود انتظام و اہتمام کا کام سرانجام دیں.

یہ ارادہ لیکر مولانا امین صاحب موصوف شاہ صاحب کو تلاش کرتے ہوئے بجنور جا پہنچے اور اپنی سکیم کے ہر پہلو پر بحث ومباحثہ کرنے کے بعد شاہ صاحب کو اپنے ارادہ کے ساتھ متفق کرکے دہلی لے گئے۔

بجنور سے دہلی اور مدرسۂ امینیہ کی بنیاد

چنانچہ مولانا امین صاحب اور شاہ صاحب کے متوکلانہ عزم بالجزم اور دہلی کے چند نیک دل علم دوست ہستیوں کے تعاون سے دہلی کے چاندنی چوک بازار کی سنہری مسجد میں ماہِ ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ کا قیام عمل میں آگیا۔ یہ وہی مدرسہ ہے جو آگے چل کر "مدرسۂ امینیہ" کے نام سے موسوم ہوا اور جس کو مولانا امین الدین صاحب مرحوم کی وفات کے وقت سے اپنی حیات کے آخری لمحات (۱۳۷۲ھ) تک ہند کے مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ صاحبؒ سنہری مسجد سے منتقل کرکے دہلی کے کشمیری گیٹ کے باہر مدرسۂ امینیہ کے نام سے چلاتے رہے۔ (اور خدا کے فضل سے آج بھی یہ دینی مدرسہ اچھے ڈھنگ اور بڑے پیمانہ پر چالو ہے.)

بہر کیف ۱۳۱۵ھ میں جب اس مدرسے کا افتتاح ہوا تو سب سے پہلے

شہر سے ہی چند طلباء کو جمع کر کے سنہری مسجد میں تعلیم کا آغاز کیا گیا۔

مولینا محمد ادریس سکھروڑوی کا بیان

حضرت شاہ صاحب رح کے ایک مشہور و معروف شاگرد اور خادمِ خاص مولینا محمد ادریس صاحب سکھروڑوی کی روایت ہے کہ خود حضرت شاہ صاحب رح کو اس بات کا اطمینان نہ تھا کہ مولینا امین الدین صاحب کی یہ کوشش جسقدر کامیاب ثابت ہوئی واقعی اتنی کامیاب ہو جائیگی۔ مولینا ادریس صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے:۔

"جب مولینا امین الدین صاحب مجھے لینے کے لئے بجنور پہنچ گئے تو چونکہ زمانۂ قیام دار العلوم میں مولینا امین الدین صاحب بہت اخلاص اور محبت سے پیش آتے رہے تھے۔ تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو، میں مولوی صاحب کے ساتھ ہو لیا اور دہلی پہنچ کر سولہ سترہ[1] روپے جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولینا کے حوالہ کر دئے۔ یہی روپے مدرسہ کا سب سے پہلا مالی سرمایہ تھا۔ چنانچہ مولینا امین الدین صاحب رح نے اس رقم ہی سے کاغذ لا کر مدرسہ کے لئے رجسٹر بنائے اور طلبہ کو داخل کرنا شروع کر دیا۔ مولینا کا توکل خدا کے فضل سے کامیاب رہا اور کسی انتظار کے بغیر طلبہ کا اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابل اطمینان ہو گئی"[1]

بہر حال حضرت شاہ صاحب ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک مدرسۂ امینیہ میں بحیثیت صدر مدرس بلا تنخواہ کام کرتے رہے[2]۔ البتہ ایسا معلوم ہوتا

---

[1] حیاتِ انور صفحہ ۲۷۵ و صفحہ ۲۴۵ ÷ [2] مولینا محمد میاں صاحب دیوبندی مرحوم کا بیان ہے کہ اس دوران حضرت شاہ صاحب کے کھانے کا انتظام مدرسہ ہی کی طرف تھا اور نقد[1]

ہے کہ ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۱۸ھ تک تین چار سال کی مدت میں جب مدرسہ کی مالی حالت کسی حد تک سُدھر گئی تو مدرسین کو حق الخدمت دینا ضروری سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب نے بھی اقل قلیل وجہ کفاف قبول کرنا مان لیا جس پر ۱۳۱۹ھ میں مبلغ بیس۲۰ روپے ماہوار مشاہرہ مقرر ہُوا۔

حضرت رائے پوری کا بیان	مشہور شیخ وقت حضرت مولٰینا عبدالقادر رائے پوریؒ کا بیان

ہے کہ "میں جن ایام میں حضرت شاہ صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں مدرسۂ امینیہ میں پڑھتا تھا، حضرت شاہ صاحب ڈیڑھ پیسہ کی روٹی منگا کر کھایا کرتے تھے۔ (اور اس برائے نام خوراک پر) سارا دِن درس متعدد علوم و فنون کا دیتے تھے، شدتِ گرما (جون اور جولائی کے مہینے) میں دوپہر کے وقت بھی آپ کتب بینی میں مصروف رہتے جبکہ ہر شخص دوپہر کی نیند کے مزے لیتا تھا۔ اور موسمِ سرما میں دیکھا گیا کہ آپ نمازِ عشاء سے صبح صادق تک مطالعہ فرما رہے ہیں اور اوپر کی رضائی جو لپیٹ رکھی تھی، کِھسک کر کہیں سے کہیں جا پڑی ہے اور آپ

(متعلق صفحہ گذشتہ) "تنخواہ تین۳ روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی"۔ (حیات انور ص۲۷۵)

مگر یہ تنخواہ کا لفظ حضرت میاں صاحب مرحوم نے رواجاً استعمال کیا ہے ورنہ بہ حقیقت ظاہر ہے کہ یہ وہ تین روپے ہیں جو شاہ صاحب مہینہ بھر میں اپنی خورد و نوش اور لباس کی مرمت و شست شو پر خرچ کرتے تھے۔ چنانچہ مدرسۂ مذکور کے اس زمانہ کے قبضُ الوصول کے رجسٹر اور روئیداد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں بھی شاہ صاحب کے لئے تعینِ تنخواہ کا ذکر تک نہیں بلکہ "بلا تعین" کا لفظ درج ہے۔

کو مطالعہ میں محویت کی وجہ سے اس کا احساس بھی نہیں۔ رہا مغرب کی نماز سے عشاء تک کا وقت تو یہ ذکر و مراقبہ میں مشغول رہنے کے لئے مخصوص تھا۔" (حیاتِ انور صـ۳۰۳ صـ۳۰۴ مفہوم)

حضرت رائے پوریؒ کا یہ مختصر بیان مدرسہ امینیہ دہلی کے پنج سالہ دور میں شاہ صاحب کی مصروفیات، مشاغل و عادات اور زہد و تقویٰ وغیرہ زندگی کے تمام گوشوں پر ایک مفصّل و مکمّل تبصرہ ہے جو قابلِ داد ہے۔ اس میں آپ کی وہ مکمّل تصویر جھلک رہی ہے جس پر صفحات در صفحات لکھے جا سکتے ہیں۔

مفتی کفایتُ اللہ صاحب کے اعترافات

حضرت علّامہ مولٰینا مفتی محمّد کفایت اللہؒ کا مدرسۂ امینیہ دہلی کو زندہ رکھنے اور اس کو ترقی دینے میں قوم پر ان کا احسانِ عظیم ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے امینیہ کو ترک کر کے کشمیر آجانے اور مولٰینا امینُ الدّین صاحب کے زمانۂ جوانی میں ہی وفات پا جانے کے بعد مفتی صاحب مرحوم اکیلے اس مدرسہ کو چلاتے رہے۔

حضرت مفتی کفایتُ اللہ صاحبؒ نے "روضُ الریاحین" کے نام سے ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے جو عربی فصاحت و بلاغت کا قابلِ قدر آئینہ ہے۔ یہ رسالہ علم و علماء کا ایک اجمالی تذکرہ ہے اور مدرسۂ امینیہ دہلی کی مختصر تاریخ بھی ہے۔ اس کے آخر میں حضرت شیخ الہند مولٰینا محمود الحسن صاحبؒ کی شان میں بھی ایک طویل عربی قصیدہ ملحق ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ نے اپنی عربی نظم میں مدرسۂ امینیہ کے اساتذہ کے مناقب کے دوران حضرت شاہ صاحب کے علم و عمل کو جن الفاظ میں

بیان کیا ہے ان سے کچھ وہی لوگ پورا پورا حظ حاصل کر سکتے ہیں جو عربی زبان کے اسرار سے واقف ہوں۔

مفتی صاحب فرماتے ہیں ؎

ونختم ذا الکلام بذکر حبرٍ فقید المثل علّامٍ فریدٍ

اب ہم ایک بڑے عالم کے ذکر پر کلام ختم کرتے ہیں۔ وہ بے نظیر علامہ یگانۂ زمانہ ہیں۔

مربغ العلم مقتضب الفنون لہ کل المزایا کالمصید

وہ علم کو ڈھونڈ نکالنے والے فنون کو شکار کرنیوالے ہیں۔ تمام فضیلتیں انکے فتراک کا شکار ہیں۔

نبیہ فائق الاقران یُدعی بانور شاہ موموق الحسود

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو۔ انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے، حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فھذا الحبر غارس ذا النخیل واوّل موقظ القوم الرقود

یہی علامہ وہ ہستی ہے جس نے اس باغ (یعنی مدرسۂ امینیہ) کے پودے نصب کئے۔ یہی ہیں جو سوتی قوم کو نیند سے جگانے والوں کے پیش رو ہیں۔

امینیہ اور شاہ صاحبؒ

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے اسی رسالہ کے ص۸ پر اپنے اشعار کی وضاحت حاشیہ کی شکل میں کی ہے، جس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مدرسۂ امینیہ کے مُدرّس کی حیثیت سے حضرت شاہ صاحبؒ نے جناب مفتی صاحبؒ جیسے فاضل معاصرین کے ذہن پر جو اثر مرتب کیا تھا وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند تھا۔ بہرکیف اس حاشیہ میں مفتی صاحب یوں رقمطراز ہیں:-

"علامہ فہامہ جناب مولانا مولوی محمد انور شاہ صاحب ساکن کشمیر بے نظیر شخص ہیں۔ ذہن و ذکاء، ورع و تقوی میں مردِ کامل، مدرسۂ ہذا میں

ابتدائے مدرس اوّل تھے، بلکہ آئندہ اشعار میں ذکر کیا گیا ہے کہ اس شجر علم کے لگانے والے آپ ہیں، کیونکہ مولینا محمد امین صاحب جب دہلی تشریف لائے اور مدرسہ قائم کرنیکا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے پاس نہ سامان تھا، نہ روپیہ۔ آپنے محض متوکلاً علی اللہ سنہری مسجد میں پڑھانا شروع کیا، مولینا محمد انور شاہ صاحب آپ کے شریک تھے، دونوں صاحبوں نے طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھائیں فاقے کئے، مگر استقلال کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ آہستہ آہستہ اہلِ دہلی کو خبر ہوئی اور لوگ متوجہ ہونے لگے۔ یہاں تک کہ مدرسہ اس حالت کو پہنچا جو آپ کی نظر کے سامنے ہے۔ غرض یہ کہ ابتدائی زمانہ کی کس مپرسی کی حالت میں مولینا مولوی محمد انور شاہ صاحب اس مدرسہ کے اعلیٰ و اوّل محسن ہیں، ان کا شکریہ ادا کرنا اور ہمیشہ ان کو یاد رکھنا اہلِ مدرسہ پر فرض ہے۔ مولینا نے ایک عرصہ تک مدرسۂ ہٰذا میں درس دیا اور طلبہ کو مستفید فرمایا۔ پھر والدین سلّمہما اللہ تعالیٰ کے تقاضے اور اصرار سے وطن تشریف لے گئے۔ ۱۳۲۳ھ میں حج کو تشریف لے گئے۔ واپسی پر دہلی میں دو ماہ قیام فرمایا اور اب بھی وطن میں تشریف رکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ مولینا کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے بے نظیر علمی کمال سے لوگوں کو فایدہ پہونچائے۔"

مدرسۂ امینیہ میں شاہ صاحبؒ کا درس

نقل ہے کہ جب حضرت شاہ صاحب مدرسۂ امینیہ دہلی میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے اور وہاں شرح چغمنی اور صدرا پڑھاتے تھے تو یہ دنیائے درس و تدریس میں ایک انقلاب تھا۔ اس خاص وقت میں دہلی کے تمام عربی مدارس بند ہوتے تھے اور قدردان طلبہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں شامل ہو کر

مُستفید ہوتے تھے۔

دہلی سے لولاب

بہر صورت مدرسۂ امینیہ کے قائم ہونے کے وقت سے لیکر ۸ ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ تک کچھ ایک ماہ کم پانچ سال مسلسل اس درسگاہ میں حضرت شاہ صاحب نے بحیثیت صدرُ المدرسین فرائض انجام دئے۔ اس اثناء میں مدرسہ دِن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کے مدارج طے کرتا گیا۔ اگرچہ شاہ صاحب کے حسّاس دل میں یہ تمنّا کروٹیں لیتی رہتی تھی کہ آپ اپنی تعلیمی خدمات کے لئے دہلی کے بدلے کشمیر کو میدان بنائیں لیکن موافق حالات کے فقدان کی وجہ سے یہ ارادہ ٹلتا جاتا تھا۔ اسی اثنا میں یہ حادثہ پیش آیا کہ ماہ ربیع الاوّل ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۲ء میں ان کے بڑے بھائی، مولوی یٰسین شاہ صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا اور آپ کے غم زدہ پدر بزرگوار مولانا معظم صاحب نے حادثہ کی اطلاع کے علاوہ آپ کو تاکیداً گھر آجانے کو لکھا تاکہ والدین ایک جوان بیٹے کے غم کو دوسرے قابل بیٹے کی ملاقات سے دور کر سکیں۔ بہرکیف اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے حضرت شاہ صاحبؒ کو دہلی کے مدرسۂ امینیہ کو چھوڑ کر وطن واپس آنا پڑا، یہ ممکن ہے کہ جب آپ دہلی سے کشمیر کے لئے روانہ ہوئے ہوں تو آپ کو مدرسۂ امینیہ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے کا ارادہ نہ ہو۔ لیکن جب آپ کشمیر آگئے، تو غمگین والدین نے آپ کو کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی۔ مزید برآں خود آپ بھی اہلِ کشمیر کے سامنے معارف کی شمع روشن کرنے کے مُدت سے آرزومند تھے۔ اس لئے چار و ناچار آٹھ سال کا زمانہ وطن میں ہی گذارنا پڑا جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔ (اِن شاء اللہ تعالیٰ وبہ نستعین)

وطن میں قیام کے تین سال

(سنہ ۱۳۲۰ھ تا سنہ ۱۳۲۳ھ)

یوں تو ۱۳۲۰ھ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی کشمیر اور اپنے گھر کو واپسی کا بڑا سبب اپنے برادرِ اکبر پیر یٰسین شاہ کی وفات پر غمگین والدین کی دلجوئی کرنا تھا لیکن جب آپ نے واپس آکر ایک دردمند مُبصر اور رہنما کی نظر سے اپنے وطن اور اہل وطن کی خستہ حالی کو دیکھا تو دہلی یا دیوبند جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور کشمیر میں ہی رہ کر دین اسلام کی تعلیم اور عوام کو بیدار کر کے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ چونکہ آپ دہلی اور یو۔پی میں قوم کی بیداری کے لئے جدید مدرسے قایم کرنے کی تحریک اور اس کے مقاصد کو نہ صرف دیکھ کر آئے تھے بلکہ مدرسہ امینیہ دہلی (جو اسی تحریک کا ایک قدم تھا) کے بنانے میں عملاً حصہ بھی لے چکے تھے اور ۱۳۱۵ھ سے سنہ ۱۳۲۰ھ تک اس میں تعلیم دیکر اس راستہ میں قربانی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک تعلیم کا تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے کشمیر میں بھی قومی بیداری کا ذریعہ آپ کی نظروں میں یہی ہو سکتا تھا کہ دیوبند کے دارالعلوم، سہارنپور کے مظاہر العلوم اور دہلی کے امینیہ کی طرز کا ایک مدرسہ کشمیر میں بھی قایم کیا جائے۔ مگر اُس وقت وادی کشمیر کے عوام انتہائی گہری نیند میں بے خبر اور غافل پڑے سو رہے تھے، غلامی اور محکومیت کے طویل

مصائب نے ان کے اعصاب کو شل کر ڈالا تھا۔ وہ اپنی اس محکومیت پر قانع تھے اور اس کے دائرہ سے باہر جھانک کر دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ رہے خواص تو وہ ایک طرف حاکم وقت کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے میں مصروف تھے اور دوسری طرف آپسی رقابت اور مخاصمت کو حاصل زندگی سمجھ کر ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کی فکر میں شب و روز سرگرداں رہتے تھے۔ ایسے لوگوں کو دیوبند کے طرز پر مدرسہ قائم کر کے اس کو بیداری عامہ اور اس کے سایہ میں انقلابِ حالات کی جدوجہد کا فلسفہ سمجھانا بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔

ایک تلخ تجربہ حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادہ تو مدرسہ قائم کر کے اشاعت تعلیم کے ذریعہ عوام کو بیدار کرنا تھا مگر جب آپ نے اندازہ کیا کہ مدرسہ کے قیام کے لئے جو سازگار ماحول مطلوب ہے، اس کا فقدان ہے تو آپ نے ماحول کو سازگار بنانے کی غرض سے وادی میں وعظ و تلقین اور تبلیغ و تذکیر کا سلسلہ شروع کیا اور اس کام کی ابتدائی اپنے ہی علاقہ لولاب اور علاقہ کامراج سے کی۔ زیادہ تر دیہاتی بستیوں میں اور کبھی کبھی سوپور اور بارہ مولہ کے قصباتی لوگوں میں وعظ و ارشاد کی یہ مہم چلتی رہی۔

آپ کی ذات اور شخصیت اس قدر پُرکشش تھی کہ بہت جلد آپ کو قبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی۔ جہاں کہیں آپ وعظ و تبلیغ کرنے جاتے عوام اپنے کام کاج چھوڑ کر جمع ہو جاتے اور اتنے بڑے اجتماعات ہوتے کہ سب لوگوں تک اپنی آواز پہنچانا شاہ صاحب کے لئے مشکل ہو جاتا۔ کچھ مدت تک شاہ صاحب ہجوم خلائق کو پُر امید نظروں سے دیکھتے رہے اور اشاعت تعلیم و قیامِ مدرسہ کے اپنے اصل مقصد کے حق میں اسے مفید اور فالِ نیک

سمجھتے رہے۔ لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ آپ پر یہ عجیب انکشاف ہوا کہ آپ کے رہنمایانہ ارشادات کی جو چیز روح ہے اس تک ان اجتماعات کے شرکاء کی نہ رسائی ہے اور نہ اس سے ان کو کوئی دلچسپی ہے اور آپ کی زبان سے نکلے ہوئے دینی مسائل و نصیحت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو وہ محض رسماً ہی سُن لیتے ہیں۔ ان کو اگر دلچسپی ہے تو صرف اس بات سے کہ وہ آپ کو ولی کامل اور مجموعۂ کرامات سمجھتے ہوئے آپ کی ذات سے برکت حاصل کریں اور قریب سے دیدار کر لیں اور آپ سے اپنی روزمرہ کی مشکلات کے حل کے لئے تعویذ حاصل کریں اور چونکہ آپ تعویذ لکھنے سے شدت کے ساتھ انکار کرتے تھے لہٰذا آپ سے اپنے لئے دُعا کی درخواست کرنا ان لوگوں کا منتہائے مقصود تھا جس کو لیکر بعض اوقات یہ لوگ بہت دور سے لمبی مسافتیں طے کر کے اور پیدل چلکر شاہ صاحب کی مجلسوں میں شریک ہونے کو پہنچتے تھے۔

مایوس کن صورتِ حال

تین سال تک شاہ صاحب نے وعظ و نصیحت کی یہ مہم جاری رکھی اور ان لوگوں کو یہ سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے کہ آپ کا مقصد کشمیر کی خواب غفلت میں پڑی ہوئی خلقت کو بیدار کرنا ہے اور یہ کہ آپ دینِ اسلام کے ایک معلم اور مبلغ ہیں اور چاہتے ہیں کہ کشمیر کے عوام تعلیم یافتہ ہو جائیں اور بے علمی اور جہالت کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنے دین اور اپنی دُنیا کے مسائل پر غور کریں اور اپنے حقوق اور فرائض کو سمجھیں لیکن اس وعظ و تذکیر کا ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس مدت میں شاہ صاحبؒ کی شہرت گھر گھر پہنچ گئی مگر محض مستجاب الدعوات اور کثیر الکرامات ولی کی حیثیت میں نہ کہ علمی و عملی

انقلاب کے داعی کی حیثیت میں۔

پیری مریدی کی دُکان چمکانا مقصود ہوتا تو یہ عوامی مقبولیت بہت بڑی چیز تھی لیکن اس قسم کے لاحاصل رجوعِ خلق سے شاہ صاحب فطرۃً سخت متنفر اور بیزار تھے اور اس قسم کی مقبولیت کو آپ "تحسین ناشناس" قرار دیتے تھے اور اپنے مقاصد کے راستے میں رکاوٹ یقین کرتے تھے، اسلئے تین سال کی جدوجہد کا نتیجہ جب حسبِ آرزو نہ نکلا تو آپ اہلِ کشمیر سے مایوس ہو کر ترکِ وطن پر تیار ہو گئے۔

سفرِ حج اور اس کے محرکات

(۱۳۲۳ھ)

جب کشمیر میں قیامِ مدرسہ کا ارادہ کامیاب نہ ہو سکا تو اب آپ کے سامنے سوال یہ تھا کہ کشمیر سے ہجرت کر کے کہاں جائیں؟ اور اپنی زندگی کا مقصد جب تعلیم و تدریس کو قرار دے دیا ہے تو اپنے ارادوں کو عملی شکل دینے کے لئے میدان کہاں تلاش کریں؟ اس سوال پر غور کرتے کرتے آپ کو خیال آیا کہ آپ حجازِ مقدس چلے جائیں۔ حجاز کی طرف ہجرت کر جانے کا خیال آپ کو جب آیا ہو گا تو یقیناً آپ کے سامنے اس وقت بڑے بڑے بزرگانِ دین کا اُسوہ بھی رہا ہو گا۔ جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اور تدریس و تعلیم سے خدمتِ اسلام کرتے رہے۔ پھر ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور وہاں اپنے علم و عرفان کے خزانے تقسیم کرنے کے بعد دیارِ محبوب میں ہی محوِ خواب ہو گئے۔

مثلاً حضرت مولینا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی، حضرت مولینا شاہ محمد یعقوب، حضرت مولینا شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی اور اپنے پیر طریقت حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی کے مُربّی و مُرشد حضرت شاہ امداد اللہ (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) - آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ جس طرح ان حضرات علماء نے ہندوستان سے ہجرت کر کے حرمین میں مقیم ہو کر خود بھی فیض و برکات حاصل کئے اور دوسروں کو بھی فیض پہنچائے، اسی طرح میں بھی کشمیر سے ہجرت کر کے اپنی زندگی کو اپنے وطن کے تعویذ پرستوں سے بچا کر مکّہ مکرّمہ اور مدینہ منوّرہ میں کسی بڑے مقصد پر صَرف کر دوں اور حیاتِ مُستعار ختم کرنے کے بعد وہاں ہی پیوندِ خاک ہو جاؤں۔

رُفقاءِ سفرِ حج

یہ تھا وہ تصوّر جس نے آپ کو حج بیت اللہ کی تیاری پر آمادہ کیا، چنانچہ ۱۳۲۳ھ کے ذی الحجہ میں واقعہ ہونے والے ایامِ حج میں ادائے فریضہ کی نیت کر کے آپ زادِ سفر کی فکر میں لگ گئے۔ اس زمانہ میں زادِ سفرِ حج کے طور سے بہت تھوڑی رقم کافی ہو جاتی تھی جو غالبًا مولینا معظم شاہ صاحب کی توجہ سے آپ کو مہیا ہو گئی۔ اب آمادۂ سفر ہو جانے کے بعد "الرفیق قبل الطریق" کے مطابق رُفقاءِ سفر کی فکر کرنا قدرتی امر تھا۔ قیامِ وطن کے تین سال کے عرصہ میں قصبۂ بارہ مولہ کے ایک رئیس خواجہ عبدالصمد ککرو نہ صرف حضرت شاہ صاحب کے مدّاحوں میں شمار ہوتے تھے بلکہ آپ کے مُحبّین و معتقدین کی صفِ اوّل میں شامل ہو چکے تھے۔ جب خواجہ صاحب موصوف کو حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادۂ سفرِ حج معلوم ہوا تو آپ نے بھی حج کا ارادہ کر لیا تاکہ ان کے مناسکِ حج حضرت شاہ صاحبؒ کی معیت میں ادا ہوں۔ اس

طرح آپ کو رفاقتِ سفر کے لئے ایک یارِ شاطر میسر آ گیا۔ اور جب شاہ صاحبؒ اور خواجہ صاحب کے حج پر روانہ ہونے کا چرچا ہوا تو خواجہ صاحب کے چند دوسرے دوست احباب بھی آمادہ حج ہو گئے۔ جن میں سے ایک ضلع ہزارہ میں واقعہ جاگیر گڈھی حبیب اللہ کے نواب کے وزیر سید مردان علی شاہ بھی تھے۔ جو حضرت شاہ صاحبؒ کے قدردانوں میں شمار ہوتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ، خواجہ عبد الصمد ککرو اور سید مردان علی شاہ کے علاوہ اس قافلہ میں مزید چھ کس رفقائے سفر تھے جن کے ناموں کا پتہ نہیں چل سکا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اگرچہ اپنے لئے سفر حج کا انتظام اپنے طور پر کر رکھا تھا لیکن خواجہ عبد الصمد ککرو نے اصرار کیا کہ وہ اس قافلہ کے نو ارکان کے اخراجات خود برداشت کریں گے اور شاہ صاحب نے اس کو مان لیا تاکہ ان کے دوست کے جذبۂ فیاضی کو ٹھیس نہ لگے۔

حجاز سے واپس آجانیکا فیصلہ بدورانِ سفرِ حج خواجہ عبد الصمد ککرو کو باتوں باتوں میں یہ پتہ چلا کہ حضرت شاہ صاحب کشمیر کے عوام کی عدم بیداری سے مایوس ہو کر ہمیشہ کے لئے حجاز میں مقیم ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو آپ کو یہ بات سخت گراں گزری اور سوچنے لگے کہ اس دورِ ظلمت میں یہ ایک شمع ہے جو کشمیر میں مستقبل کی امیدوں کو روشن کر رہی ہے۔ اگر یہ بھی ہم سے دور ہو جائے تو کشمیر میں بجز تاریکی کے اور کیا رہ جائے گا۔ یہ سوچ کر خواجہ صاحب نے حضرت شاہ صاحب کو ہجرت کے ارادہ سے باز رکھنے میں اپنی ساری منطق اور قوتِ بیان صرف کر دی اور بار بار کی طویل گفتگو کے بعد جب خواجہ صاحب نے کشمیر میں ایک دار العلوم قایم کرنے میں شاہ

صاحب کو مکمل تعاون دینے کا وعدہ کیا تو شاہ صاحب نے ترکِ کشمیر کا اپنا فیصلہ منسوخ کر دیا اور مراجعتِ وطن پر آمادہ ہو گئے اور ۱۳۲۴ھ میں سفرِ حج سے واپس آکر دہلی و دیوبند سے ہوتے ہوئے کشمیر پہنچ گئے۔

حرمین میں آپ کے علم کا اعتراف

سفرِ حجاز میں طرابلس، بصرہ، مصر، شام اور دوسرے کئی مقامات سے آئے ہوئے جلیل القدر حضرات علماء نے حضرت شاہ صاحبؒ کی بہت عزت کی اور سب نے آپ کی خداداد اور بے نظیر لیاقت اور علمی استعداد دیکھ کر تبرکاً و اعزازاً سنداتِ حدیث عطا فرمائیں۔ یہ اعتراف فضیلتِ علمی کا ایک طریقہ تھا جو عالمِ اسلام میں مُروّج تھا۔ ان سندات میں آپ کا نامِ نامی اکثر مقامات پر "الفاضل الشیخ محمد انور شاہ بن مولینا محمد معظم شاہ الکشمیری" وغیرہ القاب کے ساتھ لکھا گیا تھا۔

مدینۂ منورہ میں قیام کے دَوران اپنے ذاتی ارادے سے جن بزرگ سے آپ نے علمِ حدیث میں استفادہ کیا ہے وہ محدثِ کبیر حضرت شیخ حسین طرابلسیؒ تھے۔ جن سے آپ کو حدیث کی باقاعدہ اجازت بھی حاصل تھی۔

شاہ صاحب نے مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ میں کافی دن قیام فرمانے کے دَوران روحانی فیوض و برکات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں کے علمی کتب خانوں سے کامل استفادہ بھی کیا۔ اور ایک عرصہ تک آپ وہاں کے نوادراتِ علمی کا مطالعہ کرتے رہے۔

روضۂ اطہر کے سامنے اشکباری

مدینۂ پاک میں جب یکم محرم الحرام ۱۳۲۴ھ کو آپ روضۂ اطہر نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف تحیات مبارکۃ طیبۃ) پر عرضِ سلام کے لئے

حاضر ہوئے تو سوچا کہ آج تک دربارِ محمدی میں فصحاءِ عرب و عجم نے فصیح و بلیغ زبانوں میں عقیدت کے نذرانے پیش کئے۔ میں کس زبان میں سلام عرض کروں؛ چونکہ آپ کو عربی اور فارسی زبان پر یکساں قدرت حاصل تھی اس لئے یکایک نطق انور سے ایسی نعت جاری ہوئی جس کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا عربی ہے۔ تبرکاً چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں:-

"اے صبا حالم رساں نزدِ رسولؐ — اذ ما آلی نحو مولای قد یلول
گرچہ از تر دامنی خستم ولے — علی ان اہ اوی اذا هبت قبول
چوں گدا ہستم نہ راند از درم — انہ لا ینہر الوجہ سئول
چوں رسیدی انورؔ سا ابرِ کوئے او
انک الآتی بخیر فی القفولؐ"

د

لہ بحوالہ دار العلوم دیوبند اپریل ۱۹۷۴ء

مدرسۂ فیض عام کے قیام کا پس منظر

مدرسۂ فیض عام قائم کرنے کے فوری محرکات کی طرف کچھ اشارات سابق سطور میں آ چکے ہیں۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ جس زمانہ کے یہ واقعات ہیں وہ مسلمانانِ ہند کے حق میں انتہائی ابتلاء اور آزمائش کا دور تھا جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے رہنمایانِ وقت بلا امتیازاتِ طرزِ فکر تعلیم دین اور مروّجہ تعلیم پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر رہے تھے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے حساس دل پر اس تحریک کا اثر گہرا تھا اور یہ اثر کسی وقتی حادثہ کا نہیں بلکہ حالات کا کئی برسوں تک مسلسل اور ہر پہلو سے مطالعہ اور غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنے وطن سے باہر اپنی تعلیم کی تکمیل ہزارہ کی درسگاہوں اور دار العلوم دیوبند سے کی تھی۔

دار العلوم دیوبند اور ہزارہ کی یہ درس گاہیں ہند میں انیسویں صدی عیسوی (تیرہویں صدی ہجری) میں پیش آمدہ شدید قسم کی قومی شکستوں اور ناکامیوں کے تباہ کن اثرات سے بچا کر از سرِ نو جہد للبقا کے میدان میں مسلمانانِ ہند کو صف آراء کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں۔

حادثۂ بالاکوٹ ۶؍ مئی ۱۸۳۱ء کو ضلع ہزارہ کے ایک شمالی مقام بالاکوٹ میں جب حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک جہاد بالسیف کو شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تو اس بات

کا سخت خطرہ محسوس کیا گیا کہ عوام جو کل تک حضرت شہید کی کامیابیوں کے ساتھ روشن مستقبل کی بڑی بڑی امیدیں باندھ رہے تھے اور آپ کو نہ صرف امامِ جہاد تسلیم کرتے تھے بلکہ آپ کے امام مہدی ہونے کے چرچوں سے بھی دلچسپی لیتے تھے کہیں اب مایوسی کے پہاڑ کے نیچے دبکر شکست خوردگی اور مرعوبیت کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس لئے ہزارہ میں ہر طرف دینی درسگاہیں قائم کرکے علم و دانش کے آبِ حیات سے قوم کی رگِ حیات کو سیراب کیا گیا۔

۱۸۵۷ء کی قیامت کبریٰ ۱۲۷۲ھ

حضرت سیدؒ کی شہادت پر ابھی مشکل پچیس (۲۵) یا چھبیس (۲۶) سال گذرنے پائے تھے کہ مسلمانانِ ہند کو ایک دوسری قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے طوفان میں زوال آمادہ مغل راج کو ختم ہونا ہی تھا مگر پوری قوم کو عزت و وقار کی ہر علامت سے ہاتھ دھو لینے پڑے، ہر طرف خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں محبانِ وطن کو سڑکوں کے کنارے پھانسیاں دی گئیں، علماء اور سربرآوردہ لوگوں کو قطاروں میں کھڑے کرکے توپوں سے اڑایا گیا۔ شہر اور بستیاں جاڑ ڈالی گئیں اور پورے ملک پر ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک برطانوی سامراج کا وہ تسلط قائم ہوا جس کو اکھاڑ پھینکنے میں پورے نوے (۹۰) سال کا عرصہ لگا۔

سعیِ نشاۃِ ثانیہ

غرضیکہ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ذرا تھما تو دردمندانِ قوم نے تعلیم کو ہی غلامی کے دردِ لادوا کا علاج قرار دیکر قدم اٹھایا۔ ۱۸۶۷ء (۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ) میں مولینا محمد قاسم نانوتوی

رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے رُفقاء نے پہلے دیوبند میں اور اس کے فوراً بعد سہارنپور میں مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد قیام مدارس نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ مولینا محمد قاسم نانوتوی رح اور اُن کے رُفقاء کے یہ مدارس دینی بنیادوں پر قائم ہو رہے تھے اور ان میں پڑھنے والوں کے ذہن پر ملت کی خستہ حالی کو دور کرنے اور وطن کی از سرِ نو آزادی کا راستہ تلاش کرنے کے ساتھ ساتھ سمندر پار سے آئی ہوئی برٹش حکومت کی نفرت اپنے آپ کندہ ہو جاتی تھی۔

مساعی علیگڑھ دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور اور کئی دوسرے دینی مدارس ملک کے طول و عرض میں قائم ہو جانے کے کئی سال بعد سر سید احمد خان مرحوم (المتوفی ۱۸۹۸ء) کی قیادت میں ایسے لوگ بھی میدان میں نکلے، جن کے نظریۂ ترقی کے لحاظ سے صرف دینی تعلیم تک محدود رہنا مستقبل کی ضرورتوں کے لئے ناکافی تھا۔ اس لئے انہوں نے حکومت وقت کے تجویز کردہ نصاب تعلیم کی بنیاد پر ادارہ ہائے تعلیم قائم کرنے کی وکالت شروع کی۔

سر سید گروپ اور مولینا محمد قاسم نانوتوی گروپ، دونوں کے بنیادی مقصد میں کوئی فرق نہ تھا۔ دونوں یہی چاہتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کو بذریعہ تعلیم اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ ملک کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور وقت کے طوفانوں کا لقمۂ تر بن جانے سے بچ جائیں۔ البتہ طریقِ کار اور ترجیحاتِ عمل میں نمایاں فرق تھا اور نصابِ تعلیم اور طریقۂ تربیت کے بارے میں اختلافات تھے۔ لیکن یہ اختلافات دونوں طرف خلوصِ نیت پر مبنی تھے۔

بہر حال مسلمانانِ ہند میں تعلیم کو عام کرنے کے لئے دو تحریکیں متوازی خطوط پر چلنے لگیں، پہلی تحریک ۱۸۶۷ء میں قیام دار العلوم دیوبند کی شکل میں نمودار ہوئی اور دوسری تحریک کے نتیجہ میں ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم ہوا جس کے نقشِ قدم پر چلکر جابجا اسلامیہ مڈل سکول اور اسلامیہ ہائی سکول بنتے گئے اور اسی دوران پنجاب میں لاہور کا اسلامیہ کالج بھی معرضِ وجود میں آیا۔

کشمیر بھی پیچھے نہ رہا

کئی برس مزید بیت جانے کے بعد جب اشاعتِ تعلیم کا پروپیگنڈا ملک کے کونے کونے کو متاثر کر چکا تو یہ لہر کشمیر کے پہاڑوں سے بھی ٹکرائی اور سرینگر میں ایک حسّاس دل کی مالک ہستی حضرت مولٰنا میرواعظ رسول شاہ صاحبؒ (المتوفی رجب ۱۳۲۷ھ) کی مساعی جمیلہ سے ۱۳۱۷ھ میں انجمن نصرۃ الاسلام قائم ہوئی، جس کے ذریعہ پہلے اسلامیہ پرائمری سکول پھر مڈل سکول اور ۱۳۲۵ھ میں اسلامیہ ہائی سکول اور بعد ازاں اورینٹل کالج جیسے مدرسے قائم ہوئے۔ (الحمدللہ یہ اپنے بانیوں کے خلوصِ نیت کی برکت سے کسی نہ کسی شکل میں آج تک زندہ ہیں۔)

حالاتِ زمانہ کا تقاضا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہزارہ، دیوبند اور یو.پی وغیرہ علاقوں کی جن فضاؤں میں حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی ان میں تعلیم کا فلسفہ یہی تھا کہ قوم کو انیسویں صدی کے حادثات سے جو مصائب پیش آئے ہیں ان کا علاج تعلیم کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور جو کوئی بھی قوم کی خدمت کرنا چاہے اس کا فرض ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق چھوٹا یا بڑا، دینی یا

دُنیاوی مدرسہ قائم کر کے ملّتِ اسلامیہ کے دین اور دُنیا دونوں کو سُدھارے۔ چنانچہ دیوبند سے اپنی تعلیم کی تکمیل اور سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد شاہ صاحب نے جب عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے ہم درس مولانا امین الدّین صاحبؒ المتوفّی ۱۹ رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۹۲۰ء) کی رفاقت میں دہلی کا مدرسۂ امینیہ قائم کیا اور کامیابی کے ساتھ چلایا۔

کشمیر کے حقِ مُقدم کا احساس

حضرت شاہ صاحب جیسی بڑی ہستیاں اپنے فیوض کو علاقائیت اور صوبائیت کے محدود دائروں میں بند نہیں کر سکتیں۔ خدا تعالیٰ کی ساری دُنیا ان لوگوں کا وطن ہوتی ہے اور اس کی ساری مخلوق ان کا کنبہ ہوتا ہے۔ لیکن اپنے زاد بوم اور ابتدائی مقامِ نشو و نما کے ساتھ فطرتی لگاؤ سے کوئی مفر نہیں۔ شاہ صاحب اس لحاظ سے کشمیر اور کشمیریوں کا حقِ مقدم سمجھتے تھے اور تمنا رکھتے تھے کہ اس مظلوم مخلوق کی آنکھوں سے جہالت اور بے علمی کے پردے ہٹا دینے میں اپنا فرض انجام دیں۔ بنا براں دہلی کے زمانۂ قیام میں آپ لازمی طور پر دل ہی دل میں یہ محسوس کرتے رہے ہونگے کہ ان کی جد و جہد کا اصلی میدان کشمیر ہے کیونکہ دہلی جیسے بیدار شہروں میں قوم کی اجتماعی خدمات کا فرض انجام دینے والوں کی قلت نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے مظلوم وطن اور ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ یعنی خطۂ کشمیر کے مظلومین کی فکر کیوں نہ کی جائے۔ لازمی طور پر آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا کہ اگر تعلیم کی اشاعت باقی ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل ہے تو کشمیر جنّت نظیر میں اولادِ آدم کی جو تذلیل اور

انسانیت کی جو پائے مالی ہو رہی ہے اس کا علاج بھی تعلیم ہی کی اکسیر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان تصوّرات نے رفتہ رفتہ اس تجویز کی شکل اختیار کرلی کہ اگر حالات ساز گار ہو جائیں اور موقعہ مل جائے تو خود کشمیر میں ایک اچھا مدرسہ قائم کرکے مسلمانانِ کشمیر کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا جائے اور ان کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرکے ترقی دارین کی شاہراہ پر ڈالنے کا فرض انجام دیا جائے۔

کشمیر میں کام کی مُشکلات

یہ ایک قدرتی امر تھا کہ دار العلوم دیوبند کے درجۂ تکمیل سے امتیازی فراغت کے بعد حضرت شاہ صاحب اپنی علمی خدمات اور فیوض و برکات کا اوّلین مستحق وادیٔ کشمیر کے عوام کو تصوّر کریں جو نہ صرف یہ کہ آپ کا گوشت و پوست تھے بلکہ محکومیت اور غلامی کے شکنجہ میں گرفتار ہونے کی وجہ سے تعلیم کے دینی اور دنیاوی دونوں شعبوں میں ہندوستان کے دوسرے حصّوں کے لوگوں سے زیادہ پسماندہ تھے اور زندگی کے ہر میدان میں اپنی ہمہ گیر پستی کے لحاظ سے بھی شاہ صاحب کی طرح ہر ایک حسّاس دِل رکھنے والے صاحب بصیرت شخص کی ہمدردی اور توجہ کے مستحق تھے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ کشمیر میں کام کس طرح شروع کیا جائے اور کہاں سے کیا جائے؛ کسی سابق موجود درس گاہ سے نئے مقاصد پورے کئے جائیں یا نئے کام کے لئے کوئی نئی درس گاہ قائم کی جائے؛ اس وقت بھی محدود پیمانہ پر کشمیر میں خاصکر سرینگر میں بعض دینی درس گاہیں موجود تھیں جو پُرانے ڈھنگ سے اپنی بساط کے مطابق ایک حد تک کام کر رہی تھیں لیکن وہ آپ کے مُنصوبہ معیار اور زمانہ کے جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مُطابق نہ تھیں۔ اس لئے ان سے کسی انقلابی مقصد

کو پورا کرنے کی اُمید باندھنا ممکن نہ تھا اور ایک موزوں قسم کی جدید درس گاہ کی شکل میں جو تعلیمی ادارہ آپ قائم کرنا چاہتے تھے اس کے لئے اولین ضرورت تھی پختہ کار اور بالغ الذہن رُفقاء کی اور دوسری ضرورت تھی ایثار پیشہ معاونین کی اور تیسری ضرورت تھی ذہین اور حساس دل رکھنے والے طلباء کی، یہ اہم عناصر وادیٔ کشمیر میں تب بھی مفقود تھے اور اب بھی ستّر سال گذرنے کے بعد شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ بقولِ مولینا روم علیہ الرّحمۃ ؎

زین ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست

اس لئے آپ کو دار العلوم سے فارغ التحصیل ہو جانے کے فوراً بعد کشمیر میں اپنا کام شروع کرنے میں بہت کچھ تامّل تھا بالفاظِ دیگر مدرسۂ امینیہ دہلی میں تعلیم دینے کے دوران شاہ صاحب کا وطن میں مدرسہ قائم کرنے کے منصوبے سوچتے رہنا تو فطری امر تھا مگر جب تک اس کے ذرائع مہیّا نہ ہو جائیں ان ارادوں کو عمل میں لانے کی کوئی صورت نہ تھی، اس لئے آپ کئی سال تک "قدم الخروج قبل الولوج" کے مُطابق ارادہ کے باوجود اقدام میں مُتردّد رہے اور غور و خوض کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔

آپ دیکھ رہے تھے کہ کشمیر کے عوام کے احساسِ خودی کو طولِ زمانۂ محکومیت نے کچل ڈالا تھا۔ مطلوبہ معیار کے انقلاب آموز مدارس کے قیام کے لئے قوم کے سربرآوردہ افراد میں جس قسم کی بیداری اور جذبۂ ایثار کی ضرورت ہے، اس کا نام و نشان دور دور تک پایا نہ جاتا تھا۔ اس لئے آپ

اپنے ارادے کو آج سے کل اور کل سے پرسوں پر ملتوی کرتے رہے۔
ناگہاں خاندان میں آپ کے جواں سال بھائی کی وفات کا وہ حادثہ پیش آیا جس کا ذکر سطورِ گذشتہ میں آچکا، اس المناک حادثہ کی اطلاع ملتے ہی آپ کشمیر آگئے اور تعزیت کے لوازمات سے فراغت کے بعد قیامِ مدرسہ کے متعلق اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کے امکانات کا جائزہ لینے لگے۔ (جس کی تشریح اوپر آچکی) تو آپ کو روشنی کی کوئی کرن کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ کچھ مدت تک اپنے وطن میں ہی قیام فرمایا اور اس دوران مقامی طور کچھ وعظ و تبلیغ اور کچھ اپنے خاندانی امور کی انجام دہی میں مصروف رہے۔

کامیابی کی جھلک

سطورِ سابقہ میں اس امر کی تفصیلات آچکیں کہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء سے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۷ء تک حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنا سارا وقت اور ساری توجہ کشمیر میں رہ کر ایک نئے اور نمونے کے لائق دینی تعلیم گاہ قائم کرنے کی کوششوں میں صرف کی اور نامساعد ماحول سے اکتا کر حجاز کی طرف ہجرت کر جانے کا ارادہ بھی کر لیا لیکن بدورانِ سفرِ حج خواجہ عبدالصمد ککرو کی اس یقین دہانی پر یہ ارادہ فسخ کر دیا کہ وہ قیامِ مدرسہ کی مہم میں شاہ صاحب کی معاونت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ اس دوست اور رفیقِ سفر کی ہمدردانہ باتوں سے فطری اقتضا کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی مایوسی از سرِ نو امید میں تبدیل ہو گئی اور آپ نے ترکِ وطن کا ارادہ ترک کر دیا اور آپ کے دل میں مدرسہ قائم کرنے کا داعیہ جو پھر تازہ ہو گیا تھا اس کی تکمیل میں مصروف ہو گئے۔ اور آپ نے یہ بھی طے کیا کہ

مجوزہ مدرسہ وادی کے کسی دوسرے مقام کے بدلے قصبۂ بارہ مولہ میں قائم کیا جائے۔ اب بارہمولہ کو ترجیح دینے کی وجہ بظاہر یہی تھی کہ مدرسہ کے معاونینِ اوّلین خواجہ عبدالصمد مرحوم اور اس قصبہ کے چند دیگر معزّزین تھے، اس کے علاوہ بارہ مولہ چونکہ وادیٔ کشمیر کا وہ دروازہ تھا جہاں سے کشمیر کا تعلّق ہزارہ، پشاور، راولپنڈی، لاہور، امرتسر اور دہلی تک تمام بیرونی علاقوں کے ساتھ قائم ہورہا تھا۔ اس لئے بیداریٔ عامّہ کی غرض سے قائم کی جانے والی درس گاہ کے لئے بارہمولہ کا مقام وادی کے دوسرے سب مقامات سے زیادہ موزون مقام تھا۔

بارہمولہ میں مدرسۂ فیضِ عام کا قیام

(۱۳۲۴ھ)

۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۷ء میں جب شاہ صاحب سفرِ حج سے واپس آئے تو آپ نے لولاب کے بدلے بارہ مولہ میں قیام فرمانا شروع کیا۔ اور بعض مقامی علماء اور قصبۂ بارہ مولہ کے بعض سربرآوردہ تاجروں اور رئیسوں خصوصًا خواجہ عبدالصمد ککرو، خواجہ امیرالدین ککرو اور خواجہ امیر شاہ (تحصیلدار) وغیرہُم کے تعاوُن سے قصبہ میں اسی سال یعنی ۱۳۲۴ھ / ۱۹۰۷ء میں مدرسۂ فیضِ عام کے نام سے ایک دینی ادارہ قائم کیا۔

فیضِ عام کی وجہ تسمیہ ا مدرسے کا نام "فیضِ عام" رکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کے ذہن پر کونسا جذبہ کارفرما تھا، اس کا علم تو سوائے علیمٌ بما فی الصدور کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا! قیاس یہ ہے کہ چونکہ مدرسہ قائم کرنے سے آپ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کشمیر کی محکوم و مظلوم دہشت زدہ آبادی کو غلامانہ خوف زدگی کے اندھیرے سے نکالیں۔ اور چونکہ حریت کی روشنی سے آشنا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے خواص ہی کو نہیں بلکہ ان کے عوام کو دینی تعلیم کے ذریعہ خدا شناسی کے ساتھ ساتھ خودشناسی اور خودداری کا درس دیا جائے اور بفحوائے لِيُخْرِجَهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ، وادی کشمیر کے گاؤں گاؤں اور گھر گھر تک صحیح اور حقیقی علم کی روشنی پھیلادی جائے۔ اس مقصد کی ترجمانی "فیضِ عام" کا جملہ ہی کما حقہٗ کر سکتا تھا۔ اس لئے آپ نے اس نئے پودے کو اس نام سے پکارا۔

وجہ تسمیہ ۲ بارہ مولہ کا مدرسہ فیضِ عام تو ۱۳۲۴ھ میں قائم ہو رہا تھا۔ اس سے کوئی اڑتالیس (۴۸) سال قبل یعنی ۱۲۷۶ھ میں صوبہ یو۔پی کے شہر کانپور میں جہاد ۱۸۵۷ء کے ایک بڑے مجاہد اور ایک بہت بڑے نامور عالم (قبل از ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے منصف اور ہنگامہ کے بعد کے بحیثیت باغی اور مجاہد کالے پانی کے جلائے وطن قیدی) مولانا مفتی عنایت احمد صاحبؒ نے جزیرہ انڈمان سے رہا ہونے کے بعد "فیضِ عام" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا تھا اور خود قیامِ مدرسہ کے دو سال بعد سفرِ حج کے موقعہ پر آپ

جہاز کے غرقاب ہو جانے کی وجہ سے سینکڑوں دیگر حُجاج کے ساتھ شہید ہو گئے مگر مدرسۂ فیضِ عام کانپور اس کے بعد بھی جاری تھا اور جن بزرگوں نے بعد میں لکھنو کا مدرسہ ندوۃُ العُلماء قائم کیا انکی سرگرمیوں کا پہلا مرکز کانپور کا مدرسۂ فیضِ عام ہی تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۱۰ھ میں مدرسۂ فیضِ عام کانپور کے سالانہ جلسہ میں مولینا سیّد محمد علیؒ نے ندوۃ العلماء کی تجویز پیش کی جو آگے چل کر ایک زندہ تحریک بن گئی۔ حضرت مفتی عنایت احمد صاحب کے بعد مدرسۂ فیضِ عام کانپور میں جو لوگ صدرُ المُدرّسین کے عہدے پر فائز ہوتے رہے ان میں حضرت مولینا احمد حسن صاحب، اُستاذُ العُلماء حضرت مولینا لُطف اللہ صاحب علی گڈھی اور حکیمُ الاُمّت حضرت مولینا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی جیسے بزرگ قابلِ ذکر ہیں۔ (مولینا تھانویؒ ۱۳۰۱ھ میں مدرسۂ فیضِ عام کانپور کے صدر مُدرِّس مقرّر ہوئے تھے۔)

اس طرح "فیضِ عام" کے نام کو تعلیم اور حُرّیّت کی تحریکوں سے جو قریبی تعلّق تھا، اس کی تاریخ حضرت شاہ صاحبؒ سے پوشیدہ نہ تھی اس لئے یہ بھی امکان اغلب ہے کہ بارہ مولہ کے مدرسہ کو کانپور کے مدرسہ کا ہمنام بنانے سے شاہ صاحبؒ کی یہ تمنا رہی ہو گی کہ یہ فیضِ عام اپنے پیشرو کی طرح اپنے نام کا حرف بحرف مِصداق بن جائے اور کشمیر کے عوام ہر اعتبار سے اس کے فیوض و برکات سے بہرہ یاب ہو جائیں۔

اہلِ کشمیر کی کم نصیبی

مسجد تو بنادی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پُرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ دوسری بات ہے کہ وادیٔ کشمیر کی ملّتِ اِسلامیہ کی اپنی کم نصیبی کا کوہِ گراں

حضرت شاہ صاحبؒ کی تمناؤں اور مساعی جمیلہ کے راستے میں حائل رہا اور وہ اپنی شامتِ اعمال کی تاریکیوں میں ہی پڑے سوتے رہے اور فیضِ عام کی شمع اپنی روشنی سے اُن کے راستے کو منوّر نہ کر سکی۔ ؎

گلیمِ بخت کسے را کہ بافتند سیاہ
بآبِ زمزم و کوثر سفید نتواں کرد

یہ مدرسہ کیوں نہ چل سکا؟

بہر حال بارہ موڑہ کا مدرسۂ فیضِ عام ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا اور ربیع الاول ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء تک چلتا رہا۔ مگر جس طرح موسمِ بہار سے بہت پہلے بیجا ہوا تخم زمین کے اندر ہی گل سڑ جاتا ہے یا جس طرح مخالفِ آب و ہوا میں نصب کیا ہوا درخت سیب مرجھا کر سوکھ جاتا ہے بالکل اسی طرح مدرسۂ فیضِ عام بارہمولہ بھی تقریباً چار سال کی عمر پاکر ختم ہو گیا۔

مؤرخ کو اس کے ختم ہو جانے پر تعجب نہیں ہو سکتا، البتہ اگر یہ مدرسہ ختم نہ ہوتا تو واقعی موجبِ حیرت ہوتا۔ مدرسۂ فیضِ عام بارہمولہ کے قیام کے زمانہ سے آج تک ستّر سال کا عرصہ ہوا، تب سے دُنیا بدل گئی اور برائے نام ہی سہی کشمیر میں "تحریک آزادی" کے نام سے بھی برسوں تک وہ ہنگامے ہوئے کہ کانوں میں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اور لوگوں کو اپنے بیدار اور باشعور ہو جانے کے دعوے پر یقین بھی رہا، لیکن اس کے باوجود آج بھی اس قسم کی بلند پایہ درس گاہ کے لئے فضا سازگار نہیں ہوئی جس قسم کی درسگاہ حضرت شاہ صاحبؒ بارہمولہ کے فیضِ عام کو بنانا چاہتے تھے۔

معاونین میں استقلال کا فقدان

یہ امر تو ثابت شدہ ہے کہ مدرسہ فیض عام
بارہ مولہ ۱۳۲۴ھ ۱۹۰۷ء میں قائم ہوا لیکن اس کے قیام کی مُعین تاریخ کونسی
تھی، کون سا دن تھا اور کون سا مہینہ تھا؟ ان سوالات کا جواب
ابھی تک ہمیں ہاتھ نہیں آیا۔ بہر کیف جب مدرسہ قائم ہوا تو ابتداء
میں خواجہ عبدالصمد، خواجہ امیرالدین، خواجہ امیر شاہ اور قصبۂ بارہمولہ
و ضلع بارہ مولہ کے بعض سمجھدار لوگوں نے بہت جوش کے ساتھ
حضرت شاہ صاحب کا ساتھ دیا۔ لیکن وادئ کشمیر کی آب و ہوا میں کچھ
اس قسم کی تاثیر پوشیدہ ہے کہ ہم لوگ کسی بھی بڑے اور اہم کام کو جتنے
زیادہ جوش کے ساتھ شروع کرتے ہیں، چند قدم آگے چلکر اس سے
کئی گنا زیادہ بے پروائی کے ساتھ اُس مقصد سے مُنہ موڑ کر کسی
دوسرے شغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کُلیہ سے خواجگانِ بارہمولہ
بھی مُستثنیٰ نہ تھے۔ خاصکر مرحوم خواجہ عبدالصمد صاحب ککرو جو اپنے
مُعاصر کشمیریوں کے مُقابلہ کافی بیدار مغز اور اپنی حد تک بہبودئ قوم
کا احساس رکھنے والے افراد میں سے تھے اور اپنی دیگر بہت سی
خوبیوں کے لحاظ سے اپنے ہم عصر تاجروں اور کشمیر کے دوسرے سرکردہ
لوگوں میں خاص امتیازات کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود مُتلوّن
مزاجی اور بے استقلالی میں دوسرے مُعاصرین ہم وطنوں سے مختلف
نہ تھے۔ اس لئے جوں جوں وقت گذرتا گیا مُعاونین کی توجہ مدرسۂ
فیضِ عام سے ہٹتی گئی۔ جب ابتداء کی گئی تھی تو مدرسے کے لئے درسگاہوں
اور طلباء کے لئے دارالقیاموں (HOSTELS) کی تعمیر کے بڑے

بڑے اعلان کئے گئے تھے اور جب جوش ٹھنڈا پڑ گیا تو طلباء کے قیام وطعام کے لئے ایک معمولی دارالاقامت کی تجویز بھی عملی جامہ نہ پہن سکی۔ بالفاظِ دیگر حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ مدرسۂ فیضِ عام کی ترقیات کے جو لمبے چوڑے وعدے کئے گئے تھے وہ خالی خولی وعدے ہی رہے اور تین چار سال تک شاہ صاحب حالات کی بہتری کا صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے۔ جب تھک گئے تو آپ کو اپنا قیمتی وقت ضائع ہو جانے پر بہت صدمہ ہوا اور آپ نے انتہائی مایوسی کی حالت میں ایک بار پھر کشمیر کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔

دل برداشتگی کے اسباب

اگر ایک طرف مدرسہ کے معاونین کی سرد مہری آپ کے لئے مدرسہ کے مستقبل سے مایوس ہو کر دل برداشتہ ہو جانے کا موجب تھی تو دوسری طرف قابلِ تعلیم عنصر کی ذہنی تاریکی آپ کے لئے سب سے بڑا سوہانِ روح تھی۔ تین سال کی مدت میں ایسے طالب علم آپ کو بہت کم ملے جو شاہ صاحبؒ کے نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے کسی بلند مقصد کو اپنا نصب العین بنا کر تعلیم حاصل کرنے آئے ہوں۔ کشمیر کی آبادی تب بھی اور آج بھی زیادہ تر زراعت پیشہ اور محنت مزدوری کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ آج کے زمانہ میں بھی یہ لوگ رسمی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہی اپنے بچوں کو سکول بھیجنے پر تیار ہو جاتے ہیں لیکن آج سے ساٹھ ستر سال قبل یہ صورت نہ تھی بلکہ ان عام لوگوں کے سوچنے کا ڈھنگ اُس زمانے میں کچھ اس طرح کا تھا:۔

" بھلا ہمارے بچوں کو کسی نے تحصیلدار بنا دینا ہے جو ہم ان کو

پڑھنے بٹھادیں۔ ہم غریب ہیں اور ہمارے بچوں نے وہی کچھ بننا ہے جو کچھ ہم ہیں۔ سکول بھیجکر ان کا دماغ خراب کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ یہ آج ہی موروثی کام کاج کی عادت ڈالیں۔ بھیڑ بکریاں چرا کر لائیں، ہل چلائیں اور محنت مزدوری کر کے کمائیں تاکہ سرکار کے ٹیکس ادا ہو سکیں۔"

اہلِ ثروت کی تاریک خیالی

اس کے بعد رہ جاتے تھے کشمیری مُسلمانوں میں چند ایک صاحبِ ثروَت، تجارت پیشہ یا زمینوں کے بڑے مالک۔ ذہنیت کے لحاظ سے ان کے بچے نہ گھر کے تھے نہ گھاٹ کے۔ کیونکہ ان کو کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا ذلت دکھائی دیتا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں پڑھتے تھے کہ اپنی دُکان کے لین دین کا حساب خود رکھ سکیں۔ مدرسۂ فیضِ عام کا قصہ نومبر ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کے زمانہ کا ہے۔ کشمیر کے تجارت پیشہ مسلمان ۱۹۳۱ء تک بھی اپنی دُکان اور کاروبار کا حساب رکھنے کے لئے بطورِ منشی کسی کشمیری پنڈت کو رکھنے پر مجبور ہوتے تھے اور اپنے بچوں کو اتنی سی ادنیٰ تعلیم دینے پر بھی آمادہ نہ ہوتے تھے جو انکو حساب و کتاب اور بہی کھاتہ رکھنے کے قابل بنا سکے۔ ایسے لوگوں کو مدرسۂ فیضِ عام سے کیا واسطہ؟ اِلّا ماشاء اللہ دینی تعلیم حاصل کرنے پر ثواب کی بات کسی کے ذہن پر بیٹھ جائے تو وہ دوسری بات ہے۔

جمود و خمود کے مریض

لے دے کر مدرسۂ فیضِ عام میں جس طبقے کے بچے حصولِ تعلیم کے لئے آ سکتے تھے یا آتے تھے وہ طبقہ کشمیر کے پیرزادوں، مولوی اور مُفتی

زادوں، آخون زادوں اور مُجاوروں کا طبقہ تھا۔ اس طبقے سے جو طالب العلم فیضِ عام میں آئے اُن میں بلاشبہ بعض ہونہار، ذہین اور محنتی تھے۔ مگر ان طلبا کی اکثریت کی حالت اپنی تاریک ذہنیت، مقصد کی محدودیت اور خیالات کی پستی کے لحاظ سے نہایت مایوس کن تھی۔ چونکہ ان میں سے زیادہ تر زیارتوں کے مُجاوروں یا مساجد کے اماموں کے فرزند تھے جو ہوش سنبھالتے ہی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی وجہ سے فطرتِ سلیمہ کی خداداد نعمت کو مسخ کر چکے ہوتے ہیں اور بقولِ علامہ اقبالؒ ع

"ضمیرش تہی از خیالِ بُلندے"

کا پورا نمونہ بن چکے ہوتے ہیں۔ اس لیئے ان کی حالت یہ تھی کہ جب کبھی شاہ صاحبؒ یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ حصولِ علم کے اغراض و مقاصد کے بارے میں ان لوگوں کی نیت کیا ہے اور مستقبل میں یہ لوگ کیا بننے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ تو معلوم ہوتا تھا کہ کسی مسجد کی امامت کو پیٹ پالنے کا ذریعہ بنالینا یا ختم خوانی اور تعویذ نویسی کے پیشے کی آڑ میں لوگوں کے صدقات و خیرات سمیٹنا یا جاں بلب موروثی پیری مُریدی کو چمکانے کے کچھ گُر سیکھ لینا، ان کے بڑے بڑے مقاصد ہیں جو ان طالب علموں میں سے اکثر کے دماغ میں ان کے ماں باپ کی طرف سے ٹھونسے گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا فلسفۂ تعلیم

حضرت شاہ صاحب کا اپنا ایک فلسفۂ تعلیم تھا اور آپ مدرسۂ فیضِ عام کو اپنے اسی فلسفہ کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے ایک دینی مدرسے کے قیام کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ پڑھنے والے

تاریکیوں سے نکلکر علم وعقل اور دانش وخردمندی کی روشنی میں آجائیں، لیکن جو لوگ تعلیم کو تعویذ نویسی اور ختم خوانی کے لئے حاصل کر رہے ہوں، وہ علم وعرفان کی نورانیت سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ ان لوگوں کو یہ حقیقت سمجھانے کی بہت کوشش کرتے تھے کہ دینی تعلیم کو ان ادنیٰ مقاصد کے لئے حاصل کرنا ان علوم کی توہین کرنا ہے۔ اور آپ کا یہ مقولہ آپ کے شاگردوں میں مشہور تھا کہ:

"جو شخص قرآن وحدیث اور دوسرے دینی علوم کو محض شکم پروری کے لئے پڑھتا ہے وہ بازار سے قیمتی شال اس لئے خرید کر لاتا ہے کہ اس سے اپنے جوتے صاف کرے"۔

جو لوگ شاہ صاحب کی شاگردی کے دائرہ میں شامل ہو جاتے تھے شاہ صاحب ان کو صرف کتابوں کا مضمون پڑھا دینے پر اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان کے اخلاق و اطوار اور عادات وخصائل کو سنوارنے کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے اور درس کے درمیان میں مسائل کی تشریح کے ساتھ ساتھ نہایت دلنشین پیرایہ میں آپ ان مستفیدین کو ذہن نشین کراتے رہتے تھے کہ علم حاصل کرنے کا اصل مقصد اپنی اپنی شخصیت کی تکمیل، تہذیب اخلاق اور تزکیۂ نفس ہے۔ کیونکہ یہی وہ عناصر ہیں جو روح کی بالیدگی اور حصولِ عرفان کی اساس ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک علم، تعلیم، معلّم اور متعلّم کی دُنیا ملاء اعلیٰ کی دُنیا ہے جس کو پاک وصاف رکھنے کے لئے شکم پروری اور تن پرستی کی دُنیا سے دُور اور بلند وبالا رکھنا پڑھنے اور پڑھانے والوں کا پہلا فرض ہونا چاہیئے۔ یہ وہ فلسفۂ تعلیم تھا جس کے مُبلّغ اور منادی شاہ صاحب تھے۔ اور یہ

فلسفۂ تعلیم آپ کو اپنے اساتذۂ کرام خاصکر حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سے مِلا تھا۔ اور اسی فلسفۂ تعلیم کے سانچے میں آپ نے اپنی ذات کو ڈھال دیا تھا۔ اور آپ چاہتے تھے کہ مدرسۂ فیضِ عام کو اسی فلسفہ کا قالب بنادیں تاکہ جو "سکے" اس میں ڈھل کر نکلیں وہ زرِ کامل عیار ثابت ہوں۔
لیکن جو خام مواد (Raw Material). آپ کے سامنے تھا بدقسمتی سے اس کا بیشتر حصہ "اَوْسَاخ اَمْوَالَ النَّاسِ" یعنے خیرات وصدقات کی روٹیوں کی پیداوار تھا۔ ان لوگوں کا خمیر ہی دوسرا تھا۔ ان کے ذہن کی تاریکیاں کسی طرح بھی حقیقی علم کی نورانیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوتی تھیں۔ اور حضرت شاہ صاحب کو اس قرآنی صداقت کا تجربہ درپیش تھا۔ اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَاءُ۔
انتہائی دلسوزی کے ساتھ سادہ اور عام فہم الفاظ میں شاہ صاحب ان پر واضح کرنے کی کوشش کرتے کہ :
"حصولِ علم کا مقصد ہے اپنے دل اور دماغ کو جہالت کی تاریکیوں سے پاک کر کے خود بھی اندھیرے سے نکل کر روشنی میں آجانا اور خلقِ خدا کو بھی تاریکیوں سے نکالکر نور وہدایت کی شاہراہ پر لانا۔"
وہ بے چارے اس آسمانی اصول کو سمجھ ہی نہ سکتے اور کَاَنَّھُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ کی تصویر بن کر سمجھانے والے کا مُنہ تکتے رہ جاتے۔

احساسِ ناکامی

جب مدرسے کو چلانے والوں کا وہ حال تھا اور مدرسے میں پڑھنے والوں کا یہ حال تھا تو مولانا انور شاہ صاحب جیسا شخص اگر یہ محسوس کرے کہ میں یہاں بیٹھ کر اپنی زندگی کو مُلاسازی (اور وہ بھی نہایت محدود پیمانے کی اور نہایت

تاریک دماغ کی مُلّا سازی) کے شغل میں ضائع کر رہا ہوں تو اس پر کسی کو متعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ۱۹۰۷ء (۱۳۲۴ھ) سے ۱۹۱۰ء (۱۳۲۸ھ) کے اوائل تک مدرسۂ فیضِ عام کو چلانے کے بعد آپ کو پورا اندازہ ہوگیا کہ کشمیر کے عوام کی ذہنی یخ بستگی اس قدر سنگین اور شدید ہے کہ اِس گلیشر کو پگھلانے میں تغیّراتِ زمانۂ جدید کے سورج کو ابھی مزید چند سال تک اپنی تیز کرنوں کو ایک نقطے پر مرتکز کرنا ہوگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ میں اپنی کوششوں کی یہاں پر ناکامی کا احساس ہی نہیں بلکہ اعتراف کر کے کسی دوسرے مقام پر چلا جاؤں اور اللہ کے دین اور اسکی خِلقت کی خدمت کے لئے اِمکان بھر سعی و عمل کو جاری رکھوں۔ چنانچہ آپ نے بارہ مولہ کے مدرسۂ فیضِ عام کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنی جدوجہد کے لئے کشمیر سے باہر میدان تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مؤرخ فوق کی مُلاقات

یہ ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ کا زمانہ تھا، جن دِنوں آپ بارہمولہ سے رختِ سفر باندھ کر ہندوستان جا رہے تھے۔ مؤرّخ منشی محمّد دین فوق نے آپ سے ملاقات کی۔ غالبًا خواجگانِ بارہمولہ کی خواہش پر یا منشی صاحب نے اپنے قلبی احساس کی بناء پر شاہ صاحب سے باصرار عرض کیا کہ آپ کشمیر سے باہر نہ جائیں اور یہاں ہی اپنے فیوضات کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یہ واقعہ منشی صاحب کے الفاظ میں یوں ہے:۔

"آپ بمقام بارہ مولہ خواجہ امیر الدین (شاہ) مرحوم تحصیلدار کے مکان پر رونق افروز تھے کہ سب سے پہلی مرتبہ راقم الحروف نے آپ سے نیاز حاصل کیا۔ میں نے دیوبند کی نسبت جہاں بہت سے اور عُلماء

دارالعلوم میں کام کر رہے ہیں، کشمیر کے زیادہ حقوق عرض کئے، جہاں چاروں طرف سناٹا چھایا ہُوا ہے، آپ نے فرمایا کہ کوئی ایسا آدمی پیدا کیجئے جو ہماری باتیں سُن سکے، ہمیں خدمت وطن سے انکار نہیں" میں نے عرض کیا کہ جہاں زمین ناہموار ہو، ناصاف ہو، اگر تکلیفیں اور صعوبتیں اُٹھا کر اس کو صاف وہموار کر دیا جائے تو وہاں بھی جو چیز بوئی جائے وہ نشو ونما حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن آپ کے عزمِ مصمم نے کوئی پیش نہ جانے دی۔[1]"

مولانا امین الدین صاحب کے نام خط

ایک موقعہ پر حضرت شاہ صاحبؒ نے کشمیر سے دل برداشتگی کے متعلق اپنے دیرینہ رفیق مولانا امین الدین صاحبؒ (بانئ مدرسۂ امینیہ دہلی) کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۷ جمیدۃ الاوّل ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے کہ :-

"یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر مخلوق کی بد معاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا۔[2]" الخ

حضرت شاہ صاحبؒ کا صبرِ جمیل

اس سلسلہ کی تمام پیش آمدہ مشکلات کی تفصیلات پر اسلئے پردہ پڑا ہُوا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ چونکہ صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں تھے اور اپنے گذرنے والے صدمات کی شکایت سے گریز کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو مشاہیر کشمیر از محمد الدین فوق ص ۱۶۲، ۱۶۳، مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰ء

[2] مختصر تاریخ مدرسۂ امینیہ دہلی ص ۲۶ بحوالہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ. ستمبر ۱۹۶۷ء۔

تھے خاص کر ایسی شکایت جس کی زد کسی دوست پر پڑتی ہو، آپ کو کسی حالت میں گوارا نہ تھی۔ فیضِ عام ہی نہیں بلکہ دیوبند کے مدرسہ دارالعلوم سے بھی جب آپ کو تعلق کاٹ لینے پر مجبور ہو جانا پڑا تو آپ کا یہی صفحِ جمیل کا صابرانہ طرزِ عمل نمایاں رہا۔

یہ تھا مدرسۂ فیضِ عام جو اپنی مختصر حیات کے دوران بارہمولہ کے لئے موجبِ افتخار رہا اور آج جب تاریخوں کے صفحات پر حضرت شاہ صاحبؒ کے دیگر کارناموں کی فہرست میں اس کارنامے کا بھی تذکرہ آتا ہے تو قصبۂ بارہ مولہ اور خواجگانِ بارہمولہ کو بھی اس یادِ عہدِ گذشتہ کی جھلکیوں سے اپنا حصّہ نصیب ہو جاتا ہے۔ ؎

"وَلِلْاَرْضِ مِنْ کَاْسِ الْکِرَامِ نَصِیْبٌ"

سوچئے تو یہی ہے کہ یہ دینی مدرسہ اگر جاری رہتا تو واقعی اپنی نظیر آپ ہوتا اور اس کے وجود پر کشمیر کو آج اسی طرح فخر ہوتا جس طرح دارُالعلوم دیوبند پر دیوبند کو، مدرسۂ مظاہرالعلوم پر سہارنپور کو۔ مدرسۂ ندوۃ العلماء پر لکھنؤ کو اور مدرسۂ امینیہ پر دہلی کو فخر ہے۔ لیکن غلامی کی زہریلی آب و ہوا کی وجہ سے کشمیر کا ماحول اس وقت ایسے ادارہ کے لئے سازگار نہ تھا اس لئے یہ پودا کونپلیں اور شاخیں نکلنے اور پھول پھل لانے سے قبل ہی مرجھا گیا۔ بقولِ ظفر ؎

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دِن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ایک صدمہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ عمران شاہ نامی ایک طالب العلم موضع لوات (علاقہ مظفر آباد) سے مدرسۂ فیضِ عام میں تعلیم حاصل کرنے

کے لئے آئے تھے جو حضرت شاہ صاحبؒ کے محسن چچیرے بھائی مولینا عبدالمجید شاہ (فاضل دیوبند) کے یتیم بیٹے تھے اور ذکاوت و ذہانت اور دیگر اوصاف میں اپنے والد مرحوم اور حضرت شاہ صاحبؒ کا نمونہ تھے۔ چنانچہ حصولِ تعلیم کے دوران پورے مدرسہ میں اپنے کمالات کے لئے انگشت نما تھے۔ ناگاہ ان پر سرسام کا حملہ ہوا اور جان بحق ہوگئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کو اس کے مستقبل کے ساتھ بہت امیدیں قائم تھیں اس لئے آپ کو اس کی موت کا سخت صدمہ ہوا۔

شاہ صاحبؒ کی زندگی کے آٹھ سال

(ربیع الاول ۱۳۲۰ھ تا ربیع الاول ۱۳۲۸ھ)

مدرسۂ فیضِ عام کو قائم کرنے، چلانے اور آخرکار مایوس ہوکر ختم کر ڈالنے میں حضرت شاہ صاحبؒ کو ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۸ھ تک اپنی قیمتی زندگی کے آٹھ سال صرف کرنے پڑے۔ نتیجہ ناکامی نکلا مگر آپ نے اس صدمۂ عظیم کو انتہائی صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا اور پُروقار طریقے سے زندگی کا دوسرا قدم اٹھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور ان تمام واقعات کو اس طرح پسِ پُشت پھینک دیا کہ کَانَ لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا۔ یہ واقعات جن میں تنِ تنہا آپ آٹھ سال تک جدوجہد کے میدان میں سرگرمِ عمل نظر آتے ہیں، جہاں آپ کی عظمت کے آئینہ دار ہیں وہاں کشمیری عوام کی آج سے ستر سال قبل کے افسوسناک ذہنی تنزّل، ان کی مردہ گانہ خوابِ غفلت، دماغی جمود اور قلبی خمود کا اندازہ بھی ان ہی واقعات سے ہوتا ہے۔ اس وقت مسلمانانِ کشمیر خود فراموشی اور خود ناشناسی کی جس دنیا میں تھے اس کا مرقع ترجمانِ حقیقت حضرت اقبالؒ نے

یوں کھینچا ہے ۔

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ	بُتے مے تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے	خودی ناشناسے ز خود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او	نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغِ نگاہے	نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے
ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری	کہ خاکسترش آفریند شرارے

فیضِ عام کے باقیاتِ صالحات

بہر حال مدرسۂ فیضِ عام چونکہ بہت قلیل مُدت زندہ رہ کر ختم ہو گیا، اس لئے اس کے فیض یافتہ لوگ کسی خاص اور معقول تعداد میں پھیلنے نہ پائے۔ ایک علمی درسگاہ برسوں تک قائم رہتی ہے، تب ہی اسکے نتائج کا اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر بایں ہمہ حضرت شاہ صاحبؒ کے اس دور کے چند سرکردہ شاگردوں اور فیضِ عام کے فیض یافتہ افراد کا پتہ چلایا جا سکا ہے جو علاقہ میں اپنے اپنے وقت کی نمایاں شخصیتیں ثابت ہوئے۔ ان میں حسبِ ذیل اصحاب قابلِ ذکر ہیں:۔

(۱) مُفتی پیر عبدُالجبار صاحب سابق خطیب جامع مسجد سوپور۔
(آپ نے سالہا سال تک قصبۂ سوپور کی جامع مسجد میں خطابت اور افتاء کے علاوہ عربی، فارسی اور دینی علوم کی تعلیم دی اور سینکڑوں لوگ آپ سے مُستفید ہوتے رہے۔)

(۲) مولوی مفتی محمد اکبر صاحب سابق خطیب خانقاہِ معلّٰے سوپور و امامِ حی۔

(۳) مولوی مفتی محمد نورالدّین صاحب خطیب مسجد صوفی حمام سوپور۔

(۴) پیر غلام محی الدین صاحب مخدومی سابق امام عیدگاہِ بارہمولہ۔
(۵) پیر غلام احمد شاہ قریشی مسکین بارہمولہ۔

(۶) سید علی شاہ صاحب اندرابی سابق مفتی بارہمولہ و مرشدِ علاقہ مظفر آباد
(۷) سید احمد اللہ شاہ صاحب اندرابی۔ بارہمولہ۔

کشمیر سے دیوبند

(ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ)

ارادۂ ہجرت بسوئے حجاز جب ۱۳۲۸ھ شروع ہوا تو مدرسۂ فیضِ عام بارہمولہ اس جاں بلب مریض بچے کی طرح تھا جس کے والدین، معالج اور سب چاہنے والے اس کی زندگی سے مایوس ہو چکے ہوں اور سوچتے ہوں کہ ؎

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے فیضِ عام کی ناکامی سب سے زیادہ صدمۂ شدید تھا۔ سات آٹھ سال کی بہترین تمنائیں آنکھوں کے سامنے خاک میں مل رہی تھیں۔ آپ کے حساس اور نازک دل نے آپ کو یہی مشورہ دیا کہ کشمیر اور اہلِ کشمیر کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حوالہ کر کے اپنے قیمتی اوقات کو کسی دوسری جگہ کسی زیادہ نتیجہ خیز مصرف میں صرف

کیا جائے اور نہ صرف وطن کو ہی ترک کر دیا جائے بلکہ ہندوستان کو بھی خیر باد کہہ دیا جائے۔ اور حج کے زمانے میں جو یہ ارادہ کیا تھا کہ حجاز میں قیام پذیر ہو کر خدمتِ اسلام کے لئے زندگی وقف کر دی جائے گی۔ اس ارادے کو اب عمل کی صورت دے دی جائے۔

اس قسم کی ذہنی کیفیت کے ساتھ شاہ صاحب نے اپنے والدین اقرباء اور کشمیر میں سب دوست احباب کو الوداع کہا اور کشمیر سے دیوبند پہنچ گئے تاکہ اپنے اساتذۂ کرام سے بھی ملیں۔

اکابر کی نظرِ انتخاب

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" مطبوعہ مکتبۂ دینیہ دیوبند جلد اوّل کے صہ ۱۲۱ پر رقمطراز ہیں کہ:

"غالباً ۱۳۲۵ھ یا ۱۳۲۶ھ میں ایک ایسے مجمع میں جس میں دارالعلوم کی علمی ترقی پر غور وخوض ہو رہا تھا۔ حضرت حافظ احمد صاحب مرحوم نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ اگر مولوی انور شاہ کشمیری، مولوی عبید اللہ سندھی، مولوی مرتضیٰ حسن چاندپوری، مولوی سہول بھاگل پوری، مولوی عبدالصمد کرتپوری اور حسین احمد (مدنی) یہاں آکر جمع ہو جاتے تو دارالعلوم کی علمی ترقی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر پہنچ جاتی۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم دہلی چھوڑ کر کشمیر میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔ مولانا عبید اللہ صاحب عرصے سے سندھ ہی میں مقیم تھے۔ دیوبند کی آمد و رفت بھی عرصہ سے منقطع تھی۔ مولانا مرتضےٰ حسن صاحب دربھنگہ میں مدرسِ اوّل اور بہت بڑے صاحب نفوذ تھے۔ مولانا محمد سہول صاحب مدرسۂ عالیہ

کلکتہ میں بڑی تنخواہ پر ملازم تھے۔ مولینا عبدالصمد صاحب مرحوم رڑکی کی مدرسۂ رحمانیہ میں مدرّس اوّل تھے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بات پسند آئی اور اگرچہ بظاہر سکوت کیا مگر خدا جانے کیا باطنی تصرّف کیا کہ یہ سب اشخاص بغیر کسی ظاہری جِد و جہد اور خط و کتابت کے یکے بعد دیگرے دیوبند پہنچ گئے۔ ممکن ہے کہ بعض اشخاص سے کچھ ظاہری جِد و جہد کی نوبت آئی ہو مگر اکثروں سے کسی قسم کی خط و کتابت اور طلب و فہمائش کی نوبت نہیں آئی الخ۔

مولینا مدنی کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اکابر دارالعلوم کی یہ طے شدہ رائے تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور ان ہی جیسے چند دوسرے لائق و فائق فرزندان دارُالعلوم کو یکجا کر کے مستقبل کی قیادتِ تعلیم کے لئے ان کو تیار کرنا ہی اس ادارہ کی بقاء دوام اور ترقی کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ بعد کے واقعات نے بتادیا کہ ان بزرگوں کی رائے کس قدر پُراز خلوص اور صائب تھی۔

دارالعلوم کا جلسۂ دستار بندی

(ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء)

جیسا کہ سطورِ گذشتہ میں بیان ہوا کہ حضرت شاہ صاحبؒ بارہ مولہ کشمیر سے دل برداشتہ ہو کر ربیع الاوّل ۱۳۲۸ھ کو بعزم ہجرت حرمین شریفین اپنے وطن سے روانہ ہوئے لیکن اپنے استاذِ مکرم حضرت شیخ الہندؒ اور دیگر اکابرین و شیوخ سے ملنے کے لئے پہلے دیوبند

تشریف لے گئے۔

ان ہی دِنوں دارُالعلوم میں دستار بندی کا وہ جلسہ ہونے والا تھا جو قیامِ دارالعلوم کے پہلے دَور میں ہر سال منعقد ہوتا تھا اور اب بعض موانع کی وجہ سے کئی سال سے نہیں ہو رہا تھا۔ اور فارغ شدہ طلباء کو صرف سند دے کر دستار بندی کے بغیر ہی رخصت کر دیا جاتا تھا۔ اس نقصان کی تلافیٔ مافات کے طور پر ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ (مُطابق ۱۶، ۱۷، و ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء) میں صدرُ المدرسین حضرت شیخ الہند مولٰینا محمودُ الحسنؒ اور مہتمم دارالعلوم مولٰینا حافظ محمد احمدؒ اور دیگر اکابر نے ایک تاریخی جلسے کا اہتمام فرمایا۔ یہ جلسہ چونکہ کئی سال کے بعد منعقد ہو رہا تھا اس لئے کوئی ہزار بھر سے زائد ان علماء کی دستار بندی ہونا تھی جو اس عرصہ کے فارغین تھے۔ ان ہی فارغین میں حضرت شاہ صاحبؒ بھی شامل تھے۔ جلسہ کے دَوران آپ کا جو نمایاں کردار رہا اس نے ثابت کیا کہ نہ صرف اپنے ہم سبق فارغین میں بلکہ دارُالعلوم سے کئی سال کے دَوران فارغ شدگان میں محمدؐ انور شاہ کشمیری کی شخصیت کو وہی امتیازات حاصل ہیں جو شب چہاردہم کے ماہِ تاباں کو اپنے اردگرد کے ستاروں پر حاصل ہوتے ہیں۔

جلسۂ دستار بندی کے واقعہ کو حضرت مولٰینا سیّد حسین احمد مدنیؒ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ وہ اس جلسہ کے منتظموں میں سے بھی تھے اور ان لوگوں میں سے بھی جن کی اس موقعہ پر دستار بندی سے عزّت افزائی کی گئی۔ اس لئے اس بارے میں ان کا بیان ایک چشم دید

گواہ کا بیان ہے جس کو "نقشِ حیات" سے یہاں نقل کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

دستار بندی یعنی چہ؟

مولانا مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"زمانہ ہائے قدیمہ میں اس امر کے ظاہر کرنے کے لئے کہ طالب علم کتُب درسیہ پڑھ کر اور علوم وفنون، فقہ و حدیث میں ماہر ہو کر اس درجہ میں پہنچ گیا ہے کہ اس کے فتاویٰ قابلِ اعتماد سمجھے جائیں اور اس کی تعلیم و تدریس قابلِ اطمینان شمار ہو، دو طریقے جاری کئے گئے تھے۔ ایک سند دینا جس میں اساتذہ اپنے تلامیذ کی کتب خواندگی اور اس کی صلاحیت علمی اور عملی اور اپنی اجازت ظاہر کیا کرتے تھے اور دوسرا طریقہ دستار بندی یا خرقہ عطا کرنے کا ہوتا تھا۔ مجمع عظیم میں اساتذہ تلمیذ کے سر پر اپنے ہاتھ سے دستار باندھتے تھے یا اپنا جُبہ وغیرہ خرقہ ہائے عُلماء عطا کرتے تھے، اس طریقہ ثانیہ سے عام و خاص میں تلمیذ کی قابلیت کا علم اور چرچا ہو جاتا تھا۔ بخلافِ سند کے کہ اس کو سمجھنا اور پڑھنا صرف اہلِ علم سے ہو سکتا تھا۔

دارالعلوم میں دستورِ دستار بندی

دارالعلوم دیوبند قائم ہونے کے بعد فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا طریقہ جاری کیا گیا۔ دوسرے تیسرے سال اجتماعِ عظیم کیا جاتا تھا اور دستار بندی، سندِ امتحان اور تقریرِ علمی کی رسوم جاری ہوتی تھیں۔ اس طریقہ سے دارُالعلوم کی شہرت بہت زیادہ ہونے لگی۔ نیز تعلیم عربی اور تحصیل علومِ دینیہ کا جذبہ لوگوں میں بڑے پیمانہ پر

پیدا ہو گیا۔ یہ طریقہ غالباً ۱۳۰۴ھ تک جاری رہا مگر بعد میں کچھ ایسے عوائق پیش آئے کہ اس کی انجام دہی نہیں ہو سکی۔ طلبہ کو صرف سند دی جاتی تھی۔ مگر عام لوگوں اور بالخصوص فارغ التحصیل طلبہ کے تقاضے دستار بندی کے برابر ہوتے رہتے تھے جن کو لطائف حیل سے ارباب اہتمام ٹالتے رہتے تھے۔[1]"

بہر حال ۱۳۲۸ھ کے اس تاریخی دستار بندی اور تقسیم اسناد کے اجلاس کی خاص بات یہ ہے کہ دار العلوم سے فارغ التحصیل طلباء میں سے سب سے پہلے جن صاحب کی دستار بندی کی گئی وہ حضرت شاہ صاحب ہی کی ذات گرامی تھی۔

جلسے کی کیفیت

مولانا مدنیؒ نے جلسے کی روئداد ذیل کے الفاظ میں قلمبند کی ہے:۔

"جلسہ میں اولاً جناب قاری عبد الوحید خان صاحب مرحوم مدرس تجوید اور اُن کے (نوعمر) شاگردوں بالخصوص مولانا محمد طیب صاحب اور (آپ کے برادر) مولانا (قاری) محمد طاہر صاحب وغیرہ نے با تجوید قرآن سُنایا۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مرحوم و مغفور نے اپنا مطبوعہ خطبہ موسومہ "دار العلوم دیوبند کا زریں ماضی اور مستقبل" جو کہ نہایت مبسوط تھا اور اس میں دار العلوم کی ماضی کی خدمات دینیہ اور علمیہ کو واضح طور پر ظاہر کیا گیا تھا سُنایا۔ اس میں مستقبل کی ضروریات اور اراکین کے ارادوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کے بعد سب سے پہلے عربی

---

[1] "نقش حیات" جلد اول ص ۱۲۲ و ص ۱۲۳ (از مولانا حسین احمد مدنیؒ)

زبان میں حضرت مولٰنا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مبسوط تقریر فرمائی۔ ان کے بعد میں نے تقریر کی جو کہ جناب رسول اللہ ؐ کے فضائل کے متعلق تھی۔ پھر دو تین طلبہ نے تقریریں کیں مگر طلبہ کی اُمنگیں مایوسی سے تبدیل ہوگئیں جبکہ عام حاضرین نے مطالبہ کیا کہ تقاریر اردو میں ہونی چاہئیں ہم لوگ کچھ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اربابِ انتظام نے مجبور ہو کر عربی تقریریں بند کرادیں اور اردو میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا۔ اس کے بعد دوسرے اجلاس میں دستار بندی کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت مولٰنا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دستار بندی ہوئی۔ اس کے بعد میری دستار بندی کی گئی۔" (نقشِ حیات جلد اول ص۱۲۴ و ص۱۲۵)

دارالعلوم میں تدریس کا آغاز

(۱۳۲۸ھ)

التوائے ارادۂ ہجرت ۱۳۲۸ھ میں کشمیر سے روانہ ہو کر دیوبند پہنچا اور حضرت شیخ الہند رحؒ اور اپنے دیگر اساتذۂ کرام کی ملاقات اور زیارت کے لئے وہاں کا عارضی قیام بظاہر حضرت شاہ صاحبؒ کی ہجرت کے ارادے کی تکمیل کا پہلا قدم تھا لیکن بقولِ حضرتِ شاہ ولایت علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہٗ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ، شاہ صاحب کو بھی دیوبند کا دانہ پانی زندگی بھر کے لئے نصیب ہو گیا۔ ؎

یُرِیْدُ الْمَرْءُ اَنْ یُّعْطٰی مُنَاہُ ❊ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا مَا یَشَاءُ

دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ دستار بندی کی تقریب سے کامل فراغت کے بعد جب شاہ صاحبؒ نے پھر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب سے عرض کیا کہ میں حجازِ مقدس کو چلا جاؤں تو انہوں نے شاہ صاحب کو ہجرت کی اجازت نہ دی اور باصرار شاہ صاحب کو فرمایا کہ آپ کو اب دارالعلوم میں ہی کام کرنا ہے۔

چونکہ شاہ صاحبؒ کو اپنے استاذ جلیل حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ اور مولانا حافظ محمدؒ احمد صاحبؒ کے حکم کے آگے یارائے سخن نہ تھا اسلئے حضرت شیخ الہندؒ (صدر المدرسین) اور مولانا حافظ محمدؒ احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم) کی دیرینہ خواہش اور تازہ اصرار کا احترام کرتے ہوئے دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دینے کے بغیر آپ کے لئے کوئی چارہ نہ رہا۔

بہر صورت اکابر دارالعلوم کے اصرار سے شاہ صاحب نے تدریس کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے۔ اگرچہ ہجرت کا ارادہ اب بھی آپ کے دل کے کسی گوشے میں محفوظ و مستور تھا۔

دیوبند میں حضرت شاہ صاحب شمعِ انجمن ہونے کے باوجود قناعت و توکل اور زہد و تقویٰ کا جو عملی نمونہ پیش کر رہے تھے اس کی بہترین تصویر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے اپنے دلنشین مقالہ "نورالانور" میں کھینچی ہے۔ یہ مضمون اگلے صفحات میں من وعن مجموعۂ ہذا کی زینت بنایا گیا ہے۔ یہاں اس کے چند متعلقہ اقتباسات دیئے جاتے ہیں تاکہ شاہ صاحب کی حیاتِ دیوبند کے مختلف گوشے یک جا پیشِ نظر ہو جائیں۔

دارالعلوم کے ساتھ معلمانہ تعلّق

"آپ کے شیوخ و اساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جانے اور پہچانے ہوئے تھے" یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسندِ درس کے شایانِ شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لئے پیدا کیا ہے، آپ کو دیوبند روک لیا، اور آپ نے بھی غایتِ تواضع و انکسارِ نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیامِ دیوبند کا ارادہ فرما لیا۔

حضرت ممدوح کے ٹھیرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرت ممدوح سے لکھوائی جائے، لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس کی وجوہ نامعلوم ہیں، شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ واللہ اعلم۔

بہرحال آپ نے بامتثالِ اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمایا البتہ غلبۂ زہد و قناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے، اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا، اس اصرار پر اُن کے اکابر نے بھی سکوتِ رضا سے کام لیا، اور تنخواہ کا مسئلہ کلیتہً اُن ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

دس برس بطورِ فردِ خاندانِ قاسمی

لیکن حضرت والد ماجد حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اس کے بعد یہ گوارا نہیں کیا کہ طعام ضروریاتِ طعام کے مصارف خود اُن کے سر ڈالے جائیں، اور فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو اُن کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعلق صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں، اُسے

حضرت ممدوح نے منظور فرمالیا۔ اور اس طرح تقریباً دس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرت والدِ ماجد علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلبیت کے سمجھا اور نہایت پورے انشراح و انبساط کے ساتھ یہ دَور پورا ہوا۔

علمی مجالس کا دلکش منظر

اس دَور میں حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے یاد فرمایا، اور قیامِ دیوبند پر مجبور فرمایا، ممدوح بھی یہاں رُک گئے، اور وہ بھی اس پوری مُدت میں حضرت والد ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا لیکن حقیقۃً اہلِ علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی جس میں حضرت والدِ ماجد قدس سرہٗ، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہٗ۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور اکثر و بیشتر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور متعدد دوسرے اکابر اساتذہ دارالعلوم شریک رہتے تھے۔ علمی مسائل میں مکالمے ہوتے، بحثیں ہوتیں، معارف و حقائق کھلتے، اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا سندھیؒ مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے اور آخر کار بزرگانِ مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور متین رنگ میں فیصلے اور مکالمے سُنائے جاتے۔ حاضر الوقت خدام و طلبہ کو شاید درس و تدریس کی لائن سے برسہا برس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقۂ طعام میں پکی پکائی اِک دم

مِل جاتی تھیں، اِن دونوں بزرگوں میں حاضرُ الوقت اکابر کے کمال ادب و احترام کے ساتھ سلسلۂ مسائل حق گوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ اِضمحلال یا تہاوُن پیدا نہ ہوتا تھا اور ہر ایک دوسرے کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔

اس طرح کھانے پینے کا یہ دسترخوان، مائدۂ علم و فضل بن جاتا، اور اس دسترخوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی، بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے اَلوان جمع ہو جاتے تھے، اور دسترخوان اس شعر کا مِصداق بن جاتا ہے

بہارِ عالمِ حُسنش دِل و جاں تازہ میدارد
بہ رنگ اَصحابِ صورت را بہ بو اربابِ معنیٰ را

قناعتِ فطری

حضرت شاہ صاحب رحمۃُ اللہ علیہ میں غذا کے بارہ میں لطافت تھی مگر شوقینی نہ تھی، غِذاؤں کے تنوُّع اور کھانوں کے اَلوان کی طرف طبیعت جُھکی ہوئی نہ تھی۔ جو مِل گیا، کھالیا، جو آگیا شکر و رضاء سے اُسے قبول کرلیا، میری جدّۂ محترمہ رحمۃُ اللہ علیہا (جن کی مہمان نوازی اپنے دَور میں مشہور رہتی، اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ "ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے"۔) کبھی کبھی حضرت شاہ صاحبؒ سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ "حضرت! کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجئے!" تو مُتاثّرانہ لب و لہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے سلام گذارش کیجئے اور یہ عرض کر دیجئے کہ "دسترخوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں، مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جارہی ہیں؟"

حضرت شاہ صاحبؒ کا نکاح

(۱۳۳۶ھ)

حضرت شاہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے قلبِ معصوم اور نفسِ مطمئنہ کی دولت سے سرفرازی بخشی تھی۔ آپ فطرۃً حصور واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ ۴۴ سال کی عمر تک آپ نکاح اور تأہل سے پرہیز کرتے رہے اور تجرد کی زندگی کو ترجیح دیتے رہے۔ اس کا بنیادی سبب تو یہ تھا کہ فنا فی العلم ہو جانے کی وجہ سے آپ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ پڑھنے اور پڑھانے ہی میں صرف کرنا چاہتے تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ آپ کے دل و دماغ پر حرمین کی طرف ہجرت کر جانے کا شوق ابتداء ہی سے جاگزین تھا اور جب کچھ ناملائم حالات پیش آجاتے تو دماغ میں جاگزین داعیۂ ہجرت تازہ ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس طویل عرصہ میں آپ نے دیوبند، دہلی اور بارہ مولہ وغیرہ میں اپنا قیام عارضی شکل کا رکھا اور کہیں بھی مستقل طور پر توطن اختیار نہ کیا۔ ظاہر ہے کہ نکاح اور ازدواج اس قسم کی طرزِ حیات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔

اب جب آپ کی عمر چوالیس سال سے متجاوز ہو چکی تھی تو روز بروز آپ تجرد و تنہائی کو دوام دینے کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہو رہے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور دیگر اکابرینِ دیوبند بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ شاہ صاحبؒ کے تجرد کے بواعث میں سے ایک

باعث ہجرت کا ارادہ بھی ہے۔ اس لئے ان کو کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کسی وقت یہ شہباز دیوبند کے مرغزار سے پرواز کر کے کوہستانِ حجاز کو اپنا مسکن نہ بنائے اور ہندوستان اس کے فیوضات سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ بنابراں دارالعلوم کی ملاء اعلیٰ میں مشورے ہوئے اور اس آہوئے گریز پا کو ازدواج اور تاہل کی زنجیریں پہنا ڈالی گئیں۔

مولینا حبیب الرحمٰن عثمانی کی حسن تدبیر

چنانچہ اکابرینِ دیوبند خصوصاً مولینا حبیب الرحمٰن عثمانی (جو اس وقت دارالعلوم کے مہتمم ثانی تھے) نے وہ تدبیر اختیار فرمائی جو اہلِ یمن نے حضرت معمرؒ[1] کے روکنے کے لئے کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی شادی کی اجمالی تفصیل حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب نے بلیغانہ ایجاز کے ساتھ یوں رقم فرمائی ہے:۔

ہجرت سے روکنے کی سعی

قیامِ دیوبند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحبؒ نے

---

[1] حضرت معمر بصرہ کے رہنے والے تھے اور اس جلیل القدر عالم اور حافظِ حدیث کو یہ شرف و مجد بھی حاصل تھا کہ موصوف تبع تابعین میں سے تھے اور سفیان ثوری، شعبہ، سفیان بن عیینہ اور عبداللہ بن مبارک جیسے اکابر کو آپ ہی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

لَمَّا دَخَلَ مَعْمَرُ الْيَمَنَ كَرِهُوا أَنْ يَخْرُجَ مِنْ بَيْنِهِمْ فَقَالَ رَجُلٌ قَيِّدُوهُ فَزَوِّجُوهُ۔ (شرح الامام النووی علی البخاری صہ۱۲، ج۱۔)

معمر (بصرہ کے رہنے والے تھے) جب یمن میں داخل ہوئے تو اہلِ یمن نے یہ گوارا نہ کیا کہ معمر یہاں سے واپس چلے جائیں۔ ایک شخص نے کہا کہ اگر انکو روکنا چاہتے تو معمر کو یہاں قید کر لو یعنی انکا نکاح کردو۔

باشارۂ اکابر درس و تدریس کا مستقل سلسلہ جاری تو فرما دیا، لیکن ہجرت کی پاک نیت سے دستبردار نہ ہوئے اور برابر حاضری حرم نبوی و حرم الٰہی کا جذبہ آپ کو دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا، جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا۔ اور اکابر بلطائف تعبیر اسے ٹلاتے جاتے۔ لیکن خطرہ انہیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے اور دار العلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی امیدوں کی مجوزہ ہستی سے دستبردار ہونا پڑ جائے، اس لئے یہ حضرات بھی انہیں مستقل جمانے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

ازدواجی علائق

آخر کار انہیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ ہی لی اور ارادہ کیا کہ حضرت ممدوح کا نکاح کر دیا جائے۔ گو اس سے حضرت ممدوح کو انکار تھا مگر بلطائف تدبیر انہیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا[1]۔ میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اور حضرت والد ماجد قدس سرہٗ نے اس کی کفالت فرمائی اور نکاح کی اس تقریب کو اسی طرح انجام دیا جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔

بارات بھوپال گئی[2]۔ علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی، بڑی پُر مسرت

---

[1] یہ ۱۳۲۶ھ کا واقعہ ہے جب شاہ صاحب کی شادی ہوئی۔ اسوقت آپکی عمر ۴۴ سال تھی۔ کوندو

[2] چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کی زوجۂ محترمہ کے والد گرامی سید یعقوب علی صاحب ۱۸۵۷ء میں گنگوہ سے بھوپال چلے گئے تھے۔ اسی لئے بارات کو بھوپال جانا پڑا۔

کوندو

فضا میں نکاح ہوا، دُلہن آئی تو حضرت جدّہ محترمہ نے اُسی طرح گھر میں اُتارا جیسے اپنے گھر کی دُلہن اُتاری جاسکتی ہے۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی اور احقر کے زنانہ مکان کے بالاخانہ پر حضرت شاہ صاحب رح مع اہلیۂ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریبًا ایک دو سال ہی گذرے تھے کہ اولاد کی امید ہوئی، ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہلبیت کے اولاد ہونے کی ہوتی ہے، اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، گھر میں عرصۂ مدید گذر چکا تھا، کوئی بچّہ نہیں تھا، جس کی سب کو تمنّا تھی اس امید سے کہ حضرت ممدوح کے یہاں بچّہ ہونے والا ہے، سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہ مرحومہ کو بے حد خوشی تھی اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے، انہوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا کہ اچانک حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود ان کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا ہو، انہوں نے حضرت جدۂ مرحومہ سے عرض کرایا کہ "دسؔ سال تک تو میں تنہا تھا، اب دوؔ سال سے متأہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں، اب اولاد کی اُمید ہے تو اب میں ایک اور دوؔ کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالے اور ڈالتے رہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لیکر رہوں۔"

حضرت ممدوحہ اور والدِ ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے تھے، لیکن اُدھر سے اصرار بڑھا تو انہوں نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول فرمالیا اور حضرت شاہ صاحب محلۂ دیوان کے ایک مکان میں فروکش ہو گئے۔

تنخواہ لینے پر رضا مند ہونا پڑا

اس صورتِ واقعہ کے بعد ذمہ داران مدرسہ کے لئے موقع آگیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرت ممدوح پر اصرار کریں۔ چنانچہ کیا۔ اور تاہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورتِ حال کے ماتحت طوعاً و کرہاً ممدوح کو بھی یہ اصرار قبول کر کے تنخواہ لینے پر راضی ہو جانا پڑا، اور اب ایک گھر ہستی کی طرح اُن کی عائلی زندگی کا دَور شروع ہو گیا۔

اس مکان کی رہائش کے بعد عزیزم مولوی ازہر شاہ سلمہٗ کی بہن عابدہ مرحومہ پیدا ہوئی، اور پھر میاں ازہر شاہ سلمہٗ معرض وجود میں آئے۔ تجرد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی اور زندگی کے علائق ایک ایک کر کے بڑھتے رہے، اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحب مُقیّد ہو گئے، اور ہجرت کر جانے کا وہ جذبہ سُست پڑ گیا، بالآخر ترک کر دینا پڑا، اور باطمینانِ خاطر دارالعلوم میں مسند نشینِ درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔

دارُالعلوم کی صدر مدرّسی

اور

حضرت شیخُ الہند کی جانشینی

(شوّال ۱۳۳۳ھ
اگست ۱۹۱۵ء)

ایک مقدّس انقلابی

دارُالعلوم دیوبند کے عظیمُ الشّان صدر مدرّس حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن رحمۃُ اللہ علیہ جامعُ الکمالات ہستی تھے۔ محدث جلیل اور فقیہہ نبیل ہونے کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں بے مِثال تھے۔ حدیث اور فقہ میں اسی امتیاز نے آپ کو دارُ العلوم کی صدارتُ المعلّمین کا صحیح ترین مسند نشین بنادیا تھا۔ بے نظیر علمی کمالات کے ساتھ ساتھ آپ نے زہد و تقویٰ اور تصوّف و طریقت میں بھی آخری منزلیں طے کی تھیں اور اپنے وقت کے اُن اولیاءِ کبار میں سے تھے جِن کی عظمت کا مخالفین کو بھی اعتراف تھا۔ پھر ان تمام خصوصیّات کے علاوہ آپ کو یہ ذاتی امتیاز حاصل تھا کہ ہندوستان کی سیاست اور بین الاقوامی سیاست کے بارے میں آپ کے مخصوص نظریات اس قسم کے تھے جو آپ کو حال سے زیادہ مستقبل کا مُفکّر ثابت کر رہے تھے۔ آپ انگریزی

امپیریل ازم کے شدید ترین مخالف اور انگریزوں کے اثر و تسلّط کو ہندوستان، مصر اور تمام مشرقی ممالک سے مکمّل اور غیر مشروط طور اکھاڑ پھینکنے کے زبردست داعی تھے۔ جس زمانہ میں اکثر سیاسی لیڈر انگریز کے زیر سایہ چند ایک رعایات کا نام ہوم رول رکھ کر آئینی اصلاحات کی بھول بھلیوں میں سرگرداں رہتے تھے۔ شیخ الہندؒ اس زمانہ میں بھی مکمّل انقلاب اور آزادی کامل کے سوا ہندوستان کے مستقبل کے لئے دوسرے کسی نقشے کا تصوّر کرنا بھی لایعنی سمجھتے تھے۔ آپ کی عادت شریف تھی کہ اپنے شاگردوں پر بہت گہری نظر رکھتے تھے اور تدریس کے زمانہ میں ہی ایک طرف ان کی علمی اور عملی خصائل کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے، اور دوسری طرف اپنے وسیع مشن کی ضرورتوں کے لحاظ سے یہ بھی دیکھتے رہتے تھے کہ ان شاگردوں میں سے کس کو حدیث سے، کس کو فقہ سے اور کس کو سیاست اور انقلاب کے کام سے فطری مناسبت ہے۔ آپ ہر شاگرد کے فطری اور خداداد رجحان کو صیقل دینے اور جلا دینے کا حکیمانہ فرض درس کے ساتھ ساتھ ہی انجام دیتے جاتے تھے۔

استاد پر شاگرد کی صلاحیتوں کا انکشاف

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ذہنی صلاحیتیں حضرت شیخ الہند پر ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک طالب علمانہ مراحل کے زمانہ میں ہی روشن ہو چکی تھیں اور آپ پر واضح ہو چکا تھا کہ ذہانت و فطانت، متانت و دیانت کا پُتلا یہ کشمیری نوجوان

میدانِ سیاست کے لئے نہیں بلکہ مسندِ تدریسِ علومِ دین کے لئے تخلیق کیا گیا ہے۔ وقت آنے پر اس سے یہی کام لینا اس کی قابلیتوں کا صحیح استفادہ کرنا ہوگا۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد مدرسۂ امینیہ دہلی کے پنج سالہ دور تدریس میں شاہ صاحب کی جو عالمانہ و معلمانہ شہرت علمی حلقوں میں پھیل گئی اس سے حضرت شیخ الہندؒ نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اس پر گہری نظر رکھتے تھے۔ دہلی سے کشمیر واپس آکر سنہ ۱۳۲۰ھ سے سنہ ۱۳۲۸ھ تک مدرسۂ فیضِ عام کے سلسلہ میں شاہ صاحب سے دینی اور ملّی ترقی کے لئے جس بے تابی اور بے چینی کا ظہور ہوتا رہا اس سے بھی حضرت شیخ الہندؒ کسی طرح بھی بے خبر نہیں ہو سکتے تھے اسی زمانہ کا واقعہ ہے اور یہ واقعہ حضرت شیخ الہندؒ کی شاہ صاحب کے حالات پر توجہ مسلسل کا ثبوت ہے کہ جب علامہ ظہیر احسن شوق نیموی ؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تالیف "آثارُ السُّنَن" کے کچھ اجزاء بغرضِ ملاحظہ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں بھیجے تو حضرت ممدوح نے انہیں وہ اجزاء واپس ارسال کئے اور مولانا شوق نیموی کو مشورہ دیا کہ وہ اس بارے میں میرے ایک شاگرد رشید انور شاہ کشمیری سے مراسلت کریں اور ان سے مشورہ لیں۔ چنانچہ آپ ہی نے محدّث نیموی کو شاہ صاحب کا پتہ بھی لکھ دیا۔ شاہ صاحب اِن دنوں کشمیر میں ہی تھے۔ حضرت شیخ الہند کی اُمید کے مُطابق مولانا شوق نیموی کے مسودات پر شاہ صاحب نے اتنے اِضافے فرما دئے کہ بقولِ خود حضرت شاہ صاحب کے کہ "ہم نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں اُن کی اصل کتاب سے زیادہ تھے۔"

۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک (قریباً چھ سال) حضرت شاہ صاحب دارالعلوم دیوبند کے درجۂ اعلیٰ کے معلمین میں شامل رہے اور حضرت شیخ الہندؒ کی آنکھوں کے سامنے مختلف علوم کی اونچے درجے کی کتابیں پڑھاتے رہے۔ حدیث میں صحیح مسلم، ابن ماجہ اور ابوداؤد کا درس آپ کے ذمے تھا۔

پہلا مرحلہ۔ مدرّس درجۂ عالیہ جب اکابرینِ دیوبند نے حضرت شاہ صاحبؒ کو ۱۳۲۸ھ میں دارالعلوم کی مُعلّمی قبول کرنے پر آمادہ کیا تو شاہ صاحب کی شخصیت کے متعلق ماضی کے یہی تجربات اُن کی خواہشات کے محرّک اور رہبر تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحبؒ کی ذات کے ساتھ ان حضرات کا اپنی اونچی توقّعات وابستہ کرنا مبنی برحقائق تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ خاص مولینا محمّد صدّیق نجیب آبادی نے "انوارُ المحمود فی شرح سُننِ ابی داؤد" حضرت شاہ صاحب کی اسی زمانہ کی امالیات کی بناء پر لکھی ہے۔ (اس کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔)

صحیح مُسلم کے درس کی انوری تقاریر پر مُشتمل ایک مجموعہ امالی شاہ صاحب کے ایک اور مشہور شاگرد اور عالم و فاضل مولینا سیّد مناظر احسن صاحب گیلانی نے بھی تیار کی تھی جو چھپ نہ سکی اور ضائع ہوگئی۔[۱]

---

[۱] عجائباتِ تقدیر میں سے اس چیز کو شمار کرنا چاہیئے کہ حضرت شاہ صاحب کے قابل شاگردوں نے آپکی تقاریر (باقی برصفحۂ آئندہ)

مولینا گیلانی مرحوم ۱۳۳۰ھ کے دورۂ احادیث کے طلبا میں سے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب حضرت شیخ الہندؒ کی موجودگی میں ہی سوائے صحیح بخاری اور جامع ترمذی کے صحاح ستہ کی دیگر سب کتابیں پڑھا رہے تھے۔ جب حضرت شیخ الہندؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ کے مدرسانہ کمالات اور علم حدیث میں آپ کے تبحر کا براہِ راست اندازہ لگا لیا تو آپ کو شاہ صاحب کے وجود میں خود اپنی ذات کا عکس دکھائی دینے لگا۔ اس مرحلے پر حضرت شیخ الہند نے یقیناً یہ محسوس کر کے اطمینان کا سانس لیا ہوگا کہ ضرورت کے وقت میری ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر لے لینے کی اہلیت کی مالک ایک شخصیت منصۂ شہود پر آ گئی ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) درسِ حدیث کی جو امالیات مرتب کی تھیں ان میں سے متعدد گم ہوگئیں یا عاریۃً لینے والوں نے واپس نہ کیں۔ مولینا قاری محمد طیب صاحب نے کافی عرق ریزی سے چار پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک املائی بیاض تیار کی تھی جس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی نادر علمی تحقیقات درج کی گئی تھیں۔ افسوس ہے کہ مولینا طیب صاحب سے یہ کاپی ایک طالب علم نے مستعار لی اور بقولِ حضرت موصوف کے انہوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریتاً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں۔

صاحبِ نزہۃ الخواطر مولینا سید عبدالحیؒ لکھنوی کے فرزندِ ارجمند اور مولینا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے برادرِ مکرم مولینا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (فاضل دیوبند' بی ایس سی ایم بی بی ایس' سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے ۱۳۲۹ھ میں دورہ حدیث دیوبند میں پڑھا۔ حضرت شیخ الہندؒ سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی۔ حضرت شاہ صاحب سے ابوداؤد شریف پوری اور مسلم شریف کا بڑا حصہ پڑھا۔ مولینا عبدالعلی صاحب موصوف اور آپ کے ایک اور ہم درس ساتھی مولینا خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی حضرت

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

شیخ الہند کا تاریخی اقدام

جب ۱۹۱۴ء کی پہلی عالمگیر جنگ
(First world war)
کا شعلہ بھڑک اٹھا، حضرت شیخ الہند مشرق سے انگریزی تسلط کے خاتمے کی تمنا اور ہندوستان کی آزادی کے جذبے سے بے تاب ہو گئے۔ سرحدات، افغانستان اور خود ہندوستان کے اندر سعی آزادی کو بے ثمر دیکھ کر آپ نے سرزمینِ حجاز کو اپنی مساعی کا مرکز بنا کر انگریزی راج کے خلاف ایک وسیع محاذ منظم کرنا چاہا اور دیوبند سے حرمینِ شریفین کا سفر اختیار کیا۔

"چونکہ آپ دار العلوم کو ایک امانت مان کر اپنے آپ کو پہلے اللہ تعالیٰ کے سامنے اور اس کے بعد قوم کے سامنے اس امانت کی حفاظت کا ذمہ دار سمجھتے تھے۔ اس لئے اس نازک موقعہ پر آپ کو ایسے انسان کی تلاش تھی جو آپ کی عدم موجودگی میں دار العلوم کو آپ کے وضع کردہ طریقۂ کار پر چلائے اور خاص کر تدریسِ حدیث میں آپ کے طرزِ فکر کی ترجمانی کما حقہ، کر سکے۔

دوسرا مرحلہ۔ مسندِ صدارت المدرسین

حضرت شیخ الہند کو دار العلوم کے تمام معلمین میں سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے نوادرِ علیہ کو مشترکہ طور قلمبند کر چکے تھے۔ ان دونوں حضرات کے تحریر کردہ امالی کے نوٹ کا یہ نادر مجموعہ بھی کوئی صاحب اڑا کر لے گیا۔ کسی کا مشہور شعر ہے:

"دیوانِ ظہیر فاریابی در مکہ بدزد اگر بیابی"۔

ظہیر فاریابی کے دیوان کو توصرف چرانے کی ترغیب دی گئی تھی مولانا انور شاہ کشمیری کی امالیات کو عاریتاً لینے کے بعد واپس نہ کرنے کا دستور رائج ہو گیا۔

صرف مولینا محمد انور شاہ صاحب ایک ایسے معلّم دکھائی دئے جن میں یہ مطلوبہ اوصاف بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی نیابت کے لئے شاہ صاحبؒ ہی کو منتخب فرمایا۔ حضرت مولینا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کے الفاظ میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ "دارُ العلوم کی جانشینی ایک ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و بُرید کے حضرت شاہ صاحبؒ کے قامتِ موزون پر راست آ رہا تھا۔"

حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز اختیار فرمانے کے وقت اوروں کو تو یہ فکر تھی کہ اب آپ کی جگہ دارُ العلوم کا صدر مُدرّس کون ہو؟ قیاس یہی تھا کہ حضرت شیخ الہند کے بہت سے سینئر رُفقاء ہیں۔ (جن میں سے بعض حضرت شاہ صاحبؒ کے اُستاد بھی تھے) اغلبًا ان ہی میں سے کوئی ہوگا جس کو حضرت شیخ الہندؒ سفر حجاز اختیار کرنے کے وقت اپنی جگہ پر بٹھائیں گے۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ نے ایک تعجبُ خیز (اور بہت سے لوگوں کے لئے حیرت انگیز) قدم اُٹھایا، اور دارُ العلوم کے مُدرّسین میں سے ایسے مُدرّس کو اپنی جگہ مَسند آرائے صدارتِ معلّمین بنادیا، جس کی مُدرّسی کی مُدّت پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی اور وہ تھے مولینا انور شاہ کشمیری۔ اس طرح حضرت شاہ صاحب کچھ چالیس یا اکتالیس سال کی عُمر میں دینی اور علمی مقامِ عزّت کے اُس بلند ترین مینار پر پہنچ گئے جس سے اونچا ہندوستان بھر میں کوئی اور مقام نہ تھا۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

مولانا طیب صاحب کی تحریر

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب عم فیضہم کے مضمون مطبوعہ "حیات انور" میں سے یہاں کچھ حصے عنوانِ زیرِ بحث پر بصیرت افروز روشنی ڈالتے ہیں۔ اس لئے ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

"(جب) حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حجازِ مقدس جانے کا قصد فرمایا اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیتِ ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بری محقق تھی۔ مگر شیخ زمانہ اور دار العلوم کے شیخ الحدیث کا دار العلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ زمانہ بھی پُر آشوب ہو گیا تھا۔ حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے اور حضرت شیخ اور دار العلوم کے بہی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام نہ لے، اور سب سے بڑا خطرہ دار العلوم کی ایسی فردِ فرید شخصیت نمونۂ اکابر و اسلاف اور یگانہ روزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا، جو کچھ کم حادثہ نہ تھا۔ لیکن دار العلوم کے ذمہ دار مُدبّرین نے حضرت شاہ صاحبؒ کو دار العلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرے کی روک تھام کر لی تھی اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دار العلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت شیخ کی دار العلوم سے اس عارضی جُدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ رو براہ نہ آسکا۔ مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی، اگر شیخ الہندؒ برائے چندے سامنے

نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرت (شیخ الہند) کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درس ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا اُن کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے جس سے بلا تأمّل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔ بلکہ حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہیں تھیں اور حضرت شاہ صاحب کا اندازِ درس درحقیقت دُنیائے درس و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہُوا۔" (حیاتِ انور صـ۲۰۸ و صـ۲۰۹)

تقسیم کار

صاحبِ "التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح" مولٰنا محمد ادریس کاندھلوی مرحوم (سابق شیخ الحدیث دار العلوم اشرفیہ لاہور) حضرت شاہ صاحب کے ان تلامذہ میں سے تھے جن کو فنِ حدیث کی مناسبت کے لحاظ سے آپ سے خصوصی فیض حاصل ہُوا تھا۔ اور یہ فیض آپ کی وساطت سے ان ہزاروں لوگوں تک پھیلا جو دار العلوم اشرفیہ لاہور سے ہر سال حدیث کا دَورہ ختم کر کے نکلتے رہے۔

مولٰنا محمد ادریس صاحبؒ نے اپنے ایک مضمون میں حضرت شیخ الہند

کی روانگی حجاز کے موقعہ پر شاہ صاحب کی جانشینی کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ آپ نے رخصت ہونے سے پہلے احادیث کی کون کون سی کتابوں کا درس اپنے کس کس شاگرد کے ذمّہ کیا۔ مولانا کاندھلوی تحریر فرماتے ہیں :-

"حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ اپنے زمانہ میں علم اور وَرع کے لحاظ سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ تھے۔ حدیث کے پروانے آپ کے گرد جمع تھے۔ آپ کے بے شمار شاگردوں میں حضرت مولانا انور شاہ امام بُخاریؒ کا نمونہ تھے۔ اور حضرت مولانا شبیر احمد عُثمانی دیوبندیؒ امام مُسلمؒ کا نمونہ تھے۔ اور حضرت مولانا سیّد اصغر حسین دیوبندیؒ ابو داؤد کا نمونہ تھے۔ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے جب ہندوستان سے حرمینِ محترمین کا قصد فرمایا تو صحیح بخاری کا درس مولانا انور شاہ کے سپرد فرمایا اور صحیح مُسلم مولانا شبیر احمد عثمانی کے اور سُننِ ابی داؤد مولانا سیّد اصغر حسین صاحب کے سُپرد فرمائی چنانچہ یہ تینوں حضرات ساری عمر یہی تین کتابیں پڑھاتے گذر گئے جو ان کے امام احمد ان کے سُپرد کر گئے تھے۔ آج ہندوستان کی سرزمین میں صدہا جگہ بخاری، مُسلم اور ابو داؤد کے درس جاری ہیں۔ جن کے درس دینے والے شیخ الہند کے خُدّام اور خدّامُ الخدّام ہیں۔ لیکن ان اسباقِ ثلاثہ کی خصوصی تقسیم کی خصوصیّت سوائے ان حضراتِ ثلٰثہ کے اور کسی کو نہیں۔"

(حیات انور صفحہ ۱۱۱)

اسیرِ مالٹا حضرت شیخ الہندؒ

۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہندؒ

دیوبند سے سفر حجاز پر روانہ ہو گئے تو کس کے وہم و گمان میں تھا کہ ساتِ سمندر پار سے آئے ہوئے ظالم انگریز حکمران حضرت موصوف اور آپ کے دیگر رُفقاءِ سفر (خاص کر آپ کے خصوصی فیض یافتہ مولینا سیّد حسین احمد مدنی) کو گرفتار کر کے جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رکھیں گے اور اس طرح سے تقریباً پانچ سال تک حضرت شیخ الہند کو دیوبند سے دور رکھا جائے گا۔

قیامِ حجاز میں حضرت شیخ الہندؒ نے آزادیٔ وطن کے لئے کیا کیا اقدامات کئے، اور جب آپ کو گرفتار کر کے مالٹا کے جزیرہ میں نظر بند رکھا گیا تو آپ نے کیا کیا تکلیفیں برداشت کیں؟ یہ ایک بہت بڑا موضوع ہے اور اس پر باقاعدہ تصنیفیں بھی منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ خاصکر مولینا سید حسین احمد مدنی کی تصنیفات اسیرِ مالٹا اور نقشِ حیات میں اس کی کافی تفصیل ہے۔ اس لئے اس واقعہ کی تفصیلات درج کرنے کا یہ موقعہ و محل نہیں ہے۔ بایں ہمہ چونکہ حضرت شیخ الہندؒ علمِ حدیث میں شاہ صاحب کے سب سے بڑے اُستاد اور مُربّی تھے۔ اس لئے آپ کے حالات پر مشتمل ایک مختصر خاکہ کو ہم کتاب ہذا کے تتمّات میں درج کر رہے ہیں۔ (ان شاء اللہ)

یہاں صرف اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہند دیوبند سے روانہ ہوئے اور ۲۰ رمضان ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء کو طویل اسارت کے بعد واپس وطن آ گئے۔ وطن پہنچکر آپ کو چند اسفار پیش آئے اور واپسی سے رحلت تک کُل ۶ ماہ تک بقیدِ حیات تھے۔ آخر ۱۸ ماہِ ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۱ء کی صبح کو آپ نے انتقال فرمایا۔ (رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً)

تیسرا مرحلہ۔ مستقل صدر المدرسین

اس وقفہ قلیلہ میں سیاسی مشاغل اور علالت مسلسل کی وجہ سے حضرت شیخ الہند کو دار العلوم کے صدر المدرسین کی حیثیت سے از سر نو مسند تدریس پر رونق افروز ہونے کی فرصت ہی نہ ملی اور حضرت شاہ صاحب اس امید پر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے میں لگے رہے کہ جلد ہی حالات تبدیل ہوں گے اور حضرت الاستاذ اپنا کام سنبھال لیں گے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ چنانچہ ان ہی حالات میں حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کا حادثہ پیش آیا تو منتظمین دار العلوم کو حضرت موصوف کا عہدۂ جلیلہ پُر کرنے کے لئے شخصیت کی تلاش میں پریشان ہونے کی نوبت نہ آئی۔ حضرت شاہ صاحب کو بذاتِ خود پانچ چھ سال قبل حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی جگہ پر بٹھایا تھا اور اس مدت میں شاہ صاحبؒ کے محدثانہ و مدرسانہ کمالات، اکابر اہتمام کو اور دار العلوم کے تمام مدرسین اور طلباء کو اور مدرسہ کے باہر ملک کے اہل علم کو اپنا گرویدہ بنا چکے تھے۔ اس لئے سب کی نظروں میں اب حضرت شیخ الہند کی خالی کردہ نشست کو پُر کرنے کے لئے حضرت شاہ صاحب سے موزون تر ہستی ملک بھر میں موجود نہ تھی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چھ سال قبل سفرِ حجاز کا قدم اُٹھانے کے وقت شاہ صاحب کو اپنے فرائض سونپ کر اپنی پسند اور اپنے انتخاب کا اظہار کر دیا تھا

مولانا آزاد کا مطالبہ

اسی طرح اپنی وفات سے چند دن پہلے بھی شاہ صاحب کو دار العلوم کے لئے ضروری

ترین شخصیت قرار دیتے ہوئے مولٰینا آزاد کا یہ مطالبہ مسترد فرمادیا تھا کہ شاہ صاحب کی خدمات کلکتہ کے جدید مدرسہ کے لئے عطا کی جائیں۔ اس کی تفصیلات حضرت مولٰینا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقشِ حیات" میں لکھی ہیں۔ آپ کے ارشاد کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا کی اسارت سے رہا ہو کر جب واپس اپنے ملک کو وارد ہوئے تو آپ کی وفات سے چند دن قبل کا ہی ایک واقعہ ہے کہ مولٰینا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بنگال میں بہت اعلیٰ پیمانہ پر ایک عربی اور دینی مدرسہ قائم کر کے حضرت شیخ الہندؒ سے استدعاء کی کہ دارالعلوم کلکتہ کے لئے مولٰینا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی خدمات عطا کی جائیں تاکہ آپ (شاہ صاحب) درجۂ اعلیٰ کے طلباء کو درسِ حدیث دیں اور تازہ قائم شدہ درس گاہ کامیاب ہو جائے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے مولٰینا ابوالکلام آزاد کا یہ مطالبہ یہ کہہ کر مسترد فرمایا کہ شاہ صاحب تو کسی صورت میں بھی دارالعلوم دیوبند کو نہیں چھوڑ سکتے ہیں جس میں ان کی ذمہ داریاں نہایت ہی گراں بار ہیں۔ البتہ میں ان کے بدلے ایک دوسرا مدرس بھیجوں گا۔ (چنانچہ مولٰینا مدنیؒ کو ہی حضرت شیخ الہندؒ نے کلکتہ روانہ کیا لیکن ابھی آپ راستہ میں ہی تھے کہ شیخ الہندؒ کے انتقال کا واقعہ پیش آگیا۔)

ان تاریخی حقائق سے واضح ہے کہ اپنی وفات سے قبل یعنی ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء میں بھی حضرت شیخ الہندؒ شاہ صاحب ہی کو اپنا صحیح جانشین تصور کرتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ جس طرح سفرِ حجاز کے وقت شاہ صاحب نے انکی خالی کردہ نشست کو پُر کیا اسی طرح آپ کے سفرِ آخرت کے وقت بھی اس

نشست پر آپ ہی جمے رہیں۔ چناں چہ جب حضرت شیخ الہندؒ انتقال کر گئے تو حضرت شاہ صاحب حسب سابق صدارت المعلمین کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ یہاں تک کہ ۱۳۴۶ھ میں آپ نے شعبۂ اہتمام کے ساتھ اختلافات ہونے پر دار العلوم سے علیحدگی اختیار کی۔ اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔

دار العلوم میں کوئی ۱۹ سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے دوران حضرت شاہ صاحب نے علماء کی ایک بڑی تعداد کو تیار کیا جو اپنے وقت کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔

دُنیائے درس میں آپ نے کیا انقلاب لایا' وہ بھی ایک اہم ترین اور دلچسپ موضوع ہے۔ اس سلسلے میں مجموعۂ ہذا کے بیشتر مقالات میں اس امر کی وضاحت آچکی ہے۔

دار العلوم کے سابق صدر المدرسین

دار العلوم دیوبند کی بنیاد ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ڈالی ہے۔ تب سے آج تک بہت سی برگزیدہ اور نادرۂ روزگار ہستیاں اس ادارہ کے صدر المدرسین کے عہدۂ جلیلہ پر فائز رہ چکی ہیں۔ دار العلوم کے اوّلین صدر مدرس مولینا محمد یعقوب نانوتوی (م ۱۳۰۲ھ) سے پانچویں صدر مدرس مولینا سیّد حسین احمد مدنی (م ۱۳۷۷ھ) تک مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ نے ان حضرات کی تدریسی خصوصیات کی نہایت بلیغ انداز میں جو تصویر کھینچی ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"دارالعلوم کے اوّل صدر مدرس حضرت مولینا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ اپنی جامعیتِ علوم و فنون، جودتِ طبع، ذکاوت، احساس اور رموزِ ولایت میں شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کئے جاتے تھے اور فنِ حدیث میں آپ کا اندازِ درس حکیمانہ، عارفانہ اور ساتھ ہی عاشقانہ تھا آپ کے بعد ایک قلیل عرصہ کے لئے حضرت مولینا سیّد احمد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ صدر نشینِ مسند درس ہوئے، آپ فنونِ عقلیہ و ریاضیہ میں امام وقت سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے دینیات کے درس میں آپ کا اندازِ درس عاقلانہ، مستدلانہ اور مفکرانہ تھا۔ آپ کے بعد حضرت شیخنا شیخ الہند مولینا محمود حسن قدس سرہٗ اس گدی پر بٹھلائے گئے آپ جامعیتِ علوم کے ساتھ شیخِ کامل، عارف باللہ، جامع معقول و منقول اور اخلاقِ فاضلہ میں راسخ القدم تھے۔ اس لئے آپ کا اندازِ درس اپنے استاد حضرت قاسم العلوم قدس سرہٗ کے نقشِ قدم پر عالمانہ، متکلمانہ، فقیہانہ اور فانیانہ تھا، ان کے بعد آپ کے ارشد التلامذہ آیۃٌ من آیات اللہ، استاذنا حضرت اقدس علامہ دہر مولینا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ مسند آرائے درسِ کتاب و سنّت ہوئے۔

آپ کا غیر معمولی حافظہ، تبحّر علمی، حفظِ کتب و سفائن اور وعاءِ علوم و فنون گویا ایک اعجازی شان رکھتا تھا۔ عقل و نقل کا ہر علم و فن اور اس کے تفصیلی اصول و فروع آپ کو اس طرح مستحضر تھے کہ آپ کو (اپنے معاصر علماء و فضلاء میں) وقت کا چلتا پھرتا کتب خانہ کہا جانے لگا۔ اس لئے آپ کا اندازِ درس حدیث حافظانہ، داعیانہ، محدثانہ اور متبحرانہ تھا، آپ کے بعد حضرتِ اقدس مولینا سیّد حسین احمد صاحب مدظلہ (مرحوم) سے

اس گدی کو رونق بخشی گئی، تو آپ کے جوشِ جہاد، ذوقِ عمل، ہمتِ باطنی اور وسعتِ اخلاق نے علم کو عمل کے ہر ہر گوشہ میں دوڑا کر عملی سانچوں میں پیش کیا اور علمی کمالات پر دوامی عمل کو غلبہ پانے کا موقع ملا، اس لئے آپ کے درس کا انداز عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اسپرٹ سے بھرپور اور جذباتِ عمل سے زیادہ سے زیادہ لبریز ہوتا ہے، جس سے طالبوں کے قوائے عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جذباتِ عمل زیادہ سے زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں الخ"

(مکتوباتِ شیخ الاسلام ج ا ص۸ مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی)

مرحوم مولانا سید محمد میاں صاحب کی تحریر

مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم فضلائے دیوبند اور حضرت شاہ صاحب کے اُن تلامذہ میں سے تھے جو ہندوستان کے رجالِ علم کے حالات قلم بند کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ علماءِ ہند کا ماضی اور علماءِ ہند کے مجاہدانہ کارناموں پر آپ نے ہزارہا صفحات تحریر کئے ہیں جو کئی ضخیم جلدوں میں شایع ہو چکے ہیں زندگی کے آخری برسوں میں آپ جمعیۃ العلماء ہند کے جنرل سکریٹری اور مدرسۂ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تھے۔ اس منصب پر آپ اپنی وفات تک فائز رہے جو ماہِ محرم ۱۳۹۶ھ ۱۹۷۵ء میں واقع ہوئی۔

حضرت شاہ صاحب کی سوانح حیات کے متعلق میاں صاحب مرحوم کا جو مضمون "حیاتِ انور" میں شامل ہے ہم یہاں اس کا ایک اہم حصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:-

دارُالعلوم کی علمی زندگی میں تغیّر و اضافہ

"حضرت شاہ صاحب کے علمی فیوض سے

دارُالعلوم دیوبند کی علمی زندگی میں کیا تغیّر اور اضافہ ہُوا۔؟ یہ بہت ہی دلچسپ موضوع ہے۔ مگر اس کے لئے ایسے عالم کے قلم کی ضرورت ہے جو درس و تدریس کا پورا تجربہ رکھتا ہو اور جس نے حضرت شاہ صاحب سے پہلے ہی دارُالعلوم کی علمی زندگی کا گہری نظر سے مُطالعہ کیا ہو۔ احقر ان دونوں سعادتوں سے محروم ہے۔ لہٰذا اس موضوع کا حق تو ادا نہیں کر سکتا تاہم اپنی فہمِ ناقص و استعدادِ ناتمام کے مُطابق آپ کے درس کی چند خصوصیّات قلمبند کرتا ہے انہیں کو تغیّر و اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۱) تحقیق و تفتیش

حضرت شاہ صاحب کا درس اس پر قناعت نہیں کرتا تھا کہ عبارت کا مطلب سمجھا دیا جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ سے متعلق تحقیق و تدقیق کا سیر حاصل خُلاصہ ہُوا کرتا تھا۔ جس میں ہر دعوے کی دلیل کتاب کے حوالہ سے پیش کی جاتی تھی۔ یہ خصوصیّت حضرت شاہ صاحب ہی کی تھی کہ آپ کے سامنے ایک بینچ پر کتابوں کا انبار رہتا تھا اور مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ زبانی حوالہ پر قناعت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کتاب کھول کر اصل عبارت پیش فرما دیتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس کتاب کا حوالہ دیا جاتا وہ انبار میں موجود نہ ہوتی تو اس کو منگواکر وہ عبارت پیش فرماتے۔ اور اگر وہ کتاب اُس وقت دستیاب نہیں ہو سکی تو اگلے روز وہ کتاب اپنے ساتھ لاتے اور

عبارت پڑھ کر سُنا دیتے۔

یہ حضرت شاہ صاحبؒ کی قوّتِ حافظہ کا کمال تھا کہ جس عبارت کا حوالہ دیتے تھے اُس کے صفحات بھی گویا آپکو محفوظ ہوتے تھے۔ چنانچہ فہرستِ مضامین سے آپ شاذ و نادر ہی مُدد لیتے تھے بلکہ عام طریقہ یہی تھا کہ سینکڑوں صفحات کی کتاب میں بھی عبارتِ مُحوّلہ کو اس طرح پیش کر دیتے تھے جیسے پوری کتاب آپ کو حفظ ہے۔ اور اُس کے مضامین کے صفحات آپ کے ذہن میں مُستحضر ہیں۔ اس کمال کا حیرت انگیز مُظاہرہ اُس وقت ہوتا تھا جب طلبہ کے سوالات پر کوئی تازہ بحث شروع ہو جاتی اور حوالہ کے لئے کوئی ایسی کتاب منگائی جاتی جس کا مُطالعہ سالہا سال پہلے کیا ہو۔ یہ کتاب خواہ کتنی ہی ضخیم ہوتی، محولہ عبارت اس طرح پیش کر دی جاتی گویا اس کے صفحات اور سطور آئینۂ قلب پر نقش ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طریقِ کار نے تلامذہ میں تحقیق و تفتیش کا نیا ذوق پیدا کر دیا۔ یہ ذوق فقط حوالۂ کتاب سے مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اس کی کاوش اس وقت ختم ہوتی ہے جب اصل عبارت اصل کتاب میں مُطالعہ کر کے بحوالۂ صفحات اس کو نوٹ کر لیا جائے۔

(۲) تاویل کے بجائے تطبیق و توجیہہ

فنِ حدیث وُسعتِ نظر چاہتا ہے۔ روایت بالمعنیٰ کرتے ہوئے ایک ہی مفہوم کو راوی حضرات نے موقع اور محل کے لحاظ سے مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اختلافِ الفاظ کے ساتھ

بسا اوقات انداز میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک بات جو ترغیب و تشویق کے طور پر لسانِ رسالت سے صادر ہوئی تھی، اسکو قطعی حکم کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ کوئی حدیث طویل تھی۔ راوی نے کسی وقتی ضرورت کی بناء پر پوری حدیث نہیں بیان کی، بلکہ ضرورت کے مطابق اس کا ایک حصہ نقل کر دیا ہے۔ جو راوی نے اس جملہ کا وہی مفہوم لیا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا منشاءِ مبارک تھا۔ لیکن بعد کے راویوں نے جب تنہا اس جملہ کو نقل کیا تو اصل مفہوم ذہن میں نہیں رہا۔

اس طرح بعد کے علماء میں ایک اختلاف کی بنیاد پڑ گئی۔ اب اس جملہ کا صحیح منشاء وہی معلوم کر سکتا ہے جس کی نظر ذخیرۂ احادیث پر ہو اور جس نے کتبِ حدیث کے ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر کے سمجھ لیا ہو کہ اصل واقعہ کیا ہے۔ اور فقط اس ایک جملہ کے نقل کر دینے سے کیا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن قاصرُ الہمّت اور کوتاہ دست ایک ہی روایت کے الفاظ لیکر اپنی مرضی کے مطابق اُن میں معنیٰ ڈالتے رہتے ہیں۔ یہ بدعت اُس اُمّت میں بہت ہی زیادہ قابلِ ملامت بن جاتی ہے جب کسی دوسری روایت میں اس کے خلاف الفاظ واقع ہوں۔

حضرت شاہ صاحب اس قسم کے معنی پہنانے کے سخت مخالف تھے۔ اس کو مدرسین کا طریقہ فرمایا کرتے تھے یعنی جو محض کارگزاری کے لئے درس دیتے ہیں۔ درس میں اپنی ذاتی تحقیق پیش نہیں کرتے۔

اس معنیٰ پہنانے کو "تاویل" فرمایا کرتے تھے اور ارشاد ہوتا تھا کہ میں تاویل نہیں کرتا بلکہ "توجیہہ" یا "تطبیق" کرتا ہوں۔ یعنی روایت کے تمام الفاظ جو مختلف انداز میں ذخیرۂ احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان سب کو سامنے رکھ کر ایک معنیٰ معیّن کیا کرتا ہوں اور جس جملہ کا جو حقیقی محل ہے اس پر منطبق کرتا ہوں۔

۳۔ فنِ حدیث اور سلفِ صالحین کا احترام

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طرز نے تلامذہ میں دو باتیں خاص طور پر پیدا کیں :۔

(الف) وہ مثلاً ترمذی شریف پڑھاتے وقت یہ جائز نہیں سمجھتے کہ ترمذی شریف کی روایت کے الفاظ پر ان کی نظر منحصر رہے، اور اس موقع کے لحاظ سے حدیث کے معنی پہنا کر سبکدوش ہو جاتے۔ بلکہ اس روایت کے وہ الفاظ لامحالہ اُن کے پیشِ نظر رہیں گے جو کم از کم صحاحِ ستّہ میں وارد ہوئے ہیں۔ اس طرح شوقِ مطالعہ کے ساتھ فنِ حدیث کا خاص احترام ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

(ب) جب وہ احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دریائے ناپیدا کنار کے ساحل پر کھڑے ہو کر اس کی وُسعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جس طرح امام ابو حنیفہ رضؓ کی عظمت اُن کے دل میں گھر کرتی ہے، اسی طرح اُن کے قلوب امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ وغیرہم ائمّۂ مجتہدین اور ائمہ حدیث کے احترام سے بھی لبریز ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے کس طرح

اِس بحرِ محیط اور اِس قلزمِ اعظم میں ساری عمر شناوری کر کے اس کی گہرائیوں سے فقہی مسائل کے موتی بر آمد کئے ہیں اور کِس طرح اس سمندر کی لہروں کو کتبِ احادیث کے آبگینوں میں سمویا ہے۔ (فجزاھمُ اللّٰہُ وشکرَ سعیَھُمْ)

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے مقلدین یا علمائے حدیث سے نفرت نہیں کرتے، اُن کی تحقیر و توہین سے اُن کے ذہن پاک ہوتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فقہی مسائل کا یہ اختلاف ایک علمی بحث اور خوشگوار نظریاتی اختلاف بن جاتا ہے جو "اِختلافُ اُمّتی رحمتہٗ" کی تصدیق پیش کرتا ہے جو متعصّبانہ جنگ و جدال اور نفرت و حقارت کے بجائے وُسعتِ مُطالعہ اور تحقیق و تفتیش کی دعوت دیتا ہے۔

۴۔ **تحقیقِ فن** شرح مُلا جامی، ایک تصنیف کی حیثیت سے قابلِ قدر کتاب ہے، مگر درسیات میں اس کا شمول دماغوں میں ایک خطرناک مرض کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے، طلبہ کی توجّہ فن سے ہٹ جاتی ہے اور ان کے دماغ اس قیل و قال اور عبارت سے متعلق مباحثہ میں پھنس جاتے ہیں، جس کا تعلّق فن کے بجائے منطقی موشگافیوں سے ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ منطقی موشگافیوں میں تو مہارت ہو جاتی ہے لیکن فن سے متعلّق مسائل میں مہارت تو درکنار اُن پر پوری طرح عبور بھی نہیں ہوتا۔ منطقی موشگافیوں کی گرم بازاری حضراتِ مُدرسین کے دِماغوں کو بھی متاثّر کرتی ہے۔ اور وہ فن کے

متعلق وسعتِ نظر پیدا کرنے کے بجائے پوری توجہ شروح، حواشی اور منہیات وغیرہ متعلقاتِ عبارت میں صرف کر دیتے ہیں۔ اور انہیں چیزوں کے استحضار کو مدرسی کی مہارت مانا جاتا ہے۔ اس کا افسوسناک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حضراتِ مدرسین کا علم درسیات کے حواشی، شروح اور منہیات تک محدود ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب اس مرض سے بہت زیادہ بیزار تھے، الفاظ کی ژولیدگی میں مشغول ہونا آپ کے نزدیک تضییعِ اوقات تھا۔ آپ کی تمام توجہ فن کی تحقیق پر مبذول رہتی تھی، اسی کا مظاہرہ آپ کے درس میں ہوتا تھا۔ آپ کی تقریر شروح اور حواشی کے اقتباسات کا مجموعہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ مسئلہ پر محققانہ تبصرہ ہوتا تھا۔

۵۔ اِملاء اور درس آج ہمارے مدرسوں میں درس کا طریقہ جاری ہے یعنی کتاب سامنے رکھ کر اس کی عبارت کی تفہیم میں وقت صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن سلف کا طرز یہ نہیں تھا، اُن کے یہاں طریقۂ اِملاء جاری تھا۔ یعنے وہ مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق پیش فرمایا کرتے تھے۔ طلبہ اس کو نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ عبارت کا سمجھنا اور اس سے مطلب اخذ کرنا طالب علم کا کام ہوتا تھا۔ اِس سے طلبہ میں قوتِ مطالعہ کے اضافے کے ساتھ فنی واقفیت پیدا ہوتی تھی اور وہ اپنے زمانہ کے ابن ہمام و ابن حجر بن جاتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے حلقۂ درس میں کتابیں بے شک کھلی رہا کرتی تھیں، طلبہ عبارت بھی پڑھتے تھے، مگر حضرت

شاہ صاحبؒ کی تقریر کا تعلق عبارت سے زیادہ تحقیق و تنقیح مسئلہ سے ہوتا تھا۔ آپ الفاظ کی بندشوں سے بلند ہو کر مسئلہ کے متعلق اپنی ذاتی تحقیق پیش فرماتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس طرز کے لئے مناسب یہ تھا کہ "درس" کے بجائے "اِملاء" کا طریقہ اختیار کیا جاتا۔ تاکہ طلبہ کی توجہ بھی تقریر کے قلمبند کرنے کی طرف رہتی اور اس طرح معلومات کا ایک نادر ذخیرہ فراہم ہوجاتا، اور آئندہ کے لئے مدارسِ عربیہ میں سلف کا طریقہ "اِملاء" دوبارہ جاری ہو جاتا جس سے حضراتِ مدرسین میں وُسعتِ نظر، اور طلبہ میں قوتِ مطالعہ پیدا ہوتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اساتذۂ حدیث (شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ) وُسعتِ نظر، مہارتِ فنِ حدیث، تفقّہ اور حذاقت میں یکتائے روزگار تھے۔ حضرت شاہ صاحب بھی انکی جلالت و عظمت اور تبحرِ علمی کے قائل تھے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے متعلق فرمایا کرتے تھے "آپ سے زیادہ ائمہ اربعہ کے مذہب کا ماہر میں نے نہیں دیکھا۔" حضرت شیخ الہند کی تحقیقات اپنی تقریروں میں پیش فرمایا کرتے تھے۔ مگر ان بزرگوں کا طریقۂ درس بالکل مختلف تھا۔ ان بزرگوں کی ابتدائی تقریر عبارتِ کتاب سے متعلق نہایت مختصر ہوتی تھی۔ ان کی مفصل تقریر اُس وقت ہوتی تھی جب طلبہ سوال کرتے اور طلبہ کے سوالات

کا تقاضا ہوتا کہ مطمئن کرنے کے لئے مفصّل تقریر کی جائے"
مگر حضرت شاہ صاحبؒ طلبہ کو اصرار کی زحمت نہیں دیتے۔
بلکہ آپ کی ابتدائی تقریر ہی مفصّل ہوتی اور پہلے ہی مرحلہ میں
آپ طلبہ کو موقع دیتے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر
غور کرلیں۔" (حیاتِ انور صـ۲۸۷ تا صـ۲۸۸)

دارالعلوم سے شاہ صاحبؒ کی مفارقت کا حادثہ

(۱۳۴۶ھ — ۱۹۲۸ء)

دانشکدوں میں اختلافِ آراء تعلیمی ادارات چاہے وہ خالص دینی اور عربی تعلیم کے ہوں یا مروجہ جدید علوم کی دانشگاہیں ہوں، ان میں طلباء اور اہل اہتمام کے درمیان اختلافات ایک قسم کا امرِ طبعی ہے۔ دارالعلوم دیوبند، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی، مدرسۂ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ بلکہ اُن سے اُتر کر دوسرے درجے کے قومی مدارس سب کی تاریخ کو اُٹھا کر پڑھ جائیے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہر جگہ کبھی نہ کبھی ایسا موقعہ ضرور آیا ہے جب پڑھنے اور پڑھانے والوں کے درمیان اختلافات کی ہوا چلی اور چھوٹے چھوٹے اختلافات بڑھتے بڑھتے ناقابلِ عبور خلیجوں میں تبدیل ہو گئے۔

علیگڈھ اور ندوۃ العلما کی مثال

علیگڈھ میں تو گذشتہ سو سال کے دوران درجنوں طوفان آئے ہیں اور گذر گئے ہیں۔ سب کی تاریخ بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔ ابھی چند سال پہلے سے یونیورسٹی کی تاریخی حیثیت کو قائم رکھنے یا بدلے ہوئے ماحول سے دب کر تبدیل کر ڈالنے کے سوال نے جو رُخ اختیار کر رکھا ہے وہ اس دانشکدہ کی حدود سے نکل کر پورے ہندوستان کے مُسلمانوں کے ذہنی زلزلے کا موجب بنا ہُوا ہے۔ اور سات کروڑ مسلمانانِ ہند آئے دن اپنے لئے جن "اقلیتی تحفظات اور ثقافتی و تعلیمی حقوق کی آزادی" پر بحثیں کرتے رہتے ہیں، ان کی فہرست میں مُسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا کردار بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جو ملّتِ اسلامیہ کے مُطالبات میں شامل ہوگیا ہے یونیورسٹی کے وائس چانسلروں اور طلباء کے درمیان رائے کا اختلاف تو اب علی گڈھ کی آب و ہوا کا ضروری عنصر بن کر رہ گیا ہے

جہاں تک ندوۃ العُلماء کا تعلق ہے الحمدللہ عصر حاضر میں وہاں کا ماحول پُرسکون ہے لیکن اس صدی کے ابتدائی دس پندرہ سال میں دار العلوم ندوۃ العُلماء کے اکابر کے درمیان اختلاف کی وجہ سے طلباء اور ناظمین کے درمیان بھی کشمکش کے ہنگامے برپا ہوتے رہے۔ جس وقت مولانا شبلی نعمانی مرحوم مدرسۂ ندوۃ العلماء کے معتمدِ تعلیم مقرّر ہوئے تو آپ کی علمی شہرت کا آفتاب نصف النّہار پر تھا اور ہندوستان سے لیکر مصر اور قسطنطنیہ تک علمی حلقے آپ کے تاریخِ اسلام کے محقّق و مُبصر اور بہترین ترجمان

ہونے کے معترف ہو چکے تھے۔ اس لئے ندوۃ العلماء کے ساتھ مولینا مرحوم کی وابستگی، مدرسہ کی اندرونی تعلیمی ترقیات کے ساتھ ساتھ ملک بھر میں اس کی شہرت میں بھی چار چاند لگانے کا موجب بنی۔ لیکن طرزِ فکر کے لحاظ سے چونکہ آپ کی بعض آراء اور مدرسہ کے بہت سے دیگر فاضل ارکان خاص کر مدرسہ کے ناظم حضرت مولینا خلیل الرحمٰن صاحب سہارن پوریؒ کی آراء میں فرق تھا۔ مولینا خلیل الرحمٰن صاحب مشہور مُحدّث مولینا احمد علی صاحبؒ سہارنپوری کے فرزند اور مولینا شبلیؒ کے اُستاد زادہ تھے۔ مگر علمِ کلام کے بعض مباحث میں دونوں کا اختلاف رائے تھا اور اس اختلاف نے بڑھتے بڑھتے افسوس ناک شکل اختیار کرلی تھی۔ جس کے نتیجہ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ پورا ادارہ اس اختلاف سے اثر پذیر ہوگیا اور طلباء کی ہڑتال نے مولینا ابو الکلام کے "الہلال"، مولینا محمّد علی کے "ہمدرد" اور مولینا ظفر علی خان کے "زمیندار" کے صفحات کو حمایت اور مُخالفت کی بحثوں کا میدانِ کارزار بنا ڈالا۔ یہ تینوں اہلِ قلم جو مولینا شبلی نعمانیؒ کے ہی فیض یافتہ تھے اور کانگریس کی طرفداری اور تعلیمی رُجحانات میں مولینا شبلی کے مکتبۂ فکر (SCHOOL OF THOUGHT) کے ترجمانوں میں شمار ہوتے تھے، اپنی اپنی شہرۂ آفاق اِنشاء پردازی سے اپنے ممدوح کی کوئی زیادہ مدد نہ کر سکے اور مولینا شبلی کی زندگی کے یہ آخری سال جو پہلے ہی پاؤں کٹ جانے اور بعض مُزمن امراض کی شدّت کی وجہ سے تلخ تھے، ندوۃ العلماء کے اس جھگڑے نے تلخ تر

کر ڈالے۔ آپ نے مدرسہ کے معتمدِ تعلیم کے منصب سے استعفیٰ بھی دے دیا۔ مگر مصالحت کا مقصد تب بھی حاصل نہ ہوسکا حتیٰ کہ آپ کی اجل پہنچی جس نے آپ کو دُنیا کے تمام جھگڑوں سے نجات دِلادی۔ آپ کی وفات کے صدمے نے ارکانِ ندوۃ العلماء کو بمشکل اتنا مُتاثر کیا کہ وہ مرحوم کی وفات کے قومی نقصان کا احساس کرکے دوبارہ شیر وشکر ہوجانے پر آمادہ ہوپائے اور "اَلصُّلحُ خیرٌ" پر عمل پیرا ہوگئے۔ اس مصالحت کو ممکنُ العمل بنانے کا سہرا مسیحُ الملک حکیم محمد اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کے سر رہا۔

شاہ صاحبؒ کو صدمۂ جاں گداز

دارُ العلوم دیوبند کے ساتھ حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کا تعلُّق ۱۳۱۰ھ سے ۱۳۱۴ھ تک بحیثیّتِ طالبِ علم، ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۳۳ھ تک بحیثیّتِ اُستاذ اور ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۶ھ تک بحیثیّتِ صدرُ المدرّسین کے قائم رہا۔ ۱۳۴۶ھ میں صدر مُدرّس کے منصب سے مُستعفی ہوکر اس مادرِ علمی سے جُدائی گوارا کرنے کا جو صدمۂ جاں گُداز حضرت شاہ صاحبؒ کو برداشت کرنا پڑا، اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے وہ اسی قسم کے حالات کا نتیجہ تھا جن کی طرف مُسلم یونیورسٹی اور ندوۃُ العُلماء میں پیش آمدہ اختلافات کا ابھی سطورِ بالا میں اشارہ کیا گیا ہے۔ تقاضائے وقت کے مطابق دار العلوم کے نصابِ تعلیم میں ردوبدل، طلباء کی رہائش اور خوراک کے انتظام میں اصلاحات، طلباء اور مُعلّمین کے بعض حقوق اور سہولتیں اور اس طرح کے کچھ چھوٹے کچھ بڑے سوالات دوسرے تعلیمی

ادارات کی طرح دیوبند میں بھی پیدا ہوتے رہتے تھے اور حل بھی ہوتے رہتے تھے۔ اور بعض اوقات ہیچو قسم سوالات صیغۂ اہتمام میں تغیرّ وتبدّل کا موجب بھی بن جاتے تھے۔ لیکن ۱۳۴۶ھ میں جب یہ سوالات اُٹھے تو طلباء کے مطالبات کو اونچے درجہ کے اساتذہ میں سے صدرُ المدرّسین حضرت شاہ صاحبؒ اور چند دیگر بڑی شخصیتوں کی ہمدردی حاصل ہوگئی جس سے ضرور ہے کہ صیغۂ اہتمام کے لئے پیش آمدہ مسئلہ سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہوگیا ہوگا۔ ادھر دہلی اور لاہور کے مسلم پریس نے بھی طلباء کے مطالبات کی حمایت کچھ اس شدومد سے کی کہ طلباء بھی اپنے کسی مطالبہ میں نرمی پیدا کرنے کے قابل نہ رہے۔

مصالحانہ مساعی کی ناکامی جب کشمکش نے انتہائی نازک شکل اختیار کرلی تو باہمی مصالحت کی کوئی کوشش بارآور نہ ہوسکی۔ ایک موقعہ پر مہتمم دارُالعلوم حضرت مولانا حافظ محمدؒ احمد صاحب مرحوم نے براہِ راست حضرت شاہ صاحبؒ سے مِلکر کوشش کی کہ کسی طرح یہ دردناک ختم ہو جائے اور شاہ صاحبؒ اس کو ختم کرنے پر آمادہ بھی کن اب حالات دونوں بزرگوں کے تصرّف سے باہر ہوچکے بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اور آخر کار وہی ہوا شیئت ازلی میں مقدر ہوچکا تھا۔

فلسا حضرت شاہ صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، مولانا مفتی عزیزالرحمٰن

صاحبؒ، مولانا بدرِ عالم صاحب میرٹھیؒ، مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہارویؒ، مولانا محمد ادریس صاحب سکھروڈویؒ اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی وغیرہم وہ مقدس حضرات تھے جن کا استعفیٰ ادارۂ اہتمام دار العلوم نے منظور کر لیا اور قافلہ کے سالار حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ اور آپکے رفقاءِ کرام نے بمع ۲۷۵ طلباءِ درجاتِ عالیہ اپنے محبوب دانش کدہ دارُ العلوم پر نگاہِ حسرت ڈالکر ہمالیہ کی گود میں واقع مقام دیوبند سے روانہ ہو گئے اور قریباً ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہندوستان کے جنوب مغرب میں بحیرۂ ہند کے ساحل کے قریب یہ اپنی قسم کا نرالا قافلہ جا پہنچا جس نے اپنے فرشتہ سیرت سالارِ قافلہ حضرت شاہ صاحبؒ کی قیادت میں (سورت بندر کے حوالی میں) واقع ڈابھیل نامی ایک قصبے میں دار العلوم دیوبند کا ایک ہمزاد قائم کر دیا اور دیوبند کا یہ مثنیٰ قائم کر ڈالنے کے بعد خود دیوبند کی درازیٔ عمر اور سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ سچ ہے کہ مقدسین کا ہر قدم مقدسانہ ہوتا ہے۔

مشاجراتِ اکابر سے کفِ لسان

دارُ العلوم کی یہ اصلاحی تحریک جو حضرت شاہ صاحبؒ کے استعفیٰ کا موجب بنی، اس کے ساتھ آپ کا واسطہ براہِ راست نہ تھا۔ محض بہبودیٔ دارُ العلوم کی تحریک کو آپ کی پُرخلوص تائید حاصل تھی۔ آپ کے دل میں مہتمم دارُ العلوم حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ اور دارُ العلوم کی مجلسِ مشاورت کے دیگر ارکان

خصوصاً مولینا حکیم مسعود صاحب گنگوہی کا احترام انتہا درجہ کا تھا۔ اور یہ تمام حضرات بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے احترام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرنے کے روادار نہ تھے لیکن تقدیرِ الٰہی قضائے مبرم بن کر پیش آئی اور ہر دو فریق کو بادلِ ناخواستہ ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔

اہلِ سنّت والجماعت کا مشاجراتِ صحابۂ کرام رضوانُ اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یہی طرزِ عمل ہے کہ اس میں کفِ لسان کیا جائے اور ان تنازعات کی تفصیلات میں پڑنے سے اجتناب برتا جائے۔ تاریخ کے ہر مرحلے پر یہی طریقۂ کار مسلم معاشرہ کے حق میں خیر و برکت کا موجب رہا ہے۔ اس سبق پر عمل کرتے ہوئے اگر مشاجرات صحابۂ کرام کی طرح مشاجراتِ اکابرِ ملّت سے بھی کفِ لسان پر عمل کیا جائے تو قوم کے لئے اس میں بے شمار فوائد مضمر ہیں۔ اس لئے ہم دار العلوم دیوبند کے اکابر اور حضرت شاہ صاحب کے مابین واقع شدہ اختلافات و مشاجرات کی کسی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ان واقعات سے متعلّق خود حضرت شاہ صاحبؒ کا عمل یہ تھا کہ آپ اس واقعہ کے بعد چار پانچ سال زندہ رہے مگر کبھی بھولے سے بھی ان واقعات کا تذکرہ زبان پر نہ لاتے تھے۔ اور

"درمیانِ ما و جانان ماجرائے رفت و رفت"

کے مطابق اس معاملے کو آپ نے كَأَنْ لَّمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُورًا۔ کا مصداق بنا ڈالا۔ اس لئے اگر ہم بھی اس کی تفصیلات کو حوالۂ طاقِ نسیان کر ڈالیں تو ہم کو حضرت شاہ صاحبؒ کی قابلِ تقلید مثال پر

عمل پیرا ہونے کا ثواب ملیگا۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْر۔

بقول مرحوم مولینا سید محمد میاں صاحب دیوبندی "داستان بہت طویل ہے اور اس کا آخری باب استعفےٰ ہے جو تحریک (اصلاح) کے رہنماؤں نے بطورِ احتجاج پیش کیا اور اہتمام کے تدبیرِ قلم نے اس پر منظوری صادر کر کے احتجاج کو ناکام بنا دیا۔ اس موضوع کا آخری فقرہ یہ ہے کہ سات سال طبقۂ علیا کے مدرس اور تیرہ سال صدر مدرس رہنے کے بعد ۱۳۴۶ھ میں آپ نے دار العلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کی اور دیوبند کے بجائے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔" (حیاتِ انور ص۲۸)

ہر طرف چشم فرش راہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جب حضرت شاہ صاحب دار العلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو مدرسہ امینیہ دہلی، ندوۃ العلماء لکھنو، ڈھاکہ اور کلکتہ یونیورسٹی کے علاوہ بہت سے مشہور و معروف اداروں نے معقول مشاہروں پر آپ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن آپ نے بڑی بڑی تنخواہوں کو اہمیت دئے بغیر اپنے ایک مخلص شاگرد الحاج مولینا محمد میاں سملکی افریقی کی استدعاؤں اور مشوروں پر ڈابھیل جانے کو ترجیح دی۔

علامہ اقبالؒ کی تمنا یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب شاہ صاحبؒ نے دار العلوم سے علیحدگی اختیار کی تو علامہ اقبالؒ نے خوشی کا اظہار کیا اور سخت

لے حاشیہ صفحہ نمبر ۱۹۳ پر دیکھیے۔

اصرار سے شاہ صاحب کو ایک تار ارسال کیا کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں لیکن چونکہ وہ تار حضرت شاہ صاحب کو اس وقت ملا جب آپ نے ڈابھیل والوں سے وعدہ کیا تھا اس لئے شاہ صاحبؒ لاہور نہ جاسکے۔

مولینا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہ نے اپنے مضمون میں اس سلسلے میں جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"دار العلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدۂ صدر الاساتذہ سے استعفےٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو، میں بہرحال شاہ صاحبؒ کے استعفےٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا "کیا آپ کو دار العلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا کیوں نہیں؟ مگر دار العلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے جو کام اب میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحبؒ کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور

شاہ صاحبؒ دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلامی میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشّان ذمّہ داری کا حامل ہو سکے۔" پھر فرمایا "یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔" چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مقیم ہو جائیں لیکن افسوس! حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحب لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے۔ جس کا ڈاکٹر صاحب کو واقعی بڑا ملال اور صدمہ ہوا۔"

(حیاتِ انور ص۱۶۵ و ص۱۶۶)

(حاشیہ متعلق صفحہ نمبر ۱۹۱) مولانا سید محمد میاں صاحب مرحوم نے حضرت شاہ صاحبؒ کا زمانہ قیام دیوبند بیس ۲۰ سال قرار دیا ہے لیکن حقیقت میں حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند سے صرف ۱۸ سال تک وابستہ رہے ہیں۔ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری راقم الحروف کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں رقمطراز ہیں کہ: "میری بیاض درس بخاری ص۹۵۳ میں حضرتؒ کا یہ ارشاد نقل ہے کہ میں ۱۸ سال دیوبند میں رہا۔" (کوثر)

دیوبند سے ڈابھیل

(۱۳۴۶ھ
۱۹۲۸ء)

اِختلافُ اُمّتی رحمۃٌ اُمّتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والف والف تحیّۃ) کا اختلاف رحمت ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اختلاف جن کے درمیان پیدا ہوگیا ہو وہ مُتّقین و مخلصین ہوں۔ تاریخِ اسلام میں پیش آمدہ اختلافات کی فہرست کو پیشِ نظر رکھ کر ہر اختلاف کے نتائج و ثمرات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اختلاف جو نیک نیتی پر مبنی تھا آخر کار اس کا نتیجہ مُشترکہ مقاصد کی ترقی کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ دار العلوم کے اکابر صیغۂ تعلیم اور صیغۂ اہتمام کے درمیان جو اختلاف ۱۳۴۶ھ میں پیدا ہُوا وہ ہمارے اس دعوے کی روشن مِثال ہے۔ چونکہ جانبین مُخلِص تھے اس لئے خدا کے فضل سے اس اختلاف نے دار العلوم دیوبند کو بھی کوئی ناقابلِ تلافی نقصان نہ پہنچایا اور اختلاف کے نتیجہ میں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کی شکل میں ایک جدید اور دوسری شاندار درس گاہ اُبھر کر سامنے آگئی۔ جس نے علامہ وجیہہ الدّین، علامہ طاہر پٹنی اور علی متقی کے گجرات کو ایک بار پھر قال اللہ اور قال الرسول کے نغمات


سے گونجا دیا اور علوم و فنون کا ایک ایسا چشمہ بہا دیا جس سے ہندوستان کے جنوب مغرب میں بھی، دیوبند و سہارنپور، مراد آباد و رامپور اور دہلی و لکھنو جیسے علمی باغات کی آبیاری کا سامان ہوگیا۔ حضرت شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے دیگر رُفقاء نے ڈابھیل کے مدرسہ کو جہاں علومِ اسلامیہ کی تعلیم کے اونچے سے اونچے درجات کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کا مثنیٰ بنا ڈالا۔ وہاں سیاسی اور معاشرتی پالیسیوں اور تربیتِ مُستفیدین کے لحاظ سے بھی مدرسۂ ڈابھیل کو دارالعلوم دیوبند کے متوازی خطوط پر گامزن رکھا اور مزید یہ کہ وہاں تصنیف و تالیف کا ایک ادارہ "مجلسِ علمی ڈابھیل" کے نام سے قائم کر کے نئی اور نایاب کتابوں کی اشاعت سے علمی دولت کی ترقی کا راستہ کھولدیا۔ یہی ادارہ تھا جس کی کوششوں سے صحیح بخاری پر حضرت شاہ صاحب کی تدریسی تقاریر فیضُ الباری کی شکل میں مصر سے چھپ کر کحلُ البصر لِاُولی الابصار بنی، اور یہ فخر بھی مجلسِ علمی ڈابھیل کو ہی حاصل ہوا کہ اس نے اکابرِ اُمت حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ (قدس اللہ اسرارہما) اور خود مولانا انور شاہ کشمیری رح کے نادر علمی خزینوں کی نشر و اشاعت سے روپوش شدہ خزائنِ علمیہ کے فیوض عام کر دئیے۔

جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل میں نزولِ اجلال

بہر حال کس کے وہم و گمان میں تھا کہ حضرت

شاہ صاحب کی تدریسی خدمات کا جو شرف ملک کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور معروف تعلیمی اداروں کی قسمت میں نہ آسکے، وہ ڈابھیل کی سرزمین کے لئے ازل ہی سے مُقدّر ہو چکا تھا۔ حالانکہ گجرات میں زمانۂ قدیم کی درسگاہیں کالعدم ہوجانے اور قدیم علماء کے فیوض کے چشمے خشک ہوجانے کے بعد اب وہاں کوئی معروف تعلیمی ادارہ موجود نہیں تھا۔

حضرت شاہ صاحب و دیگر عُلمائے ربّانی کے گجرات پہنچکر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل قائم کرنے سے پہلے قصبۂ ڈابھیل میں مدرسۂ "تعلیمُ الدّین" کے نام سے ایک چھوٹا سا دینی مدرسہ موجود تھا۔ جسے علاقۂ گجرات ہی کے ایک اہلُ اللہ مولینا احمد حسن صاحب اور گجرات کے بعض مخیّر و متموّل بندگانِ خدانے مولینا موصوف کو ہر ممکن مدد بہم پہنچاکر قائم کیا تھا۔ یہ امر بھی تدبیرِ قدرت کا ایک کرشمہ تھا کہ اس مدرسہ کے متعلقین اور بہی خواہ شروع ہی سے علماءِ دیوبند اور خصوصًا حضرت شاہ صاحب کے عقیدتمندانِ خاص میں سے تھے اور اس مدرسہ کو وسیع پیمانے پر چلانے کے ہمیشہ سے مُتمنّی تھے۔ جوں ہی ان حضرات کو علم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب اور آپ کے بہت سے رفیق علماءنے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی اختیار کرلی ہے تو مُنتظمینِ مدرسۂ ڈابھیل نے اس ادارہ کو ترقی دینے کے لئے اس مَوقعہ کو ایک قسم کی نعمتِ خداداد سمجھا۔ اس لئے انہوں نے (خاصکر حضرت


صوبۂ گجرات
شمال
پاکستان
راجستھان
رن
کچھ
کچھ
گاندھی نگر
احمد آباد
گجرات
خلیج کچھ
بحیرۂ عرب
مدھیہ پردیش
بڑودہ
ڈابھیل
سورت
دمن
مہاراشٹر

شاہ صاحبؒ کے ایک شاگرد مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی نے حضرت شاہ صاحبؒ اور آپ کے سب رُفقاء کو پیہم اصرار کے ساتھ ڈابھیل پہنچنے پر آمادہ کرلیا۔

اس چھوٹے سے مدرسے میں جب ہندوستان کے سب سے بڑے علماء نے درجاتِ عالیہ کے سینکڑوں طلباء کا قافلہ ساتھ لئے ہوئے ڈیرا ڈال دیا تو اس مدرسہ کا نام "جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل" رکھا گیا۔ اور یہ بھی قدرت کا کرشمہ تھا گویا ایک پرائمری سکول راتوں رات ایک یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔

حضرت شاہ صاحب کے ساتھ دارالعلوم سے مُستعفی شُدہ حضرت مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی اور حضرت مولانا سراج احمد رشیدی جیسے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ساتھ دورۂ حدیث اور دوسری اونچی جماعتوں میں پڑھنے والے دوسو پچھتر (۲۷۵) طلباء پر مشتمل ایک قابلِ توجہ اور لائقِ اعتناء تعداد بھی تھی۔ اس لئے ڈابھیل جاکر اساتذہ درس و تدریس اور طالبانِ علم استفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے دیوبند کے مشاغل کو اس سنجیدگی سے آگے بڑھانا شروع کر دیا کہ گویا کوئی بڑا حادثہ پیش ہی نہ آیا تھا۔

اکابرِ اسلام کی ہمیشہ سے یہی شان رہی ہے کہ ان کے لئے بڑے بڑے حوادث کا تاثر لمحاتی ہوتا ہے اور جوں ہی وہ حادثہ گذر جاتا ہے وہ پہلے سے زیادہ توجہ اور انہماک

کے ساتھ اپنے اصلی کام میں مصروف ہو جاتے ہیں بلکہ حادثہ کی وجہ سے متنبّہ ہوکر منزلِ مقصود کی طرف اپنی رفتار کو بھی تیز کر دیتے ہیں۔

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے
(اقبالؒ)

ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے مدرسۂ امینیہ دہلی کا قیام

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں شاہ صاحب نے ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء تک قال اللہ وقال الرسولؐ کی مجلس گرم رکھی یہاں تک کہ آپ کے قُویٰ نے بالکل جواب دے دیا۔ ڈابھیل کے اس پانچ سالہ قیام کے دَوران آپ کبھی کبھی دیوبند آیا کرتے تھے کیونکہ دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرنے کے باوجود وطنیت دیوبند کو آپ کسی حالت میں بھی ترک کر ڈالنے پر آمادہ نہ تھے۔ آپ کا دولت خانہ دیوبند میں تھا اور دیوبند میں ہی رہا۔ اس دوران آپ ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے دہلی کے مدرسۂ امینیہ میں اپنے رفیقِ خاص حضرت علامہ مفتی محمد کفایتُ اللہؒ سے بھی ملتے تھے۔ اور ایسے ہی اکثر موقعوں پر مولانا ابو الکلام آزادؔ بھی شاہ صاحب سے ملنے کے لئے دہلی کے مدرسۂ امینیہ میں تشریف لاتے تھے۔ اس

سلسلے کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ مولانا آزاد شوقِ ملاقات سے امینیہ میں وارد ہوئے اور یکدم شاہ صاحب کے سامنے دوزانو بیٹھ گئے۔ چونکہ حضرت شاہ صاحب حلم و انکسار کے کوہِ گراں تھے انہوں نے مولانا آزاد مرحوم کی یہ ہیئتِ گذائی گوارا نہ فرمائی اور مولانا آزاد کو مناسب نشست پر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔

قیامِ ڈابھیل کے دوران علّامۂ عثمانی کا استفادہ

قیامِ ڈابھیل کے دوران علّامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ نے حضرت شاہ صاحبؒ سے علمِ تفسیر، علمِ حدیث اور دوسرے علوم کے دقائق و مشکلات میں رجوع فرماکر صحیح معنی میں اپنی علمی تشنگی بجھائی، اسی لئے مولانا عثمانیؒ کے علم و فضل میں (خاص کر حذاقتِ علمِ حدیث میں) ڈابھیل جاکر بہ نسبتِ دیوبند کے نمایاں فرق ہوگیا تھا۔

اس سلسلے میں مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری کا بیان ہے کہ "مجلسِ علمی ڈابھیل کے قیام کے زمانہ میں یہ بات خاص طور پر میں نے محسوس کی کہ اساتذۂ جامعہ میں سے کم و کیف دونوں کے اعتبار سے زیادہ علمی استفادہ حضرت شاہ صاحب سے مولانا عثمانی رحؒ نے کیا۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ نے جو رجال کی مدح و توصیف میں انتہائی محتاط تھے، ایک بار مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی سے فرمایا:

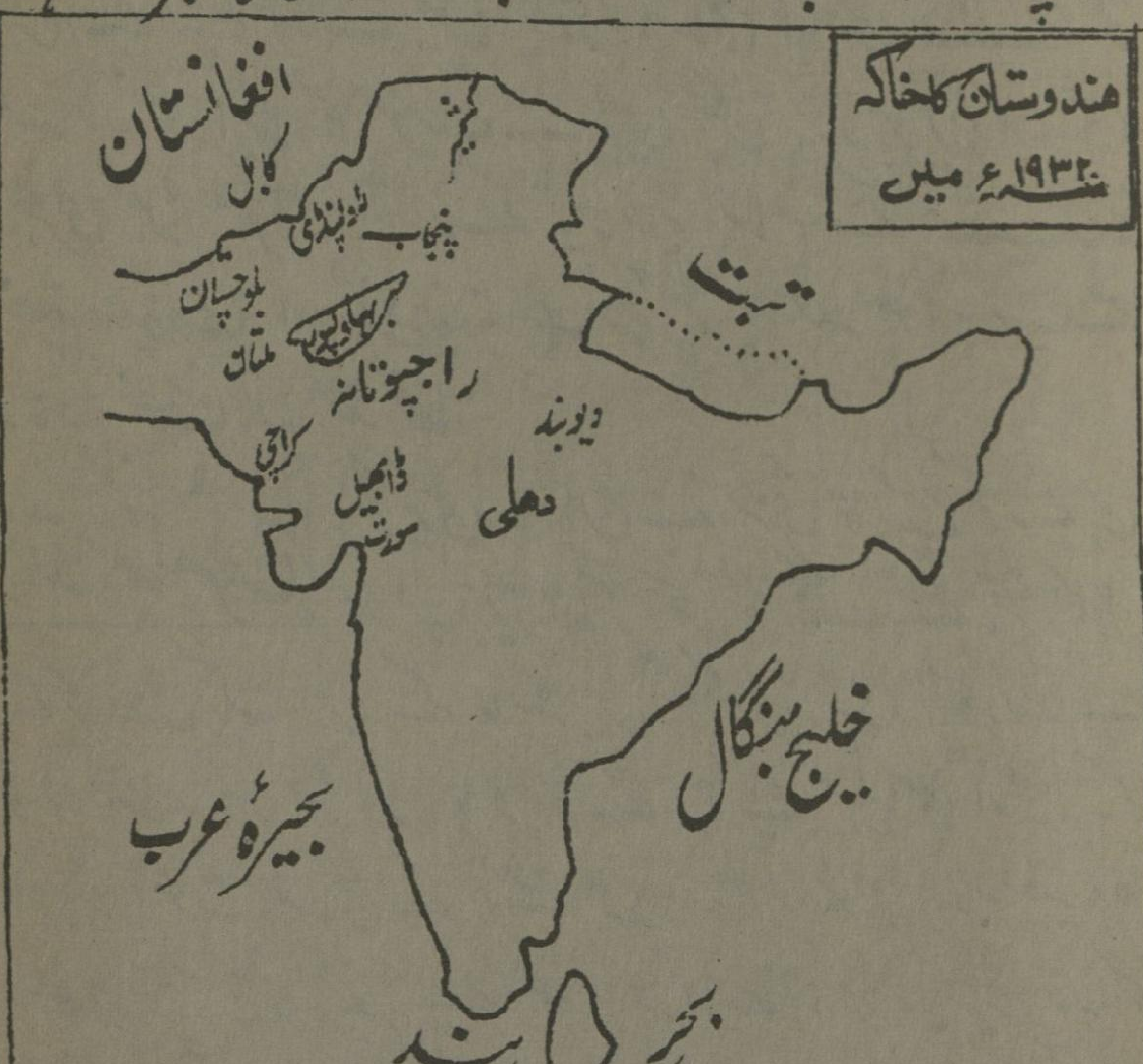
"تمہیں ایک خوش خبری سُناتا ہوں کہ مولانا شبیر احمد صاحب کو علمِ حدیث سے مناسبت ہوگئی ہے۔" (نطقِ انور ج ۱ ص۹)

بہاولپور کا مقدمہ اور قادیانیت پر ضرب کاری

۱۳۵۱ھ
۱۹۳۲ء

اُمّت پر فتنوں کی بارش

محسنِ اعظم مُخبرِ صادق حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو اپنے زمانہ کے بعد آنے والے بے شمار فتنوں کی خبر دی ہے



اور ان سے بچنے کا اور ان کا مقابلہ کرنے کا راستہ بیان فرمایا ہے ان فتنوں میں سب سے زیادہ شدید فتنے وہ ہیں جن کا رُخ

اسلام کے عقایدِ حقّہ پر حملے کر کے ملّت کو تشتیت کا ہدف بناتا اور اعدائے دین کی بالواسطہ مدد کرنا ہوتا آیا ہے۔ گذشتہ چودہ سو سال کی مدّت میں اُمّت محمّدیہ (علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام) کو قدم قدم پر ان فتنوں کا سامنا رہا ہے۔ مُسیلمۂ کذّاب اور اسود عنسی جیسے مُدعیانِ درجۂ نبوت کا فتنہ، خوارج کے پے در پے فتنے اور معتزلوں کا فتنہ، اور ان کے بعد ایسے ہی بے شمار فتنے ہر ملک اور ہر دَور میں اپنے اپنے زمانے میں پوری اسلامی آبادی کے لئے تو مصائب و اِبتلاء کا موجب رہے ہیں لیکن چودہویں صدی ہجری میں مغربی استعمار کے زیر سایہ اسلام کے "عقیدۂ ختمِ نبوّت" اور "فریضۂ جہاد" پر جو حملہ ہوا یہ سب سے زیادہ خوف ناک حملہ تھا۔

فتنۂ سامراج انگریزی سامراج نے مشرق کا رُخ کرتے ہی بھانپ لیا تھا کہ بحر اٹلانٹک سے بحرُ الکاہل کے کناروں تک اس کے راستہ میں اگر کوئی بڑی رُکاوٹ ہے تو وہ اسلام اور مسلمانوں کا وجود ہے۔ جو اپنے سیاسی انتشار کے باوجود اُخوتِ اسلامی کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "ان کا پیغمبر یعنے محمّد رسول اللہؐ اس دنیا میں خدا کا آخری پیغمبر اور خاتم النّبیین ہے جس کا لایا ہُوا دین آخری دین ہے۔ اور اس دین کا صحیفہ یعنے قرآنِ مجید خُدا کی آخری کتاب ہے۔ اور یہ کتاب ہر زمانہ اور ہر ملک کے لئے مکمل

ہدایت نامہ ہے اور یہ کہ اسلام ہی وہ دین ہے جو زمانۂ حاضرہ میں تمام انسانوں کے لئے مکمل ضابطۂ حیات ہے جس کی اشاعت اور تبلیغ حکمت و موعظۂ حسنہ سے فرض ہے لیکن اس کی حفاظت کے لئے اور دشمنوں کے نرغے سے اس کے متبعین اور دیگر مظلوم انسانوں کو بچانے کے لئے تیر و تفنگ اور ہر میسّر ہتھیار سے کام لینا بھی فرض ہے، جس کو جہاد فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔"

بنا براں مشرق پر سامراجی تسلّط کو مستحکم کرنے اور اس کو دوام دینے کے لئے مغربی سامراج مُسلمانوں کو اپنے اس راستے سے ہٹانا یا کم از کم ان کی روحِ مقاومت و قوتِ مقابلہ کو کچل ڈالنا ضروری سمجھتا تھا

سامراجی چال

انگریز یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں سے ایسے لوگ پیدا ہو جائیں جو پروپیگنڈا کریں کہ "جس طرح دوسرے مذہبوں کے پیشوا اپنے اپنے وقت اور اپنی اپنی بستی کے لوگوں کی اصلاح کو آئے تھے اور جب اس دُنیا سے چلے گئے تو ان کے بعد ان ہی جیسے یا ان سے بھی بڑھ کر دوسرے آتے اور پہلوں کی جگہ لیتے رہے۔ اسی طرح محمد رسولُ اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم بھی اپنے زمانے کے عربوں کی اصلاح کر کے چلے گئے۔ ان کا دین اسی زمانہ کے لئے تھا اب نیا دین لیکر کوئی اور آسکتا ہے۔ اور چونکہ مذہب ملکوتی چیز ہے اس کی حفاظت جہاد جیسے مُسلّح اور خون ریزی والے اقدام سے

نہ ہونی چاہیئے جس میں تیر و شمشیر کا دخل ہے جو وحشیانہ بات ہے۔" انگریز کا یہ خیال تھا کہ جب ختم نبوت کا عقیدہ نہ رہے گا تو مسلمانوں کی وحدتِ ملت اور وحدتِ انسانیت کے عقائد خود بخود ختم ہو جائیں گے اور جب جہاد کے فرض الی یوم القیامۃ کا عقیدہ نہ رہا تو ملتِ اسلامیہ کو غلام بنا لینے کا راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا اور ایشیا و افریقہ میں انگریزی سامراج کی راہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہ جائے گی۔

بہائیت اور قادیانیت کی پیدائش

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے اور بھی ضرورت محسوس کی کہ مسلمانوں کے دل سے جذبۂ جہاد اور عقیدۂ ختمِ نبوت کو ختم کرنا مشرق میں اور خاصکر ہندوستان میں ان کے سامراج کی بقا و حیات کے لئے بہت ضروری ہے اور وہ اپنے وسیع ذرائع اور گہری چالوں سے کام لیکر مختلف شکلوں میں جہاد کی فرضیت اور اسلام کی ہمہ گیری پر حملے کرتے اور کراتے رہے۔ پہلے پہل یہ کام عیسائی مشنریوں کو سونپا گیا تھا لیکن ان کی ناکامی بہت جلد آشکارا ہو گئی۔ اس کے بعد بہت کچھ رد و کد کے بعد ایران میں علی محمد باب اور بہاؤ اللہ اور ہندوستان میں پنجاب کے مرزا غلام احمد قادیانی چن لئے گئے جنہوں نے انگریزی راج کی پناہ، حفاظت اور سرپرستی میں سامراج کی بدترین تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے اسلام کے عظیم عقائد محمد رسول اللہ ؐ کے خاتم النبیین ہونے اور جہاد کی تاقیامت فرضیت

سے انکار کیا اور سامراج کی اغراضِ مشومہ کو پورا کرنے کے لئے مسلمانوں میں وہ فتنے کھڑے کئے کہ الامان والحفیظ۔

بہائیت نے ایران میں شیعہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے اور قادیانیت نے ہندوستان میں زیادہ تر اہلِ سنّت میں اور ساتھ ہی اہلِ تشیع میں بھی تفریق و تشتیت کی آگ بھڑکانے میں مغربی سامراج کے لئے وہی کام کیا جو دوسری عالمگیر جنگ میں ہٹلر کے لئے اس کا تیسرا دستہ (THIRD COLUMN) کرتا تھا اور بحیثیتِ مجموعی ان دونوں فتنوں نے اسلام کو ہر پہلو سے اپنی نیش زنی کا نشانہ بنائے رکھا۔

چونکہ ایران میں مسلم سلطنت موجود تھی جس نے علی محمد باب کو سزائے موت دے کر اور بہاؤ اللہ کو جلائے وطن کر کے اور ان کے متبعین کو غیر مسلم قرار دے کر فتنۂ بابیت و بہائیت کی آگ جلد ہی بجھا دی۔ اور اس کے بعد بہائیت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ خود بھی دینِ اسلام سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کر کے اسلام کے لئے اندرونی چھپے دشمن کا رول ترک کر دے۔

انگریز کا خود کاشتہ پودا

لیکن ہندوستان میں انگریزی راج کی موجودگی میں قادیانیت کے پھوڑے کو اہلِ اسلام کے جسم سے کاٹ کر الگ کرنے کا امکان نہ تھا۔ اس لئے یہ فتنہ زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ مرزا غلام احمد اپنے آپ کو انگریزی سامراج کا "خود کاشتہ پودا"

بھی کہتا رہا۔ انگریزی راج کے حق میں اسلامی ممالک (ترکی اور عربستان) میں پروپاگینڈا کرنے کا دعویٰ بھی کرتا رہا۔ انگریزوں پر احسان جتاتے ہوئے یہ بھی لکھتا رہا ہے کہ "میں نے اس حکومت کی تائید میں جتنا لٹریچر شایع کیا ہے اس سے پچاس الماریاں پُر ہو سکتی ہیں"۔

پہلی جنگِ عظیم میں جب بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہُوا تو قادیان اور جہاں کہیں قادیانی تھے انہوں نے خوشی سے چراغاں کیا اور فتح کے جشن منائے اور مسلمانوں کے لئے جہاد کو حرام قرار دیتے رہے اور انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر مصر، عرب، عراق، ترکی اور ایران میں جاکر مسلمانوں پر گولیاں چلانے کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے رہے اور محمدؐ رسولُ اللہ کی ختمِ نبوّت سے انکار کرکے ایک جھوٹے مُدّعیٔ نبوّت کو پیغمبر بنا کر پیش کرتے رہے تاکہ مغربی سامراج کی تائید اور مسلمانوں کو اس کی غلامی پر رضامند کرنے کے لئے "وحی" اور "الہام" جیسی پاکیزہ اِصطلاحات کا استحصال (EXPLOI - TATION) کیا جائے اور اس اسلام دُشمنی پر بھی اپنے آپ کو مُسلمان کہلانے پر مُصر رہے۔

عُلمائے اسلام کا جہاد

عُلماءِ اُمّت نے دونوں جگہ اس فتنے کا مُقابلہ کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور الحمدُ للّٰہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علمائے حق کی سعی کو قبولیت اور برکت عطا فرمائی اور اب یہ

دونوں فرقے ہر محاذ پر پسپا ہو رہے ہیں اور ان کا پھیلا ہوا دجل و فریب کا جال پارہ پارہ ہو چکا ہے اور اب کسی کو بھی پھنسانے کے قابل نہیں رہا۔ اور سامراج کے خاتمہ سے تو وہ سرچشمہ ہی ختم ہو گیا جس پر ان کی آبیاری منحصر تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا کارنامہ

فتنۂ قادیانیت کے خلاف جہاد کرنے والے علمائے ربانیؒ کی ایک بہت بڑی تعداد ہے جن میں سے بعض نے اپنی تقریروں سے، بعض نے تحریروں سے اور بعض نے مناظروں اور مباحثوں سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ شکراللہ سعیہم۔ لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے جن گہرے احساسات کے ساتھ اس فتنہ کے خطرات کا اندازہ لگایا اور پھر جس لگن کے ساتھ وہ مدافعتِ عقائدِ اسلام کی جنگ لڑنے میں محو ہو گئے اس نے وہ فضا پیدا کردی کہ قادیانیت کے لئے کوئی پناہ لینے کی جگہ باقی نہ رہی۔ یہ شاہ صاحبؒ کی للہیت کا ثمرہ تھا کہ حضرت علامہ اقبالؒ سے لے کر رئیس الاحرار مولینا سید عطاءُ اللہ شاہ بخاریؒ تک اور مولینا ظفر علی خانؒ سے لے کر مولینا ثناءُ اللہ امرتسریؒ تک اور ایک عالم و فاضل سے لے کر ایک عامی مسلمان تک سب کے سب مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کا ورد کرنے لگے اور الجهادُ ماضٍ اِلٰی یومِ القیٰمۃ کے غوامض و اسرار کی قدر و قیمت پر غور کرنے لگے۔

پنجاب کی طرف توجہ خاص: چونکہ فتنۂ قادیانیت کا مرکز اور اسکا

مقا یدائش پنجاب تھا۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی زندگی کے ری برسوں میں اپنی توجہ عالیہ کا مرکز پنجاب کو قرار دیا۔ انگریزی سامراج کے خلاف مجاہدین کی ایک سرفروش تنظیم مجلسِ احرار کو اپنی سرپرستی کا شرف بخش کر اس کو قادیانیت کے خلاف بھی صف آرا کر دیا اور اس کے پیشواؤں میں سے سب سے بڑے خطیب سیّدُ الاحرار مولینا سید عطاءُ اللہ شاہ بخاریؒ کو امیرِ شریعت کا اعزاز بخشکر جلسۂ عام میں بذاتِ خود ان کے ہاتھ پر قادیانیت کے خلاف بیعتِ جہاد کی اور اس طرح قادیانیت پر وہ بھرپور حملہ شروع کیا جو شاہ صاحبؒ کی وفات پر بھی ختم نہ ہُوا۔

قادیانی ایک غیر مسلم فرقہ

الغرض قادیانیت کے خلاف حضرت شاہ صاحبؒ کی چلائی ہوئی تحریکِ جہاد کا سلسلہ قریبًا پچاسؔ سال تک جاری رہا۔ آخرِ کار مملکتِ پاکستان کی پارلیمنٹ نے قادیانیوں اور مُنکرینِ ختمِ نبوّت اور منکرینِ فرضیتِ جہاد کو اسلام سے خارج ایک غیر مُسلم اقلیت قرار دے کر جسمِ اسلامی کو اس رِستے ہوئے ناسور سے ہمیشہ کے لئے پاک کر ڈالا۔

آج سے برسوں پہلے حضرت مولینا ابو الوفا ثناء اللہ امرتسریؒ حضرت مولینا انور شاہ کشمیریؒ، حضرت مولینا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ہندوستان کے دیگر عُلمائے کرام نے قادیانیوں کے ملّتِ اسلامیہ سے خارج ایک ٹولی ہونے کا جو فیصلہ فتوؤں کی صورت میں صادر کیا تھا اور ترجمانِ ملّتِ اسلامیہ علامہ اقبالؒ نے

پنڈت جواہر لال نہرو کے شبہات کا جواب دیتے ہوئے قادیانیت کو اسلام کی بغاوت ثابت کرتے ہوئے جو فیصلہ کُن مضامین تحریر فرمائے تھے، ان کو قانونِ وقت بن جانے میں نصف صدی کا وقت لگا۔ سامراج کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی انگریز کا خود کاشتہ پودا زندہ رہ کر ماحول کو مسموم بنانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہا مگر آخرِ کار اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔

الغرض تاریخ کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ علماءِ ربّانی قرآن و حدیث اور اسلام کے ہادیانہ اصولوں کی روشنی میں اس کینسر کو اسلام کے جسم سے کاٹ کر پھینک دینے کا جو فیصلہ صادر کر گئے تھے، آج ان کے اس فیصلے کو ایک اسلامی ملک کی قانون ساز جماعت نے ایک دوامی آئین اور قانون بنا ڈالا۔ اور عرب و عجم کی تمام مُسلم حکومتوں نے اس اقدام پر مہرِ تصدیق ثبت کر ڈالی۔

مقدمۂ بہاولپور اور اس کی اہمیت

حضرت شاہ صاحب نے فتنۂ قادیانیت کے خلاف اپنی زندگی کے آخری دس بارہ سال کی مُدت میں جو جہاد شروع کیا تھا، ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور کے مقدمہ میں عدالت کے سامنے پیش ہو کر بطورِ گواہ کے اسلام کی حقانیت اور قادیانیت کا اِبطال ثابت کرنا اس طویل معرکے میں آپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ بہاولپور سے واپس جاکر آپ تھوڑی

ہی مُدت کے اندر اندر انتقال فرما گئے اور مقدمہ کا فیصلہ جو قریبًا سارے کا سارا آپ ہی کی شہادت پر مبنی ہے، آپ کی وفات کے بعد صادِر ہُوا۔

مقدمۂ بہاولپور کی نوعیت مقدمہ کی نوعیت یہ تھی کہ ایک شخص کے ساتھ اس کے رشتے کے ایک شخص نے اپنی لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔ ابھی شادی کی رسومات انجام نہ پائی تھیں کہ منگیتر نے قادیانیت اختیار کرلی۔ لڑکی اور اس کے باپ نے شادی سے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ شخصِ مذکور مُرتد ہوگیا ہے۔ اس لئے مسلمان عورت اس کی زوجہ نہیں بن سکتی۔ قادیانیوں نے اپنے آپکو مُسلمان ثابت کرنے کے لئے اپنے خلیفہ کا اثر رسوخ اور اپنی تنظیم اور انگریزی حکومت کے قوانین کو داؤ پر لگا دیا۔ کوئی ساتؔ سال تک مقدمہ چلتا رہا لڑکی نے خاوند کے قادیانیت کی وجہ سے مُرتد اور خارج از اسلام ہونے کے ثبوت میں علماءِ اسلام کو بطورِ گواہ پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریک سے مولٰینا ابوالوفا شاہجہان پوری لڑکی کی طرف سے پیروکار رہے، اور مولٰینا مُرتضٰی حسن صاحب استاذ دیوبند، مولٰینا محمد شفیع صاحب مفتی دیوبند (سابق مفتی اعظمِ پاکستان)، مولٰینا نجمُ الدین صاحب پرنسپل اورینٹل کالج لاہور، مولٰینا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور اور مولٰینا محمد حسین گوجرانوالہ کی شہادتوں کے بعد خود حضرت شاہ صاحب بطورِ گواہ پیش ہوئے اور پانچ دِن تک

اپنی شہادت قلم بند کراتے رہے۔ اور قادیانی وکلاء کے سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ بہاولپور کی عدالت کے فاضل جج جناب محمد اکبر خان صاحب نے حضرت شاہ صاحب کی شہادت پر اپنے فیصلے کا انحصار رکھا اور قادیانیت کو اسلام سے خارج شدہ ٹولہ قرار دیتے ہوئے نکح کو مرتد قرار دیا۔

بستر مرگ سے عدالت کے کٹہرے میں

یوں تو حضرت شاہ صاحب اس زمانہ میں کہیں بھی فتنۂ قادیانیت کو سر اٹھاتے دیکھتے تو اس کو کچل ڈالنے کے لئے شہباز کی طرح جھپٹ کر پہنچ جاتے تھے۔ لیکن بہاولپور میں جانے کے وقت آپ بستر مرگ سے اٹھ کر گئے تھے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بہاولپور ایک ایسی ریاست تھی جو انگریزی راج کے ماتحت ہونے کے باوجود اسلامی ریاست کہلاتی تھی اور اس کی عدالتوں میں عائلی معاملات کی حد تک اسلامی قانون کے مطابق فیصلے صادر ہوتے تھے۔ شاہ صاحبؒ کی تمنا تھی کہ قادیانیت کے خارج از ملتِ اسلام ہونے کا فیصلہ کسی چھوٹی سی چھوٹی اسلامی حکومت کی عدالت سے ہی صادر ہو جائے تو حقیقت کو آشکارا کرنے اور فتنے کو اس کے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ایک مستحکم بنیاد بن جائے گی۔

بہاولپور کے عوام سے خطاب

جن دنوں (اگست ۱۹۳۲ء) بہاولپور کے تاریخی مقدمے

میں حضرت شاہ صاحب کو شہادت دینے کے لئے جانا پڑا۔ اس وقت آپ سخت علالت کی وجہ سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) کے مدرسے کی صدارت کا چارج مولینا شبیر احمد عثمانیؒ کو سونپ کر موافق آب و ہوا میں علاج کرانے کے لئے اپنے دولت خانہ پر دیوبند تشریف لے آئے تھے۔ دیوبند میں کچھ قلیل عرصہ ہی قیام فرمایا تھا کہ اسی دوران میں مقدمۂ بہاولپور کا معرکتہ الآرا واقعہ پیش آگیا۔ اس لئے حضرت کو وہاں جانا پڑا حالانکہ اب آپ چار و ناچار دوبارہ ڈابھیل جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ چنانچہ پہلے ہی جمعہ کو جب بہاولپور کی جامع مسجد میں عامۃُ المسلمین سے آپ نے خطاب فرمایا تو اس بات کا انکشاف ان الفاظ میں کیا:۔

"حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامان سفر باندھ لیا تھا کہ یکایک مولینا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ (بہاولپور) کا خط دیوبند موصول ہوا، کہ شہادت دینے کے لئے بہاول پور آیئے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بہاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانبدار ہو کر بہاولپور میں آیا تھا۔" (حیاتِ انور صـ۳۲۶، صـ۳۲۷)

مولینا محمد انوری لائلپوری کا بیان ہے کہ حضرت کے اس فرمانے پر تمام مسجد میں چیخ و پکار پڑ گئی، لوگ دھاڑیں مار مار کر اور

پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیتِ وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتامِ وعظ پر فرمایا کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی شان ایسی ہے اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ۔ حضرت فوراً کھڑے ہو گئے۔ فرمایا "حضرت! ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ "ہم سے گلی کا کتا ہی اچھا ہے"، ہم اس سے بھی گئے گذرے ہیں۔" (حیاتِ انور ص۳۲۷)

لاہور کا آخری سفر اور مسجد میں کرسی کا مسئلہ

بہاولپور کے اس سفر میں حضرت شاہ صاحب لاہور بھی تشریف لے گئے۔ وہاں دو روز قیام فرمایا۔ اس سلسلے میں مرحوم مولینا محمد انوری لائلپوری کے الفاظ میں ہی ایک اور واقعہ کا اندراج غیر مناسب نہ ہوگا:۔

مولینا لائلپوری یوں رقمطراز ہیں:۔

"(حضرت شاہ صاحب نے) آسٹریلین بلڈنگ (لاہور) کی مسجد میں بعدِ نمازِ فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء، عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوئے تھے۔ بیان ہوتا تھا:

"اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو" غرض حضرت نے خطبہ شروع فرمایا۔ "الحمدُ للّٰہ نحمدہٗ ونستعینُہٗ" الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے، احقر کے دل میں وسوسہ سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوءِ ادب ہو۔ حضرت نے فوراً

خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ مسجد میں کرسی رکھنا نبی کریمؐ سے ثابت ہے۔ چناں چہ مسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لئے حضورؐ کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اس کرسی کے پائے سیاہ تھے، غالبًا لوہے کے تھے، مصلّے کے قریب رکھی گئی، حضور نبی کریمؐ نے اسی پر بیٹھ کر جوابات دئے۔ یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرماکر حضرت نے وعظ کہا، احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔" (حیات انور ص۳۲۷۔ ص۳۲۸)

مرضُ الوِصال

ریاستِ بہاول پور اور شہر لاہور کے سفر کے بعد جب حضرت شاہ صاحبؒ دیوبند پہنچے تو آپ کی علالت میں مزید اضافہ ہوگیا اور سفر کی تھکان اور بے آرامی کی وجہ سے خونی بواسیر کے دیرینہ مرض نے شدت اختیار کرلی۔ لیکن ڈابھیل میں تدریس کا جو کام ہو رہا تھا آپ اس کو حاصلِ حیات کا درجہ دے رہے تھے اس لئے آپ اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ازسرِنو کچھ عرصہ کے لئے ڈابھیل تشریف لے گئے اور درسِ حدیث کا محبوب شغل جاری رکھا۔ آخر کار جب جسمانی ضعف و نقاہت نے انتہائی نازک صورت اختیار کرلی اور مسندِ درس کو

رونق بخشنے کا امکان ہی باقی نہ رہا تو آپ رُفقاء سے رخصت ہو کر واپس دیوبند تشریف لے آئے اور گھر پہنچ کر صاحبِ فراش ہو گئے۔ مرض کا یہ آخری حملہ اس قدر شدید تھا کہ کوئی علاج کارگر نہ ہو سکا۔ آپ کے جسم کا خون اس قدر ضائع ہو چکا تھا کہ اس کا بدل مایتحلل اب پیدا ہی نہ ہوتا تھا اور وہ دیرینہ مرض جس کو آپ اپنے علمی اِنہماک کی وجہ سے اہمیت نہ دیتے تھے اب مرضُ الوصال ثابت ہو رہا تھا اور ہُوا۔

مگر آخری دم تک مُطالعہ

اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں دینِ اسلام کی خِدمت کا جو جذبۂ بے پایاں ودیعت فرمایا تھا وہ آپ کو بسترِ مرگ پر بھی چین سے لیٹنے نہ دیتا تھا۔ آپ کو اپنے علاج کی طرف توجہ ہی نہ تھی، پرہیز وغیرہ سے بھی یک گونہ بے پروائی بلکہ بیزاری تھی۔ البتہ مُطالعۂ کتُب کا سلسلہ اس حالت میں بھی حسبِ معمول جاری تھا۔

مُعالج اطبّاء نے باصرارِ تمام مُطالعہ کی ممانعت کی اور عرض کیا کہ حضرت! اس سے مرض بڑھ جائے گا۔ فرمانے لگے کہ بھائی یہ کتب بینی بذاتِ خود میرا مُستقل مرض ہے اور لاعلاج ہے۔

دو پیشین گوئیاں

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولٰینا محمدؐ انوری لائلپوری تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"(حضرت مولٰینا) مفتی عتیق الرّحمٰن صاحب عثمانی (مدظلہ العالی) نے بیان فرمایا کہ حضرتِ شاہ صاحبؒ کے سفرِ آخرت اختیار فرمانے سے چند یوم قبل (میں) درِ دولت پر حاضر ہُوا۔ آپ نے فرمایا کہ میں

نے کبھی پیشین گوئی نہیں کی، اب تو دو باتیں ذہن میں آگئی ہیں، عرض کرہی دیتا ہوں " ایک یہ کہ حضرت شیخ الہند کے علوم کی خوب اشاعت ہوگی، دوم " ہندوستان (اب) ضرور آزاد ہوگا اس لئے کہ مظالم کی انتہا ہو گئی۔" (دار العلوم مئی ۱۹۶۵ء ص ۱۵)

اسی طرح حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ مرض وفات میں ایک دفعہ مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ " بھائی ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا کیونکہ اس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عاید کر دئے ہیں۔ ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا اُن پر پابندی عاید کرنا قدرت کا مقابلہ ہے۔ جس کے بعد زیادہ دیر تک بقا نہیں ہوسکتی اس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آگئے ہیں۔" (حیاتِ انور ص ۲۳۸ ۔ ص ۲۳۹)

مراجعت بطرفِ کشمیر کی تمنّا جہانگیر بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنی آخری تمنّا کے بارے میں سوال کا یہ جواب دیا تھا کہ " کشمیر و دِگر ہیچ "۔ حالانکہ کشمیر جہانگیر کے لئے صرف سیرگاہ تھی اور بس۔ حضرت شاہ صاحب کا خمیر ہی کشمیر کی خاکِ پاک سے تھا۔ یہ خطۂ دلپذیر آپ کا وطن تھا اور آپ کے آباء و اجداد کا وطن تھا۔ آپ کو اس جنّتِ ارضی کے ساتھ جو قلبی لگاؤ ہوسکتا تھا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ وفات سے متصل

قبل کے ایّام میں قلبِ مُبارک میں مُراجعت کشمیر کی تمنّا جاگ اُٹھی تھی، آپ چاہتے تھے کہ لولاب پہنچکر حضرت مولٰینا معظم شاہ صاحب کی قدم بوسی حاصل کریں۔ عزیز و اقارب سے بھی ملیں اور موافق آب و ہوا میں علاج بھی جاری رکھیں اور اس پر مزید یہ کہ اِن دِنوں پنجاب کے مُسلِم پریس کا ایک حصّہ یہ تاثر دے رہا تھا کہ قادیانی پارٹی نے کشمیر کے سیاسی ہنگاموں کا ناجائز فائدہ اُٹھا کر یہاں قادیانیت پھیلانے کا دھندا شروع کر رکھا ہے۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ یہ چاہتے تھے کہ کچھ وقت کے لئے کشمیر میں قیام کر کے عُلمائے کشمیر کا ایک محاذ مُنظّم کریں اور وادیٔ کشمیر کے عوام کو جھنجوڑ کر فتنۂ آخر زمان کے خطروں سے خبردار کریں۔ اور قادیانیت کے زہر کا کچھ نہ کچھ تریاق اپنی وفات سے پہلے مہیّا کر جائیں۔ مگر وقتِ مُعیّن قریب آپہنچا تھا اور اہلِ کشمیر بھی اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ ان کو یہ دولتِ غیر مُترقبہ ارزانی ہو جاتی اس لئے آپ کا یہ ارادہ عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

مولٰینا مُفتی محمّد شفیع صاحب کا بیان

حضرت مولٰینا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ (سابق مفتی اعظم پاکستان) کے بیان کے مُطابق مرضُ الوصال میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادہ تھا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے۔ اور وہاں اپنے اعزّہ و اقارب کی مُلاقات کے علاوہ پیشِ نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فتنہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تک وہاں پہنچکر

اس کے اِنسداد کے مُتعلق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اُردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے۔ فارسی زبان میں مسئلۂ ختمِ نبوّت اور قادیانیت کے متعلق لِکھ کر طبع کرکے وہاں ساتھ لے جائیں اور مُفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی۔ ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ مرض کے اِشتداد نے بالکل ہی قویٰ کو مُعطل کردیا تو ایک طالبِ علم کے ذریعہ اس ناکارۂ خلائق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیر کی ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلہ ختمِ نبوت پر ایک رسالہ لکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تکمیل سے معذور ہوں تجھ سے ہوسکے تو اس کی تکمیل کردے۔

کتاب خاتم النبیّین

احقر ناکارہ نے تعمیلِ ارشاد کو سعادت سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتاب عالمتاب غروب کے کنارے آلگا یہاں تک کہ اس پیکرِ علم و تقویٰ، مجسّم دین و دیانت نے دین ہی کی فِکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کردیا۔ اب وہ کشمیر کا قصد اور

ؔ حضرتِ شاہ صاحبؒ اپنی وفات سے کوئی ایک سال قبل ۱۳۵۰ھ میں آخری بار کشمیر تشریف لاچکے تھے۔ دورانِ قیام سوپور، بارہ مولہ اور لولاب وغیرہ مقامات پر اپنے مواعظِ حسنہ سے عامۃُ المسلمین کو مُستفید فرمایا۔ ۲۳، صفر ۱۳۵۰ھ کو حضرت ممدوح نے جو خطبہ جامع مسجد سوپور میں ارشاد فرمایا ہے اُسے اسی وقت قلم بند کیا گیا ہے۔ ایک رفیق کی وساطت سے راقم الحروف نے یہ تقریر حاصل کی ہے۔ کوندو

وہاں رسالہ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہو گیا۔ عرصہ کے بعد آپ کے مسوّدات میں سے وہ منتشر اوراقِ فارسی جمع کر کے مجلسِ علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت نے "خاتم النبیین" کے نام شائع کیا اور یہی اوراق آپ کا خاتمۃُ التصانیف قرار پائے۔"[1] (اور حضرت سرورِ عالم کی شانِ ختمِ نبوّت پر قادیانی دجّال نے جو حملے کئے تھے ان کی مدافعت کرتے کرتے حضرت شاہ صاحبؒ کی حیاتِ سراپا کرامات کا بھی خاتمہ ہوا)

یہ وہی "خاتم النبیین" نامی کتاب ہے جس کے متعلق مولانا قاری محمد طیب صاحب کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے "مرضِ وفات میں رو رو کر فرمایا کہ ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا۔ یہ رسالہ خاتمُ النبیین اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے۔ توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے"۔ (حیات انور ص ۲۳۴)

ــــــــــــــــــــ

[1] ملتقطاً و مختصراً حیات انور ص ۲۶۸ - ص ۲۶۹

وفاتِ حسرت آیات

۳؍ صفر ۱۳۵۲ھ
۲۹؍ مئی ۱۹۳۳ء

کُلُّ مَنْ علیھا فانٍ ○ وَّ یَبْقیٰ وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالجلالِ وَالاِکْرَام ○ (الرحمٰن)

(روئے زمین پر موجود ہر کوئی فنا ہونے والا ہے، آپ کے پروردگار کی ذات کو ہی دوامی بقا ہے جو عظمت اور احسان والی ہے۔)

امیرالمؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اور بار بار "رَبِّ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ" پڑھ رہے تھے۔ بسترِ مرگ کے پاس بیٹھی ہوئی آپ کی عظیم الشان دختر اُمّ المومنین حضرت عایشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبانِ مبارک سے آپ کے جذباتِ قلب ان الفاظ میں ادا ہوئے جو وفات کے ہر واقعہ کے بہترین ترجمان ہیں ؎

وَکُلُّ ذِی غَیْبَۃٍ یَئُوْبُ
وَغَائِبُ الْمَوْتِ لَا یَئُوْبُ

لہ اے رب! مجھ کو پوری فرمانبرداری کی حالت میں دنیا سے اُٹھا لے اور مجھ کو (خاص) نیک بندوں میں شامل کر لے۔"

(ہر مسافر کبھی نہ کبھی گھر آہی جاتا ہے۔ مگر موت کے سفر پر گیا ہوا کبھی واپس نہیں لوٹتا)

عبقریت اور جواں مرگی

علم و فضل کی دنیا میں ایسی بے شمار ہستیوں کا تذکرہ ملتا ہے جو وفات کی طبعی اور عادی عمر کو پہنچنے سے پہلے انتقال کر گئے۔ اور ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے والے آج بھی حسرت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ کاش یہ کچھ اور مدت جیئے ہوتے تو نہ جانے اس جہاں میں اپنے آثار کے کتنے خزانے چھوڑ جاتے۔"

استاذ العلماء والمحدثین علامۃ الدہر شیخ الحدیث حضرت مولٰینا انور شاہ کشمیری بھی عباقرۂ اسلام کی اس جواں مرگ جماعت میں شامل ہیں جو۔ اسی یا نوّے سال تو کجا عالم پیری کی پہلی منزل ساٹھ سال کی عمر کو بھی نہ پہنچنے پائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذہانت کی آگ کے تیز شعلے ذہین انسان کی جسمانی قویٰ کو اندر ہی اندر جلاکر بھسم کر دیتے ہیں ؎

سحر می گفت بلبل باغباں را
دریں گل جز نہالِ غم نگیرد
بہ پیری می رسد خارِ مغیلاں
ولی گل چوں جواں گردد بمیرد

إذا جاء الأجل

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی دیرینہ علالت کو صبر ایوبی کے ساتھ برداشت کرنے کے بعد ۳ ماہِ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ (مطابق ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء) کو "یا أیتها النفس المطمئنة ٥ ارجعي إلى ربك راضية

مَّرْضِيَّةً ؕ[1] " کا پیغام ربانی سن کر " لَبَّیْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّیْكَ[2] "
کہتے ہوئے اور " فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ؕ[3] "
کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے حضرتِ جان آفرین (جل جلالہٗ)
کو اپنی جانِ عزیز سپرد کر دی۔ اور اپنے اعزّہ و اقارب ملک
بھر کے علماء و فضلاء اور اپنے مدّاحین و معتقدین کو اشک بار
چھوڑ کر اپنے معبود و مقصود اور محبوب حقیقی الرَّفیق الاعلیٰ
سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

وَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهٗ هُلْكُ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهٗ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

(قیس کی وفات ایک آدمی کی وفات نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی
موت سے قصرِ ملّت کے ستون گر گئے ہیں۔)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے وقت آپ کے گرد و پیش
سے بقولِ مولینا مفتی محمد شفیع صاحب (مفتی اعظم پاکستان) گویا بزبان
حال یہ سنا جاتا تھا ؎

اگرچہ خرمنِ عمرم غمِ تو داد بباد
بخاکِ پائے عزیزت کہ عہد نہ شکستم

---

[1] " اے اطمینان والی روح! تو اپنے پروردگار (کے جوارِ رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش۔"

[2] میں حاضر ہوں اے میرے اللہ، میں حاضر ہوں۔"

[3] " تو میرے (خاص) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کے وِصال کا واقعہ دیوبند میں آپ کے اپنے دولت خانے پر ہی پیش آیا اور سرزمین دیوبند ہی میں آپ کے جسدِ خاکی کی تدفین عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ آپ کے رفیق شفیق شیخ وقت مولینا میاں اصغر حسین صاحبؒ (متوفی ۱۳۶۴ھ) نے پڑھائی۔ واقعۂ وِصال پر اگرچہ دیوبند سے باہر اعلان واطلاع کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا پھر بھی خبر وفات ہر طرف بجلی کی طرح پھیل گئی اور دور دراز علاقوں سے آنے والوں کا جمِ غفیر شامل نماز جنازہ ہوا۔ گوجرانوالہ، لاہور، لدھیانہ، دہلی، امرتسر سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ اور یو۔پی کے دیگر اطراف واکناف سے مرحوم کے تلامذہ اور محبین دیوبند پہنچ گئے۔

رنج وغم کی ہمہ گیر لہر حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ اپنی رحلت سے نہ صرف اپنے جگر پاروں ازہر، اکبر اور انظر کو بے سہارا چھوڑ گئے بلکہ اپنے تلامذہ اور وقت کے عُلماء وفضلاء کو یتیم کر گئے۔ جس روشن، نورانی اور پُرکشش رُخِ انور کو دیکھ کر ایک غیر مُسلم نے کہا تھا کہ "اسلام کے حق ہونے کی ایک مُستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے۔" وہ آفتاب اپنے عُشاق کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا۔

ہندوستان، بنگال و برما اور بلادِ اسلامیہ کے مشہور اہلِ علم اور دینی اداروں نے حضرت مرحوم کی رحلت کے صدمہ کو محسوس کیا۔ اور اپنے ملک کی حدود سے نکل کر غیر ملکی اخبار و جرائد میں دیر تک آپ کے حالاتِ زندگی پر تذکرے شائع ہوتے رہے۔ پورے

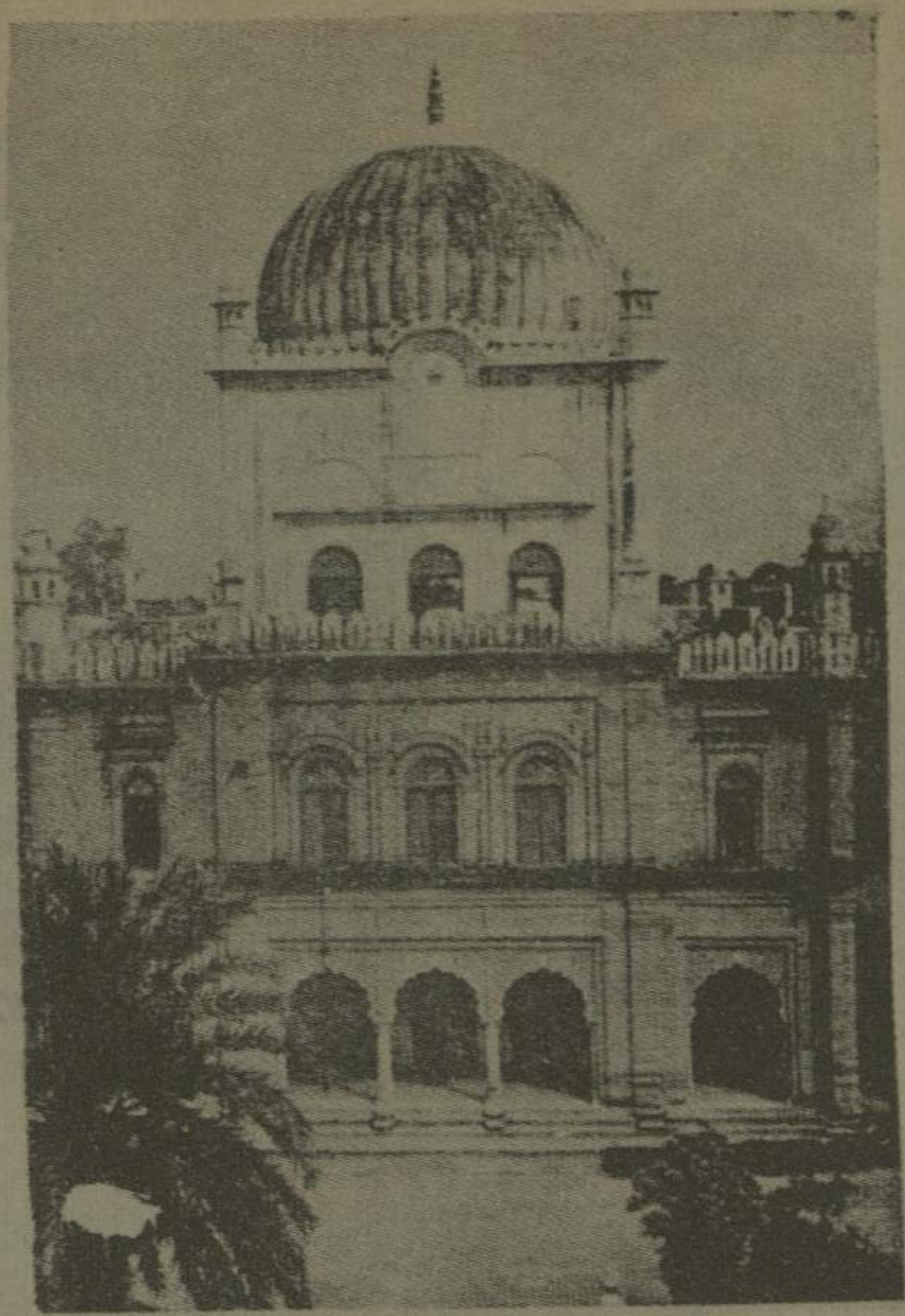
غیر منقسم ہندوستان میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک آپ کی وفات کو قومی اور ملی نقصان کے طور پر محسوس کیا گیا اور تقریر و تحریر اور نثر و نظم میں اس نقصانِ عظیم پر اشک باری کی گئی۔

ماتم کدۂ ڈابھیل چونکہ وفات کے وقت آپ کا بحیثیتِ صدرُ المدرّسین جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سے تعلّق تھا اس لئے اس ادارے کا سب سے زیادہ متاثر ہونا قدرتی امر تھا۔ جس دِن حضرت شاہ صاحب کے انتقال کی اطلاع ڈابھیل پہنچی تو پورا خطۂ ڈابھیل ماتم کدہ بن گیا۔

حضرت مولٰینا شبیر احمد صاحب عثمانی (متوفی ۱۳۶۹ھ) بے ساختہ چیخیں اور دھاڑے مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ آہ! اب کس کے پاس جاکر علمی اشکالات حل کرائیں گے؟ اس سلسلے میں مولٰینا سیّد احمد رضا صاحب بجنوری کا بیان ہے کہ:

"جب جلسۂ تعزیت (جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے) دارُالحدیث میں منعقد ہُوا تو مجھے وہ منظر اب تک یاد ہے کہ طلبہ، اساتذہ اور اہلِ قصبہ کا پُورا مجمع حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات پر گریہ و بکا میں مصروف تھا اور خود حضرت (مولٰینا) عثمانیؒ نے جب تقریر شروع فرمائی تو وہ بھی تحمّل نہ فرما سکے اور فرطِ گریہ سے کچھ دیر کے لئے رُکے۔ تقریر بند کرنی پڑی۔ پھر انہوں نے طلبہ کو خطاب فرمایا:

"حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات سے تم لوگ یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم جیسے پڑھانے والے یتیم ہو گئے ہیں کیونکہ تمہارے لئے تو خدا کے فضل سے ہم بھی کافی ہیں۔ مگر جس سے ہم پڑھانے والے پڑھتے



دار التفسیر، دار العلوم دیوبند



دار الحدیث، دار العلوم دیوبند



حضرت علامہ کشمیریؒ کی خواب گاہ۔
خاک کی وہ ڈھیری جس کے نیچے ایک گنجِ گراں مایہ پنہاں ہے۔



حضرت شاہ صاحبؒ کے جدِ بزرگوار حضرت الشیخ بابا مسعود نرورئیؒ کی تُربت۔
منظر میں سنگِ مزار کے سرہانے چراغ دان پھولوں کے جُھنڈ میں سے سر اُٹھائے کھڑا ہے۔

تھے، وہ شخصیت ہم سے جدا ہو گئی ہے۔ الخ" (نطق انور صہ۹)

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد حضرت مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحؒ نے ڈابھیل میں علماء و طلباء کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے اپنے مشفق محترم حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق بلیغ انداز میں فرمایا کہ "بھائی! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ صحابہؓ کا قافلہ جارہا تھا، (اس میں سے) یہ پیچھے رہ گئے تھے"۔

وادیٔ کشمیر میں صفِ ماتم

حضرت شاہ صاحبؒ کے انتقال پر سارے ملک کے علمی اور مذہبی حلقوں میں جو صفِ ماتم بچھ گئی تھی، اس میں آپ کے اہلِ وطن پیش پیش تھے۔ وادیٔ کشمیر کے طول و عرض میں اسوقت ایسے بے شمار اہلِ علم موجود تھے جو براہِ راست یا بالواسطہ آپ کے علمی و روحانی فیوض سے بہرہ ور ہو چکے تھے اور آپ کی ذات کو اسلام کی دولت بے بہا یقین کرتے تھے۔ سرینگر، سوپور، بارہ مولہ اور اسلام آباد کی مساجد و معابد میں دعائیہ مجالس اور فاتحہ خوانی کے حلقے منعقد ہوئے۔ کشمیر کے علماء و فضلاء اور مشاہیر و مقتدر شعراء نے سرینگر میں ایک ماتمی اجتماع کیا جہاں حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائل و مناقب بیان کئے گئے اور آپ کے علوم و کمالات پر تقریریں ہوئیں اور مشہور شعراء خواجہ عبدالقادر صاحب درویش، پیر عبدالقادر صاحب آثم (ملارٹی)، خواجہ محمد امین صاحب داراب، سید مبارک شاہ گیلانی فطرت اور خواجہ سعدالدین سعد صاحب نقشبندی وغیرہم نے نہایت عالمانہ مرثیے پڑھے۔

(جن میں سے پیر عبدالقادر صاحب آثم کا مرثیہ اس کتاب کے اگلے صفحات میں شامل ہے۔)

باپ کے آنسو خطۂ کشمیر کے باشندے حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات حسرت آیات پر نالاں و گریاں تھے ہی۔ آپ کے اخوان و اقرباء خصوصاً آپ کے پدرِ بزرگوار مولینا معظم شاہ صاحب پر کیا گذری ہو گی اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل امر نہیں۔ آپ تو اِنَّمَآ اَشْكُوْ بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کی تصویر بن کر رہ گئے ہونگے۔ حضرت معظم شاہ صاحب پہلے بھی ایک جواں سال فاضل اور شاعر فرزند مولوی الیٰسین شاہ کی وفات کا صدمہ برداشت کر چکے تھے۔ اور اب علّامہ انور شاہ جیسے ہمہ صفت موصوف اور علمی دُنیا میں سورج کی طرح مشہور و معروف لختِ جگر کی جُدائی نے انہیں جیتے جی ہی مار ڈالا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے موقعہ پر آپ کو اطراف و اکناف سے بے شمار تعزیتی پیغامات موصول ہوئے۔ جامعہ اسلامیہ کے مُنتظمین نے بھی ایک تعزیت نامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس کے جواب میں مولینا معظم شاہ صاحب نے ادارہ کو شکریہ کا ایک خط تحریر فرمایا جس میں دیگر باتوں کے علاوہ لکھا تھا کہ :-

"میں ہمیشہ سے اس آرزو میں تھا کہ حضرت مرحوم میرا جنازہ پڑھائیں اور وقتاً فوقتاً فاتحہ سے یاد فرماتے رہیں گے۔ افسوس کہ خاکسار کی یہ تمنّا پوری نہ ہو سکی۔ الخ"

دہلی و لاہور کے تعزیتی جلسے :- حضرت شاہ صاحبؒ دوشنبہ کو

انتقال فرما گئے۔ آنے والے جمعہ کو جامع مسجد دہلی میں مفتی اعظم ہند حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہؒ (متوفی ۱۳۷۲ھ) کی صدارت میں ایک بہت بڑا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں علماء و فضلاء کی ایک جماعت نے حضرت شاہ صاحبؒ کو خراج عقیدت پیش کیا۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے شاہ صاحبؒ کی رحلت کو کامل ترین عالم ربانی کی وفات قرار دیا۔

دہلی کے اسی جلسہ میں سحبان الہند مولینا احمد سعید صاحب دہلویؒ (متوفی ۱۳۷۹ھ) نے شاہ صاحبؒ کی شان میں جو طویل اور بلیغ تقریر ارشاد فرمائی وہ اگلے صفحات میں من وعن مجموعۂ ہذا کی زینت ہے۔ یہاں صرف اس تقریر کا حسب ذیل اقتباس درج کرنا کافی ہوگا۔

"معزز حاضرین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے دوشنبہ کی شام کو دیوبند کی خاک میں کسی انسان کو دفن نہیں کیا ہے، بلکہ آپ نے ایک ایسے مکتبہ کو خاک میں ملایا ہے جس میں ہر فن کی بے شمار کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے ایک ایسے کتب خانہ کو زمین کی تہ میں چھپا دیا ہے جس کی کتابیں احاطۂ احصاء و شمار سے خارج تھیں۔ ہائے مسلمانوں کی بدقسمتی، ہائے قوم کی حرماں نصیبی، کیا چیز ان کے ہاتھ سے تلف ہوگئی"۔

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، جولائی ۱۹۶۶ء)

لاہور کے تعزیتی جلسے میں حضرت علامہ اقبالؒ (متوفی ۱۹۳۸ء) نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔" (مقدمۂ انوار الباری حصۂ دوم، ص ۲۲۵)

ہر طرف سے خراجِ عقیدت

فاتح قادیان حضرت مولینا ثناء اللہ امرتسری نور اللہ مرقدہٗ اس موقعہ پر اخبارِ اہلحدیث امرتسر میں حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ فرماتے ہوئے تحریر فرماچکے ہیں: "بے نظیر عالمِ دین رخصت ہوگیا۔"

دار المصنّفین اعظم گڈھ کے ترجمان رسالہ "معارف" جون ۱۹۳۳ء کے شذرات میں اپنے دردِ دل کا اظہار فرماتے ہوئے حضرت علامہ سیّد سلیمان ندویؒ یوں رقمطراز ہیں:۔

"دین ودانش کا مہرِ انور ۲۹ر مئی ۱۹۳۳ء کی صُبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا.......مرحوم کم سخن لیکن وسیعُ النظر عالِم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔الخ"

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عُثمانیؒ نے جلسہ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کو حافظ ابن حجر عسقلانی، شیخ تقی الدین اور سُلطانُ العُلماء کا انتقال قرار دیا۔

مزارِ پُر انوار

بر مزارِ ما غریباں نے چراغ و نے گُلے
نے پرِ پروانہ سوزد، نے صدائے بُلبلے

اس شعر میں شاعر نے مزار کی جس سادگی اور درسِ فنائیت کا نقشہ پیش کیا ہے، وہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مزارِ پُر انوار پر صادق آتا ہے۔ کیونکہ دیوبند کے دیگر اکابرِ عُلماء و صُلحاء کے مقابر کی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کی تُربتِ شریف کو بھی شریعتِ اسلامیہ کی ہدایات کے مُطابق رکھا گیا ہے تاکہ "لا تجعلوا قبری صَنَمًا" کی عملی تعمیل کا

زندہ نمونہ سبق آموز ہے۔

سرزمینِ کشمیر کا یہ مایۂ ناز فرزند اور علم وعمل کا یہ پیکرِ عظیم سرزمینِ دیوبند کے عیدگاہ سے متصل محوِ استراحت ہے۔ آپ کی تربت مخزنِ قربت بالکل کچی ہے۔ اس کا نہ کوئی پختہ چبوترہ ہے اور نہ اس پر کوئی قبہ اور گنبد ہے۔ اگر ایک طرف کو بعد کے زمانے میں نصیب کئے کتبے سے رہنمائی نہ ملے تو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ شاہ صاحب کہاں پر آرام فرما ہیں؟ اللہ اللہ! اس سادگی پر ہزار بناؤ قربان کئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر بینوں کو وہاں کیا ملیگا؟ البتہ اہلِ دل اور اصحابِ دانش وبینش کے لئے وہاں ہمہ وقت انوار وتجلیات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ اور ارادتمند برابر فاتحہ کے پھول چڑھاتے رہتے ہیں۔

دیوبند میں وقتاً فوقتاً دنیائے اسلام کی برگزیدہ ہستیاں وارد ہوتی ہیں۔ ان میں سے اہلِ ذوق حضرت شاہ صاحبؒ اور دیوبند کے دیگر اکابر بزرگانِ ملت کے مقابر پر حاضری اور فاتحہ خوانی کے بغیر سیرِ دیوبند کو ادھورا تصور کرتے ہیں۔ یہ صاحبِ قبر حضرت شاہ صاحبؒ کی بلند وبالا شخصیت کا کرشمہ ہے کہ ظاہری اور رسمی دھوم دھام نہ ہوتے ہوئے بھی آپ کی قبر شریف یُزارُ وَیُتبرّکُ بہ کا نمونہ ہے۔

ایک حالیہ واقعہ مجموعۂ ہٰذا ابھی زیرِ ترتیب ہی تھا کہ ۲۴ر اپریل ۱۹۷۶ء کو صدرِ جمہوریۂ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب دیوبند تشریف فرما ہوئے۔ اخبارات میں چھپا کہ آپ پورے سرکاری لوازمات کے ساتھ اکابرینِ دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن،
حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا انور شاہ
کشمیری (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) کے مقابر پر ایصالِ ثواب کے
لئے تشریف لے گئے۔

مرقدِ انور پر فاتحہ خوانی کے موقعہ پر صدرِ جلیل القدر کے ہمراہ
حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزندانِ کرام کے علاوہ مولانا اسعد مدنی
(صدر جمعیۃ العلماءِ ہند) مولانا حامد الانصاری غازی (ممبر مجلسِ شوریٰ
دارالعلوم دیوبند) جناب محمد عثمان (چیئرمین میونسپل بورڈ دیوبند)
شری نرائن دت تیواری (وزیرِ اعلیٰ یوپی)، ڈاکٹر چنا ریڈی (گورنر
یو۔پی) اور دیگر عمائدین و زعماء بھی تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا کنبہ

حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے اکابر و اقرباء میں مشائخ
و علماء اور رجالِ مشہور کی اتنی کثرت ہے کہ ان سب کو سمیٹنے کے
لئے ایک الگ مجلد کی ضرورت ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ ایک
مختصر تتمہ کی صورت میں حضرت شاہ صاحبؒ کے جدِ امجد، آپ کے
خاندان اور کشمیر کے ہزاروں مسعودیوں کے جدِ اعلیٰ حضرت الشیخ
بابا مسعود نروریؒ کا مختصر تذکرہ شامل کر دیں اور آپ کی اولاد کی
مختلف شاخوں میں سے جو حضرات علمی اور عملی کمالات میں مشاہیر
ہو گذرے ہیں ان کے حالات کی تھوڑی سی جھلک اس ضمن میں

شامل کتاب کر دیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے بزرگوار دادا صاحب قاضی شاہ عبدالکبیر کا تذکرہ بھی اسی تتمہ میں ہی آئے گا۔ البتہ آپ کے والدِ ماجد مولٰینا محمدؐ معظم شاہ صاحب کا تذکرہ جو قدرے تفصیل کا مُتقاضی ہے شاہ صاحب کے اقرباء و اولاد کے تذکرے کے ساتھ ساتھ کر دینا برمحل محسوس ہوتا ہے۔

والدِ ماجد کتابِ ہٰذا کے مختلف ابواب وفصول میں شاہ صاحب کے والدِ گرامی کا جو حال بیان ہوا ہے اس کا خُلاصہ یہ ہے کہ "مولوی پیر محمدؐ معظم شاہ صاحب" قاضی شاہ عبدالکبیر صاحب کے چھ فرزندوں میں سے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ آپ قریباً ۱۲۵۰ھ میں یا اس سے بھی کچھ قبل وادیٔ نیلم کے ایک گاؤں "کوٹن" میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال کو بھی نہ پہنچے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ خاندانی روایات میں ہے کہ وفات کے وقت باپ نے اس ننھی سی جان کو اپنے سینے سے چمٹا کر دیر تک آنکھیں بند رکھیں اور نہ جانے کیا کیا دُعائیں دیتے رہے اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح چھوٹے مُعظم کی پرورش بھی موضع لوات میں اپنے قریبی رشتہ داروں نے کی۔ ابتدائی تعلیم بھی لوات ہی میں حاصل کی اور اپنے قبیلہ کے دستور کے مُطابق اونچی تعلیم کے لئے ضلع ہزارہ کے عربی مدارس میں جا کر داخل ہو گئے۔ وہاں کے نصاب کی تکمیل کے بعد واپس لوات آ گئے۔ موضع دودھوان (کپواڑہ) کے پیر سیف اللہ شاہ کی دختر سے شادی کی اور اہلیہ محترمہ کو بھی لوات لے گئے اور

صاحب اولاد ہو جانے کے بعد بھی مزید برسوں تک لوات میں مقیم رہے۔ مگر چونکہ اپنا اور بیوی صاحبہ دونوں کے اجداد کا وطن لولاب تھا اس لئے صاحب عیال ہو جانے کے بعد آپ نے وادیٔ نیلم کو ترک کر کے وادیٔ لولاب میں منتقل ہونے کا عزم کر لیا اور کچھ اپنی کوششوں سے اور کچھ اپنے سسرال والوں کی مساعیٔ جمیلہ سے قریباً ۱۳۰۰ھ میں لولاب کے موضع وَرنو میں وہ گھر بنا لیا جو اب قریباً ایک سَو سال سے، پہلے آپ کا اور اب آپ کی ذُریات کا مسکن چلا آ رہا ہے۔ جب آپ وادی نیلم میں تھے تب بھی اور لولاب سے چلے آنے پر بھی تبلیغ دین، وعظ و تذکیر، فتویٰ نویسی اور تعلیم و تدریس کے ساتھ پیری و مُریدی کے لوازمات کی انجام دہی آپ کا محبوب مشغلۂ حیات رہا۔ اس زمانہ میں ڈوگرہ حکومت عوام کی بیداری کو اپنے وجود کے لئے خطرناک تصوّر کرتی تھی اور اس نے ہر قسم کی تقریر اور عوام سے خطاب کی ممانعت کر رکھی تھی۔ بڑی مُشکل سے صرف چند ایک ایسے عُلماء ہی دین کی تبلیغ کر سکتے تھے جن کے پاس حکومت کا تحریری اجازت نامہ ہوتا تھا اس لئے مولینا معظم صاحبؒ نے بھی مہاراجہ رنبیر سنگھ سے اجازت نامۂ وعظ خوانی حاصل کر رکھا تھا۔ اور پولیس کی مُداخلت کے بغیر کھُلے بندوں تبلیغ اسلام کا فرض انجام دیتے تھے۔ ان مشاغل سے بچے ہوئے اوقات کو آپ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں صرف کرتے تھے۔ آپ کی عبادت و ریاضت اور تہجّد کی پابندی ضرب المثل تھی۔ کشمیر کے اہلِ علم کے ہاں آپ کا شمار دانشمندانِ وقت

میں ہوتا تھا۔ آپ فارسی زبان کی نثر میں صاحب طرزِ محرّر اور نظم میں قادرُ الکلام شاعر تھے۔ طویل عمر کے ساتھ ساتھ آپ قابلِ رشک صحت کے مالک تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی والدۂ ماجدہ کی وفات کے بعد دردِ تنہائی سے تنگ آکر جب آپ نے دوسرا نکاح کیا تو اس وقت آپ کی عُمر نوّے سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس عُمر میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ساتواں فرزند عطا کیا جو بحمدِ اللہ ابھی تک بقیدِ حیات ہے۔ مولینا معظّم صاحب کو دو قابل ترین فرزندوں مولوی یٰسینؒ شاہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی قبل از وقت وفات کے صدمات برداشت کرنے پڑے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد آپ مزید کوئی آٹھ نو سال زندہ رہ کر ایک سو دس سال کی عمر پا کر انتقال کر گئے، اور اپنی مسجد کے مشرق کی طرف بُلند ٹیلے پر مدفون ہوئے۔ رحمہُ اللہ تعالیٰ وَبَرَّدَ مَضْجَعَہٗ۔

الاخوان حضرت شاہ صاحبؒ کے والدِ ماجد مولینا مُعظّم صاحبؒ کے سات صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:۔

مولینا یٰسینؒ شاہ، حضرت مولینا محمد انورؒ شاہ، مولینا عبد اللہؒ شاہ، مولینا سلیمانؒ شاہ، پیر محمد نظامُ الدّین شاہ، مولینا سیفُ اللہؒ شاہ اور پیر محمدؒ شاہ۔

مولینا معظّم صاحبؒ کے ان ساتؒ فرزندوں میں سے پہلے چھ صاحب انتقال کر گئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم، والدین کی حُسنِ تربیت، تعلیم اور

دُعاؤں کی برکت سے یہ تمام بھائی چندے آفتاب و چندے مہتاب تھے۔ اپنی صورت و سیرت اور سلیقہ ہر صفت میں ابنائے زمانہ سے مُمتاز تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے علوم کی تکمیل حضرت شاہ صاحبؒ کے سِوا صرف مرحوم مولینا سیفُ اللہ شاہ نے کی تھی۔ مگر دیکھنے اور برتنے میں ان میں سے ہر ایک عالمِ دین ثابت ہوتا تھا۔

(۱) مولینا یٰسین شاہ: عمر میں سب سے بڑے تھے بڑے ذکی، فہیم، عالِم اور شاعر تھے۔ ۱۳۲۰ھ ۱۹۰۰ء میں (جبکہ آپ صرف ۲۳ سال کے تھے) ان کا اچانک انتقال ہوگیا اور اپنے پیچھے کوئی اولاد بھی نہ چھوڑی۔ حضرت شاہ صاحبؒ ان دِنوں مدرسۂ امینیہ دہلی میں صدر مُدرّس تھے۔ اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے کشمیر آکر مُدّت تک غمزدہ والدین کی تسکینِ قلب کے لئے ٹھہرے رہے۔

(۲) خود صاحبِ تذکرہ ــــ حضرت شاہ صاحبؒ۔

(۳) مولینا عبداللہ شاہ:۔ حضرت معظم صاحب نے اپنی جدت پسندی کی وجہ سے آپ کا پہلا نام بسم اللہ شاہ رکھا تھا مگر جواں ہوکر حضرت شاہ صاحبؒ کے مشورے سے آپ عبداللہ شاہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ آپ بھی انتہائی ذہین تھے اور اپنے وقت کے ممتاز ترین طبیب حاذق تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دستِ شفا ارزانی کر رکھا تھا۔ آپ صرف نبض سے (بلکہ اکثر و بیشتر نظر ہی سے) مرض کی جو

تشخیص کرتے وہ ہو بہو ایکسرے (X-RAY) کے مطابق ہوتی تھی۔ ان کی غیر معمولی ذہانت اور تشخیصِ امراض آج بھی ضلع بارہ مولہ میں زبان زدِ خاص و عام ہے اور عجب تر آنکہ طبِ یونانی کی تعلیم و تربیت آپ نے باضابطہ کسی سے بھی نہیں لی تھی، جو کچھ بھی تھا ذاتی اور تفریحی مُطالعہ پر مبنی تھا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

آپ فارسی زبان کے شاعر بھی تھے۔ بعض شرعی مسائل کو نظم کیا تھا۔ طبابت سے بچا ہُوا وقت خدا تعالیٰ کی یاد اور گوشہ نشینی میں بسر کرتے تھے۔ آپ کے اکلوتے فرزند پیر محمد سعید شاہ صاحبِ علم و عمل اور طبابت غرضیکہ ہر کام میں آپ کے مکمّل جانشین ہیں۔ اور بقیدِ حیات ہیں۔

(۵ و ۶) مولٰینا سلیمان شاہ اور مولٰینا سیف اللہ شاہ

مولٰینا سلیمان شاہ کو عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر خاص دسترس تھی۔ فتویٰ نویسی آپ کا شغل تھا۔ فقہی کتُب پر نظر وسیع تھی۔ آپ نے اور مولٰینا سیف اللہ شاہ نے تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے اوّلین دَور میں عوام کو بیدار کرنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ ۱۹۳۱ء میں سرینگر سے سیاسی تحریک کا جو نعرہ بُلند ہُوا اُس سے دیہاتی علاقے اِبتدا میں کم سے کم متاثر ہوئے۔ لیکن کامراج، لولاب اور ہندوارہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے برادران مولٰینا سلیمان شاہ و مولٰینا سیف اللہ شاہ صاحب جب میدانِ عمل میں نکل آئے تو تحریک نے بے پناہ ہنگامے کی

صورت اختیار کرلی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ان علاقوں میں ان حضرات کا اثر اور عقیدت پہلے سے موجود تھی۔ اس لئے انکی زبان سے نئی تحریک کو عوام نے پورے اعتماد اور جوش کے ساتھ یک دم قبول کرلیا۔ حکومت نے لوگوں پر سخت تشدد کیا۔ پولیس نے ہندوارہ میں نماز جمعہ پڑھکر نکلتے ہوئے ہجوم پر گولیاں چلائیں جس سے درجنوں شہید ہوئے اور زخمیوں کا شمار ہی نہیں۔ مولانا سلیمان شاہ، مولانا سیف اللہ شاہ اور ان کے رفیقوں حاجی عبدالغفار، مفتی محمد شاہ تارت پوری ماسٹر غلام حسن مخدومی، خواجہ محمد لون (ہندوارہ) اور غلام قادر وغیرہ کو طویل قید و بند اور بڑے بڑے جرمانوں کی سزائیں دی گئیں۔

یہ ماہ جنوری اور فروری ۱۹۳۲ء کے واقعات ہیں کہ جب کشمیر کی ڈوگرہ حکومت نے علاقۂ ہندوارہ میں فوج بھیجکر مولانا سیف اللہ شاہ اور سلیمان شاہ کو گرفتار کیا اور الزام یہ لگایا کہ ان دونوں بھائیوں نے کامراج میں اپنی حکومت قائم کرکے مولانا سیف اللہ شاہ کو حاکم اعلیٰ اور سلیمان شاہ کو چیف جسٹس بنا رکھا ہے۔ فوج نے دہشت گردی کے بعد دونوں کو گرفتار کرکے پولیس کے ہاتھوں بہت سی تکالیف کا ہدف بنانے کے بعد کئی دنوں تک برف اور کیچڑ بھرے راستوں سے پیدل چلاکر سنٹرل جیل سرینگر پہنچاکر بند کردیا۔ یہ سزائیں دونوں بزرگوں نے نہایت ہمت، استقلال اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیں بزمانۂ اسارت جیل کے سینکڑوں قیدیوں کو ان کے علمی اور روحانی

فیوض حاصل ہوتے رہے۔ رہائی کے بعد بھی عوامی تحریک میں دونوں بھائیوں کا رول بہت نمایاں رہا۔ مسلم کانفرنس قائم کرنے میں بھی دونوں بھائی دوسرے سیاسی رہنماؤں کے دوش بدوش رہے۔ اپنے والدِ ماجد مولینا معظم صاحبؒ کی وفات کے چند سال بعد مولینا سلیمان شاہ انتقال کرگئے۔ آپ کے چار فرزند ہیں (۱) مولینا عزیزالدین شاہ (۲) مولوی احمد سعید شاہ (۳) مولوی عبدالرشید شاہ، اور (۴) مولوی عبدالمجید شاہ۔ چاروں نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ خاصکر مولوی عبدالمجید شاہ نے کشمیر یونیورسٹی سے عربی زبان میں مولوی فاضل کی ڈگری حاصل کی ہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح کشمیر کے محکمۂ تعلیم میں خدمات انجام دیتے ہیں۔

مولینا سیف اللہ شاہ کے سیاسی کارناموں کا تذکرہ اوپر آچکا۔ آپ اپنے علم و عمل کے لئے بھی مرجعِ عام تھے۔ آپ فاضل دیوبند، حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند میں میرواعظ مولینا محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم کے ہمدرس تھے۔ دونوں نے ایک ہی سال سندات حاصل کی تھیں۔ لولاب اور ملحقہ علاقوں میں آپ کے عقیدت مندوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ ۲۷، اکتوبر ۱۹۷۴ء کو آپ وفات پا گئے۔ آپ نے دو فرزند پیچھے چھوڑے ہیں۔ آپ کے بڑے فرزند پیر شریف الدین صاحب ہیں۔

(۷) **پیر محمد شاہ:۔** آپ حضرت شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ نے وُدَر کو چھوڑ کر درگمولہ

(کپواڑہ) میں سکونت اختیار کرلی ہے اور تجارت کا شغل اختیار کر رکھا ہے۔

اولادِ نا اکبار نا

حضرت شاہ صاحبؒ کی اولاد۔ ذکور و اُناث کُل پانچ تھے۔ تین صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں۔ ان سب میں بڑی صاحبزادی عابدہ خاتون تھیں۔ یہ اور منجھلے صاحبزادے محمد اکبر شاہ دونوں حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد جلد ہی انتقال کر گئے۔ اور صرف دو صاحبزادے اور ایک صاحبزادی زندہ رہے۔ جو اب تک خدا سلامت رکھے زندہ ہیں۔

یہ ہیں:- (۱) مولٰنا حافظ محمّد ازہر شاہ قیصر (۲) مولٰنا محمد انظر شاہ (۳) محترمہ راشدہ خاتون۔

حضرت شاہ صاحب کی وفات کے وقت یہ تینوں نوعمر اور نابالغ تھے، سوجھ بوجھ اور رُشد کی عُمر کو ابھی کوئی بھی نہ پہنچا تھا اور نا ہی کسی کی تعلیم آپ کے سامنے کسی قابل لحاظ درجے تک پہنچ پائی تھی۔

مولٰنا حافظ محمّد ازہر شاہ قیصر

آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے فرزند ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے وقت آپ کم سن تھے۔ یتیمانہ حالات و مشکلات کو ہمت سے برداشت کرتے ہوئے آپ نے عربی اور فارسی کی تعلیم ذاتی مطالعہ سے حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ناموافق کوائف کی وجہ سے آپ کسی قاعدے اور ڈھنگ سے تعلیم کی تکمیل

تو نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم موروثی ذہانت و فطانت اور اپنے مُطالعہ اور محنت سے اتنی عُمدہ قابلیت حاصل کر لی ہے کہ ایک وسیعُ النّظر عالِم کی حیثیت میں علومِ ضروریہ کی کُتُب زبان ہائے عربی اور فارسی وغیرہ سے پورا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اُردو زبان جو آپ کو مادری دولت ہے، اس کے نظم و نثر کے ساتھ اور اس کے ادب اور صحافت کے ساتھ آپ کو غیر معمولی اور فطری لگاؤ ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے آپ کا رہوارِ قلم اس میدان میں جولانیاں دکھا رہا ہے۔ ابتداء میں اخبار الانور دیوبند، اخبار استقلال دیوبند، رسالۂ خالد دیوبند اخبار صداقت سہارن پور، اخبار زمیندار لاہور اور اخبار شہباز لاہور کے صفحات آپ کے رشحاتِ قلم کے لئے وقف رہا کرتے تھے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کے زمانے میں آپ کے جو بے شمار ادبی اور سیاسی مضامین برصغیر کے مشہور اخبارات اور اونچے معیار کے جرائد و رسائل میں چھپتے رہے وہ اگر جمع کئے جائیں تو کئی ضخیم جلدیں مُرتّب ہو سکتی ہیں۔

ادارتِ جریدۂ دارُ العلوم

تقسیمِ مُلک کے بعد آپ دارُ العلوم دیوبند کے ترجمانِ خاص ماہنامہ "دارُ العلوم" کی ادارت کی ذمّہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ گذشتہ ایک رُبع صدی سے رسالۂ دارُ العلوم کی ادارت کے گرانبار فرائض کامیابی سے سرانجام دینے کے علاوہ آپ تصنیف و تالیف کے شغل سے بھی غافل نہیں ہیں۔ مزمن علیل اور عدیمُ الفرصت ہونے کے باوجود کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ کتاب "حیاتِ انور" تو آپ کی بہت پُرانی تالیفات میں سے ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رض کے

حالات میں "صدیق اکبر" نام سے بھی آپ کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے۔ اور آپ کی ایک تازہ تصنیف "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" تھوڑی مدت پہلے شایع ہوئی ہے جو اپنی نوعیت کی خاص چیز ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ بھی اور بہت سی گرانقدر تخلیقات غیر مرتّب و غیر مکمل ہیں جو اپنی اشاعت کے لئے موافق حالات اور آپ کی فرصت کی منتظر ہیں۔

مولینا ازہر صاحب نے یکے بعد دیگرے دو نکاح کئے تھے دونوں سے آپ کو خدا نے بابرکت اولاد عطا فرمائی ہے۔ آپ کے چار فرزند اور تین صاحبزادیاں ہیں۔ صاحبزادوں کے نام یہ ہیں :۔ محمد اطہر، محمد راحت، محمد نسیم اور محمد وجاہت۔

مولینا محمد انظر شاہ صاحب

آپ اس وقت دارالعلوم کے اساتذہ میں سے ایک اہم مدرّس اور اس کے ناظمِ تعلیم ہیں۔ آپ نے دارالعلوم دیوبند سے ہی علوم کی تکمیل کی ہے اور دورِ یتیمی کی صبر آزما ابتلا و آزمائشوں سے گذر کر اپنی شخصیت کو نکھارا ہے۔ آپ آج کل دارالعلوم دیوبند میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے صدقے میں طبقۂ اعلیٰ کے اساتذہ کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ فنونِ حدیث اور تفسیر کے لائق مدرّس اور کامیاب مقرر ہونے کے علاوہ آپ دارالعلوم کے موجودہ اساتذہ میں ایک فاضل محقق و مصنف مانے جاتے ہیں آپ کی کئی کتابیں منصۂ شہود پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ جن میں "تذکرۃ الاعزاز" اور "شرح اسماءِ حسنیٰ" آپ کی ابتدائی مشق کی

چیزیں تھیں، اب آپ کا تفسیر ابن کثیر پر ایک بسیط حاشیہ بھی منظر عام پر آیا ہے جو آپ کا علمی کارنامہ ہے۔ آپ علم و عمل کی ترقی کے راستہ پر جس رفتار سے گامزن ہیں اس کو دیکھ کر اُمید ہے کہ وقت آنے پر آپ اپنے فقید النظیر والد کے قدم بقدم جادہ پیما دکھائی دیں گے اور اس مقولہ کے مصداق ثابت ہونگے ؎

إِذَا مَاتَ مِنَّا سَيِّدٌ قَامَ سَيِّدٌ
قَئُولٌ لِمَا قَالَ الْكِرَامُ فَعُولٌ

مولٰنا انظر شاہ صاحب کی اولاد میں سے صاحبزادہ صرف ایک احمد میاں ہیں اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔

خانوادۂ مولٰنا سید احمد رضا بجنوری

حضرت شاہ صاحبؒ کی سب سے چھوٹی صاحبزادی محترمہ راشدہ خاتون جو حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے وقت بہت چھوٹی اور نو عمر تھیں اور جن کو صحیح تعلیم اور بہترین پرورش عطا کرنے میں حضرت شاہ صاحبؒ کی زوجہ، محترمہ نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ فرمایا۔ جب شادی کی عمر کو پہنچیں تو حضرت شاہ صاحب کے تلامذہ میں سے ایک فاضل ہستی مولٰنا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے ساتھ آپ کا رشتہ طے ہوا۔ شاہ صاحب کے رفیقِ اعظم علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے خطبۂ نکاح پڑھا۔

مولٰنا سید احمد رضا صاحب موصوف مشہور اہلِ قلم اور حضرت شاہ صاحبؒ کے لائق و فائق تلامذہ میں سے ہیں۔ اور آپ صحیح البخاری کی مفصل شرح " انوار الباری " کے مصنف ہیں جس کی ۱۲ جلدیں

چھپ چکی ہیں۔

احفاد و نبائر مولینا سید احمد رضا صاحب سے علیا حضرت راشدہ خاتون صاحبہ کے ہاں پانچ فرزند محمد ارشد رضا، محمد اسعد رضا، محمد امجد رضا، محمد اسجد رضا، محمد اعبد رضا اور چار بچیاں ہیں۔

صورت و سیرت اور ذہانت و فطانت میں یہ سب لوگ حضرت شاہ صاحبؒ کی خصوصیات کے وارث ہیں۔ خاصکر بڑے فرزند مولوی محمد ارشد رضا جو فاضل دیوبند ہو جانے کے بعد حجاز چلے گئے اور مدینۂ طیبہ کی زمانۂ حال میں قائم شدہ عدیم النظیر اسلامی یونیورسٹی سے فیض یاب ہوئے اور اس کے بعد قاہرہ کی مشہورِ عالم یونیورسٹی "جامعہ ازہر" سے بھی تکمیل کی سند حاصل کی۔

دیوبند، مدینۂ منورہ اور الازہر قاہرہ کے گلستان ہائے علوم کے رنگا رنگ پھولوں سے اپنا دامن بھر لینے کے بعد مولینا محمد انور شاہ کشمیری کے علوم و فیوض کے چشمے اگر مولوی ارشد رضا کے دہان سے بہنے لگ جائیں تو عین تقاضائے فطرت ہوگا نہ کہ مقام حیرت۔ یہی وجہ ہے کہ علمی حلقوں میں اب آپ کی ذات سے بڑی امیدیں وابستہ ہو رہی ہیں۔

آپ کے باقی برادران بھی اپنی ذہانت کے لحاظ سے مستقبل کے چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دیتے ہیں۔ اِن شاءَ اللہ تعالیٰ۔

"ایں خانہ ہمہ آفتاب است"

نور الانور

الاستاذ الامام محمد انور شاہ الکشمیری نور اللہ ضریحہ

از حکیم الاسلام حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ العالی مہتمم دارالعلوم دیوبند

"حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحب کے فرزند ارجمند اور بانیٔ دارالعلوم دیوبند حضرت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے ہیں۔ آپ کا سالِ ولادت ۱۳۱۵ھ ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں آپ دارالعلوم کے ابتدائی درجات میں داخل ہوئے اور پندرہ سال میں دارالعلوم میں پڑھائے جانے والے تمام علوم کی تکمیل کر کے ۱۳۳۷ھ میں سندِ فضیلت حاصل کر لی۔ تکمیلِ تعلیم کے بعد عملی زندگی کا آغاز دارالعلوم میں بحیثیتِ ایک مُدرّس کے کیا۔ ۱۳۴۳ھ میں اس عظیم ادارہ کے نائب مہتمم کے منصب پر فائز ہوئے اور اپنے پیشرو مہتمم مولینا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کی وفات کے بعد ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم کے اہتمام کی تمام ذمہ داریاں آپ کے کاندھوں پر آپڑیں۔ جو قریبًا نصف صدی سے آپ کامیابی سے انجام دے رہے ہیں۔ یوں تو دارالعلوم دیوبند نے بڑے بڑے ثقہ بزرگوں کو مہتمم کی مسند پر رونق افروز دیکھا ہے۔ حاجی سید محمد عابد صاحب، مولینا رفیع الدین صاحب، حاجی سید فضل حق صاحب مولینا محمد مُنیر صاحب، مولینا حافظ محمد احمد صاحب اور مولینا حبیب الرحمن صاحب (رحمۃ اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب اپنے اپنے وقت میں دارالعلوم کے عظیم معماروں میں سے تھے، لیکن جو ترقی دارالعلوم کو مولینا قاری محمد طیب صاحب کے زمانۂ اہتمام میں نصیب ہوئی ہے۔ اس سے پہلے دورِ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ طیبی دورِ اہتمام میں دارالعلوم نے ترقی کی جو

منازل طے کی ہیں انکا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ جب حضرت قاری صاحب نے اہتمام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو دارُالعلوم کا سالانہ میزانیۂ مداخل و مصارف پچاس ہزار روپے سے زیادہ نہ تھا مگر آج وہی سالانہ بجٹ چھبیس ۲۶ لاکھ روپے سے متجاوز ہو چکا ہے۔ دارالعلوم میں اساتذہ اور طلباء کی تعداد بھی آپکے دَور میں دوگنی سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اور دارُالعلوم کی بہت سی عالیشان تعمیرات بھی اسی دَور میں بن کر تیار ہوئی ہیں جن پر لاکھوں روپیہ کے اخراجات آئے ہیں۔ مدرسے کے نصابِ تعلیم، کتب خانہ اور دوسرے شعبوں میں بھی ترقی کی بہت سی منزلیں طے ہوئی ہیں۔ حالانکہ قاری صاحب کے اہتمام کا دَور مشکلات سے بھرا ہوا دَور تھا، اس دَور میں ملک تقسیم ہوا۔ بہت سے وہ صوبے جو دارُالعلوم کے لئے مالی امداد کا کھیت تھے، جُدا ہو گئے۔ ہندوستان میں جو مُسلم آبادی بچ رہی ہے، ملک کی تقسیم کا غصّہ اُس پر اُتارا جاتا رہا اور ماحول میں امن و سلامتی کے فقدان کی وجہ سے اس کی معاشی مشکلات بجائے خود ایک مسئلہ بن گئیں۔ فرقہ وارانہ تعصبات کی طوفانی آندھیاں اُٹھیں، جن کے اثر سے دارُالعلوم کا گلشن بھی مُرجھاتے مُرجھاتے مشکل سے ہی بچتا رہا۔ لیکن قاری محمد طیب صاحب کا پختہ عزم، صبر و توکل، مقصدِ عظیم کے لئے بے پناہ ایثار و قربانی اور اس پر مستزاد حُسنِ تدبیر اور بے پایاں خلوص ایک ایسا بادبان ثابت ہُوا جس کے سہارے، الحمد للہ۔ دارالعلوم کا سفینہ منزل بمنزل ساحلِ مراد کی طرف جادہ پیما ہے۔

سفینۂ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

آپ کی مساعی کا تازہ قدم یہ ہے کہ آپ ۱۹۷۸ء میں دارُالعلوم کے قیام کا یک صد و چہاردہ ۱۱۴ سالہ تقریبا منا رہے ہیں۔ جو یقین ہے کہ اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے اس ادارہ کو ظاہری و باطنی ہر لحاظ سے بامِ عروج پر پہنچانے کا موجب ثابت ہو گی۔ وما ذٰلکَ علَی اللہِ بعزیز۔

حضرت قاری صاحب ادارۂ دارُالعلوم کی امداد و اعانت کے حصول اور اس سے بھی زیادہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور سربلندی کے لئے لازمی آرام

تک ترک کر کے اپنی صحت سے بے پروا ہو کر دُور دراز مُلکوں کے سفر پر جاتے ہیں۔ یورپ، عربستان، افریقہ، افغانستان اور پاکستان ہر جگہ پہنچتے ہیں۔ ہندوستان کے اندر تو آپ سال کا اکثر حصّہ دَورے پر ہی رہتے ہیں۔ جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب تک آپ کی تگ و دَو پیہم جاری رہتی ہے۔ مُسلمانوں کے پرسنل لاکے تحفّظ کی مُہم نے آپ کے لئے آرام و سکون اور بھی مُشکل کر ڈالا ہے۔ مگر یہ آپ کی قوّتِ ایمانی اور اولوالعزمانہ ہمت ہے جس کی وجہ سے ضعف و پیری اور بدنی نحافت پر آپ غلبہ حاصِل کر کے چلتے جارہے ہیں۔ ؎

ہوا ہو گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دئے ہیں اندازِ خسروانہ

مولٰنا طیب صاحب قریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنّف ہیں۔ چند ایک کے نام یہ ہیں :-

۱۔ التّشبُّہ فی الاسلام۔
۲۔ مشاہیر اُمّت
۳۔ کلماتِ طیّبات۔
۴۔ الطیب الشر فی مسئلۃ القضأ و القدر
۵۔ سائنس اور اسلام۔
۶۔ تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام
۷۔ مسئلۂ زبان اور ہندوستان۔
۸۔ دین و سیاست
۹۔ اسبابِ عروج و زوالِ اقوام۔
۱۰۔ اسلامی آزادی کا مکمّل پروگرام
۱۱۔ الاجتہادُ و التقلید۔
۱۲۔ اصولِ دعوتِ اسلام
۱۳۔ اسلامی مساوات۔
۱۴۔ تفسیر سورۂ فیل
۱۵۔ فِطری حکومت۔

اور اسی قسم کے دیگر موضوعات پر آپ کے قلم نے اپنی جولانیاں دِکھائی ہیں۔ اور دُورِ حاضرہ کی تشکیکات و تلبیسات کے شافی اور کافی جوابات فراہم کر دئے ہیں۔ آپ کا اندازِ تحریر امام غزالیؒ کا سا ہے، جس

موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں عقلی اور نقلی دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔

مولانا طیب صاحب کو شعر و سخن سے بھی مُناسبت ہے۔ "عرفانِ عارف" کے نام سے آپ کا ایک مجموعۂ کلام بھی منصّۂ شہود پر آیا ہے، مگر آپ کی مصروفیات میں سخن وری کی فرصت کہاں؛ اور یوں بھی آپ کا پایہ شعر و شاعری کی دُنیا سے بہت بُلند ہے۔ اور آپ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ارشاد کا مِصداق ہیں۔

ولولا الشّعرُ بالعُلماءِ یُزری
لکُنتُ الیومَ اَشعَرَ مِن لَبیدِ

(اگر شاعری عُلماء کی شان سے پست درجے کی چیز نہ ہوتی تو میں آج لبید سے بڑھکر شاعر ہوتا)

مولانا قاری طیب صاحب حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشد و اخصّ تلامذہ میں سے ہیں۔ آپ کو مولانا انور کشمیریؒ کے ساتھ وہی تعلق ہے جو علامہ ابن قیمؒ کو شیخ الاسلام علّامہ ابن تیمیہ حرّانیؒ کے ساتھ تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت میں مولانا طیب صاحب نے طالب علمی اور اس کے بعد کے دَور میں دوسرے تلامذہ کی نسبت رہنے کا زیادہ موقع پایا ہے۔ اس لئے ان کے علوم و کمالات سے غیر معمولی استفادہ فرمایا ہے۔ علمِ سلوک میں حضرت قاری صاحب کو حضرت شاہ صاحبؒ کے علاوہ حکیم الاُمّت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بھی رابطہ تھا جن کے ہاتھ پر آپ نے ۱۳۵۰ھ میں بیعت کی تھی۔

الغرض مولانا طیب صاحب مشہور و معروف شخصیّت کے عالم دین ہیں آپ اپنے حسب و نسب کے لحاظ سے مُمتاز، علم و عمل کے لحاظ سے یکتا، بیدار مغز، فلسفی، شرافت و حلم کے مُجسّمہ، استقلال و اخلاص کے نمونۂ کامل اور وَرع و تقویٰ کا چلتا پھرتا پیکر ہیں۔ اس لئے زمانۂ حاضر میں مُسلمانانِ ہند کے لئے آپ کا وجود مُغتنمات میں سے ہے۔

حضرت قاری صاحب تحدیثِ نعمت اور ادائے شُکر کے طور پر ہمیشہ اپنے ہر کمال کو اپنے محبوب مُعلّم و مُرشِد حضرت شاہ صاحبؒ کے فیض کی طرف منسوب فرماتے ہیں اور ہر مجلس میں حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائلِ علمیہ کے بیان میں رطبُ اللّسان رہتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا تذکرہ "حیاتِ انور" جب تیار ہوا تھا تو کتاب کے مُرتّب مولٰنا حافظ محمّد ازہر شاہ صاحب قیصرؔ کی استدعاء پر حضرت مولٰنا محمّد طیّب صاحب نے بھی ایک مقالہ عجالۃً لکھا تھا جو "نورُ الانور" کے عنوان سے زینتِ کتاب ہے۔ اس مضمون میں آپ نے ساگر کو گاگر میں بند کر دینے کی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔ اور اپنے ذاتی و نیازمندانہ تعلقات اور تجربات کی روشنی میں نہایت فصیح و بلیغ انداز میں اتنا کچھ فرما گئے ہیں کہ جس کو اگر پھیلایا جائے تو ایک کتاب کی صُورت اختیار کرے۔ ہم نے گذشتہ اوراق میں اس مقالہ کے بعض اقتباسات ہدیۂ ناظرین کئے ہیں لیکن مقالہ کے حُسن و جامعیت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو یہاں پر من و عن دہرایا جائے:

کوندو

الحمدُ للہِ وَسَلامٌ علیٰ عبادہِ الّذین اصطفیٰ

دار العلوم دیوبند نے اپنی نوّے[1] سالہ زندگی میں علم وفضل کے ایسے ایسے رجال پیدا کئے کہ ان آخر کی صدیوں میں دور دور تک تاریخ اُن کی مثال پیش کرنے سے عاجز نظر آتی ہے، ہر ایک اپنے فن، کردار، سیرت اور بلند ذوقی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہی تھا، جو حضرات نصف صدی پیشتر گذر چکے ہیں اُن سے شاید نئی دُنیا واقف نہ ہو اور ممکن ہے کہ تعارف کرانے کے باوجود وہ اُن سے متعارف نہ ہوسکے۔ لیکن ماضی قریب کے مشاہیرِ دیوبند کی ایک بڑی جماعت ہے جو اپنے شہرت العام کے لحاظ سے محتاج تعارف نہیں، اُس کے علم و سیرت کی مثالیں بھی دُور دُور تک نہیں ملتیں۔

حضرت شیخ الہند مولٰنا محمود حسن قدس سرہٗ، حضرت مولٰنا احمد حسن محدّث امروہی رح، حکیم الاُمّت مولٰنا اشرف علی تھانوی رح حضرت مولٰنا عبدالحق مفسّرِ تفسیر حقّانی۔ حضرت مولٰنا عُبیداللہ سندھی رح، حضرت مولٰنا سیّد حسین احمد مدنی رح، حضرت مولٰنا شبیر احمد عُثمانی رح وغیرہ حضرات اپنے شہرہ آفاق علم و فضل اور کردار و سیرت کے لحاظ سے عزّت و شہرت کی اونچی سطح پر پہونچے

---

[1] اسوقت تک اسمیں لگ بھگ ۲۵ سال کا مزید اضافہ ہُوا ہے کیونکہ زیر نظر مقالہ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ کو لِکھا گیا ہے :- کوندو عفی عنہ

ہیں، قلم و زبان اُنہیں عام طور پر جانتے پہچانتے ہیں۔ پھر ایسی تعداد کی تو کوئی شمار ہی نہیں جو مشاہیر میں نہیں لیکن اپنی مضبوط علمی و اخلاقی سیرت کے ساتھ وہ زمینوں سے زیادہ آسمانوں میں مشہور ہیں اور وہاں اچھے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں اور زمین کے کتنے ہی خطوں کے ایمانوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

بہرحال دارالعلوم دیوبند ایک شجرۂ طیبہ ہے، جس کے خوش ذائقہ اور خوشبودار پھل پھول سے دُنیائے اسلام کا دِل و دماغ معطّر اور پُر کیف بنا ہُوا ہے، اور اِس آخری صدی میں اُس کی جماعت مجموعی حیثیت سے اُٹھی تو اس نے مجدّدانہ اور اسلامی علم و عمل کو غیر اسلامی اثرات کی آمیزشوں اور شرک و بدعات کے لوث سے پاک کر کے نکھار دیا، اور سُتھرا کر کے دُنیا کے آگے رکھ دیا۔

دیوبند کی ان آفتاب و ماہتاب ہستیوں میں نہایت تیز اور شفّاف روشنی کا ایک جلیل المرتبت ستارہ حضرت الاُستاذ علامۂ دہر، فریدِ عصر، حافظ الدُّنیا، محدّثِ وقت مولانا محمّد انور شاہ الکشمیری رح صدر المدرّسین دارالعلوم دیوبند کی مُبارک ہستی بھی ہے جو مجموعی حیثیت سے آیۃٌ من آیاتِ اللہ، اور اپنے غیر معمولی علم و فضل کے لحاظ سے دین کا ایک روشن منارہ تھے، اور آپ کی ذات بلامُبالغہ عالِم جلیل، فاضِل نبیل، تقی و نقی مُحدّث، مُفسّر و مُتکلّم، ادیب و شاعر، صوفی صافی اور فانی فی السُّنّۃ ذات تھی ؎

لَیْسَ عَلَی اللهِ بِمُسْتَنْکَرٍ
اِنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

دارالعلوم میں آپ ۱۳۱۰ھ میں داخل ہوئے جبکہ منشی فضل حق دیوبندی کا دورِ اہتمام تھا، اور ۱۳۱۴ھ میں تمام علوم وفنون کی تکمیل سے فارغ ہو کر جبکہ مولینا محمد احمد صاحب کا زمانۂ اہتمام تھا یہاں سے واپس ہوئے۔ چند سال مدرسۂ امینیہ دہلی میں مسندِ درس پر متمکن رہے اور وہاں سے اپنے وطن کشمیر تشریف لے گئے۔ وہاں سے بہ نیتِ ہجرت حجازِ مقدس کے قصد سے روانہ ہوئے۔ دیوبند میں اپنے اساتذہ وشیوخ سے ملنے کے لئے اُترے۔

آپ کے شیوخ واساتذہ نے جو آپ کے جوہروں کو جانتے اور پہچانتے ہوئے تھے، یہ دیکھتے ہوئے کہ دارالعلوم کی مسندِ درس کے شایانِ شان یہ ایک ہستی ہے جسے دارالعلوم نے گویا اپنے ہی لئے پیدا کیا ہے، آپ کو دیوبند روک لیا، اور آپ نے بھی غایت تواضع وانکسارِ نفس سے اپنے اساتذہ کی بات اونچی رکھتے ہوئے قیامِ دیوبند کا ارادہ فرمالیا۔

حضرتِ ممدوح کے ٹھیرانے سے ابتدائی منصوبہ اور مقصد یہ تھا کہ ترمذی اور بخاری کی شرح حضرتِ ممدوح سے لکھوائی جائے، لیکن عملاً یہ معاملہ آگے نہیں بڑھا جس کی وجہ نامعلوم ہیں، شاید یہ ہوں کہ درس کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ واللہ اعلم۔

بہرحال آپ نے بامتثالِ اکابر دارالعلوم میں درس شروع فرمادیا البتہ غلبۂ زہد وقناعت سے مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے، اور لوجہ اللہ کام شروع کر دیا، اِس اِصرار پر اُن کے اکابر نے بھی سکوتِ رضاء سے کام لیا، اور تنخواہ کا مسئلہ کلیۃً اُن ہی کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

لیکن حضرتِ والدِ ماجد، حضرت مولینا حافظ محمد احمد صاحبؒ نے اس کے بعد یہ گوارا نہیں کیا کہ طعام وضروریاتِ طعام کے مصارف خود اُن کے سر ڈالے جائیں اور فرمایا کہ اگر مدرسہ سے حضرت ممدوح لینا نہیں چاہتے تو اُن کے سر میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

تیسری متعین صورت یہ ہے کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔ اسے حضرتِ ممدوح نے منظور فرمالیا اور اس طرح تقریباً بیس برس تک یہ صورت قائم رہی۔ حضرتِ والدِ ماجد علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی معروف آبائی اور روایتی مہمان نوازی سے آپ کو مثل اپنے اہلبیت کے سمجھا اور نہایت پورے انشراح وانبساط کے ساتھ یہ دَور پورا ہوا۔

اس دور میں حضرتِ مولانا عبیدُ اللہ سندھی رحمۃُ اللہ علیہ کو بھی حضرتِ شیخ الہندؒ اور حضرتِ والدِ ماجد رحمۃُ اللہ علیہ نے یاد فرمایا، اور قیامِ دیوبند پر مجبور فرمایا، ممدوح بھی یہاں رُک گئے، اور وہ بھی اس پُوری مُدّت میں حضرتِ والدِ ماجد ہی کے مہمان رہے۔ یہ دسترخوان بظاہر کھانے کا دسترخوان ہوتا تھا لیکن حقیقتاً اہلِ علم و فضل کی ایک پاکیزہ مجلس ہوتی تھی جس میں حضرتِ والد ماجد قدس سرہٗ، حضرتِ مولانا حبیبُ الرحمن صاحب قدس سرہٗ، حضرت مولانا انور شاہ صاحب قدس سرہٗ، حضرتِ مولانا عبیدُ اللہ سندھیؒ اور اکثر و بیشتر حضرتِ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃُ اللہ علیہ اور متعدد دوسرے اکابر اساتذۂ دارُ العلوم شریک رہتے تھے، علمی مسائل میں مکالمے ہوتے، بحثیں ہوتیں، معارف و حقائق کھلتے، اور خصوصیت سے حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا سندھیؒ مختلف علوم و فنون کے کافی دلچسپ مباحث چھیڑتے اور آخر کار بزرگانِ مجلس کی طرف سے کبھی مزاحی رنگ میں اور کبھی سنجیدہ اور متین رنگ میں فیصلے اور محاکمے سُنائے جاتے۔ حاضر الوقت خدّام و طلبہ کو شاید درس و تدریس کی لائن سے برسہابرس میں وہ تحقیقات ہاتھ نہ لگ سکتی تھیں جو اس حلقۂ علوم میں پکی پکائی اک دم مِل جاتی تھیں، ان دونوں بزرگوں میں حاضرُ الوقت اکابر کے کمالِ ادب و احترام کے ساتھ سلسلۂ مسائل حق گوئی میں کبھی کوئی ادنیٰ اضمحلال یا تہاوُن پیدا نہ ہوتا تھا اور ہر ایک دوسرے کے خلاف برملا اور بہت صاف ریمارک کرتا۔ اس طرح کھانے پینے کا یہ دسترخوان، مائدۂ علم و فضل بن جاتا، اور اس دسترخوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی، بلکہ روحانی غذاؤں کے قِسم قِسم کے اَلوان جمع ہو جاتے تھے، اور دسترخوان اس شعر کا مصداق بن جاتا ؎

بہارِ عالمِ حُسنش دِل و جان تازہ میدارد
برنگ اصحابِ صورت را به بو اربابِ معنیٰ را

حضرت شاہ صاحب رحمۃُ اللہ علیہ میں غذا کے بارے میں لطافت بھی مگر شوقینی نہ تھی، غذاؤں کے تنوّع اور کھانوں کے اَلوان کی طرف طبیعت جُھکی ہوئی نہ تھی۔ جو مِل گیا، کھا لیا، جو آ گیا شکر و رضاء سے اُسے قبول کر لیا، میری جدّۂ محترمہ رحمۃُ اللہ علیہا (جن کی

مہمان نوازی اپنے دور میں مشہور تھی) اور خود حضرت نانوتوی قدس سرہٗ نے بھی اس بارہ میں یہ کہہ کر شہادت دی تھی کہ "ہماری مہمان نوازی تو احمد کی والدہ کی بدولت ہے"

کبھی کبھی حضرتِ شاہ صاحبؒ سے میری معرفت یہ کہلا کر بھیجتیں کہ "حضرت کبھی تو اپنے کسی مرغوب کھانے کی فرمائش کر دیا کیجئے"؛ تو متأثرانہ لب و لہجہ سے جواب دیتے کہ میری طرف سے سلام گذارش کیجئے اور یہ عرض کر دیجئے کہ "دستر خوان پر ہمہ نعمت موجود ہوتے ہوئے میں کاہے کی فرمائش کروں، مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میری جنّت کی نعمتیں یہیں تو نہیں تمام کی جا رہی ہیں"،

قیامِ دیوبند کی یہ صورت قائم ہو جانے پر حضرت شاہ صاحبؒ نے باشارۂ اکابر درس و تدریس کا مستقل سلسلہ تو جاری فرمایا۔ لیکن ہجرت کی پاک نیّت سے دستبردار نہ ہوئے اور برابر حاضریٔ حرمِ نبیؐ و حرمِ الٰہی کا جذبہ آپ کو دیوبند چھوڑنے کی طرف مائل کرتا رہتا تھا، جس کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا۔ اور یہ اکابر بلطائفِ تعبیر اُسے ٹلاتے جاتے، لیکن خطرہ انہیں بھی رہتا تھا کہ نہ معلوم کس وقت یہ جذبہ غالب ہو جائے، اور دارالعلوم کو ایسی جامع اور مستقبل کی بڑی بڑی اُمیدوں کی محور ہستی سے دستبردار ہونا پڑ جائے، اس لئے یہ حضرات بھی اُنہیں مستقل جمادینے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

آخر کار اُنہیں پابند بنانے کے لئے ان بزرگوں نے اُن کے پیروں میں بیڑی ڈالنے کی تدبیر سوچ ہی لی، اور ارادہ کیا کہ حضرتِ ممدوح کا نکاح کر دیا جائے۔ گو اس سے حضرتِ ممدوح کو انکار تھا مگر بلطائفِ تدبیر اُنہیں راضی کر کے گنگوہ کے سادات کے ایک خاندان میں نکاح کر دیا گیا۔ میری دادی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا اور حضرتِ والدِ ماجد قدس سرہٗ نے اس کی کفالت کی اور نکاح کی اس تقریب کو اُسی طرح انجام دیا، جس طرح وہ اپنی اولاد کی کوئی بھاری تقریب کر سکتے تھے۔ بھوپال بارات گئی، علماء کی ایک جماعت ساتھ تھی، بڑی پُر مسرّت فضا میں نکاح ہوا، دُلہن آئی تو حضرت جدّہ مرحومہ نے اُسی طرح گھر میں اُتارا جیسے اپنے گھر کی دُلہن اُتاری

جاسکتی تھی۔ ولیمہ کی لمبی چوڑی دعوت کی اور احقر کے زنانہ مکان کے بالاخانہ پر حضرت شاہ صاحبؒ مع اہلیۂ محترمہ فروکش ہوئے۔

اس پر تقریباً ایک دو سال ہی گذرے تھے کہ اولاد کی اُمید ہوئی، ہمارے گھر میں اس کی وہی خوشی تھی جو اپنے گھر میں اہلبیت کے اولاد ہونے کی ہوتی ہے، اس وقت تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، گھر میں عرصۂ مدید گذر چکا تھا، کوئی بچہ نہیں تھا، جس کی سب کو تمنّا تھی اس اُمید سے کہ حضرتِ ممدوح کے یہاں بچّہ ہونے والا ہے، سب گھر والوں کو بالخصوص میری دادی صاحبہؒ کو بے حد خوشی تھی۔ اور جیسا کہ عورتوں کا قاعدہ ہوتا ہے، انہوں نے عقیقہ کی تقریب کا سامان بھی شروع کر دیا تھا، کہ اچانک حضرتِ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو مشورہ دیا گیا اور ممکن ہے کہ خود اُن کے قلب میں ہی یہ داعیہ از خود پیدا ہوا ہو، انہوں نے حضرت جدّہٗ مرحومہ سے عرض کرایا کہ "دس سال تک تو میں تنہا تھا، اب دو سال سے متأہل ہوں اور آپ ہی کے یہاں مقیم ہوں، اب اولاد کی اُمید ہے تو اب میں ایک اور دو کے ساتھ ایک عائلہ کا بار ڈالتے اور ڈالتے رہنے پر شرمندگی محسوس کرتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے کہ الگ مکان لیکر رہوں۔" حضرتِ ممدوحہ اور والدِ ماجد اس پر راضی نہیں ہوئے تھے، لیکن اُدھر سے اصرار بڑھا تو انہوں نے بادلِ ناخواستہ اسے قبول فرمالیا۔ اور حضرتِ شاہ صاحبؒ محلہ دیوان کے ایک مکان میں فروکش ہوگئے۔

اس صورتِ واقعہ کے بعد ذمّہ دارانِ مدرسہ کے لئے موقع آگیا کہ وہ تنخواہ لینے کے لئے حضرتِ ممدوح پر اصرار کریں۔ چنانچہ کیا اور تأہل کی زندگی اور اس کے وسیع ہوتے رہنے کی صورتِ حال کے ماتحت طوعاً وکرہاً ممدوح کو بھی بہ اصرار قبول کر کے تنخواہ لینے پر راضی ہوجانا پڑا اور اب ایک گرہستی کی طرح اُن کی عائلی زندگی کا دَور شروع ہوگیا۔

اس مکان کی رہایش کے بعد عزیزم مولوی اظہر شاہ سلمہٗ کی بہن عابدہ مرحومہ

پیدا ہوئی اور پھر میاں انظر شاہ سلمہ، معرضِ وجود میں آئے، تجرد سے تاہل ہوا تھا اور اب تاہل سے عائلی اور خاندانی زندگی کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور زندگی کے علائق ایک ایک کر کے بڑھتے رہے، اس کا قدرتی نتیجہ وہی نکلا جو ایک تدبیر کے اختیار کرنے والے بزرگوں نے سوچا تھا کہ حضرت شاہ صاحبؒ مقید ہو گئے اور ہجرت کر جانے کا وہ جذبہ سست پڑ گیا، بالآخر ترک کر دینا پڑا، اور باطمینانِ خاطر دارالعلوم میں مسند نشینِ درس ہو کر علمی افادات میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے حجازِ مقدس جانے کا قصد فرمایا اور شہرت ہوئی کہ حضرت بہ نیتِ ہجرت تشریف لے جا رہے ہیں۔ یہ شہرت تو غلط ثابت ہوئی لیکن تشریف بری محقق تھی۔ مگر شیخ زمانہ اور دارالعلوم کے شیخ الحدیث کا دارالعلوم سے جانے کا ارادہ کرنا کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ زمانہ بھی پر آشوب ہو گیا تھا۔ حضرت کی نسبت برطانوی حکومت کو شکوک و شبہات پیدا ہو چکے تھے، اور حضرتِ شیخ اور دارالعلوم کے بہی خواہوں کو ایک تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں گورنمنٹ آپ کو تھام نہ لے، اور سب سے بڑا خطرہ دارالعلوم کی ایسی فردِ فرید شخصیت نمونۂ اکابر و اسلاف اور یگانۂ روزگار ہستی سے محروم ہو جانے کا تھا، جو کچھ کم حادثہ نہ تھا۔ لیکن دارالعلوم کے ذمہ دار مبصرین نے حضرتِ شاہ صاحبؒ کو دارالعلوم میں روک کر پہلے ہی آنے والے خطرے کی روک تھام کر لی تھی، اور حضرت شاہ صاحبؒ جیسی یکتائے زمانہ ہستی کو دارالعلوم میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرتِ شیخ کی دارالعلوم سے اس عارضی جدائی اور مخصوص روحانی برکات سے برائے چندے محرومی کا اثر تو ضرور ہوا، لیکن علمی حلقہ کے خلاء کا خطرہ روبراہ نہ آسکا، مسند بھری بھرائی گویا موجود تھی، اگر شیخ الہندؒ برائے چندے سامنے نہ رہے تو شیخ کے مثل سامنے تھے۔

چنانچہ حضرتؒ کے تشریف لے جانے کے بعد، حضرت شاہ صاحبؒ نے قائم مقام

صدر مدرس کی حیثیت سے درسِ ترمذی و بخاری کو سنبھال لیا اور علمی پیاسوں کو یہ محسوس ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار سے محروم ہو گئے ہیں بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہ رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا اُن کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدلُ الغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے جس سے بلا تأمل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبحیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انہیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا۔

بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث میں کچھ ایسی امتیازی خصوصیات نمایاں ہوئیں جو عام طور سے دروس میں نہیں تھیں اور حضرت شاہ صاحبؒ کا اندازِ درس درحقیقت دنیائے درس و تدریس میں ایک انقلاب کا باعث ثابت ہوا۔ .... اولاً آپ کے درسِ حدیث میں رنگِ تحدیث غالب تھا۔ فقہ حنفی کی خدمت، تائید و ترجیح بلاشبہ ان کی زندگی تھی لیکن رنگ محدثانہ تھا۔ فقہی مسائل میں کافی سیر حاصل بحث فرماتے لیکن اندازِ بیان سے یہ کبھی مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ آپ حدیث کو فقہی مسائل کے تابع کر رہے ہیں اور کھینچ تان کر حدیث کو فقۂ حنفی کی تائید میں لانا چاہتے ہیں۔ بھلا اس کا قصد و ارادہ تو کیا ہوتا؟ بلکہ واضح یہ ہوتا تھا کہ آپ فقہ کو بحکمِ حدیث قبول کر رہے ہیں۔ حدیث فقہ کی طرف نہیں لی جائی جارہی ہے، بلکہ فقہ حدیث کی طرف لایا جارہا ہے، وہ آرہا ہے اور کلیۃً حدیث کے موافق پڑتا جارہا ہے۔ بالفاظِ دیگر گویا حدیث کا سارا ذخیرہ فقۂ حنفی کو اپنے اندر سے نکال نکال کر پیش کر رہا ہے، اور اسے پیدا کرنے کے لئے نمودار ہوا ہے۔

۱۳۳۰ھ میں علامہ سید رشید رضاء مدیر "المنار" مصر جب بسلسلۂ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء لکھنؤ ہندوستان آئے اور دیوبند کی دعوت پر دارالعلوم میں بھی تشریف لائے، حضرت شیخ الہندؒ کی موجودگی میں خیر مقدم کا عظیم الشان جلسہ

نودرہ ہال میں منعقد ہوا۔ حضرتِ شاہ صاحبؒ نے اپنی برجستہ عربی تقریر میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے دارالعلوم کے علمی مسلک پر روشنی ڈالی، جس کا اہم جزو یہ تھا کہ ہم تمام مختلف فیہ مسائل میں فقۂ حنفی کے مسائل کو ترجیح دیتے ہیں اور تمام متعارض روایات کی تطبیق و ترجیح کے سلسلہ میں فقۂ حنفی کی تائید حاصل کرتے ہیں۔ تو علامہ رشید رضاء نے حضرتِ شاہ صاحب کی تقریر کے دَوران ہی میں تعجب آمیز لہجہ سے کہا کہ "کیا سارا ذخیرۂ روایاتِ حدیث صرف فقۂ حنفی ہی کی حمایت کے لئے ہے"۔

اس پر حضرتِ شاہ صاحبؒ نے تقریر کے رُخ کو پھیرتے ہوئے اس متعجبانہ استفسار کے جواب کی طرف رُخ کر کے فرمایا کہ "ہمیں تو ہر حدیث میں وہی نظر آتا ہے جو ابوحنیفہؒ نے سمجھا، اور کہا ہے۔" اور اس پر بطورِ دلیل حنفیہ شافعیہ کے مشہور مختلف فیہ مسائل کی مثالیں دیتے ہوئے تطبیقِ روایات اور ترجیحِ راجح کے اپنے اصول بیان فرمائے اور واضح کیا کہ ان اصُول کے تحت ہمیں، ذخیرۂ حدیث سے کس طرح فقۂ حنفی نکلتا ہوا نظر آتا ہے؟

فقۂ حنفی کی عظمتِ شان کو نمایاں کرتے ہوئے دِکھلایا کہ ہم محض قیاسی طور پر نہیں بلکہ نصوصِ حدیث کے سارے ہی ذخیرہ میں عیاناً وہ بُنیادیں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں جن پر فقۂ حنفی کی تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

بہرحال درسِ حدیث میں آپ کے یہاں محدثانہ رنگ غالب تھا اور حدیث کو فقۂ حنفی کے مُؤید کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُس کے مَنشاء کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تھا اور ثانیاً درجہ تھا اُس کے دلائل و شواہد سے اس دعویٰ کو مضبوط بنایا جاتا تھا۔

متونِ حدیث کی معتمد کتابوں کا ڈھیر آپ کے سامنے ہوتا تھا اور تفسیر الحدیث بالحدیث کے اصُول پر کسی حدیث کے بارہ میں جو دعویٰ کرتے اُسے دوسری احادیث سے مُؤید اور مضبُوط کرنے کے لئے درس ہی میں کُتب پر کُتب کھول کھول کر دِکھاتے

جاتے تھے اور جب ایک حدیث کا دوسری احادیث کی واضح تفسیر سے مفہوم متعین ہو جاتا تھا تو نتیجۃً وہی فقۂ حنفی کا مسئلہ نکلتا تھا، اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ حدیث فقۂ حنفی کو پیدا کر رہی ہے، یہ ہرگز مفہوم نہیں ہوتا تھا کہ فقۂ حنفی کی تائید میں خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر حدیثوں کو پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی گویا اصل تو مذہبِ حنفی ہے محض مؤیدات کے طور پر روایات حدیث سے اُسے مضبوط بنانے کے لئے یہ ساری جد و جہد کی جا رہی ہے، نہیں بلکہ یہ کہ حدیث اصل ہے لیکن جب بھی اُس کے مفہوم کو اُس کے نحوی اور سیاق و سباق نیز دوسری احادیث باب کی تائید و مدد سے اُسے متشخص کر دیا جائے تو اُس میں سے فقۂ حنفی نکلتا ہُوا محسوس ہونے لگتا ہے، اس لئے طلبۂ حدیث حضرت ممدوح کے درس سے یہ ذوق لیکر اُٹھتے تھے کہ ہم فقۂ حنفی پر عمل کرتے ہوئے حقیقتاً حدیث پر عمل کر رہے ہیں، اور حدیث کا جو مفہوم ابوحنیفہؒ نے سمجھا ہے وہی درحقیقت شارع علیہ السّلام کا منشاء ہے جس کو روایتِ حدیث ادا کر رہی ہے، بلکہ یہ سمجھ میں آتا تھا کہ روایتِ حدیث سے امام ابوحنیفہؒ اپنا کوئی مفہوم پیش نہیں کرتے، بلکہ صرف پیغمبر علیہ السّلام کا مفہوم پیش کر رہے ہیں اور خود اس حدیث میں محض ایک جویا اور ناقل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض حضرتِ شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث کی ایک خصوصیت تو یہ تھی کہ تحدیث و اخبار کے سلسلہ میں فقۂ حنفی کی تائید ہوتی نظر نہیں آتی تھی بلکہ فقۂ حنفی حدیث سے نِکلتا ہُوا نظر آتا تھا جس سے حدیث مؤیدِ فقہ نہیں بلکہ منشاءِ فقہ ثابت ہوتی تھی۔

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ یاد آیا جو اس مقام کے مناسب حال ہے اور وہ یہ کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک بار ایک مناظرہ میں جو حضرتِ ممدوح اور ایک عالم اہلِ حدیث کے مابین ہُوا، اہلحدیث عالم نے پُوچھا، کیا آپ ابوحنیفہؒ کے مقلِد ہیں؟ فرمایا نہیں، میں خود مجتہد ہوں اور اپنی تحقیق پر عمل کرتا ہوں

اُس نے کہا کہ آپ تو ہر مسئلہ میں فقۂ حنفی ہی کی تائید کر رہے ہیں۔ پھر مُجتہد کیسے؟ فرمایا یہ حُسنِ اتّفاق ہے کہ میرا ہر اجتہاد کلیۃً ابو حنیفہؒ کے اجتہاد کے مُطابق پڑتا ہے اس طرح جواب سے سمجھانا یہی منظور تھا کہ ہم فقۂ حنفی کو خواہ مخواہ بنانے کے لئے حدیث کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ حدیث ہیں سے فقۂ حنفی کو نکلتا ہوا دیکھ کر اس کا استخراج سمجھا دیتے ہیں اور طریقِ استخراج پر مُطّلع کر دیتے ہیں۔

بہر حال اکابرِ دیوبند کے مذاق کے مُطابق حضرتِ شاہ صاحبؒ مُقلّد بھی تھے مگر اس تقلید میں محقّق بھی تھے، وہ مسائل میں پابندِ فقۂ حنفی بھی تھے مگر اس پابندی کو مُبصّرانہ تحقیق سے اختیار کئے ہوتے تھے۔ جیسے مسئلۂ تقدیر میں اہلِ سُنّت کا مذہب بندے کے جبر و اختیار کو جمع کر کے یہ کہنا ہے کہ وہ مختار ضرور ہے مگر مجبور فی الاختیار ہے۔ اسی طرح مسائلِ فقہیہ میں حضرتِ شاہ صاحبؒ کا رنگ یہ تھا کہ وہ مُقلّد ضرور ہیں مگر مُحقّق فی التقلید ہیں، اور تمام اجتہادی مسائل میں جہاں تقلید کرتے ہیں وہاں مسائل کی تمام حدیثی اور قرآنی بنیادوں کی تحقیق بھی ذہن میں رکھتے ہیں

ایک امریکی مصنف نے اپنی معروف کتاب "MODEREN INDIA" میں زیرِ عنوانِ "دیوبندیوں کا اسلام" اہلِ دیوبند کا یہی جامع اضداد طریقے اپنے مختصر عنوان میں اس طرح ادا کیا ہے کہ:-

"حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ لوگ (اہلِ دیوبند) اپنے کو مُقلّد کہتے ہیں، مگر ساتھ ہی ہر مسئلہ کو پورے مُحققانہ انداز سے کہتے ہیں اور مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایسی تنقیح و تحقیق کرتے ہیں کہ وہ اِس دعوائے تقلید کے ساتھ بے ساختہ مجتہد بھی نظر آنے لگتے ہیں۔" (انتہیٰ بالمعناہٗ)

حاصل اس کا بھی وہی ہے کہ یہ حضرات مُجتہد فی التقلید اور محقّق فی الاتباع ہیں، کورانہ تقلید یا جامد اتباع کے جال میں پھنسے ہوئے نہیں ہیں اور لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا کے سچے مصداق ہیں۔

بہر حال یہ عنوان حضرت شاہ صاحبؒ کے درس میں اس لئے کافی نکھرا ہوا نظر آتا تھا کہ اُن کا غالب رنگ محدّثانہ تھا اور ہر ہر مسئلہ میں حدیثی مسئلہ کی تائید حدیث ہی سے کرتے جاتے تھے لیکن نتیجہ میں پہنچ کر وہ مسئلہ حنفی فقہ کا مسئلہ بن جاتا

تھا، اور معلوم ہوتا تھا کہ اس مسئلہ کا منشأ فلاں حدیث ہے جسے امام ابو حنیفہؒ نے باتّباعِ حدیث، حدیث سے نکالکر پیش کر دیا ہے۔

دوسری خصوصیّت یہ تھی کہ حضرتِ ممدوح کے علمی تبحّر اور علم کے بحرِ ذخّار ہونے کی وجہ سے درسِ حدیث صرف علومِ حدیث ہی تک محدود نہ رہتا تھا اُس میں استطراداً لطیف نسبتوں کے ساتھ ہر علم وفن کی بحث آتی تھی، اگر معانی وَبلاغت کی بحث آجاتی تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ گویا علم ومعانی کا یہ مسئلہ اسی حدیث کے لیئے واضع نے وضع کیا تھا، معقولات کی بحثیں آجائیں اور معقولیوں کے کسی مسئلہ کا ردّ فرماتے تو اندازہ ہوتا کہ یہ حدیث گویا معقولات کے مسئلہ ہی کی تردید کے لئے قلبِ نبویؐ پر وارد ہوئی تھی۔

غرض اس نقلی اور روایتی فن (حدیث) میں نقل وعقل دونوں کی بحثیں آتیں اور ہر فن کے مُتعلّقہ مقصد پر ایسی سیر حاصل اور محقّقانہ بحث ہوتی کہ علاوہ بحثِ حدیث کے وہ فنّی مسئلہ ہی فی نفسہٖ اپنی پوری تحقیق کے ساتھ منقح ہوکر سامنے آجاتا تھا۔

سال بھر تک یکسانیت کے ساتھ مسائل پر یہ مُحقّقانہ بحثیں جاری رہتیں یہ ضرور تھا کہ ششماہی امتحان کے بعد عصر سے مغرب تک کا وقت طلبہ کا مزید لے لیتے تھے جس سے رجب کے اواخر تک یعنی امتحانِ سالانہ شروع ہونے سے پہلے پہلے ترمذی و بُخاری یکسان شانِ تحقیق کے ساتھ ختم ہو جاتی تھیں۔

میں نے اُن مختلفُ الانواع تحقیقات کو دیکھ کر ایک املائی کاپی تیار کی جس کے چوڑے اوراق میں چھ سات کالم بنائے اور ہر کالم کے اوپر والے سِرے پر فنون کے عنوان ڈال دیئے یعنی مباحثِ حدیث، مباحثِ تفسیر، مباحثِ عربیت (صرف ونحو) مباحثِ فلسفہ ومنطق، مباحثِ ادبیات، (جن میں اشعارِ عرب اور فصاحت وبلاغت کی بحثیں آتی تھیں) مباحثِ تاریخ وغیرہ پھر

فنونِ عصریہ کے لئے ایک کالم رکھا۔ کیونکہ موجودہ دور کے فنون جیسے سائنس، فلسفۂ جدید اور ہیئتِ جدید وغیرہ کے مباحث بھی بذیلِ بحثِ حدیث درس میں آتے تھے، میں کالم وار ان مباحث کو اِملاء کرتا جاتا تھا۔ ان فنّی مباحث کے کالموں کے بعد کاپی کے کنارہ کا کالم حضرتِ ممدوح کی رائے اور محاکمہ کا تھا جس کے سرنامہ پر عنوان تھا "قَالَ الاُستاذ" اس میں وہ فیصلے درج کر لیا کرتا تھا جو مسائل کی تدقیق و تنقیح کے بعد بطور آخری نتیجہ کے حضرت یہ کہہ کر اِرشاد فرمایا کرتے تھے کہ "میں کہتا ہوں"۔

افسوس کہ یہ بیاض جو تقریبًا چار پانچ سو صفحات پر مشتمل تھی، ایک کرم فرما طالب علم نے مُستعار مانگی اور میں نے اپنی طالب علمانہ ناتجربہ کاری سے چند روز کے لئے اُن کے حوالہ کر دی۔ اُنہوں نے وہی کیا جو کتاب کو عاریۃً مانگنے والے طلبہ کرتے ہیں یعنی چند دن کے بعد میرے مُطالبہ پر فرمایا کہ "میں تو دے چکا ہوں آپ کو یاد نہیں رہا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ان مغالطوں سے عاجز ہو کر میں نے اس ذخیرے سے صبر کر لیا، جس کو کافی عرق ریزی اور محنت سے تیار کیا تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ چوری کا یہ علم خود اُن کے کام بھی آیا یا اُن کے پاس سے بھی یوں ہی نکل گیا جیسے انہوں نے میرے ہاتھ سے نکالا تھا۔ یہ سانحہ یاد آنے پر میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ اُنہیں جزا دے۔

بہر حال حضرتِ شاہ صاحبؒ کا درسِ حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی اور سائنس وغیرہ تمام علومِ جدیدہ و قدیمہ پر مشتمل ہوتا تھا، اور اس لئے اس جامع درس کا طالب علم اس درس سے ہر علم و فن کا مذاق لیکر اُٹھتا تھا اور اُس میں یہ اِستعداد پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ بضمنِ کلامِ خدا و رسولؐ ہر فن میں محققانہ انداز سے کلام کر جاتے۔ یہ درحقیقت درس کی لائن کا ایک انقلاب تھا جو زمانہ کی رفتار کو دیکھ کر الاستاذ الامام الکشمیریؒ نے اختیار فرمایا۔ چنانچہ کبھی کبھی تحدیث

بالنعمة کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ "بھائی! اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہو سکا، ہم نے سامان جمع کر دیا ہے" بالخصوص فقہِ حنفی کے مآخذ و مناشی کے سلسلہ میں حدیثی ذخیرہ کافی ہی نہیں، کافی سے زیادہ جمع فرما دیا۔

پھر بھی قیامِ ڈابھیل کے زمانہ میں آخری سال، جس کے بعد درس دینے کی نوبت نہیں آئی اور وصال ہو گیا۔ درسِ حدیث میں فقہی و حدیثی تحقیقات کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا، اور ترجیحِ مذہبِ حنفی اور تطبیقِ روایات میں عمر بھر کے علم کا نچوڑ پیش فرمایا جس کو املا کرنے والوں نے املا کیا۔ "تائیدِ مذہبِ حنفی" کے اس غیر معمولی اہتمام کی توجیہہ کرتے ہوئے گاہ گاہ فرماتے کہ عمر بھر ابو حنیفہؒ کی نمک حرامی کی ہے، اب مرتے وقت جی نہیں چاہتا کہ اس پر قائم رہوں۔ چنانچہ کھل کر پھر ترجیحِ مذہب کے سلسلہ میں اچھوتے اور نادرِ روزگار علوم و معارف اور نکات و لطائف ارشاد فرمائے۔ جس سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ منجانب اللہ آپ پر مذہبِ حنفی کی بنیادیں منکشف ہو گئی تھیں اور ان میں شرحِ صدر کی کیفیات پیدا ہو چکی تھیں جس کے اظہار پر گویا آپ مامور یا مجبور تھے۔ ان علوم و معارف کے ذخیرے کو حضرتِ ممدوح کے دو رشید شاگردوں مولانا محمد یوسف بنوری، اور مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے الواحج اور اق میں جمع کر کے اہلِ علم پر ایک ناقابلِ مکافات احسان فرمایا ہے۔ حق تعالیٰ ان دونوں محقق فاضلوں کو جزائے خیر عطا فرمائے اور حضرتِ شاہ صاحبؒ کی روحانیت سے ان کی نسبت کو اور زیادہ قوی فرمائے۔ آمین!

حضرتِ ممدوح کا یہ جملہ کہ "عمر بھر ابو حنیفہؒ کی نمک حرامی کی" شاید اس طرف مشیر ہے کہ حضرتِ ممدوح جہاں روایاتِ حدیث میں تطبیق و توفیقِ روایات کا اصول اختیار فرمائے ہوئے تھے وہیں روایاتِ فقہیہ میں بھی آپ کا اصول تقریباً تطبیق و توفیق ہی کا تھا یعنی مذاہبِ فقہاء کے اختلاف کی صورت میں حنفیہ کا وہ قول نقل فرماتے جس سے خروج عن الخلاف ہو جائے۔ اور

دونوں فقہ باہم جڑ جائیں، اگرچہ یہ قول مُفتیٰ بہ بھی نہ ہو اور مسلکِ معروف کے مُطابق بھی نہ ہو، نظر صرف اس پر تھی کہ دو فقہی مذہبوں میں اختلاف جتنا کم سے کم رہ جائے وہی بہتر ہے، ظاہر ہے کہ اس میں بعض مواقع پر خود امام کا قول بھی چھوٹ جاتا اور صاحبینؒ کا قول زیرِ اختیار آجاتا تھا۔ یعنی فقۂ حنفی کے دائرے سے تو کبھی باہر نہیں جاتے تھے مگر امام ابوحنیفہؒ کے بلا واسطہ قول سے کبھی کبھی باہر نکل جاتے تھے، خواہ وہ بواسطۂ صاحبینؒ ابوحنیفہؒ ہی کا قول ہو، شاید اس کو حضرتِ ممدوح نے ابوحنیفہؒ کی نمک حرامی سے تعبیر فرمایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں اس توسّع سے رجوع کر کے کُھلے طور پر مذہب کے معروف و مُفتیٰ بہ حصّے بلکہ اقوالِ ابی حنیفہؒ کے اختیار و ترجیح کی طرف طبیعت آچکی تھی اور یہ بلاشبہ اس کی دلیل ہے کہ ابوحنیفہؒ کی خصوصیات کے بارہ میں حق تعالیٰ نے انہیں شرحِ صدر عطا فرمادیا تھا اور وہ بالآخر اُسی ٹھیٹھ لکیر ہی پر جم کر چلنے لگے تھے جس پر اُن کے شیوخ سرگرمِ رفتار رہ چکے تھے۔

میں نے حضرت شیخ الہندؒ کا مقولہ سُنا ہے فرماتے تھے کہ جس مسئلہ میں امام ابوحنیفہؒ منفرد ہوتے ہیں اور ائمۂ ثلاثہ میں سے کوئی ان کی موافقت نہیں کرتا، اس میں، میں ضرور بالضرور پوری قوت سے ابوحنیفہؒ کا اتباع کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ میں ضرور کوئی ایسا دقیقہ ہے جس تک امام ہی کی نظر پہنچ سکی ہے اور پھر حق تعالیٰ اس دقیقہ کو منکشف بھی فرمادیتا ہے۔

یہ مقولہ امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک کے ذیل میں فرمایا کہ قضاءِ قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہوجاتی ہے، فرمایا کہ اس مسئلہ میں، میں بالضرور امام ابوحنیفہؒ ہی کی پیروی کروں گا، کیونکہ اس میں صرف امام ہی متفرد ہیں، اور یہ تفرّد اس کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی ایسی دقیق بُنیاد اُن پر منکشف ہوئی ہے جہاں تک دوسروں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکی ہیں۔

اسی قسم کا مضمون حضرت نانوتوی قدس سرہ کے بارے میں، میں نے حاجی امیر شاہ خاں صاحب مرحوم سے سُنا کہ حضرت والا نے مولانا محمد حسین صاحب بٹالوی سے گفتگو فرماتے ہوئے کہا تھا کہ میں ابو حنیفہ کا مُقلِّد ہوں، صاحب ہدایہ اور دُرِّ مختار کا مُقلِّد نہیں ہوں اس لئے میرے مقابلہ میں بطورِ معاوضہ جو قول بھی آپ پیش کریں وہ ابو حنیفہ کا ہونا چاہیئے، دوسروں کے اقوال کا میں جواب دہ نہ ہونگا، اس سے بھی یہی نکتہ نکلتا ہے کہ فقہ حنفی میں اصل بنیادی قول اُن حضرات کے نزدیک خود امام کا ہوتا تھا، اور وہی درحقیقت فقہ حنفی کی اساس ہونے کا حق بھی رکھتا تھا۔

پس ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحب پر آخری عمر میں یہی نکتہ منکشف ہوا ہو جو اُن کے شیوخ پر منکشف ہوا تھا، اور اس کے خلاف توسّع کو وہ ابو حنیفہ سے نمک حرامی کرنے کی تعبیر سے اس مقصد کو ظاہر فرما رہے ہوں۔

اسی کے ساتھ درسِ حدیث کے سلسلہ میں مذاہب اربعہ کے اختلافات بیان کرتے ہوئے کبھی کبھی مناظرانہ صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی تھی، ان مناظرانہ مباحث اور فروعاتی اختلافات سے کتاب و سُنّت کے ہزارہا مکنون علوم و انکشاف ہوتے تھے جو اس اختلاف کے بغیر حاصل کرنا ممکن نہ تھے، اور پھر ان فرعیات کا تزاحم اور تزاحم کے بعد قول فیصل حضرتِ ممدوح کے قلب و لسان سے ظاہر ہوتا تو ظرف کی خصوصیات لگ جانے سے عجیب و غریب اور نئے نئے علوم پیدا ہوتے پھر ان تزاحمات میں محاکمہ اور ترجیح کے سلسلہ سے جو تنقیحات بیان ہوئیں وہ خود مُستقل علوم و معارف کا ذخیرہ ہوتی تھیں۔

غرض ایجابی اور سلبی دونوں قسم کے علوم کی نیرنگیاں حلقۂ درس کو ایک رنگین گُلدستہ بنائے ہوئے تھیں، جس میں رنگ رنگ کے علمی پھول چُنے ہوئے ہوتے تھے، تفننِ علوم کی رنگینیوں کے ساتھ آپ کے درس میں ایک خاص شوکت بھی ہوتی تھی، کلام میں تمکّن اور قوّتِ الفاظ میں شوکت و حشمت اور کلام کے وقت حضرتِ

ممدوح کی ہئیتِ کذائی کچھ ایسے انداز کی ہوجاتی تھی جیسے کوئی بادشاہ اپنا حاکمانہ فرمان سُنا رہا ہے۔ بالخصوص ائمۂ مجتہدین کے متبعین عُلماء کے کلام پر بحث وتنقید چھڑ جاتی تو اس وقت مُعارضانہ اور ناقدانہ کلام کی شوکت اور بھی زیادہ اُبھری ہوئی دِکھلائی دیتی تھی، نگاہیں تیز ہوجاتیں، آواز قدرے بُلند ہوجاتی اور گردن اُٹھا کر بولتے تو ایک عجیب پُرشوکت اور رُعب افزاء کلام معلوم ہوتا تھا۔

بعض مواقع پر مثلاً حافظ ابن تیمیہؒ اور ابنِ قیمؒ کے تفرّدات کا ذکر آتا تو پہلے اُن کے علم وفضل اور تفقّہ وتبحّر کو سراہتے، اُن کی عظمت وشان بیان فرماتے، اور پھر اُن کے کلام پر بحث ونظر سے تنقید فرماتے، جس میں عجیب مُتضاد کیفیات جمع ہوتی تھیں، ایک طرف ادب وعظمت اور دوسری طرف ردّ وقدح یعنی بے ادبی اور جسارت کے ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ سے بھی بچتے، اور رجح اور صواب میں کتمانِ صواب سے بھی دور رہتے۔ کبھی کبھی علمی جوش میں آکر برنگِ مزاح بھی ردّ وقدح فرماتے تھے، جو بجائے خود ہی ایک مستقل علمی لطیفہ ہوتا تھا۔

ایک بار غالباً "استوٰی علی العرش" کے مسئلہ پر کلام فرماتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ اور اُن کے مسلک اور دلائل کا تذکرہ آیا، تو پہلے اُسے شرح وبسط سے بیان فرمایا، پھر اُن کے علم کی عظمت وشان کو کافی وقیع اور عقیدت بھرے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ حافظ ابن تیمیہؒ جبالِ علوم میں سے ہیں، اُن کی رِفعتِ شان اور جلالتِ قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں اُن کی عظمت کو سر اُٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی پیچھے کی طرف گر جائے گی اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا لیکن بایں ہمہ مسئلۂ "استواءِ علی العرش" میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں نہ گھسنے دوں گا۔ یا کبھی اُن اکابر منتقدمین کے کسی مُوہم یا شرح طلب کلام کی توجیہہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ہر شخص اپنی ہی جلالتِ شان کے مطابق کلام کرتا ہے، اُسے کیا خبر ہوتی ہے کہ بعد میں

ہم جیسے گھس کھدے بھی آنے والے ہیں جو اس کلام کی عظمت میں غلطاں و پیچاں ہو کر رہ جائیں گے۔؟

بہرحال درس کا انداز ایک عجیب نیرنگی کا رنگ لئے ہوئے تھا جو بالکل انوکھی تھی، جس میں علوم و فنون بھی ہوتے تھے، تائید و تنقید بھی ہوتی تھی علوم و معارف کے ساتھ علمی مزاح اور لطائف و ظرائف بھی ہوتے تھے، جس سے ہر استعداد کا طالب علم لطف اندوز ہوتا تھا، حتّٰی کہ کبھی کبھی خود طلبہ کے ساتھ بھی علمی رنگ کا مزاح فرما لیتے تھے۔

عصر و مغرب کے درمیان ایک دن بخاری کا درس زور و شور سے ہو رہا تھا احقر بھی اُس سال بخاری میں تھا اور شریکِ درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کر دی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لُطف رہا جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔"

ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین، اور وہ آئے کب تھے؟ اور رخصت کب ہو گئے؟ ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو غروب ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جاہلین! دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں، اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے، کیا وہ لُطف کا سبق ہو گا؟

ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالب علم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے، فرمایا کہ "جاہل! تجھے معلوم نہیں کہ میں اسنادِ متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہو گی؟ میں اس اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو مارے گا، وہ اپنے پاس والے کو تھپڑ رسید کرے گا، یہاں تک کہ تھپڑ کا یہ فعلی سلسلۂ سند تجھ تک پہنچ جائے گا۔"

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا، جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔

ایک دفعہ مسائلِ فقہیہ کے ذیل میں نابالغ کی امامت کا ذکر آ گیا۔ کہ اُس

کے پیچھے نماز نہیں ہوتی۔ فرمانے لگے کہ مسئلہ تو یہی ہے، مگر بعض نابالغوں کے پیچھے ہو بھی جاتی ہے۔ (اُس زمانہ میں حضرتِ ممدوح ہی مسجدِ دار العلوم میں امامت کرتے تھے) فرمانے لگے کہ "تم نے کبھی پیر نابالغ بھی دیکھا ہے؟ جو ساٹھ برس کا بھی ہو اور نابالغ بھی؛ جا ہلین! وہ ساٹھ برس کا نابالغ میں ہوں (اس وقت تک حضرتِ ممدوح کی شادی نہیں ہوئی تھی) اِشارہ اسی طرف تھا۔ؔ

ایک دفعہ مُلّا علاءُ الدین میرٹھی جو اُس زمانہ میں قلفی کا برف بیچا کرتے تھے اور آجکل دُودھ مٹھائی کی دُکانداری کرتے ہیں، نہایت دیندار اور وضعدار آدمی ہیں، قلفی برف کا مٹکا لیکر دارُالاہتمام میں پہنچ گئے، جہاں حضرتِ والدِ ماجد کے پاس اُس وقت حضرت شاہ صاحبؒ اور چند اکابر مُدرّسین تشریف فرما تھے، حضرتِ مہتمم صاحب رحمۃ اللہ نے مُلاجی کو روک کر برف کی کُلفیاں کھولنے کے لئے فرمایا۔ یہ سب حضرات کُلفیاں تناوُل فرماتے رہے۔ کھانے کے دَوران میں حضرت شاہ صاحبؒ نے مُلاجی سے پُوچھا کہ آپ اس برف کی تجارت میں ماہانہ کتنا پیدا کر لیتے ہیں؟" کہا کہ "یہی کوئی ساٹھ روپے ماہوار" اُس زمانہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تنخواہ بھی ساٹھ روپے ہی ماہوار تھی، مُسکرا کر فرمانے لگے "تو پھر تمہیں دارُالعلوم کی صدر مُدرّسی کی ضرورت نہیں۔"

بہر حال حضرتِ شاہ صاحبؒ کا حلقۂ درس اور ساتھ ہی دوسری مجالسِ علم وکمال کے ساتھ ظرافت سے بھی معمور ہوتی تھیں جو اُن کی زندہ دلی اور رفعتِ نفس کی دلیل تھی، اور اس ذیل میں کتنے ہی علوم ومعارف بے ساختہ نکلے ہوئے اربابِ مجلس کے ہاتھ پلّے پڑ جاتے تھے۔ مگر اس کے باوجود مجلس شرعی آداب سے بھرپور ہوتی تھی جس میں غیر مُتعلق یا فضول اور لایعنی باتوں کا کوئی وجود نہ ہوتا تھا۔

ؔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت کی عمر اس وقت ۶۰ برس کی تھی، انہوں نے یہ محاورۃً فرمایا، حقیقت میں ان کا نکاح ۴۵ سال کی عمر میں ہوا ہے ۱۲ ۔ کوندو۔

اگر کسی شخص نے کسی کی بُرائی یا فضول بات شروع کی تو مُعاً فرماتے کہ "بھائی ہمیں اس کی فرصت نہیں ہے، کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو پوچھو، ورنہ جاؤ۔ ہمارا وقت ایسی باتوں کے لئے فارغ نہیں"۔ وقت کی بہت زیادہ قدر اور حفاظت فرماتے تھے۔

اوقات کا بڑا حصّہ مُطالعۂ کتُب میں گذرتا تھا، ذوقِ مُطالعہ کا یہ عالم تھا کہ طبعی اور شرعی ضروریات کے علاوہ کوئی وقت کتُب بینی یا افادہ سے خالی نہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا کہ "فتح الباری کا (جو تیرہ[۱۳] جلدوں کی کتاب ہے) تیرہ[۱۳]ویں مرتبہ مُطالعہ کر رہا ہوں"۔ اور یہ بھی فرمایا کہ "میں درس کے لئے کبھی مُطالعہ نہیں کرتا ہوں، مُطالعہ کا مُستقل سلسلہ ہے اور درس کا مُستقل"، اس لئے ہر سال درس میں نئی نئی تحقیقات آتی رہتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اُس درس کے لئے مُطالعہ کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جب وقت کے تمام گوشے مُطالعہ سے پُر تھے، گویا مُطالعہ لامحدود تھا تو محدود مُطالعہ کی ضرورت بھی کیا تھی؟ کتُب درسیہ اور بالخصوص کتُبِ حدیث کے فنّی مباحث طبیعتِ ثانیہ بن چکے تھے، اور ہمہ وقت کے مُطالعے سے اُن میں روز بروز بسط و انبساط کی کیفیات پیدا ہوتی چلی جا رہی تھیں اور مباحثِ درس گھٹنے یا قائم رہنے کے بجائے خود ہی یوماً فیوماً بڑھتے رہتے تھے تو انہیں جزوی مُطالعہ سے بڑھانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے بلکہ شاید یہ مقررہ جزوی مُطالعہ علوم کے بڑھتے ہوئے بسط میں کچھ نہ کچھ حارج اور حد بندی ہی کا سبب بن جاتا۔

پھر یہ مُطالعہ محض کتُب درسیہ یا شروح و حواشی اور منہیاتِ درس تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ تمام فنون کی ہر مُیسّر آمدہ کتاب تک پھیلا ہُوا تھا جن میں کسی علم و فن کی تخصیص نہ تھی۔ ذہن کسی ایک فن کے ساتھ مُقیّد نہ تھا بلکہ مُطلقاً علم کے بارہ میں "هَل مِن مَزِيد" کا ذوق رکھتا تھا اور حدیث "منهومان لا

یشبعان" کا صحیح مصداق تھا۔

مصر تشریف لے گئے تو اوقات کا بڑا حصہ کتب خانہ خدیویہ کی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا، حجاز حاضر ہوئے تو حرمین کے کتب خانے کھنگال ڈالے اور فرائض وتطوعات کے بعد گویا آپ کی عبادت یہ تبحر اور کتب بینی تھی۔ مرضِ وفات میں اطباء نے مطالعہ کی ممانعت کر دی، لیکن جب بھی موقع ملا اسی وقت کتب بینی شروع کر دی۔ اطباء نے کہا کہ حضرت اس سے مرض بڑھ جائے گا۔ فرمانے لگے کہ "بھائی کتب بینی خود ہی میرا مستقل مرض ہے اور لاعلاج ہے"۔

مطالعہ کے سلسلہ میں فنونِ عصریہ فلسفۂ جدید، ہیئتِ جدید حتیٰ کہ فنِ رمل اور جفر کی کتابوں کو بھی مطالعہ سے نہ چھوڑا۔

جب بھوپال شادی کے سلسلہ میں تشریف لے گئے تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک جماعت نے عصری فنون کی کچھ بحثیں چھیڑ دیں، آپ نے اُن ہی فنون کی اصطلاحات میں بحوالۂ کتب جوابات دیئے۔ اور فرمایا کہ "یہ نہ سمجھنا کہ ہم لوگ ان فنون سے نابلد ہیں ہم ان عصری فنون کی کتابوں کا مطالعہ بھی کافی کیئے ہوئے ہیں اور ان فنون کی بنیادوں کو بھی جانتے ہیں"۔ یہی صورت مسائلِ حاضرہ کے مطالعہ کی بھی تھی۔

سفرِ پنجاب کے سلسلہ میں جب لاہور پہنچے، تو یہ زمانہ سود کی تحریک کا تھا۔ مسلمانوں کی ایک جماعت اقتصادی وجوہ پر سودی بینکوں کا قیام مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھ رہی تھی، مولوی طفیل احمد صاحب منگلوری رسالہ "سود مند" نکال رہے تھے اور جوازِ سود کا پرچار شدّ و مد سے کیا جا رہا تھا۔ لاہور پہنچنے پر حضرت کی قیام گاہ پر لوگ ملنے کے لئے آنے لگے، مجمع ہو گیا۔ مولانا ظفر علی خاں بھی آ گئے، اور جوازِ سود کے بارہ میں اقتصادی دلائل سے بھری ہوئی ایک تقریر کی جس میں ضرورتِ سود پر کلام کیا گیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ حضرتِ ممدوح بھی اُس کی تائید میں کچھ فرما دیں، حضرت شاہ صاحبؒ نے ساری بسیط تقریر سُن کر جواب میں فرمایا کہ "بھائی! جسے جہنم میں جانا ہو

وہ خود جائے ہماری گردن کو پُل نہ بنائے کہ اُس سے گذر کر جا پہنچے"۔ اور اس کے بعد سودی کاروبار کے مفرات اور اس تحریک کے غلط ہونے پر سیر حاصل علمی بحث فرمائی، جس سے لوگوں کے خیالات کی کافی حد تک اِصلاح ہوئی۔

علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے ہوئی، اُن کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات و شُبہات سے پُر آتے تھے، اور حضرت اُن کے جوابات لکھتے جس سے اُن کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی۔

غرض کثرتِ مُطالعہ صرف درسی علوم کی کُتب تک محدود نہ تھا، عصری علوم و فنون کا مُطالعہ جاری رہتا تھا، جس سے نو تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ بھی مرعوب اور مُستفید تھا۔

جب میں نے اپنے ایک عربی قصیدے "نونیۃُ الآحاد" کے طبع کرانے کا ارادہ کیا۔ اُس قصیدے میں اُمّت کے مشاہیر علم وفن کی مختصر سوانح نظم و نثر میں جمع کی گئی ہیں جسے اُس زمانہ میں طبع کرایا گیا تھا اور اب چھوٹی خوبصورت تقطیع پر برخوردار مولوی حافظ قاری محمد سالم سَلّمہٗ نے اپنے ادارہ تاج المعارف کی طرف سے دوبارہ طبع کرایا ہے، اس قصیدہ - میں ابو الحسن کذاب کا نام بھی مشاہیر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ یہ صفتِ کذب اور دروغ گوئی میں مشہور اور یکتائے روزگار تھے، مجھے اُن کی تاریخ نہ ملی جو اس قصیدے میں درج کرتا۔ اس صورت میں ہم لوگوں کی آخری دوڑ یہ ہوتی تھی کہ حضرت شاہ صاحبؒ تک پہنچ جاتے تھے اور اُس سلسلہ میں بلا محنت و مشقت علم کا نایاب اور وسیع ذخیرہ لیکر گھر آجاتے تھے جو برس ہا برس کے ذاتی مُطالعہ سے بھی حاصل ہونا دشوار تھا۔

میں اپنے اِسی معمول پہ دستور کے مُطابق حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ مرضِ وفات اپنی آخری حد پر پہنچ چکا تھا اور

دو تین ہفتہ بعد ہی وِصال ہونے والا تھا، کمزور بے حد ہو چکے تھے، لیٹنے بیٹھنے میں بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ اِطلاع کرنے پر مجھے حسب معمول گھر میں بُلالیا اور عادت تھی کہ جب بھی میں پہنچا تو کسی نہ کسی چیز سے تواضع فرماتے، فوراً چائے بنانے کا حُکم دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرتِ ممدوح کا دارُ العلوم سے کوئی تعلّق نہیں تھا، اور میں اُس زمانہ میں عہدۂ اہتمامِ دار العلوم پر تھا۔ لیکن حضرتِ ممدوح کے اس رسمی تعلّق کے انقطاع، بلکہ اس سے بھی پہلے فِتنۂ ۱۳۴۴ھ کے زمانہ میں میرا تعلّق اُن سے وُہی رہا جو پہلے سے تھا، حتّٰی کہ آمد و رفت بھی منقطع نہیں ہوئی، اسے حضرت شاہ صاحب بھی محسوس فرماتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے پھر یہ تعلّق کوئی رسمی یا دُنیوی نہ تھا جو قطع ہو جاتا، بلکہ روحانی تھا اور قدیم تھا جو ناممکنُ الانقطاع تھا۔ گو درمیانی مُدّت میں قضاء و قدر سے وہ مستور اور مغلوب سا ہو گیا تھا اور تکوینی طور پر "اَنْ نَزَغَ الشَّیْطَانُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ" فِتنہ زا مَنظر کا ظہور ضرور ہُوا، تاہم یہ سب سطحی بات تھی قلبی طور پر محبّت و عقیدت کا علاقہ بدستور قائم تھا اور اُس میں جتنا کچھ رخنہ پڑ گیا تھا، مرورِ ایّام سے اس میں بھی اضمحلال آچکا تھا، اس لئے از اوّل تا آخر میرے لئے حضرتِ ممدوح کے قلبِ مُبارک میں کافی گُنجایش تھی جس کا ظہور میری گاہ بگاہ حاضری پر ہوتا رہتا تھا۔ اس موقع پر بھی حسبِ معمول اُس بزرگانہ شفقت سے پیش آئے، چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد مُتوجّہ ہوئے۔ فرمایا "مولوی صاحب کیسے تشریف لائے؟"

میں نے عرض کیا "حضرت! "ابو الحسن کذّاب" کا ترجمہ نہیں مِلتا، اُس کے بارہ میں نشان معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں"۔ فرمایا "ادب و تاریخ کی کتابوں میں فلاں فلاں مواقع کا مُطالعہ کر لیجئے"۔ تقریباً آٹھ دس کتابوں کے نام لے دیئے، اور اُن کے مظان و مواقع کی نشاندہی فرمادی، میں نے عرض کیا کہ حضرت مجھے اس شخص کی پُوری تاریخ معلوم کرنی نہیں، صرف اُس کی صفتِ کذب و دروغ گوئی

کے حالات معلوم کرنے ہیں مگر اُن کا کوئی عنوان کسی کتاب میں نہیں مِلتا کہ اُس کے نیچے ان خاص واقعات کا مُطالعہ کر لوں۔

فرمایا، مولوی صاحب! آپ نے بھی کمال کیا، صفتِ کذب کونسی صفتِ مدح ہے کہ لوگ اُس پر عنوانات قائم کر کے اُس کے واقعات دِکھلائیں۔ ایسی مذموم صفات و افعال کا تذکرہ تو ضمناً اور اِستطراداً آجاتا ہے، عنوانات ہمیشہ کمالات پر قائم کئے جاتے ہیں نہ کہ نقائص وعیوب پر۔ ان کُتب میں فلاں فلاں مقام دیکھ لیجئے، ضمناً اُس کی صفتِ کذب کا بھی تذکرہ کہیں نہ کہیں مِل ہی جائے گا۔

میں نے عرض کیا کہ حضرت! مجھے تو کتابوں کے اتنے اسماء بھی یاد نہیں رہیں گے، چہ جائیکہ اُن کے یہ مَظان اور مَواقع محفوظ رہیں۔ نیز انتظامی مہمات کے بکھیڑوں میں اتنی فرصت بھی نہیں کہ چند جزوی مثالوں کے لئے اتنا طویل و عریض مُطالعہ کروں، بس آپ ہی اس شخص کے کذبات اور دروغ گوئی سے متعلقہ واقعات کی دو چار مثالیں بیان فرما دیں، میں اُنہی کو آپ کے حوالہ سے جُزوِ کتاب بنا دوں گا۔ اس پر مُسکرا کر ابوالحسن کذّاب کی تاریخ اُس کے سنِ ولادت سے سنِ وفات تک بیان فرمانی شروع کر دی، جس میں اُس کے جھوٹ کے عجیب وغریب واقعات بیان فرماتے رہے، آخر میں سن وفات کا ذِکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شخص مرتے مرتے بھی جھوٹ بول گیا۔" پھر اُس جھوٹ کی تفصیل بیان فرمائی۔

حیرانی یہ تھی کہ یہ بیان ایسے طرز سے ہو رہا تھا کہ گویا حضرت ممدوح نے آج کی شب میں مُستقلاً اِسی کی تاریخ کا مُطالعہ کیا ہے جو اس بسط سے سن وار واقعات بیان فرما رہے ہیں۔

میں نے تعجُّب آمیز لہجہ میں عرض کیا کہ "حضرت شاید کسی قریبی ہی زمانہ میں اس کی تاریخ دیکھنے کی نوبت آئی ہو گی؟" سادگی سے فرمایا "جی

نہیں، آج سے تقریباً تیس ۳۰ سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں مصر گیا ہوا تھا، خدیوی کتب خانہ میں مطالعہ کے لئے پہنچا تو اتفاقاً اسی ابوالحسن کذاب کا ترجمہ سامنے آگیا اور اُس کا مطالعہ دیر تک جاری رہا، بس اُسی وقت جو باتیں کتاب میں دیکھیں حافظہ میں محفوظ ہوگئیں اور آج آپ کے سوال پر مستحضر ہوگئیں، جن کا میں نے اس وقت تذکرہ کیا"

اللہ اکبر! یہ واقعات حدیث وتفسیر اور فقہ و اصول کے اُن مباحث سے تعلق نہ رکھتے تھے جو اُن کے متداول فنون اور روزمرہ کے مشاغل میں سے تھے بلکہ ایک غیر متعلق بات اور وہ بھی تیس ۳۰ سالہ مدت کی، ذہن میں آئی ہوئی اور اوپر سے وہ بھی کسی اہتمام سے نہیں محض اتفاقی طور پر اور سرسری انداز سے ذہن میں آئی ہوئی چیز تھی، اُس کا اتنا استحضار عام معتاد حافظہ سے بالاتر کراماتی حافظہ سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ جس علم وفن میں بھی گفتگو فرماتے، تبحر واستحضار کی یہی نوعیت ہوتی تھی، کہ گویا اس مسئلہ کو ابھی دیکھ کر اور ذہن میں سمیٹ کر آرہے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ صدر جمعیۃ علماءِ دہلی کا حضرت ممدوح کو "چلتا پھرتا کتب خانہ" کہنا حقیقتاً اظہارِ حقیقت پر مبنی ہے اور حضرتِ ممدوح اِس لقب کے جائز طور پر ہی نہیں بلکہ واجبی طور پر مستحق ہیں۔

وفورِ مطالعہ اور اُس کے ساتھ قوتِ حافظہ ایسا ہی ہے جیسے سرمایہ دار سرمایہ کے ساتھ سخی دل بھی ہو، بخیل سرمایہ دار ہو تو بے فیض اور بے نتیجہ ہے جیسے بعض کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے مگر قوتِ حافظہ نہ ہونے کے سبب اُن کا وقتی شوقِ مطالعہ تو پورا ہوجاتا ہے مگر خود اُن کو یا دوسروں کو اس مطالعہ کی کاوشوں سے کوئی فایدہ نہیں پہنچتا، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ کا جس درجہ مطالعہ وسیع تھا اُسی درجہ حافظہ بھی قوی تھا۔ گویا ذہن وحافظہ ہر وقت تیار

رہتے تھے کہ آنکھیں یا کان کچھ لائیں تو وہ فوراً اُسے جمع کر لیں۔ بلاشبہ حضرتِ ممدوح کے اس غیر معمولی حافظہ سے حُفّاظِ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، انہیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کُتب کی عبارتیں بھی اس درجہ مُستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلّف پیش کر دیا کرتے تھے اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔

تحریکِ خلافت کے دَور میں جب امارتِ شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سُبحان اللہ خان صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو اُن کے نقطۂ نظر کی تو مؤیّد تھی مگر مسلکِ جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ خود لیکر دیوبند تشریف لائے اور مجمعِ عُلماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابر دارالعلوم حضرت شاہ صاحبؒ کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رَد ہی کر سکتے تھے کیونکہ وہ سَلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی، اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلکِ جمہور کے صراحۃً خلاف تھی، یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اُسے کسی تاویل و توجیہہ سے بھی مسلکِ جمہور کے مُطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرتِ شاہ صاحبؒ اِستنجا کے لئے تشریف لے گئے ہوئے تھے، وضو کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں بن پڑتی۔

حضرتِ ممدوح حسبِ عادت حَسْبُنَا اللّٰه کہتے ہوئے بیٹھ گئے، اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ "اس عبارت میں جعل اور تصرّف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو مِلا کر ایک کر دیا گیا ہے، درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے"۔

اُسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی، دیکھا گیا تو واقعی اصل

عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان میں سے حذف ہوئی تھی۔ جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا، عبارت کا مطلب مسلکِ جمہور کے موافق ہو گیا، اور سب کا تحیّر رفع ہو گیا۔

بہرحال حافظہ اور انتقالِ ذہنی کے لحاظ سے حضرتِ ممدوح "آیت من آیات اللہ" تھے، جس کی نظیر ان قریبی زمانوں میں نہیں ملتی۔

حضرتِ ممدوح کی اس تبحّر پسندی اور ذوقِ زیادۂ علم کا نتیجہ یہ تھا کہ طلبہ میں بھی وہی ذوقِ تبحّر پیدا ہونے لگا۔ ہر طالبِ علم کوشش کرتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تحقیق کے ساتھ مسئلہ کی تہہ تک پہونچے۔ اُس دور میں ہر چھوٹے بڑے کا یہ ذہن بن گیا تھا اور اُس کے آثار زمانۂ طالبِ علمی ہی میں نمایاں ہونے لگتے تھے۔

چنانچہ اُس زمانہ کے متعدد طلباءِ دورۂ حدیث نے اچھے اچھے قابلِ قدر رسالے اور مضامین سے اپنے علمی تبحّر کا ثبوت دیا۔ میں نے ادب و تاریخ کے سلسلہ میں رسالہ "مشاہیرِ اُمّت" لکھا، مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم (سابق مفتی اعظم پاکستان) نے "ختم النبوۃ فی القرآن" اور "ختم النبوۃ فی الحدیث" کا رسالہ دو جلدوں میں مرتّب کیا۔ مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی نے "کلمۃ السرّ فی حیوٰۃ روح السرّ" لکھا۔ مولینا بدرعالم صاحب میرٹھی نے بھی کئی رسالے لکھے، اور تقریباً دو تین سال کے عرصہ میں احاطہ دار العلوم سے اٹھارہ، اُنیس رسالے شائع ہوئے۔

یہ درحقیقت وہی ذوق تھا جو حضرتِ ممدوح کے درسِ حدیث سے طلبہ لیکر اُٹھتے تھے اور علمی طور پر اپنے اندر زمانۂ طالبِ علمی ہی میں ایک ایسی قوت محسوس کرنے لگتے تھے کہ گویا وہ تمام علوم و فنون پر حاوی ہیں اور علم اُن کے اندر سے خود بخود اُبھر رہا ہے، وہ کتب بینی محض عنوانِ بیان تلاش کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

حضرتِ ممدوح کے یہاں علم کے اس غیر معمولی شغف و انہماک اور ہمہ وقت کے شغل کے باوجود عمل بالسنۃ اور اتباعِ سلف کے اہتمام میں ذرّہ برابر کمی اور کوتاہی نہ ہوتی تھی۔

ہم بہت سی سُنتیں اُن کے عمل دیکھ کر معلوم کر لیا کرتے تھے۔ اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے، کھانے میں ہمیشہ تین اُنگلیاں استعمال کرتے تھے اور دونوں ہاتھ مشغول رکھتے تھے، بائیں ہاتھ میں روٹی اور داہنے ہاتھ سے اُسے توڑ توڑ کر استعمال کرتے تھے، لقمے ہمیشہ چھوٹے چھوٹے استعمال کرتے تھے۔

یہی صورت لباس کی تھی، پاجامہ نیم ساق سے کبھی نیچا نہ ہوتا تھا، عمامہ کا استعمال زیادہ ہوتا تھا، سردیوں میں اکثر و بیشتر سبز یا سیاہ رنگ کا عمامہ استعمال فرماتے تھے۔ زہد و تقویٰ حضرتِ ممدوحؒ کے کھلے اور روشن چہرے پر برستا تھا۔ ایک غیر مسلم شخص نے کسی موقع پر حضرت ممدوح کا سُرخ و سفید رنگ، کُشادہ پیشانی، اور ہنس مُکھ چہرہ نیز چہرہ کی مجموعی وجاہت و عظمت دیکھ کر کہا تھا، "اسلام کے حق ہونے کی ایک مستقل دلیل یہ چہرہ بھی ہے"۔

جُمعہ کے لئے جاتے تو "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللہ" کا منظر سب کو نظر آتا۔ سعی اور دوڑ کی شان، تیز رفتاری اور لمبے لمبے قدم ڈالنے کی چال سے نمایاں ہوتی تھی۔ "حَسْبُنَا اللہ" تکیۂ کلام تھا۔ اُٹھتے بیٹھتے اکثر و بیشتر حَسْبُنَا اللہ فرماتے اور ایسے ہی موقع بموقع "اللہُ اَجَلّ" فرماتے رہتے تھے۔ درس میں بعض اوقات غایتِ خشیت سے آنکھوں میں نمی آجاتی، جسے ضبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اِنشاء و قصاید اور وعظ میں خوف و خشیت کے اشعار اکثر تر آنکھوں کے ساتھ پڑھتے جس سے چہرہ مظہرِ خشیتِ الٰہی نظر آتا تھا اور سامعین کی آنکھیں تر ہو جاتی تھیں۔ ٹھیک

طریقۂ نبوی کے مطابق کن انکھیوں سے دیکھتے اور جدھر متوجہ ہوتے، پورے پورے متوجہ ہوتے تھے۔ ادبِ علم کا یہ عالم تھا کہ خود ہی فرمایا کہ "میں مطالعہ میں کتاب کو اپنا تابع کبھی نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ خود کتاب کے تابع ہو کر مطالعہ کرتا ہوں" چنانچہ سفر و حضر میں ہم لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ لیٹ کر مطالعہ کر رہے ہوں یا کتاب پر کہنی ٹیک کر مطالعہ میں مشغول ہوں بلکہ کتاب کو سامنے رکھ کر مؤدب انداز سے بیٹھتے، گویا کسی شیخ کے آگے بیٹھے ہوئے استفادہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ "میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک دینیات کی کسی کتاب کا مطالعہ بے وضوء نہیں کیا"۔

سبحان اللہ! کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی نظر آتی ہے لیکن اس پر استقامت اور دوام ہر ایک کے بس کی بات نہیں، یہ وہی کر سکتا ہے جسے حق تعالیٰ نے ایسے کاموں کے لئے موفق اور میسّر کر دیا ہے اور وہ گویا بنا ہی اس لئے گیا ہے کہ اس سے دینی آداب کے عملی نمونے پیش کرائے جائیں۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند ؛ میلِ او را در دلش انداختند

ادبِ شیوخ و اکابر کا یہ عالم تھا کہ اُن کے سامنے کبھی آنکھ اٹھا کر یا آنکھ ملا کر گفتگو نہ فرماتے۔

فتنۂ ۱۳۴۶ھ میں جب معاملہ حدود سے بڑھنے لگا، اور حضرتِ ممدوح نے مدرسہ میں آنا اور درس دینا چھوڑ دیا، جس سے طلبہ میں انتشار پھیل گیا اور اسٹرائیک کی صورت پیدا ہوئی، تو حضرت والد ماجد نے بلا واسطہ اس مسئلہ کو سلجھانے کی سعی فرمائی، اور ایک دن اچانک صبح کے وقت حضرت ممدوح کے مکان پر تن تنہا پہونچ گئے، اور اطلاع ہونے پر اک دم گھبرا کر حضرت ممدوح باہر تشریف لائے اور اُسی سابقہ نیازمندی کے ساتھ بہت ہی مؤدبانہ انداز سے پردہ کرا کر گھر میں لے گئے۔ گردن

جھکا کر عرض کیا کہ "حضرت! اس وقت اچانک کیسے تکلیف فرمائی؟"

حضرت والدِ ماجدؒ نے فرمایا کہ "حضرت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ میرا بھی آپ پر کوئی حق ہے؟" فرمایا "ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ میری کھال کی جوتیاں بنا کر پہنیں تو مجھے کوئی عُذر نہ ہوگا"۔

والدِ ماجد نے فرمایا کہ "بَارَكَ اللّٰه! بس تو میری گذارش یہ ہے کہ آپ ان قصّوں کو چھوڑ دیں اور مدرسہ چلیں، اور میرے ساتھ چلیں"۔

فرمایا، بہت اچھا! حضرت نے چند معاملات پیش فرمائے کہ حضرت انہیں یوں کر دیا جائے، والدِ ماجد نے فرمایا کہ "آپ کا منصب مُطالبہ کرنے کا نہیں، مُطالبے پورے کرنے کا ہے، آپ اپنے قلم سے جو مناسب سمجھیں چل کر خود کریں" اس پر ساتھ ہو لئے اور مدرسہ میں پہنچ گئے۔ سب کو حیرت اور بے انتہا مسرّت ہوئی کہ سارا فتنہ ختم ہوگیا۔

والدِ ماجد نے فرمایا کہ "یہ سب مُطالبے آپ خود جاری کر دیں اور درس شروع کرا دیں"۔ فرمایا کہ حضرت اتنی اجازت دیں کہ ظہر کے بعد حاضر ہو کر درس شروع کروں۔" فرمایا "مضائقہ نہیں"۔ حضرت ممدوح تشریف لے گئے مگر پھر ظہر کے بعد تشریف نہیں لائے، اور معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجبور کر کے روک دیا۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ زمانۂ اختلاف میں ادب و توقیر اور تسلیم و رضاء کا بذاتِ خود یہ عالم تھا کہ جو اس واقعہ میں آپ نے دیکھا۔

تقریری افادہ کے ساتھ تحریری افادہ یعنی تصنیف کا بھی آپ میں کافی ذوق تھا۔ حدیث میں متعدد نافع اور نادرۂ روزگار رسالے تالیف فرمائے اور علمی ترکہ میں چھوڑے، جیسے "نَیلُ الفَرقَدَین فِی مَسئَلۃِ رَفعِ الیَدَین"، "فَصلُ الخِطَاب فِی مَسئَلۃِ اُمِّ الکِتَاب"، "کَشفُ السَّترِ عَن مَسئَلۃِ الوِترِ"، "اِکفَارُ المُلحِدِین فِی ضَرُورِیَاتِ الدِّین" (عربی) اور "خَاتَم

النّبِيّين" (فارسی)۔

مرضِ وفات میں رو کر فرمایا کہ "ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا۔ یہ رسالہ "خاتمُ النّبِیّین" اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے توقع ہے کہ شاید یہ رسالہ میری نجات کا ذریعہ ہو جائے"۔

دارالعلوم کے سنینِ قیام میں سے تقریباً اواخر سنین میں کلامی مسائل کی طرف توجہ دی، ابتدائی ایام میں کلامی مسائل میں زیادہ ذوق سے کام نہیں فرماتے تھے نقل و روایت کا غلبہ تھا۔ آخر عمر میں یہ ذوق اُبھرا تو خارج اوقات میں دوپہر کے ابتدائی حصہ میں کتاب شروع کرائی، احقر بھی اُس میں شریک تھا۔ اس میں بالخصوص حضرت نانوتوی قدس سرہٗ کی کتب کے حوالہ سے کلامی مسائل میں اُن کے علوم کو بیان فرماتے اور اُن کی شرح فرماتے اور آخر کار اُن علوم کے عنوانات منضبط کرنے کے لئے عربی کا ایک بلیغ قصیدہ خود ہی موزون فرمایا جو "ضربُ الخاتم علیٰ حدوثِ العالم" کے نام سے چھپ چکا ہے، اُس کے ایک ایک شعر میں بہت سے مسائل کھپائے ہیں، ساتھ ہی اُن کی تشریحات کے لئے ماخذوں کے حوالے دیئے گئے ہیں، جن میں تمام کتب معقول و مباحثہ فلسفہ کے حوالوں کے ساتھ علوم قاسمیہ کی کتب مثلاً "تقریر دلپذیر"، "انتصار الاسلام"، "مباحثِ شاہ جہاں پور" وغیرہ کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔ خط نہایت پاکیزہ تھا، حروف موتیوں کی طرح کاغذ پر جڑے ہوئے نظر آتے تھے اور بہت خوب صورت ہوتے تھے۔ باریک قلم سے لکھتے تھے اور مختصر نویسی کے ساتھ لکھنے کی عادت تھی، اکثر تحریریں اشارات ہوتے تھے جن کو صاحبِ ذوق ہی سمجھ سکتا تھا۔

فنِ ادب اور شاعری کا ذوق بہت بلند پایہ تھا، دارالعلوم میں عام اجتماعات یا کسی بڑی شخصیت کے قدوم یا کسی اہم حادثہ کے وقوع پر قصائد قلم بند فرماتے اور انہیں مجمع میں سناتے، پڑھنے کا طرز نہایت دلکش تھا۔ ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے جس سے سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا، عربی اور فارسی کی بلاغت اعلیٰ مقام تک

پہونچی ہوئی تھی۔

فرماتے کہ "مقاماتِ حریری جیسی عبارت ایک گھنٹہ میں چار ورق برجستہ لکھ سکتا ہوں لیکن ہدایہ جیسی عبارت چار مہینوں میں بھی چار سطر نہیں لکھ سکتا" اُردو سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا لیکن کلام بہرحال بلیغ ہوتا تھا مگر عربیت آمیز۔

اس اُردو اجنبیت کی وجہ سے ہم میں اُردو کی ایک گونہ تحقیر قائم ہوگئی تھی اردو کی کتابوں کو دیکھنا عیب سا معلوم ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ خود اپنے اسلاف صالحین کی علوم و معارف سے بھری ہوئی اردو تصنیفیں دیکھنے میں بڑی رُکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ خواہ اسے محسوس کر کے یا از خود داعیۂ قلب سے ایک دن تفسیر بیان القرآن اردو از حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے بارے میں فرمایا کہ "اُردو میں اتنی جیت تفسیر آج تک نظر سے نہیں گذری۔ اس تفسیر نے بہت سی پرانی تفاسیر سے مستغنی کر دیا ہے۔" اس کے بعد ہم لوگ اردو کی کتابیں دیکھنا گویا جائز سمجھنے لگے تھے، اور یہ کہ اُردو زبان بھی کوئی ایسی چیز ہے جس سے علم کا تعلق ہو سکتا ہے۔

اثناءِ سال تعلیمی میں گاہ بگاہ سفر بھی فرماتے تھے اور سال بھر میں سفروں کی تعداد خاصی ہو جاتی تھی، اس میں بعض سفر لمبے لمبے بھی ہوتے تھے جیسے پنجاب و سرحد وغیرہ کے اسفار سے ردِّ قادیانی کے سلسلہ میں پنجاب کے مستقل دو لیے بھی فرمائے۔ خاص قادیان کا سفر بھی ہوا، جس میں ایک بڑی جماعت ساتھ تھی۔ اور ہم لوگ بھی ہمرکاب تھے اور سفروں میں بھی احقر ساتھ رہا ہے۔

تقریر علمی ہوتی تھی جس سے علماء ہی استفادہ کر سکتے تھے، لیکن عوام بصد عقیدت سُن کر برکت حاصل کرتے تھے۔

کھوٹر ضلع راولپنڈی کے سفر میں احقر اور مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی حال شیخ الحدیث جامعۂ اشرفیہ لاہور اور دوسرے بعض اور مستفیدین بھی ساتھ تھے۔ حضرت مولینا مرتضےٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ بھی ہمراہ تھے، راولپنڈی پہنچنے پر بڑے بڑے اجتماعات ہوئے اور بڑی بڑی عالمانہ تقریریں ہوئیں، مجلسی خوش

مذاق اور ظرافت کے سلسلہ میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ حضرت مولانا مرتضیٰ حسن مرحوم وظیفہ پڑھ رہے تھے جو ناشتہ آگیا۔ حضرت ممدوح نے زور سے فرمایا کہ "شیخ! وظیفہ کا مقصد آچکا ہے، دسترخوان پر آجایئے!"

کھوڑ کے اسی سفر میں حضرت ممدوحؒ نے مجھے "فقیر صاحب" کا خطاب عطا فرمایا۔ صورت واقعہ یہ ہوئی کہ بارش بہت زیادہ ہوگئی جلسہ گاہ شہر سے میل بھر کے فاصلہ پر تھی، راستہ میں بھی بارش آگئی اور میں سر سے پیر تک پانی میں مع کپڑوں کے نچڑ گیا، جلسہ گاہ کے قریب ایک مسجد میں پہونچکر بھیگے ہوئے کپڑے اُتارے۔ ایک صاحب نے اپنی چادر لنگی کے طور پر دی، اور ایک صاحب نے اوڑھنے کے لئے دوسری چادر دیدی، میں لنگی باندھ کر اور چادر اوڑھ کر ننگے سر، ننگے پاؤں حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہونچا، حکم فرمایا کہ:-

"اس وقت جلسہ میں تقریر تجھی کو کرنا ہوگی"۔

چنانچہ مجھے اسٹیج پر کھڑا کر کے خود ہی میرے تعارف کی تقریر کی اور فرمایا کہ "یہ فقیر صاحب جو آپ کے سامنے حد میں ننگے سر، ننگے پاؤں کھڑے ہیں فلاں ہیں فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے ہیں، علمی سواد خاصا رکھتے ہیں، مجمع میں بولنے کا ڈھنگ انہیں آگیا ہے، یہ جیسے باہر سے فقیر نظر آتے ہیں ویسے ہی اندر سے بھی فقیر صاحب ہی ہیں، آپ ان کی تقریر سے فائدہ اُٹھائیں گے"۔

ملتان میں بھی شیخ ذکریا بہاؤ الدین ملتانیؒ کی درگاہ کے احاطہ میں جلسہ ہوا میں ساتھ تھا تو مجھے بھی تقریر کرنے کا حکم دیا۔ اور جب میں تقریر ختم کر چکا تو اس تقریر کی تائید میں بار بار میرا ذکر فرما فرما کر خود بھی تقریر فرمائی اور کافی حوصلہ بڑھایا اصاغر کی حوصلہ افزائی کی آپ کو خاص عادت تھی، جس سے چھوٹے اپنے حوصلہ سے زیادہ کام کر جاتے تھے۔ اور ان میں ترقی پذیری کی اُمنگ پیدا ہو جاتی تھی۔

درس و تدریس کے ساتھ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا، بیعت بھی فرمالیتے تھے، اپنے اکابر سے سُنا کہ حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی طرف سے مجازِ بیعت بھی

تھے۔ دیوبند کے بھی بعض لوگ بیعت تھے۔ الٰہ دین دیوبندی جو حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کے دیکھنے والوں میں تھے، حضرت ممدوح ہی سے بیعت تھے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد میں نے اور جناب مولینا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان مقیم کراچی نے بھی ساتھ ہی ساتھ حضرت ممدوح کی طرف رجوع کیا۔ ہمیں طریق چشتیہ کے مطابق اذکار تلقین فرمائے اور ہم اُس میں کھُلی تاثیر و تصرُّف محسوس کرتے تھے۔

علم و اخلاق کے ان اونچے مقامات کے ساتھ سیاسیات سے بھی آپ کو لگاؤ تھا اور مُلکی معاملات میں شرعی اصول پر جچی تُلی رائے ظاہر فرماتے تھے۔

جمعیۃُ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس پشاور کی صدارت فرمائی، خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، جس میں وقت کے تمام مسائل پر بحث فرمائی، انگریزوں سے کافی تنفّر تھا ایک دفعہ مرضِ وفات میں ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے سولہ سترہ سال پہلے عزیزی مولوی حامد الانصاری غازی کو مخاطب کر کے فرمانے لگے کہ "بھائی! ہمیں اب یقین ہو گیا ہے کہ انگریز ہندوستان سے نکل جائے گا، کیونکہ اُس نے قدرتی اشیاء پر بھی ٹیکس عاید کر دئیے ہیں، ہوا پر ٹیکس، فضا پر ٹیکس، پانی پر ٹیکس، نمک پر ٹیکس، جن چیزوں کو قدرت نے آزاد رکھا تھا اُن پر پابندی عاید کرنا، قدرت کا مقابلہ ہے جس کے بعد زیادہ دیر تک بقاء نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے ہمیں یقین ہے کہ اب انگریز کے جانے کے دن قریب آ گئے ہیں"۔

حضرتِ ممدوح کی ان گوناگون علمی اور اخلاقی خصوصیات کے سبب خود اُن کے اکابر اُن کی عزت کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ اُستاد ہونے کے باوجود توقیر کے کلمات اُن کے بارہ میں استعمال فرماتے، حضرت تھانوی رحمہُ اللہ فرماتے کہ "جب مولوی انور شاہ میرے پاس آ کر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب اُن کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے"۔ میرے والدِ ماجد باوجودِ اُستاد ہونے کے اُنکی انتہائی توقیر فرماتے تھے، اور غائبانہ بھی اُن کے لئے کلماتِ تعظیم استعمال فرماتے تھے۔

ظاہر ہے کہ جس کی عظمت اُس کے بڑوں کے دل میں بھی ہو اُس کی عظمت اس کے چھوٹوں کے دلوں میں کتنی ہو گی۔؟

ایک مُقتدر ہستی، ایک یگانۂ روزگار ہستی کے فضائل و مناقب ان سطور میں کیا آسکتے ہیں۔ بڑی بڑی تصنیفیں بھی ایسے لوگوں کی سوانح کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں، اس لئے یہ مضمون تو کیا اُن کی سمائی کر سکتا ہے لیکن اس کی نگارش بطور سوانح کے ہوئی ہی نہیں، یہ سطریں صرف بطور تذکرۂ کاملین اپنے دل کی تسلی یا اپنے اُستاد زادہ عزیز مولوی محمد ازہر شاہ قیصر، مُدیر ماہنامۂ دارالعلوم کے ایماء کی تعمیل کے لئے لکھی گئی ہیں۔ ورنہ کُجا سوانح خاتم المحدثین اور کُجایہ اجہل الجاہلین! بس "جہدُ المقلِ دموعہٗ" کے طور پر یہ بضاعتِ مزجاۃ (جو آج بتاریخ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ کو بعد نمازِ صبح بیٹھ کر لکھنی شروع کی اور مُسلسل لکھتے لکھتے ٹھیک گیارہ بجے دن کے ختم کر دی) بطورِ ایک ہدیۂ ناچیز عزیز محترم و ممدوح کی خدمت میں پیش ہے۔ ع

"گر قبول اُفتد زہے عز و شرف"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا ۔

(منقول از حیاتِ انور)

قادیانی فتنہ

اور

حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیریؒ

از حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (سابق مفتی اعظم پاکستان)

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ سالہاسال تک دار العلوم دیوبند میں مفتی کے فرائض انجام دے چکے ہیں اور بعد ازاں پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں دار العلوم کراچی کے شیخ الحدیث اور مملکت پاکستان میں مفتی اعظم کے منصب جلیل پر فائز رہے۔ واسع الاطلاع، کثیر المطالعہ، کثیر التصانیف، محقق مدقق اور فاضل متبحر تھے۔ ۱۱ر شوال المکرم ۱۳۹۶ھ کو آپ پاکستان میں انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ کوندو

امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی امتیازی فضیلت ہے کہ پوری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوتی اور امت میں تاقیامت ایک ایسی جماعت قائم رہنے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے واضح طور پر دی ہے جو دینِ حق کی اصلی ہیئت پر قائم رہ کر اس کے اندر پیدا ہونے والے رخنوں کی اصلاح کرتی رہے گی۔ اس کو اللہ کی راہ میں نہ کسی کا خوف مانع ہوگا نہ طمع۔ ایسے ہی لوگوں کے حق میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَیَغرِسُ لِھٰذَا الدِّینِ غَرسًا (اللہ تعالیٰ اس دین کی خدمت کے لئے پودے لگاتا رہیگا۔)

یہ ضروری نہیں کہ اس جماعت کے افراد سب کسی ایک ہی جگہ یا کسی ایک ہی

بستی یا ایک ملک میں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس جماعت کے افراد کو ہر زمانہ اور ہر خطہ میں پیدا فرماتے رہتے ہیں۔

ان کی خصوصی علامت یہ ہوتی ہے کہ دین کے فروغ اور اس میں پیدا شدہ رخنوں کی اصلاح، عام مسلمانوں کی خیر خواہی اور ان کو دین کے صحیح راستہ پر چلانے کا داعیہ ان کے قلوب میں ایسا رچا ہوا ہوتا ہے کہ یہ جذبہ ان کے حوائج ضروریہ انسانیہ کا درجہ لے لیتا ہے۔ ان مقاصد میں کسی جانب سے خلل آتا ہے تو انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا گھر جل گیا، ہم لٹ گئے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

خدمتِ خلق اور اصلاحِ خلق ان کے لئے طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے جن بزرگوں کی صحبت کا شرف عطا فرمایا ان میں کافی تعداد ایسے حضرات کی تھی جن کے چہرے دیکھ کر خدا یاد آ ئے، جن کی زندگی کو دیکھنے والے بے تأمل کہہ اٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دین کی اور مسلمانوں کی خدمت ہی کے لئے چن لیا ہے۔ اِنَّا اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (ہم نے ان کو ایک خاص کام کے لئے مخصوص کر لیا ہے، یعنی ذکر و فکرِ آخرت کے لئے۔)

ان ہی مقدس بزرگوں میں میرے استادِ محترم، استاذ الاساتذہ، بحر العلوم والفنون ذہبیٔ زمانہ اور رازیٔ وقت حضرت علامہ مولانا محمد انور شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی ذاتِ گرامی ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس ناکارہ کو آپ کی خدمت و صحبت میں رہنے اور بقدرِ ظرف استفادہ کرنے کے لئے تقریباً بیس سال کی طویل مدت عطا فرمائی۔ آپ کے پورے فضائل و کمالات کو تو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو علم کا حظِ وافر حاصل ہے۔ یہ ناکارہ اپنی کم ہمتی اور کم حوصلگی کی بناء پر اس درجہ سے محروم رہا۔ ؎

ما ندا ریم مشامے کہ تو انست شنید
ورنہ ہر دم وزد از گلشن وصلت نفحات

مگر اس پر بھی جو کچھ آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا اس کو ضبطِ بیان میں لانا آسان نہیں، خصوصاً اس وقت کہ ہجومِ مشاغل و ذواہل نے دل و دماغ کو کسی کام کا نہیں چھوڑا ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں ÷ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

مولوی محمد انہر شاہ صاحب قیصر سلمہ اللہ تعالیٰ نے احقر سے فرمائش کی کہ قادیانی فتنہ کے استیصال میں حضرت شاہ صاحبؒ کی مساعیٔ جمیلہ سے متعلق اپنی معلومات کو ضبط کر کے پیش کیا جائے۔ اس لئے میں کچھ وقت نکالکر اپنے ناتمام معلومات کا ایک حصّہ آپ کی زندگی کے ایک مختصر گوشہ پر اپنی یادداشت کے مطابق پیش کرتا ہوں۔

فتنۂ مرزائیت کی شدت اور اس کے بعض اسباب

تقریباً ۱۳۴۰ھ کا واقعہ ہے کہ فتنۂ قادیانیت پورے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں اور خصوصاً پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اُٹھا۔ اس کا سبب خواہ یہ ہو کہ ۱۹۱۹ء کی جنگِ عظیم میں قادیانی مسیح کی اُمّت نے مُسلمانوں کے مُقابلہ میں عیسائیوں (انگریزوں) کو کافی مدد بہم پہنچائی، جس کا اعتراف خود قادیانیوں نے اپنے اخبارات میں کیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب بغداد سات سو سال کے بعد مُسلمانوں کے قبضہ سے نِکل کر انگریزوں کے تسلّط میں داخل ہُوا تو جہاں محمّدِ مصطفےٰؐ کی پوری اُمّت اس کے رنج و غم میں مُبتلا تھی وُہیں قادیانی مرزا کی اُمّت قادیان میں چراغاں کر رہی تھی۔

(الفضل قادیان)

اس جنگِ عظیم میں اِمداد دینے اور مسلمانوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو کامیاب بنانے کے صلہ میں انگریزوں کی حمایت (بقولِ مرزا صاحب) اپنے اس خود کاشتہ

پودے کو زیادہ حاصل ہوگئی اور اس کا یہ حوصلہ ہوگیا کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے مقابلہ میں آجائے اور ممکن ہے کہ کچھ اور بھی اسباب ہوں۔

یہ زمانہ دارالعلوم دیوبند میں میرے درس و تدریس کا ابتدائی دور تھا اور میں اس بسم اللہ کے گنبد میں اپنی کتاب اور سبق پڑھانے کے سوا کچھ نہ جانتا تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے فروغ اور اسلام کی خدمت ہی کے لئے پیدا فرمایا تھا، قادیانیت کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے سخت تشویش و اضطراب محسوس فرما رہے تھے اور تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ اس کے مقابلے کی فکر کر رہے تھے۔ بالخصوص حضرت شاہ صاحب قدس سرہ پر اس فتنہ کا بہت اثر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے ان کو چن لیا ہے جیسا ہر زمانہ میں عادت اللہ یہ رہی ہے کہ ہر فتنہ کے مقابلہ کے لئے اس وقت کے علماء دین سے کسی کو منتخب کر لیا گیا اور اس کے قلب میں اس کی اہمیت ڈال دی گئی۔ فتنۂ قادیانیت کے استیصال میں حضرت ممدوح کی شبانہ روز جدوجہد اور فکر و عمل سے ہر دیکھنے والے کو یقین ہو جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کے لئے آپ کو چن لیا ہے۔

مصر و عراق وغیرہ ممالک اسلامیہ میں فتنۂ قادیانیت کا انسداد

میں حسب عادت ایک روز استاذ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی دائمی عادت کے خلاف دیکھا کہ ان کے سامنے کوئی کتاب زیر مطالعہ نہیں، خالی بیٹھے ہوئے ہیں اور چہرے پر فکر کے آثار نمایاں ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ کیسا مزاج ہے؟ فرمایا کہ بھائی مزاج کو کیا پوچھتے ہو، قادیانیت کا ارتداد اور کفر کا سیلاب امنڈتا چلا آتا ہے۔ صرف ہندوستان میں نہیں عراق و بغداد میں ان کا فتنہ سخت ہوتا جاتا ہے اور ہمارے علماء و عوام کو اس طرف توجہ نہیں۔ ہم نے اس کے مقابلہ کے لئے

جمعیۃ علماء ہند میں یہ تجویز پاس کرائی تھی کہ دس رسالے مختلف موضوعات متعلقہ قادیانیت پر عربی زبان میں لکھے جائیں اور ان کو طبع کرا کر البلادِ اسلامیہ میں بھیجا جائے۔ مگر اب کوئی کام کرنے والا نہیں ملتا۔ اس کام کی اہمیت لوگوں کے خیال میں نہیں، میں نے عرض کیا کہ اپنی استعداد پر تو بھروسہ نہیں لیکن حکم ہو تو کچھ لکھ کر پیش کروں، ملاحظہ کے بعد کچھ مفید معلوم ہو تو شایع کیا جائے ورنہ بے کار ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ ارشاد ہوا کہ "مسئلۂ ختمِ نبوت" پر لکھو۔ احقر نے اُستاذِ محترم کی تعمیلِ ارشاد کو سرمایۂ سعادت سمجھ کر چند روز میں تقریباً ایک سَو صفحات کا ایک رسالہ عربی زبان میں لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت ممدوح رسالہ دیکھتے جاتے تھے اور بار بار دُعائیہ کلمات زبان پر تھے مجھے کوئی تصوّر نہ تھا کہ اس ناچیز خدمت کی اتنی قدر افزائی کی جائے گی۔ پھر خود ہی حضرت ممدوح نے اس رسالہ کا نام "ھدایۃ المھدیین فی آیۃ خاتم النبیین" تجویز فرما کر اس کے آخر میں ایک صفحہ بطور تقریظ تحریر فرمایا اور اپنے اہتمام سے اس کو طبع کرایا۔ مصر، شام، عراق، مختلف مقامات پر اس کے نسخے روانہ کئے۔

خاص قادیان میں پہنچکر اعلانِ حق اور ردِّ مرزائیت

اسی زمانہ میں حضرت ممدوح کے ایماء پر امرتسر، پٹیالہ اور لدھیانہ کے چند علماء نے یہ تجویز کیا کہ اس فتنہ کے استیصال کیلئے خاص قادیان میں ایک تبلیغی جلسہ سالانہ منعقد کیا جائے تاکہ قضیۂ زمین برسرِ زمین طے ہو سکے۔ یہ عوام کو فریب میں ڈالنے والے مناظرے اور مباہلے کے چیلنج جو اکثر اس فرقہ کی طرف سے چھپتے رہتے ہیں ان کی حقیقت لوگوں پر واضح ہو جائے۔ چنانچہ چند سال مسلسل یہ جلسے قادیان میں ہوتے تھے، اور حضرتِ ممدوح اکثر بذاتِ خود ایک جماعت علماءِ دیوبند کے ساتھ اس میں شرکت فرماتے تھے، احقر ناکارہ بھی اکثر ان میں حاضر رہا ہے۔

قادیانی گروہ نے اپنے آقاؤں (انگریزوں) کے ذریعہ ہر طرح اسکی کوشش

کی کہ یہ جلسے قادیان میں نہ ہو سکیں لیکن کوئی قانونی وجہ نہ تھی جس سے جلسے روک دیئے جاویں کیونکہ ان جلسوں میں عالمانہ بیانات تہذیب و متانت کیساتھ ہوتے اور کسی نقضِ امن کے خطرہ کو موقع نہ دیتے تھے۔ جب قادیانی گروہ اس میں کامیاب نہ ہوا تو خود تشدد پر اُتر آیا۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ اور اُن کے رُفقاء کو قادیان جانے سے پہلے اکثر ایسے گمنام خطوط ملا کرتے تھے کہ اگر قادیان میں قدم رکھا تو زندہ واپس نہ جا سکو گے اور یہ صرف دھمکی ہی نہ تھی بلکہ عملاً بھی اکثر اس قسم کی حرکتیں ہوتی تھیں کہ باہر سے جلنے والے عُلماء و مُسلمانوں پر حملے کئے جاتے تھے، ایک مرتبہ آگ بھی لگائی گئی۔

لیکن حق کا چراغ کبھی پھونکوں سے بُجھایا نہیں گیا، اس وقت بھی ان کے اخلاق سوز حملے مُسلمانوں کو ان جلسوں سے نہ روک سکے۔

تردیدِ مرزائیت میں تصانیف کا سلسلہ

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ہم چند خُدام جلسۂ قادیان میں حضرتِ ممدوحؒ کے ساتھ حاضر تھے۔ صُبح کی نماز کے بعد حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے مخصوص تلامذۂ حاضرین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ زمانہ کو اِلحاد کے فتنوں نے گھیر لیا اور قادیانی دجّال کا فتنہ اِن سب میں زیادہ شدت اختیار کرتا جاتا ہے۔ اب ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی عمر و توانائی کا بڑا حصّہ اور درس حدیث کا اہم موضوع حنفیت و شافعیت کو بنائے رکھا۔ مُلحدینِ زمانہ کے وَساوس کی طرف توجّہ نہ دی۔ حالانکہ ان کا فتنہ مسئلۂ حنفیت و شافعیت سے کہیں زیادہ اہم تھا۔ اب قادیانی فتنہ کی شدت نے ہمیں اس طرف مُتوجّہ کیا تو میں نے اس کے متعلقہ مسائل کا کچھ مواد جمع کیا ہے۔ اگر اس کو میں خود تصنیف کی صورت سے مُدوّن کروں تو میرا طرز ایک خاص علمی اصطلاحی رنگ کا ہے اور زمانہ قحط الرّجال کا ہے۔ اس قسم کی تحریر کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا فایدہ بھی بہت محدود رہ جاتا ہے۔ میں نے مسئلہ قرأۃ فاتحہ خلف الامام پر ایک جامع رسالہ فصلُ الخِطاب"

بزبانِ عربی تحریر کیا۔ اہلِ علم اور طلباء میں عموماً مفت تقسیم کیا، لیکن اکثر لوگوں کو یہی شکایت کرتے سُنا کہ پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے اگر آپ لوگ کچھ ہمت کریں تو یہ مواد میں آپ کو دیدوں"۔ اس وقت حاضرین میں چار آدمی تھے۔ احقر ناکارہ، حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق ناظم شعبۂ تعلیم و تبلیغ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدرِ عالم صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند (حال مہاجر مدینہ طیبہ) اور حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سابق مدرس دارالعلوم دیوبند و شیخ الجامعہ بہاولپور (حال شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور) ادام اللہ تعالیٰ فیوضہم۔ ہم چاروں نے عرض کیا کہ جو حکم ہو ہم امتثالِ امر کو سعادتِ کبریٰ سمجھتے ہیں۔ اسی وقت فرمایا کہ "اس فتنہ کے استیصال کے لئے علمی طور پر تین کام کرنے ہیں۔ اوّل مسئلۂ ختمِ نبوت پر ایک محققانہ مکمل تصنیف جس میں مرزائیوں کے شبہات و اوہام کا ازالہ بھی ہو۔

دوسرے حیاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مسئلہ کی مکمل تحقیق قرآن و حدیث اور آثارِ سلف سے مع ازالۂ شبہاتِ ملحدین۔

تیسرے خود مرزا کی زندگی، اس کے گرے ہوئے اخلاق اور متعارض و متہافت اقوال اور انبیاء و اولیاء و علماء کی شان میں اس کی گستاخیاں اور گندی گالیاں، اس کا دعوائے نبوت و وحی اور متضاد قسم کے دعوے۔ ان سب چیزوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ اس کی کتابوں سے مع حوالہ جمع کرنا جس سے مسلمانوں کو اس فرقہ کی حقیقت معلوم ہو اور اصل یہی ہے کہ اس فتنہ کی مدافعت کے لئے یہی چیز اہم اور کافی ہے۔ مگر چونکہ مرزائیوں نے مسلمانوں کو فریب میں ڈالنے کے لئے خواہ مخواہ کچھ علمی مسائل میں عوام کو اُلجھا دیا ہے اس لئے ان سے بھی اغماض نہیں کیا جا سکتا۔" پھر فرمایا کہ مسئلۂ ختمِ نبوت کے متعلق تو یہ صاحب (احقر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) ایک جامع رسالہ عربی زبان میں لکھ چکے ہیں، اسے اُردو میں لکھ رہے ہیں اور آخر الذکر معاملہ کے متعلق مواد فراہم کر کے مدوّن

کرنے کا سب سے بہتر کام حضرت مولینا سید مرتضےٰ حسن صاحب کر سکیں گے کہ اس معاملہ میں ان کی معلومات بھی کافی ہیں اور مرزائی کتابوں کا پورا ذخیرہ بھی ان کے پاس ہے وہ اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جلد سے جلد پورا کریں۔

اب مسئلہ رفع و حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام رہ جاتا ہے اس کے متعلق میرے پاس کافی مواد جمع ہے۔ آپ تینوں صاحب دیوبند پہنچکر مجھ سے لے لیں اور اپنے اپنے طرز پر لکھیں۔

یہ مجلس ختم ہوگئی مگر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے قلبی تأثرات اپنا ایک گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑ گئے۔ دیوبند واپس آتے ہی ہم تینوں حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسئلۂ حیاتِ عیسیٰؑ سے متعلقہ مواد حاصل کیا۔

حضرت مولینا بدر عالم صاحب دامت برکاتہم نے آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ کی تفسیر سے متعلقہ مواد لے کر اس پر ایک مستقل رسالہ اردو میں "الجوابُ الفصیح لِمُنکرِ حیاتِ المسیح" تحریر فرمایا جو علمی رنگ میں لاجواب سمجھا گیا اور حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے پسند فرما کر اس پر تقریظ تحریر فرمائی۔ یہ رسالہ ۱۳۴۲ھ میں شعبۂ تبلیغ دار العلوم دیوبند سے شائع ہوا۔

حضرت مولینا محمد ادریس صاحب دامت فیوضہم نے اپنے مخصوص انداز میں اسی مسئلہ پر اردو زبان میں ایک جامع اور محققانہ رسالہ بنام "کلمۃُ اللّٰہ فی حیوٰۃ روح اللّٰہ" تصنیف فرما کر حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرتِ ممدوح نے بے حد پسند فرما کر تقریظ تحریر فرمائی اور ۱۳۴۲ھ میں دار العلوم دیوبند سے شائع ہو کر مقبول و مفید خلائق ہوا۔

احقرِ ناکارہ کے لئے یہ کام رکھا گیا کہ جتنی مستند و معتبر روایاتِ حدیث حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات یا نزول فی آخر الزمان کے متعلق وارد ہوئی ہیں ان سب کو ایک رسالہ میں جمع کر دے۔ احقر نے تعمیلِ حکم کے لئے رسالہ اَلتَّصْرِیْحُ بِمَا تَوَاتَرَ

فی نزول المسیحؑ بزبانِ عربی لکھا اور حضرتِ ممدوح کی بے حد پسندیدگی کے بعد اسی سال شائع ہُوا

اس کے بعد حسب ارشادِ ممدوح مسئلہ ختمِ نبوّت پر ایک مُستقل کتاب اردو زبان میں تین حصّوں میں لکھی :-

پہلا حصّہ ختم النبوّۃ فی القرآن" جس میں ایک سَو آیاتِ قرآنی سے اس مسئلہ کا مکمل ثبوت اور ملحدوں کے شبہات کا جواب لکھا گیا ہے۔

دوسرا ختم النبوّۃ فی الحدیث۔ جس میں دو سَو دس احادیثِ معتبرہ سے اس مضمون کا ثبوت اور مُنکرین کا جواب پیش کیا گیا ہے۔

تیسرا ختم النبوّۃ فی الآثار" جس میں سینکڑوں اقوال صحابہ و تابعین اور ائمہ دین اس کے ثبوت اور مُنکرین اور ان کی تاویلاتِ باطلہ پر رد کے متعلق نہایت صاف و صریح نقل کئے گئے ہیں۔ یہ تینوں رسالے پہلی مرتبہ ۱۳۴۲ھ سے ۱۳۴۵ھ تک شائع ہوئے۔ اسی کے ساتھ مختصر رسالہ دعاوی مرزا اور مسیح موعود کی پہچان اُردو زبان میں احقر نے لکھ کر پیش کئے۔ ان رسائل کا جو کچھ نفع مسلمانوں کی اِصلاح و ہدایت اور مُلحدین و منکرین پر اِتمامِ حُجّت کے سلسلہ میں ہوا یا ہوگا اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے مجھے تو اپنی محنت کا نقد صِلہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی مسرّت و خوشنودی اور بے شمار دعاؤں سے اسی وقت مِل گیا اور جوں جوں ان رسائل کی اشاعت سے مُسلمانوں کی ہدایت بلکہ بہت سے قادیانی خاندانوں کی توبہ و رجوع الی الاسلام کے مُتعلق حضرت کو معلوم ہوئے اسی طرح اظہارِ مسرّت اور دُعاء کے انعامات مِلتے رہے۔

مخدومنا حضرت مولینا سیّد مُرتضےٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو عمر اور طبقہ کے اعتبار سے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے مُقدّم تھے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مُحیّر العقول علم کے بے حد مُعتقد اور آپ کے ساتھ معاملہ بزرگوں کا سا کرتے تھے جو خدمت اس سلسلہ کی ان کے سپرد فرمائی تھی اس کو آپ نے

بڑی سعی بلیغ کے ساتھ انجام دینا شروع کیا اور مرزا قادیانی کی پوری زندگی، اس کے اخلاق و اعمال اور عقاید و خیالات، دعوائ نبوت و رسالت اور تکفیر عام اہل اسلام، گستاخی در شانِ انبیاء و اولیاء کو مرزا کی اپنی کتابوں سے بحوالۂ صفحہ سطر نہایت انصاف اور احتیاط کے ساتھ نقل کر کے بہت سے رسائل تصنیف فرمائے اور حضرتِ شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کے سامنے پیش فرما کر ان کی مُراد پوری فرمائی۔ ان رسائل میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں۔

"قادیان میں قیامت خیز بھونچال"۔ "اشدّ العذاب علیٰ مسیلمۃ الفنجاب"۔ "فتحِ قادیان"۔ "مرزائیوں کی تمام جماعتوں کو چیلنج"۔ "مرزائیت کا خاتمہ"۔ "مرزائیت کا جنازہ بے گور و کفن"۔ "ہندوستان کے تمام مرزائیوں کو چیلنج"۔ "مرزا اور مرزائیوں کو دربار نبوت سے چیلنج"۔ یہ سب رسائل ۱۳۴۳ھ سے ۱۳۴۴ھ تک شایع ہوئے۔

فیروزپور پنجاب میں تاریخی مناظرہ

اسی زمانہ میں چھاؤنی فیروزپور پنجاب میں قادیانیوں کا ایک خاصا جتھا جمع ہو گیا تھا۔ یہ لوگ وہاں کے مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے اور اپنے دستور کے موافق عوام مسلمانوں کو مناظرہ و مباحثہ کا چیلنج کیا کرتے تھے اور جب کسی عالم سے مقابلہ کی نوبت آتی تو راہِ گریز اختیار کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ضلع سہارنپور کے رہنے والے کچھ مسلمان جو فیروزپور میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے ان لوگوں نے روز روز کی جھک جھک کو ختم کرنے کے لئے خود قادیانیوں کو دعوتِ مناظرہ دے دی۔

قادیانیوں نے سادہ لوح عوام سے معاملہ دیکھ کر بڑی دلیری اور چالاکی کے ساتھ دعوت مناظرہ قبول کر کے بجائے اس کے کہ مناظرہ کرنے والے علماء سے شرائطِ مناظرہ طے کرتے انہیں عوام سے ایسی شرائطِ مناظرہ پر دستخط لئے جن کی رو سے فتح بہرحال قادیانی

گروہ کی ہو، اور اہل اسلام کو مقررہ شرائط کی پابندی کی وجہ سے ہر قدم پر مشکلات درپیش ہوں۔ ان عوام مسلمین نے مناظرہ اور شرائط مناظرہ طے کر لینے کے بعد دارالعلوم دیوبند سے چند علماء کو دعوت دی جو قادیانیوں سے مناظرہ کریں۔

مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ کے مشورہ سے اس کام کے لئے حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحبؒ، حضرت مولانا بدر عالم صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب اور احقر تجویز ہوئے ادھر قادیانیوں نے یہ دیکھ کر کہ ہم نے اپنی من مانی شرائط میں مسلم مناظرین کو جکڑ لیا ہے اپنی قوت محسوس کی اور قادیان کی پوری طاقت فیروزپور میں لا ڈالی۔ ان کے سب سے بڑے عالم اس وقت سرور شاہ کشمیری اور سب سے بڑے مناظر حافظ روشن علی اور عبدالرحمٰن مصری وغیرہ تھے۔ یہ سب اس مناظرہ کے لئے فیروزپور پہونچ گئے۔

ہم چاروں افراد حسب الحکم دیوبند سے فیروزپور پہونچے تو یہاں پہونچکر چھپا ہوا پروگرام مناظرہ اور شرائط مناظرہ کا نظر سے گذرا۔ شرائط مناظرہ پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ان میں ہر حیثیت سے قادیانی گروہ کے لئے آسانیاں اور اہل اسلام کے لئے ہر طرح کی بے حد پابندیاں ہیں جو کہ عوام نے اپنی ناواقفیت کی بناء پر تسلیم کی ہیں۔

اب ہمارے لئے دو ہی راستے تھے کہ یا ان مسلمہ فریقین شرائط مناظرہ کے ماتحت مناظرہ کریں جو ہر حیثیت سے ہمارے لئے مضر تھیں یا پھر مناظرہ سے انکار کر دیں کہ ہم ان شرائط کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے جو بغیر ہماری شرکت کے طے کر لی گئی ہیں۔ لیکن دوسری شق پر مقامی مسلمانوں کی بڑی خفت اور سبکی تھی اور قادیانیوں کو اس پروپیگنڈے کا موقع ملتا کہ علماء نے مناظرہ سے فرار کیا، اس لئے ہم سب نے مشورہ کر کے مناظرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور بذریعہ تار صورت حال کی اطلاع حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو دے دی۔

اگلے روز مقررہ وقت پر مناظرہ شروع ہوگیا۔ ابھی شروع ہی تھا میں مجلسِ مناظرہ میں نظر پڑی کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولینا شبیر احمد صاحبؒ مع چند دیگر علماء کے تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی آمد پر ہم نے کچھ دیر کے لئے مجلسِ مناظرہ ملتوی کی اور ان حضرات کو صورتِ حال بتلائی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جایئے ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم نے جتنی شرطیں اپنی پسند کے موافق عوام سے طے کرالی ہیں اتنی ہی اور لگا لو ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں تم چوروں کی طرح عام ناواقف مسلمانوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے عادی ہو۔ کسی شرط اور کسی طریق پر ایک مرتبہ سامنے آکر اپنے دلائل بیان کرو اور ہمارا جواب سنو، پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔

حضرتؒ کے ارشاد کے موافق اسی کا اعلان کر دیا گیا اور مناظرہ جاری ہوا۔
ان اکابر کو مناظرہ کے لئے پیش کرنا ہماری غیرت کے خلاف تھا۔ اس لئے پہلے دن مناظرہ مسئلۂ ختمِ نبوت پر احقر نے کیا۔ دوسرے تیسرے دن حضرت مولینا بدر عالم اور مولینا محمد ادریس صاحب نے دوسرے مسائل پر مناظرہ کیا۔

یوں تو مناظرہ کے بعد ہر فریق اپنی اپنی کہا ہی کرتا ہے لیکن اس مناظرہ میں چونکہ عموماً تعلیم یافتہ طبقہ شریک تھا اس لئے کسی فریق کو دھاندلی کا موقع نہ تھا۔ پھر اس مناظرہ کا کیا اثر ہوا۔ اس کا جواب فیروزپور کے ہر گلی کوچہ سے دریافت کیا جا سکتا تھا کہ قادیانی گروہ کو کس قدر رسوا ہو کر وہاں سے بھاگنا پڑا۔ خود اس گروہ کے تعلیم یافتہ و سنجیدہ طبقہ نے اس کا اقرار کیا کہ قادیانی گروہ اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کرسکا اور اس کے خلاف دوسرے فریق نے جو بات کہی قوی دلیل کے ساتھ کہی۔

مناظرہ کے بعد شہر میں ایک جلسۂ عام ہوا جس میں حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولینا شبیر احمد عثمانیؒ کی تقریریں قادیانی مسئلہ کے متعلق ہوئیں۔ یہ تقریریں فیروزپور کی تاریخ میں ایک یادگارِ خاص کی نوعیت رکھتی ہیں۔ بہت سے وہ لوگ

جو قادیانی دجل کے شکار ہو چکے تھے اس مناظرہ اور تقریروں کے بعد اسلام پر لوٹ آئے۔

حضرت شاہ صاحب کا دورۂ پنجاب

۱۳۴۳ھ میں جبکہ حضرت شاہ صاحب قدس اللہ سرہٗ کی کوشش سے بذریعۂ تصنیف و تحریر قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا گیا، اور قادیانیت سے متعلق ہر مسئلہ پر مختلف طرز و انداز کے بیسوں رسائل شائع ہو چکے تو آپ نے اس کی بھی ضرورت محسوس فرمائی کہ ناخواندہ عوام کا طبقہ جو زیادہ کتابیں نہیں پڑھتا اور قادیانی مبلغین پھر کر ان میں اپنا دجل پھیلاتے ہیں اور مناظرہ ومباہلہ کے جھوٹے چیلنج ان کو دکھاتے پھرتے ہیں، ان لوگوں کی حفاظت کے لئے پنجاب کے مختلف شہروں کا ایک تبلیغی دورہ کیا جائے۔

پنجاب و سرحد کے دورہ کا پروگرام بنا۔ علماءِ دیوبند کی ایک جماعت ہمرکاب ہوئی۔ اس جماعت میں حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ اکابرین میں سے حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح اور حضرت مولانا سید مرتضےٰ حسن صاحبؒ شریک تھے۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بدر عالم صاحب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی اور احقر ناکارہ شامل تھے۔ یہ علم کے پہاڑ اور تقویٰ کے پیکر پنجاب کے ہر بڑے شہر میں پہنچے، اور مرزائیت کے متعلق اعلانِ حق کیا۔ منکرین کو رفع شبہات کی دعوت دی۔ لدھیانہ، امرتسر لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، راولپنڈی، ایبٹ آباد، مانسہرہ ہزارہ، کھوٹہ وغیرہ میں ان حضرات کی بصیرت افروز اور عالمانہ تقریریں ہوئیں۔ مرزائی دجال جو آئے دن مناظرہ و مباہلہ کے چیلنج عوام کو دکھانے کے لئے پھرا کرتے تھے ان میں سے ایک سامنے نہ آیا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جہاں میں نہیں ہیں۔

اس پورے سفر میں عام مسلمانوں نے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ کا منظر گویا آنکھوں سے دیکھ لیا۔

بہاولپور کا معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ

حضرت شاہ صاحب اور دیگر اکابر علماء کے بیانات اور

مرزائیوں کے مرتد ہونے کا فیصلہ۔

۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی ایک مسلمان عورت کا دعویٰ اپنے شوہر کے مرزائی ہوجانے کی وجہ سے نکاح فسخ ہونے کے متعلق بہاولپور کی عدالت میں دائر ہوا۔ اور سات سال تک یہ مقدمہ بہاولپور کی ادنیٰ و اعلیٰ عدالتوں میں دائر رہتے ہوئے آخر میں دربارِ معلی بہاولپور میں پہنچا۔ ۱۹۳۳ء میں دربارِ معلی نے پھر عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ ہمارے خیال میں اس مسئلہ کی پوری تحقیق و تنقیح کرنا ضروری ہے دونوں فریق کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے علماء کی شہادتیں پیش کریں اور دونوں طرف کے مکمل بیانات سننے کے بعد اس مسئلہ کا کوئی آخری فیصلہ کیا جائے۔

اب مدعیٰ علیہ مرزائی نے اپنی حمایت کے لئے قادیان کی طرف رجوع کیا۔ قادیان کا بیت المال اور اس کے رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہوگئے۔ ادھر مدعیہ بیچاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گذار رہی تھی۔ اس کی قدرت سے قطعاً خارج تھا کہ ملک کے مشاہیر علماء کو جمع کر کے اپنی شہادت میں پیش کرسکے یا اس مقدمہ کی پیروی کرسکے۔ مگر الحمد للہ بہاولپور کے غیور مسلمانوں کی انجمن مؤیدُ الاسلام نے زیر سرپرستی حضرت مولینا محمد حسین صاحب شیخ الجامعہ بہاولپور اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا اور ملک کے مشاہیر علماء کو خطوط لکھ کر اس مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب رح اس وقت جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے اور کچھ عرصہ علالت کے سبب رخصت پر دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ طولِ علالت سے نقاہت بے حد ہوچکی تھی۔

لیکن جس وقت یہ معاملہ آپ کے سامنے آیا تو مسئلہ کی نزاکت اور ہیئت کے

قومی احساس نے آپ کو اس کے لئے مجبور کر دیا کہ اپنی صحت اور دوسری ضرورتوں کا خیال کئے بغیر وہ بہاولپور کا سفر کریں۔

آپ نے نہ صرف اپنے آپ کو شہادت کے لئے پیش فرمایا بلکہ ملک کے دوسرے علماء کو بھی ترغیب دیکر شہادت کے لئے جمع فرمایا۔

یہ واقعہ تقریباً ۱۳۵۱ھ کا ہے جب احقر ناکارہ بحیثیت مفتی دار العلوم دیوبند فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دے رہا تھا۔

انجمنِ مؤیدُ الاسلام بہاولپور کی دعوت کے علاوہ اُستادِ محترم حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کا ایماء بھی میری حاضری کے مُتعلق معلوم ہوا۔ احقر نے حاضری کا قصد کر لیا لیکن حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خداداد شغف دینی ضرورتوں کے ساتھ تھا اور آپ کو بے چین کئے رکھتا تھا اس کی وجہ سے آپ نے تاریخ مقدمہ سے کافی روز پہلے بہاولپور پہنچکر اس کام کو پوری توجہ کے ساتھ انجام دینے کا فیصلہ فرماکر سب بیانات کے اختتام تک تقریباً بیس بچیس روز بہاولپور میں قیام فرمایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا پُر شوکت عالمانہ بیان جو کمرۂ عدالت میں ہوا اس کی اصلی کیفیت تو صرف ان ہی لوگوں کے دل سے پوچھئے جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اسکو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس وقت کمرۂ عدالت دار العلوم دیوبند کا دار الحدیث نظر آتا تھا۔ عدالت اور حاضرین پر ایک سکتہ کا عالم تھا۔ علومِ ربّانی کے حقائق و معارف کا دریا تھا جو اُمڈا چلا جاتا تھا۔

پانچؔ روز مُسلسل بیان ہُوا۔ تقریباً ساٹھ صفحات پر قلم بند ہوا۔ یہ بیان اور دوسرے حضرات کے بیانات جو ایک مُستقل جِلد میں طبع ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف ردِّ مرزائیت کے لئے بلکہ اسلام و ایمان اور کفر و اِرتداد کی پوری حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نادر مجموعہ ہیں۔

اس مقدمہ میں کیا ہُوا؟ اس کی پوری تفصیل تو اس مُفصّل فیصلہ سے معلوم ہو سکتی ہے جو عدالت کی طرف سے ۷ فروری ۱۹۳۵ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۳۵۳ھ کو

دیا گیا۔ اور جو اسی وقت بزبانِ اُردو ایک سو باون (۱۵۲) صفحات پر شایع ہو چکا تھا۔ اس کی اشاعت کا اہتمام حضرت مولینا محمد صادق صاحب اُستاذ جامعہ عباسیہ بہاولپور حال ناظم امورِ مذہبیہ بہاولپور کے دستِ مبارک سے ہوا۔ اس مُقدمہ کی پیروی، عُلماء کے اجتماع، ان کی ضروریات کا انتظام بھی مولینا موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پایا تھا اور مولینا سے میرا پہلا تعلق اسی سلسلہ میں پیدا ہوا۔ آپ نے اس فیصلہ کے شروع میں ایک مختصر تمہید لکھی ہے۔ اس کے چند جُملے نقل کر دینے سے کسی قدر حقیقت پر روشنی پڑ سکتی ہے وہ یہ ہیں:۔

"مُدعیہ کی طرف سے شہادت کے لئے حضرت شیخ الاسلام مولینا محمد انور شاہ صاحبؒ، حضرت مولینا سید مُرتضےٰ حسن صاحب چاندپوری، حضرت مولینا محمد نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور اور مولینا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند پیش ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ کی تشریف آوری نے تمام ہندوستان کی توجہ کے لئے جذبِ مقناطیسی کا کام کیا۔ اسلامی ہند میں اس مقدمہ کو غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی۔ حضراتِ علمائے کرام نے اپنی اپنی شہادتوں میں علم و عرفان کے دریا بہا دیئے اور فرقۂ ضالّہ مرزائیہ کا کُفر و ارتداد روزِ روشن کی طرح ظاہر کر دیا اور فریقِ مخالف کی جرح کے نہایت مُسکت جواب دیئے، خصوصاً حضرت شاہ صاحبؒ نے ایمان، کُفر، زندقہ، ارتداد، ختمِ نبوت، اجماع، تواتُر، مُتواترات کے اقسام، وحی، کشف اور الہام کی تعریفات اور ایسے اصول و قواعد بیان فرمائے جن کے مُطالعہ سے ہر ایک انسان علیٰ وجہِ البصیرت بُطلانِ مرزائیت کا یقینِ کامل حاصل کر سکتا ہے۔ پھر فریقِ ثانی کی شہادت شروع ہوئی، مقدمہ کی پیروکاری اور شہادت پر جرح کرنے اور قادیانی دجل و تزویر کو آشکارا کرنے کے لئے شہرۂ آفاق مناظر، حضرت مولینا ابوالوفاء صاحب نعمانی شاہجہانپوری تشریف لائے۔ مولینا موصوف مختارِ مُدعیہ ہو کر تقریباً ڈیڑھ سال مقدمہ کی پیروکاری فرماتے رہے۔ فریق ثانی کی شہادت پر ایسی باطل شکن جرح فرمائی جس نے مرزائیت کی بنیادوں کو کھوکھلا اور مرزائی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقۂ مرزائیہ ضالّہ کا ارتداد آشکارا عام کر دیا۔ فریقین کی شہادت ختم ہونے کے بعد مولینا موصوف نے

مقدمہ پر بحث پیش کی اور فریق ثانی کی تحریری بحث کا تحریری جواب الجواب نہایت مفصل اور جامع پیش کیا۔ کامل دو سال کی تحقیق و تنقیح کے بعد عالی جناب ڈسٹرکٹ جج صاحب بہادر نے اس تاریخی مقدمہ کا بصیرت افروز فیصلہ ۷ فروری ۱۹۳۵ء بحق مدعیہ سنایا۔ یہ فیصلہ اپنی جامعیت اور قوتِ استدلال کے لحاظ سے یقیناً بے نظیر و بے عدیل ہے۔ مسلمانانِ ہند کی بہرہ اندوزی کی خاطر اس فیصلہ کو ایک کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ مواد مقدمہ کی تیسری جلد ہے اس سے پہلے دو جلدیں اور ہونگی۔

جلدِ اوّل میں حضراتِ علمائے کرام کی مکمل شہادتیں اور جلدِ ثانی میں حضرت مولٰنا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری کی بحث اور جواب الجواب شائع کیا جائے گا۔ باقی رہا یہ سوال کہ یہ دونوں جلدیں کب شائع ہوں گی؟ اس کا جواب مسلمانانِ ہند کی ہمت افزائی پر موقوف ہے۔ یہ تیسری جلد جتنی جلد فروخت ہوگی اسی انداز سے پہلی دو جلدوں کی اشاعت میں آسانی ہوگی۔ حضرات علمائے کرام کے بیانات اور بحث اور جواب الجواب تردیدِ مرزائیت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ اگر خدا تعالےٰ کے فضل و کرم سے یہ تینوں جلدیں شائع ہوگئیں تو تردیدِ مرزائیت میں کسی دوسری تصنیف کی قطعاً حاجت نہ رہے گی۔"

اس مقدمہ میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے حکم کی بناء پر پہلا بیان احقر کا ہوا۔ تین روز بیان اور ایک دو روز جرح ہوکر تقریباً ساٹھ صفحات پر بیان مرتب ہوا۔ یہ پہلا بیان تھا۔ ابھی لوگوں نے اکابر کے بیان سنے نہ تھے۔ سب نے بے حد پسند کیا۔ مجھے یاد ہے کہ دورانِ بیان میں بھی اور مکان پر آنے کے بعد بھی حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ دل سے نکلی ہوئی دعاؤں کے ساتھ اپنی مسرت کا اظہار فرماتے تھے اور اس ناکارہ و آوارہ کے پاس دین و دنیا کا صرف یہی سرمایہ ہے کہ اللہ والوں کی رضا، رضائے حق کی علامت ہے۔

وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَسْئَالُ اَنْ یُلْحِقَنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ۔

فتنۂ مرزائیت پر حضرت شاہ صاحبؒ کی اپنی تصانیف

مرزائیت کے متعلق تمام ضروری مسائل پر کافی سے زائد رسائل و کتب حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے ارشاد و ایماء کی بناء پر لکھے جا چکے تھے لیکن ایک مسئلہ ہنوز تشنہ باقی تھا کہ مرزائیوں کے نماز، روزہ، تلاوتِ قرآن اور کلمۂ اسلام پڑھنے سے عام مسلمانوں اور خصوصًا تعلیم یافتہ طبقہ کو سخت اشتباہ تھا کہ اِن چیزوں کے ہوتے ہوئے ان کو اسلام سے خارج کیسے کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس مغالطہ میں بعض اہلِ علم کو بھی یہ اشکال تھا کہ اہلِ قبلہ اور کلمہ گو کی تکفیر جو شخص کسی تاویل کی بناء پر خلافِ شرع عقیدے کا قائل ہو اس کی تکفیر میں علمائے اہلِ حق نے بہت کلام کیا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر حضرت الاستاذ شاہ صاحب قدس سرہٗ نے خود قلم اُٹھایا اور ایک رسالہ بنام "اِکفارُ المُلحدین والمتاولین فی شیئٍ مِن ضروریاتِ الدین" تحریر فرمایا، جس میں اس مسئلہ کو قرآن و حدیث اور تصریحاتِ سلف کی روشنی میں آفتاب نصفُ النہار کی طرح واضح فرما دیا بلکہ کفر و ایمان کی مکمل حقیقت، اہلِ قبلہ اور کلمہ گو کی شرعی تعریف پر ایک نہایت جامع کتاب تصنیف فرما دی جس میں اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر کسی عقیدۂ کفریہ میں مطلقًا تاویل کو مانعِ کفر قرار دیا جائے تو دُنیا میں کوئی کافر کافر نہیں رہ سکتا، کیونکہ ہر کافر کچھ نہ کچھ تاویل اپنے عقیدۂ فاسدہ کی کرتا ہے، بلکہ فیصلہ یہ ہے کہ اسلام کے وہ احکام جو قطعیُ الثبوت اور قطعیُ الدلالت ہیں (جن کو اصطلاحِ فقہ و کلام میں "ضروریاتِ دین" کہا جاتا ہے) جیسے ان کا انکار صریح کفر و ارتداد ہے، اسی طرح تاویل کر کے جمہور اُمت کے خلاف ان کے نئے معنی بتانا بھی کفر و ارتداد ہے (یہ کتاب عربی زبان میں ہے)

ایک دوسری مستقل کتاب مسئلۂ حیات و نزولِ عیسٰی علیہ السلام کے متعلق بھی اپنے قلم سے بزبانِ عربی تصنیف فرمائی جس کا نام "عقیدۃُ الاسلام فی نزولِ عیسٰی علیہ السلام"

رکھا۔

یہ کتاب کہنے کو تو اسی ایک مسئلہ کی بہترین و جامع تحقیق ہے لیکن حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر و تحریر کو جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کتنے علوم و معارف کے ابواب آجاتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع کی عجیب و غریب تصنیف ہے۔

مقدمہ بہاولپور سے واپسی کے بعد مرض روز بروز شدت پکڑتا گیا لیکن اسی حالت میں جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل کے درس حدیث کو جاری رکھا۔ تا آنکہ قوٰی نے بالکل جواب دے دیا اور آپ دیوبند تشریف لاکر گویا صاحبِ فراش ہو گئے۔ اور یہی مرض، مرضُ الموت ثابت ہُوا۔

لیکن قُدرت نے جو دینی خدمت کا جذبۂ بے پایاں آپؒ کے قلبِ مُبارک میں ودیعت فرمایا تھا وہ بسترِ مرگ پر بھی چین سے نہ لیٹنے دیتا تھا۔ افاداتِ علمیہ اور کُتب بینی کا سِلسلہ اس حالت میں بھی اسی طرح جاری تھا۔

تا آنکہ یہ ارادہ ہوا کہ ایک مرتبہ پھر کشمیر کا سفر کیا جائے، وہاں اپنے اَعِزّہ و اَقارِب کی مُلاقات کے علاوہ پیشِ نظر یہ تھا کہ کشمیر میں قادیانی فِتنہ پھیلا ہُوا ہے اب تک وہاں پہونچکر اس کے اِنسداد کے مُتعلِق کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اس سفر کا قصد کرنے کے ساتھ یہ ضرورت محسُوس فرمائی کہ کشمیر کے عوام اُردو یا عربی کے رسائل تو پڑھ نہ سکیں گے فارسی زبان میں مسئلۂ ختمِ نبوت اور قادیانیت کے مُتعلق لِکھ کر طبع کر کے وہاں ساتھ لے جائیں اور مُفت تقسیم کریں۔ اس ارادہ کے ساتھ ہی خود ایک رسالہ کی تصنیف شروع فرمادی۔ ابھی یہ تصنیف تکمیل کو نہ پہونچی تھی کہ مَرض کے اِشتداد نے بالکل ہی قوٰی کو مُعطل کر دیا۔ تو ایک طالب علم کے ذریعہ اس ناکارۂ خلائق کے پاس پیغام بھیجا کہ میں نے کشمیر کی ضرورت سے فارسی زبان میں مسئلۂ ختمِ نبوت پر ایک رسالہ لِکھنا شروع کیا تھا مگر اب میں اس کی تعمیل سے معذور ہوں تُجھ سے ہو سکے تو اس کی تکمیل کر دے۔

احقر ناکارہ نے تعمیلِ ارشاد کو سعادتِ عظمیٰ سمجھ کر شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ حضرت استاذ کی حالت بدلنا شروع ہوئی اور یہ علم و تقویٰ کا آفتابِ عالمتاب غروب کے کنارے آلگا۔ یہاں تک کہ ۲ ماہ صفر ۱۳۵۲ھ شب دوشنبہ اس پیکرِ علم و تقویٰ مجسم دین و دیانت نے دین ہی کی فکر میں اپنی عمر کا آخری سانس پورا کر دیا۔ آپ کے گرد و پیش سے گویا بزبانِ حال یہ سنا جاتا تھا ؎

اگرچہ خرمنِ عمرم غمِ تو داد بباد
بخاکِ پائے عزیزت کہ عہد نشکستم

اب وہ کشمیر کا قصد اور وہاں رسالۂ فارسی کی اشاعت بھی ایک خواب و خیال ہوگیا۔ عرصے کے بعد آپ کے مسودات میں سے وہ منتشر اوراقِ فارسی جمع کرکے مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت نے بنامِ "خاتم النبیین" شایع کیا۔ اور یہی اوراق آپ کا خاتمۃُ التصانیف قرار پائے۔

فجزاہُ عنّا وعن جمیع المسلمین خیرَ الجزاء ووفقنا لاتباع سُنّتِہٖ فی خدمۃِ الدّینِ المتینِ وھو الموفّقُ والمُعینُ ؎

(منقول از حیات انور)

حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ

از حضرت مولینا محمد منظور صاحب نعمانی، دامت فیوضہم (مدیر "الفرقان" لکھنو

علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں مولینا نعمانی قبلہ مدظلہ العالی کا مرتبہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ آپ سال ہا سال تک ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہے ہیں۔ اس وقت سرزمین ہند میں ملت اسلام کی دینی اور علمی خدمات انجام دینے کے لئے "الفرقان" نامی رسالہ کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ نہایت بیدار مغز، صاحب علم و فضل اور ممتاز عالم دین مبین ہیں، جن کی بلند پایہ تصانیف صاحبان بصیرت کے لئے نہایت قابل قدر ہیں۔ ان کی کئی کتابوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی ہوا ہے جن میں "ISLAMIC FAITH AND PRACTICE" اور "WHAT ISLAM IS?" مغربی ممالک کے طالبان حق اور مفکرین میں بھی کافی مقبولیت پا چکی ہیں۔ خدمت حدیث میں "معارف الحدیث" ان کا محدثانہ کارنامہ ہے۔ (کوندو)

خداداد نورانیت ومحبوبیت

حضرت استاذ قدس اللہ سرہ کے کمالات میں یقیناً علم وعمل کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر اور مخلوق کی نگاہ میں بھی زیادہ قدر و قیمت علم و عمل ہی کی ہے۔ اس لحاظ سے مجھے پہلے حضرت ممدوح کے وہی واقعات و ارشادات اور اپنے وہی تاثرات ذکر کرنے چاہئیں جن کا تعلق علم و عمل جیسے اعلیٰ کمالات سے ہے لیکن یہ عاجز چونکہ سب سے پہلے حضرت کی ظاہری نورانیت و محبوبیت ہی سے واقف اور متاثر ہوا اس لئے سلسلۂ سخن اسی سے شروع کرتا ہوں۔

آج سے قریباً تیس ۳۰ سال پہلے کی بات ہے، میری طالب علمی کا زمانہ تھا اور اگلے سال دارالعلوم دیوبند جانے کا ارادہ تھا۔ مراد آباد میں جمعیۃ العلماء ہند کا اجلاس

ہُوا، یہ عاجز بھی گیا، حضرت شاہ صاحبؒ کا ذکر اپنے اساتذہ سے سُنا کرتا تھا لیکن ابھی تک آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہُوا تھا، غالباً صُبح کا وقت تھا دیکھا کہ چند حضرات ایک طرف سے تشریف لا رہے ہیں، اُن میں ایک بزرگ جو گہرے سبز رنگ کا عبا پہنے ہوئے تھے اور غالباً ہلکے زرد رنگ کا عمامہ زیب سر تھا۔ بڑے حسین وجمیل اور بڑے نورانی نظر پڑے، آپ سے آپ دل میں آیا کہ شاید یہی دیوبند کے "حضرت شاہ صاحبؒ" ہیں؛ کسی سے پوچھا، یہ جواب مِلا کہ ہاں شاہ صاحب یہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے صرف اس دید ہی سے دل میں ایک خاص مُحبّت وعقیدت ڈال دی۔

اجلاس کے سلسلہ میں تین دن میں مرادآباد رہا۔ اب تک یاد ہے کہ اس تاک میں رہا کرتا تھا اور گھوم پھر کے بھی اس کی کوشش کیا کرتا تھا کہ حضرتؒ کو کہیں دیکھوں غالباً دیکھنا تو بار بار نصیب ہُوا لیکن تقریر یا بات سُننا کیا معنے۔ اُن دنوں میں آواز سُننا بھی یاد نہیں۔

چند مہینے کے بعد دیوبند پہونچ گیا۔ اُس سال چونکہ میں نے دورۂ حدیث نہیں لیا تھا اس لئے حضرتؒ کے یہاں میرا کوئی سبق تو نہیں تھا لیکن پھر بھی روزانہ کئی کئی بار آنکھوں کو دید کا موقع مِلتا تھا۔ مگر خوب یاد ہے کہ جی بھرتا نہیں تھا اور ہر دفعہ دیکھنے میں لذت مِلتی تھی۔ اگلے سال میں نے دَورہ لیا اور حسبِ معمول بخاری شریف اور ترمذی شریف پوری پوری حضرتؒ کے یہاں ہوئیں اور ان سے دونوں سبقوں کے سلسلہ میں روزانہ قریباً ۲، ۳ گھنٹے خدمت میں حضوری کی سعادت نصیب ہوتی تھی لیکن اپنی اس سرگذشتی کے ذکر اور اُس کی یاد میں آج بھی لذت محسوس کرتا ہوں کہ حسبِ توفیق عِلمی استفادہ کے علاوہ یہ عاجز آنکھوں کے ذریعہ بھی لذت وسرور حاصل کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ میں اس حال میں مُنفرد نہ تھا بلکہ بہت سے شُرکاءِ درس غالباً میرے شریکِ حال تھے۔

سیرت وباطن کے کمال کے ساتھ ساتھ اگر اللہ اپنے کسی بندہ کو صورت وظاہر

کی نورانیت و زیبائی اور اُس میں جذب و کشش بھی نصیب فرمائے تو بلاشبہ یہ بڑا انعام ہے اور میرا خیال ہے کہ افادہ و استفادہ میں اس سے بڑی جان پڑ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر پیغمبر کو ظاہری صورت کی زیبائی بھی عطا فرمائی جاتی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:۔

مَا بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيًّا اِلَّا حَسَنَ الْوَجْهِ حَسَنَ الصَّوْتِ فَصَاحِبُكُمْ اَحْسَنُهُمْ وَجْهًا وَاَحْسَنُهُمْ صَوْتًا[1]

کمالِ علمی اور علوم میں جامعیت

یوں تو اللہ تعالیٰ نے حضرت اُستاذ رحمۃ اللہ علیہ کو گوناگوں ظاہری و باطنی کمالات سے نوازا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آپ کا علمی کمال دوسرے تمام کمالات پر غالب تھا، اتنا غالب کہ دوسرے سب کمالات گویا بالکل اس کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ آپ کے متعلق صرف یہی سمجھتے ہیں کہ آپ اپنے وقت کے ایک بہت بڑے علامہ تھے اور بعض حضرات جن کی واقفیت اور زیادہ ناقص ہے، وہ علوم میں بھی صرف علمِ حدیث میں آپ کے امتیاز اور علوِ مقام کے قائل ہیں اور آپ کو اس دور کے صرف ایک ممتاز محدّث کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ حضرت کے مقامِ علمی سے کچھ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرتِ ممدوح کا خاص امتیاز علوم کی جامعیت تھی اور وہ بھی ایسی جامعیت کہ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس علم میں حضرت کی مہارت اور مناسبت نسبتاً زیادہ تھی۔

---

[1] یہ حدیث شریف امام قاضی عیاض نے اپنی کتاب "الشفا" میں نقل کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنے پیغمبر بھی آئے وہ سب خوبرو اور خوش آواز تھے اور ہمارے آقا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو یہ دونوں چیزیں بھی دوسروں سے زیادہ عطا فرمائی گئی تھیں اور آپ اس پہلو میں بھی سب سے فائق تھے۔

وُسعتِ علم کے ساتھ دِقّتِ نظر

اس موقع پر بعض حضرات کی ایک اور غلط فہمی کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک نامور عالم جنہیں حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خصوصیات سے بلا واسطہ واقف ہونے کا غالباً کبھی موقع نہیں ملا۔ اُن کے متعلق میں نے سُنا کہ کسی موقع پر انہوں نے حضرت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ اُن کا مُطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بہت قوی تھا اسلئے آپ بذاتِ خود ایک وسیع کُتب خانہ تھے لیکن نظر میں گہرائی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وسیعُ النّظر اور کثیرُ المعلومات تو تھے لیکن دقیقُ النظر اور عمیق العلم نہیں تھے۔

یہ عاجز پورے وثوق اور بحمد اللہ پوری بصیرت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ جن اہلِ علم و نظر کو حضرت کی علمی خصوصیات سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے انہیں اس میں ذرا بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت کے یہاں دِقّتِ نظر کا پلّہ کسی طرح بھی وُسعتِ نظر کے مقابلہ میں ہلکا نہیں تھا۔ البتہ علم کی سطح ہمارے اس زمانہ کی عام سطح سے اتنی بلند تھی کہ نہ سمجھ سکنے والے بھی معذور سمجھے جانے کے قابل ہیں۔ ایک دفعہ خود فرمایا :-

"بعض اوقات بہت نیچے اُتر کر بات کرتا ہوں لیکن پھر بھی لوگ نہیں سمجھتے"۔

یہ ایک بڑا علمی سانحہ ہے کہ حضرتِ ممدوح نے اپنے علم کی نشانی کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہوئی کہ حضرت کو اہلِ زمانہ کیطرف سے مایوسی تھی۔ تاہم بعض خاص خاص مسائل اور موضوعات پر جو چند رسالے خود آپ کے لکھے ہوئے ہیں اُن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی سطحِ علم زمانہ کی عام سطح سے کس قدر بُلند ہے اور آپ کی نظر کتنی دقیق اور علم کِتنا عمیق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے اہلِ علم اپنے کو اُن رسالوں کے سمجھنے سے عاجز و قاصر پاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ تعبیر و ادا میں

کوئی اغلاق و تعقید ہے، بلکہ یہ صرف علمی سطح کے غیر معمولی تفاوت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ آج کل کے بہت سے اہلِ علم حضرت امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کی کتابوں سے اتنی آسانی سے استفادہ نہیں کر سکتے، جتنی آسانی سے متاخرین کی کتابوں سے وہ استفادہ کر لیتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ استدلال بہ نسبت متاخرین کے متقدمین سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔

قرآنِ مجید میں تدبر و تفکر

علم کی گہرائی اور دقتِ نظر کا کچھ اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نے اپنا یہ حال خود ایک دفعہ بیان فرمایا کہ:-

"میں رمضانِ مبارک میں قرآنِ مجید شروع کرتا ہوں اور تدبر و تفکر کے ساتھ اس کو پورا کرنا چاہتا ہوں لیکن کبھی پورا نہیں ہوتا جب دیکھتا ہوں کہ آج رمضان المبارک ختم ہونے والا ہے تو پھر اپنے خاص طرز کو چھوڑ کر جو کچھ باقی ہوتا ہے اس دن ختم کر کے دور پورا کر لیتا ہوں۔"

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ رمضانِ مبارک میں کبھی حضرت کے قریب رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا لیکن یہ معلوم ہے کہ آپ "اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ" والے اس مبارک مہینہ میں زیادہ وقت قرآنِ مجید ہی کی تلاوت اور تدبر و تفکر پر صرف فرماتے تھے۔ اس کے باوجود قرآنِ مجید ختم نہیں کر پاتے تھے۔

حدیث میں غور و تدبر

خود حضرتؒ نے ایک دن بیان فرمایا۔ "کہ میں نے غور و فکر کے ساتھ صحیح بخاری کے صرف متن کا تیرہ[۱۳] دفعہ بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ شروح یا حواشی کے ساتھ جو مطالعہ کیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔"

قرآنِ مجید میں تدبر و تفکر کی مثالیں تو بہت سی سُنی ہیں اور کتابوں

میں بھی پڑھی ہیں، لیکن حدیث میں تفکّر کی ایسی مثال نہ سُنی نہ کتابوں میں کہیں نظر سے گذری۔

اور جن لوگوں کو حضرتؒ کے درسِ حدیث سے کچھ مُستفید ہونے کا موقع مِلا ہے غالباً وہ سب اس کی شہادت دیں گے کہ آپ کے درس کا رنگ بھی یہی تھا کہ اس میں اسنادی و روایتی بحث و تنقید کے مقابلہ میں معنوی اور درایتی مباحث کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتے تھے اور اس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے صرف ایک صاحبِ روایت مُحدّث کی حیثیت سے حدیث کے متون و اسانید ہی سے واقفیت حاصل نہیں کی ہے اور اسی طرح یہ کہ آپ کے علم کا ماخذ و مبلغ صرف چند حواشی و شروح ہی نہیں ہیں بلکہ ایک صاحبِ فکر و درایت اور دقیق النظر فقیہہ کی طرح آپ نے احادیث کے معانی و مقاصد پر خود بھی بڑا گہرا غور کیا ہے اور چند خاص خاص مسئلوں پر حضرتؒ کے جو بعض رسائل ہیں وہ بھی حضرتؒ کی اس خصوصیّت و جامعیّت پر شاہد ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے جو شاید بہت سے اہلِ علم کے لئے "ایک نیا انکشاف" ہو۔ اچھا ہے اس بہانہ سے وہ بھی قرطاس کی امانت بن جائے۔

علّامہ نیمویؒ کی آثار السُّنن اور حضرت اُستاذؒ

حضرت مولانا ظہیر احسن شوق

نیمویؒ اور اُن کی معرکۃ الآراء نا تمام "آثار السُّنن" سے اور اس کی غیر معمولی اہمیت سے کم از کم حضرات اہلِ علم ضرور واقف ہونگے۔ ہمارے زمانۂ طالب علمی میں تو علمی اور درسی حلقوں میں اس کتاب کی دھوم مچی ہوئی تھی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محدّثانہ طرز پر حنفیت کی تائید میں یہ کتاب ہمارے اس زمانہ کا شاہکار ہے، افسوس یہ پوری نہیں ہوسکی اور اس کے پہلے دو حصّے

تالیف فرما کر علامہ ممدوح اس عالم سے رحلت فرما گئے۔

حضرت استاذ رحمۃ اللہ نے ایک دن درس میں اس کتاب کے متعلق یہ واقعہ بیان فرمایا کہ :-

"جس زمانہ میں مولانا ظہیر احسن صاحب نیموی رحمۃ اللہ علیہ "آثار السنن" تالیف فرما رہے تھے۔ انہوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ ملاحظہ فرما کر مشورے دے دیں اور جو اضافے فرمائے جا سکیں وہ اضافے فرما دیں۔ حضرت استاذؒ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزاء واپس فرما دئے اور ان کو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں، میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔

مولانا ظہیر احسن صاحب نے حضرت استاذؒ کے حوالہ سے مجھے خط لکھا اور اس طرح میری ان کی خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اور پھر انہوں نے اپنی کتاب بھیجنی شروع فرمائی، جتنی لکھ لیتے تھے وہ مجھے بھیج دیتے تھے اور میں اُن کے حکم کی تعمیل میں اضافے کرتا تھا۔ میں نے جو اضافے کئے وہ مقدار میں اُن کی اصل کتاب سے زیادہ تھے لیکن میرے یہ اضافے زیادہ تر معنوی بحثوں سے متعلق تھے۔ کیونکہ مولانا موصوف نے عِلَل و اسانید کی بحثوں کے اضافہ کی گنجائش کسی کے لئے بہت کم چھوڑی تھی مگر چونکہ میری وہ معنوی بحثیں مولانا کی ذوق کی چیز نہیں تھی اور وہ اپنی کتاب میں خالص محدثین کے طرز پر عِلَل و اسانید ہی سے بحث کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے میرے اس باب کے (یعنی عِلَل و اسانید کے متعلق) اضافے تو قبول فرمائے اور کتاب میں لے لئے لیکن معنوی مباحث تمام تر حذف کر دئے۔"

اس عاجز نے حضرت استاذ سے یہ پوری بات درس میں خود سنی ہے اور حضرت ہی کے ذریعہ یہ معلوم ہے کہ علامہ شوق نیموی جب تک رہے حضرت سے

علمی مُراسلت اور مشاورت کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت استاذؒ ہی سے سُنے ہوئے بعض جزئیات اس عاجز کو یاد بھی ہیں لیکن وہ خالص علمی باتیں ہیں اس مقالہ میں ان کا ذکر مناسب نہ ہوگا۔

علّامہ نیمویؒ حضرت اُستاذ کی نظر میں

جب علّامہ شوق نیمویؒ کا ذکر آگیا ہے تو اس واقعہ کا اظہار بھی میرے لئے ضروری ہے کہ حضرت اُستاذؒ فنِّ حدیث میں علّامۂ ممدوح کا مُقام بہت بُلند مانتے تھے اور معرفتِ عِلل و اسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل و مثیل نہیں قرار دیتے تھے۔ اس عاجز کو خوب یاد ہے یہاں تک فرماتے تھے کہ مولٰینا ظہیر احسن صاحب حضرت مولٰینا عبدالحی صاحبؒ (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں لیکن صناعتِ حدیث میں اُن سے بہت فائق ہیں۔

اس سے یہ اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے اکثر علمی حلقوں میں جو یہ بیماری آگئی ہے کہ اپنے خاص حلقہ اور اپنی خاص جماعت سے باہر ان کو کوئی صاحبِ کمال نظر ہی نہیں آتا اور ہر میدان میں وہ اپنے ہی حلقہ اور سلسلہ والوں کا جھنڈا اونچا رکھنا چاہتے ہیں۔ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کو الحمدللہ یہ بیماری بالکل نہیں لگی تھی، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں یہ بڑی ہی خراب بیماری ہے۔

خیر، یہ باتیں تو استطراداً ذکر میں آگئیں، ورنہ میں حضرت اُستاذؒ کی علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اب پھر وہیں آجائیے۔

یادداشت کے متعلق اپنے بعض تجربے

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے کئی سال بعد تک درس و تدریس اس عاجز کا مشغلہ رہا۔ اور اُس زمانہ میں کتابوں کے مُطالعے سے بھی کچھ زیادہ شغف تھا۔ کبھی زیرِ درس کتابوں میں اور کبھی خارجی مُطالعہ میں ایسے اِشکالات بھی پیش آجاتے تھے جن کے حل کرنے سے اپنا غور و فکر عاجز رہتا تھا۔ میں ایسے تمام اِشکالات کو اپنی نوٹ بک میں نوٹ کرتا رہتا تھا اور جب حضرت اُستاذؒ

کی خدمت میں حاضری میسّر ہوتی تو وہ نوٹ بُک جیب سے نکالکر اکثر پہلی ہی ملاقات کی مجلس میں حضرت کے سامنے "میں" اپنے وہ اشکالات عرض کرتا۔ اور حضرت میرے ہر سوال کا جواب اس طرح دیتے گویا اس سوال کے تمام اطراف پر آپ نے خاص طور سے حال ہی میں غور فرمایا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس تجربہ کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے کوئی علمی اشکال کبھی حضرت کے سامنے پیش کر کے جواب چاہا ہو۔

بہرحال مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جب تک حضرت اس دُنیا میں رہے میرا برابر یہ دستور رہا بلکہ اپنے مُطالعہ کے اشکالات کے علاوہ بعض دوسرے اہلِ علم و اصحابِ درس کے اشکالات و سوالات بھی اُن سے دریافت کرکے میں اپنی نوٹ بُک میں لکھ کر لے جاتا تھا۔ اگر یہ عرض کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت کی خدمت میں حاضری کے ہر موقع پر میری نوٹ بک کے یہ سوالات ہی حضرت کے لئے میرا خاص ہدیہ ہوتا تھا جس کا میں بڑا اہتمام کرتا تھا اور حضرت کا مُعاملہ بھی یہ تھا کہ اگر کبھی میں حاضر ہُوا اور کسی وجہ سے پوچھنا مُناسب نہ سمجھا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا تو حضرت خود فرماتے تھے "مولوی صاحب کچھ پوچھنا ہے؟" اور اس کے بعد میں پوچھتا

خیر یہ تو تھی تمہید اب یادداشت اور قوّتِ حافظہ کا واقعہ سُنیئے جس کے لئے مجھے یہ لمبی تمہید لکھنی پڑی۔ ایک دفعہ کی حاضری میں ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے، بہت غور کیا لیکن حل نہیں ہو سکا۔

فرمایا۔ "مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں اور اُنہیں پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہیئے"۔ پھر فرمایا۔ صحیح عبارت اس طرح ہے۔

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہوگیا۔ اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنیئے ــــ! سورۂ نساء کے سولہویں اور سترہویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، اس واقعہ کو امام ترمذیؒ نے بھی روایت کیا ہے مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں، دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، میں نے اُن سب کو دیکھ ڈالا۔ مگر واقعہ کا زمانہ اور سنہ مجھے کہیں سے معلوم نہ ہوسکا۔ عاجز آکر حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سنہ وقوع کی تلاش ہے۔ کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا۔

فرمایا کون کون کتابیں آپ نے دیکھیں؟ میں نے تفسیر ابن جریرؒ و ابن کثیر و معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے۔ فرمایا:۔ دُرِّ منثور میں نہیں دیکھا؟ میں نے عرض کیا کہ دُرِّ منثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا، کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے، اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔

فرمایا، جاؤ اُس میں دیکھ لو، اُس میں مذکور ہے۔

چنانچہ تلاش کر کے دُرِّ منثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ اس میں موجود تھے:۔

وَکَانَ ذَالِکَ فِی شَھْرِ رَبِیْعٍ سَنَۃَ اَرْبَعٍ کہ یہ واقعہ ماہ ربیع سنہ ۴ھ میں پیش آیا۔

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں بھی حضرتؒ نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئی تھی۔

حدیث کے درس کے وقت "صحاح ستّہ" اور ان کے علاوہ چند اور حدیث کی کتابیں حضرت کے سامنے رکھی رہتی تھیں اور جب کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے آپ کو کسی حدیث کا حوالہ دینا ہوتا تھا تو صرف زبانی حوالہ پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، بلکہ تقریر جاری رکھتے ہوئے بے تکلّف اسی کتاب پر ہاتھ جاتا تھا اور حسبنا اللہ ونعم الوکیل ایک خاص انداز میں کہتے ہوئے ایسا انداز فرماکر کتاب کھولتے تھے کہ بعض اوقات تو وہی صفحہ کھلتا تھا جس پر وہ حدیث ہوتی تھی ورنہ بس دو چار ورق اِدھر سے یا اُدھر سے اُلٹنے کے بعد وہ حدیث سامنے ہوتی تھی۔ جن حضرات نے یہ منظر نہیں دیکھا اُنہیں آج یہ سُنکر غالباً حیرت ہوگی اور شاید بہت سوں کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا۔ لیکن جن لوگوں کو حضرت کے درس میں چند روز بھی بیٹھنے کا موقع ملا ہوگا انہوں نے قریباً روزانہ سبق میں یہ عجوبہ دیکھا ہوگا۔

علمی اطمینان اور اتقان

حضرت اُستاذ کے علمی امتیازات اور خصوصیات میں ایک نہایت اہم اور قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ جس مسئلہ میں آپ سے رجوع کیا جاتا آپ جواب اس طرح دیتے کہ گویا اس کے سارے پہلوؤں اور تمام مالہٗ وماعلیہ پر آپ نے ماضی قریب ہی میں غور فرمایا ہے اور آپ بالکل مطمئن ہیں۔ "شاید یوں ہو" یا شاید یوں ہو" والی بات آپ کے یہاں بالکل نہ تھی۔

فقہ حنفی کے بارہ میں اطمینان

جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث کا طالب علم تھا (اور وہی سال دارالعلوم دیوبند میں حضرت کے درس کا آخری سال تھا) شعبان کے مہینہ میں جب کہ طلبہ امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے وطن جانے والے تھے، آپ نے ایک دن بعد نماز عصر تمام طلبہ سے بالعموم اور دورۂ حدیث سے فارغ ہونے والے اپنے تلامذہ سے بالخصوص خطاب فرمایا۔ اُس میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی فرمائی :-

"ہم نے اپنی زندگی کے پورے تیس ۳۰ سال اس مقصد کے لئے صرف کئے کہ فقہ

حنفی کے موافق حدیث ہونے کے بارہ میں اطمینان حاصل کیا جائے۔ سو الحمد للہ اپنی اس تیس۳۰ سالہ محنت اور تحقیق کے بعد میں اس بارہ میں مطمئن ہوں کہ فقہ حنفی حدیث کے مخالف نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس مسئلہ میں مخالفین احناف جس درجہ کی حدیث سے استفاد کرتے ہیں کم از کم اسی درجہ کی حدیث اس مسئلہ کے متعلق حنفی مسلک کی تائید میں ضرور موجود ہے اور جس مسئلہ میں حنفیہ کے پاس حدیث نہیں ہے اور اس لئے وہ اجتہاد پر اس کی بنیاد رکھتے ہیں وہاں دوسروں کے پاس بھی حدیث نہیں ہے۔"

یہاں مجھے فقہ حنفی کے بارہ میں تو حضرت کا صرف اتنا ہی ارشاد نقل کرنا تھا جو دراصل حضرت نے ایک دوسری بات کے لئے بطور تمہید کے فرمایا تھا لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں وہ اصل بات بھی ذکر کر دی جائے جس کی یہ تمہید تھی۔

حضرت نے فقہ حنفی کے مسئلہ میں اپنی تیس سالہ محنت و تحقیق اور اس کے نتیجہ میں اپنے اس اطمینان کا ذکر فرمانے کے بعد خُدّام سے فرمایا۔ سُننے والے گوشِ دل سے سُنیں کیا فرمایا۔ فرمایا:-

"لیکن اب مجھے افسوس ہے! کاش میرا یہ وقت دین کے اس سے زیادہ اہم اور زیادہ ضروری کام میں صرف ہُوا ہوتا تو آخرت میں اُس کے کام آنے کی زیادہ اُمید کر سکتا تھا۔"

پھر اسی تقریر میں آپ نے فرمایا:-

"میں نے اپنے فارسی اور عربی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اردو لکھنے پڑھنے سے احتراز کیا یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی اور فارسی ہی رکھی لیکن اب مجھے اُس پر بھی افسوس ہے کہ ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین سے دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دُنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے۔ میں اس بارہ میں آپ صاحبوں کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔"

آگے کسی موقع پر ان شاء اللہ میں اس کا مستقلاً ذکر کروں گا کہ حضرت استاذ کو اس زمانہ میں دو فتنوں کی طرف سے بڑی سخت فکر تھی، اندرونی فتنوں میں قادیانیت کا فتنہ اور خارجی فتنوں میں الحاد و مادہ پرستی کا فتنہ۔ اپنی زندگی کے اس دور میں حضرت کی دل کی خاص لگن بس یہی تھی کہ اُمّتِ محمدیہ کو ان فتنوں کے طوفانوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اہلِ علم پوری تیاری اور طاقت سے میدان میں آئیں، اور حضرت سمجھتے تھے کہ یہ کام اس زمانہ میں اُردو اور انگریزی ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے اس لیے ان دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے خاص طور سے فرمایا کرتے تھے۔

اسی سے ناظرین یہ بھی اندازہ فرما سکتے ہیں کہ خالص "کتاب بین عالم" ہونے کے باوجود آپ کے ذہن و فکر میں کتنی وسعت تھی اور آپ کی نظر میں وقت کے تقاضوں کی کتنی اہمیت تھی۔

خیر یہ تو گویا ایک جملۂ معترضہ تھا۔ ورنہ میں فقہ کے سلسلہ میں حضرت کی بعض علمی خصوصیات کا تذکرہ کر رہا تھا۔ اب آگے اسی سلسلہ میں سنئے:۔

فقہ میں آپ کا ایک خاص اصول

ایک موقع پر آپ نے فرمایا:۔ "اکثر مسائل میں فقہ حنفی میں کئی کئی اقوال ہیں اور مرجحین اور اصحابِ فتویٰ مختلف وجوہ و اسباب کی بناء پر اُن میں سے کسی ایک قول کو اختیار کرتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ میں اس قول کو زیادہ وزنی اور قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں جو از روئے دلائل زیادہ قوی ہو یا جس کے اختیار کرنے میں دوسرے ائمۂ مجتہدین کا اتفاق زیادہ حاصل ہو جاتا ہو۔

(اسی سلسلہ میں فرمایا) میرا اپنا اصول تو یہی ہے۔ لیکن دوسرے اہلِ فتویٰ اپنے اصول پر جو فتوے لکھتے ہیں میں اُن کی بھی تصدیق کر دیتا ہوں۔ اور میری اُس تصدیق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ از روئے فقۂ حنفی یہ جواب بھی صحیح ہے۔"

بعض مسائل میں آپکی خاص تحقیق

وسعتِ علم ونظر اور خاص فقیہانہ فکر کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ بعض مسائل میں آپ کی تحقیق ہمارے زمانہ کے عام علماءِ احناف سے الگ تھی۔ بلکہ شاید واقعہ کی زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ عام علماء و اہلِ فتویٰ کے لئے فقہ حنفی میں وہ ایک نئی علمی دریافت ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک مثالیں اس عاجز کو یاد ہیں۔ لیکن اُن میں سے ایک ایسی ہے جس کا ذکر اُردو کے اس مقالہ میں بھی نامناسب نہ ہوگا۔

فقہ حنفی کا یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اگر دُنیا کے کسی بھی گوشہ میں چاند دیکھا جائے تو دوسرے تمام مقامات پر اس کا اعتبار کیا جائے گا۔ مثلاً اقصائے مغرب میں رمضان کا چاند ایک دِن دیکھا گیا تو اگر شرعًا قابلِ اعتبار ذریعہ سے اس کی اطلاع اقصائے مشرق میں رہنے والوں کو پہنچ جائے تو اُن کو بھی اُسی حساب سے روزہ رکھنا ہوگا۔ خاص علمی اور فقہی تعبیر اس مسئلہ کی یہ کی جاتی ہے کہ "حنفیہ کے یہاں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں اور دوسرے اُئمہ کے یہاں اس کا اعتبار ہے۔ جیساکہ میں نے عرض کیا عام طور سے علمی اور فقہی حلقوں میں حنفیہ کا یہی مذہب معلوم و مشہور ہے اور عمومًا اسی پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور حنفی فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا بھی ہے حالانکہ ہئیت کے حساب سے یہ بالکل ناقابلِ فہم ہے۔

حضرت اُستاذ قدس سرہٗ کی تحقیق اس مسئلہ میں یہ تھی کہ عام مصنّفین سے اس کی تعبیر میں لغزش ہوگئی ہے اور اصل مسئلہ حنفیہ کا یہ ہے کہ ایک اقلیم میں اختلافِ مطالع کا اعتبار نہیں۔ فرماتے تھے کہ مشرق و مغرب کے درمیان اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کرنا بداہتہً غلط ہے اور حضرت اُستاذ اپنی اس تحقیق کے سلسلہ میں جہاں تک اب یاد پڑتا ہے ابن رشد کی "بدایۃ المجتہد" اور فقہ حنفی کی کتابوں میں سے بدائع کا حوالہ بھی دیتے تھے۔

[واضح رہے کہ پہلے تو یہ صرف ایک قابلِ غور علمی مسئلہ تھا جو محض معقولیت پسندوں کے لئے اشکال اور خلجان کا باعث ہوتا تھا لیکن اب یہ واقعاتی مسئلہ ہوگیا ہے۔ کیونکہ اکثر

ممالکِ عربیہ میں عموماً ہندوستان سے ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے۔ اور ہیئت کے اصول پر ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے۔ اور ہوائی جہاز جدّہ سے پرواز کر کے ۸، ۹ گھنٹے میں بمبئی آجاتا ہے اور ۱۲ گھنٹے سے کم میں دہلی آسکتا ہے۔ پس یہ ہوسکتا ہے کہ مثلاً ۲۹ رمضان کی شام کو کچھ لوگوں نے جدّہ میں عید کا چاند دیکھا اور اسی شب کو وہ ہوائی جہاز سے روانہ ہو کر صبح کو بمبئی پہنچے تو اگر اختلافِ مطالع کا اعتبار نہ کیا جائے تو اُن لوگوں کی شہادت پر ہندوستان والوں کے لئے اُس دن روزہ ختم کر کے عید منانے کا حکم دیا جائے گا۔ حالانکہ یہاں اُس روز اُنتیسواں (۲۹) بلکہ کبھی تو اٹھائیسواں (۲۸) ہی روزہ ہوگا۔ اپنے زمانہ کے اکابر علماء و اہلِ فتویٰ کے متعلق سُنا ہے کہ جب اُن کے سامنے یہ واقعاتی اشکال اس مسئلہ کے متعلق پیش کیا گیا تو اُنہوں نے فرمایا کہ اگر ایسی صورت پیش آجائے پھر اس کے سوا چارہ نہیں کہ دوسرے اَئمہ کے قول پر فتویٰ دیا جائے گا جیساکہ اس قسم کی ناگریز صورتوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اگر اُن بزرگوں کو اس مسئلہ کے متعلق حضرت اُستاذ کی مندرجۂ صدر تحقیق و تنقیح پہنچی ہوتی تو اس مسئلہ میں فقہِ حنفی کو چھوڑ کر دوسرے اَئمہ کے قول پر فتویٰ دینے کو وہ ناگزیر نہ سمجھتے]

عِلم اسرار و حقایق

حضرتِ اُستاذ عِلم اسرار و حقایق میں بلاشُبہ اس دَور کے شیخ اکبر تھے۔ شیخِ ممدوح کے علوم سے خاص مناسبت بھی تھی اور شیخ کے بہت سے نہایت اعلیٰ اور قیمتی افادات زیادہ تر اُن کی مشہور کتاب "فتوحاتِ مکیہ" کے حوالہ سے درس میں بیان بھی فرمایا کرتے تھے۔ اور بلاشُبہ بعض مُشکل دینی حقیقتوں کے بارہ میں اُن سے بڑا انشراح اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔

حضرتِ اُستاذ کے شاگردِ رشید مولینا بدرِ عالم صاحب میرٹھی (مقیم حال مدینۂ طیبہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے پہلے اُنہوں نے فیض الباری میں بھی حضرتؒ کے اس سلسلہ کے افادات کا خاصہ حصّہ لے لیا تھا اور اب حدیث کی جو ایک نئی جامع کتاب

وہ خود مرتب فرما رہے ہیں، جو اُن ہی کے اُردو ترجمہ اور مفصّل تشریحی نوٹوں کے ساتھ "ندوۃ المصنّفین دہلی" سے "ترجمانُ السُّنّۃ" کے نام سے شایع ہو رہی ہے اور پہلی دو جلدیں شایع بھی ہو چکی ہیں۔ اُس میں بھی انہوں نے حضرت اُستاذ کے اس خاصُ الخاص علمی شعبہ کے نہایت گراں قدر افادات کو اُردو میں منتقل کرنے کی اور غیر عالم اردو خوانوں کو بھی سمجھا دینے کی بڑی مبارک اور کامیاب کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ اکبر کے مضامین کو صحیح و سالم اور محتاط طریقہ پر اُردو جیسی کسی زبان میں منتقل کر دینا یقیناً بڑا مشکل کام ہے مگر ترجمانُ السُّنّۃ کے ابتدائی ابواب ہی کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا بدر عالم صاحب کے لئے اس کو کس حد تک آسان فرما دیا ہے۔

جدید مغربی علوم پر بھی نظر

مصر والوں نے جدید مغربی علوم پر عربی میں جو کتابیں شائع کی ہیں اور مختلف مغربی زبانوں سے جو تراجم کئے ہیں حضرت اُستاذ اُن کے ذریعہ ان نئے علوم اور نئی تحقیقات سے بھی کافی واقفیت رکھتے تھے۔ خاص طور سے طبعیات میں یورپ نے جو علمی ترقی کی ہے اس کے معترف اور اُس کے افادی پہلو کے قدردان تھے اور اسی وجہ سے مشہور مصری فاضل طنطاوی جوہری کی تفسیر "جواہر القرآن" کے مطالعہ اور اس سے علمی استفادہ کا مشورہ دوسرے اہلِ علم کو بھی دیتے تھے۔ حالانکہ اُس میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جو سخت ناپسندیدہ ہیں۔

سلسلۂ درس کی بعض قابلِ ذکر چیزیں

جو طلبہ صرف و نحو کی خامی اور عربی استعداد کی کمزوری کی وجہ سے حدیث صحیح نہیں پڑھ سکتے تھے اور اعراب میں غلطیاں کرتے تھے حضرت اُستاذ اُن کے لئے حدیث پڑھنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر طالب علم سے سبق کی قرأت میں کسی ایسے راوی کے نام میں غلطی ہوتی جو سلسلۂ سند میں بار بار اور کثرت سے آتا تو اس سے بھی آپ کو بڑی سخت اذیت ہوتی تھی اور گویا یہ تکلیف آپ کے لئے ناقابلِ

برداشت تھی۔ ایک دن ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم نے عبارت پڑھنی شروع کی۔ شاید پہلی یا دوسری حدیث تھی۔ سلسلۂ سند میں آیا "عَنِ الشَّعْبِیْ" اُس بے چارہ نے بجائے شَعبِیؒ کے شُعُبِیْ پڑھا۔ حضرت استاذ نے تصحیح فرماتے ہوئے فرمایا "عَنِ الشَّعْبِیْ" لیکن اُس بندۂ خدا کی زبان سے پھر وہی نکلا۔ عَنِ الشُّعُبِیْ۔ حضرت نے اُسی وقت سبق سے اُٹھا دیا اور فرمایا کہ جو لوگ اتنے ناقص الاستعداد اور کم فہم ہوں کہ روزانہ سند میں آنے والے راویوں کے صحیح ناموں سے بھی واقف نہ ہوں اور بار بار بتلانے سے بھی نہ سمجھ سکیں اُن کو دورۂ حدیث میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔

صحیح قسم کے طالبعلمانہ سوالات سے حضرت بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی بشاشت کے ساتھ جواب مرحمت فرماتے تھے لیکن مہمل قسم کے اور لایعنی یا غیر متعلق سوالات کی بالکل گنجائش اور اجازت نہ تھی۔ جس سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں تھا اُس سال دورہ میں تقریباً سَو طالب علم تھے ان میں سے ۴، ۵ کو حضرت نے خود متعین فرما یا تھا کہ صرف یہی سوال کیا کریں اور ان کے علاوہ جس کو سبق کے سلسلہ میں کچھ پوچھنا ہو وہ پہلے ان کو بتلا دے۔ اگر یہ اس کو پیش کرنے کے قابل سمجھیں تو پیش کریں۔ حضرت کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے کسی فضول اور لایعنی بات میں بالکل وقت ضایع نہیں ہوتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرت کا یہ ہمیشہ کا رویّہ تھا یا اُسی سال یہ طرزِ عمل اختیار فرمایا تھا۔

حضرت استاذ قدس اللہ سرہٗ کے متعلق اس مقالہ میں ذکر کرنے کے لائق علمی اور درسی سلسلہ کی جو باتیں اس وقت یاد آئیں وہ یہی تھیں جو حوالۂ قلم ہو چکیں۔ اب زندگی کے بعض دوسرے شعبوں کے متعلق اسی طرح کی بعض جستہ جستہ چیزیں جو حافظہ میں ہیں وہ بھی ہدیۂ ناظرینِ کرام ہیں۔

دو فتنوں کا شدید احساس

رسول اللہ صلعم کے لائے ہوئے دین اور آپ کی اُمّت کے بارہ میں آپ کو دو فتنوں کی طرف سے بڑی گہری فکر تھی۔ خارجی فتنوں میں اِلحاد و مادّہ پرستی کا مغربی فتنہ جو اقوام

مغرب کے سیاسی غلبہ اور علوم و فنون میں اُن کی بالاتری کی وجہ سے تمام عالم پر چھایا جارہا ہے اور داخلی و اندرونی فتنوں میں مُسَیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا فتنہ! ان دونوں فتنوں کی شدتِ احساس سے آپ بے چین رہتے تھے اور ان کے مقابلہ اور اُمّت کی ان سے حفاظت کرنے کے واسطے تیاری کرنے کے لئے آپ طلبہ کو بڑے زور کے ساتھ ترغیبیں دیتے تھے اور اس کے لئے درس کے علاوہ آپ مستقل تقریریں بھی کرتے تھے بلکہ اُس زمانہ میں حضرت کی تقریروں کا موضوع عموماً یہی ہوتا تھا۔

قادیانی فتنہ سے آپکی غیر معمولی بے چینی

خاص طور سے مؤخر الذکر قادیانی فتنہ کے بارہ میں آپ کی فکر اور بے چینی کا جو حال تھا جن لوگوں نے دیکھا نہیں وہ اُس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی وفات کے بعد عرب کے مختلف علاقوں میں مختلف شکلوں میں ارتداد کی جو وبا پھیلی تھی اور خاص کر مُسَیلمۂ کذّاب کی جھوٹی نبوّت پر ایمان لانے کا فتنہ جو اُس وقت ایک دم زور پکڑ گیا تھا اُس موقع پر حضرتِ ابوبکر صدیق رض کی غیر معمولی بے چینی اور حرارتِ ایمانی کا ذکر جو روایات میں آتا ہے، حضرت استاذ قدس سرہٗ کے احوال میں بالکل اُس کی جھلک نظر آتی تھی اور اس زمانہ میں حضرت اپنی اکثر تقریروں میں اس فتنۂ ارتداد کے زمانہ کے سیدنا صدیق اکبر رض کے جوشِ ایمانی سے بھرے ہوئے خطبات اور کلمات اکثر دہرایا کرتے تھے۔ خاص طور سے حضرتِ صدیقِ اکبر رض کا وہ ایمان افروز جملہ جو آپ نے حضرت عمر رض سے اس وقت فرمایا تھا جب مُرتدین کے خلاف جنگ کے بارہ میں مصلحت اندیشی سے کام لینے کا حضرت صدیقِ اکبر رض کو انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

وہ جملہ کُتُبِ حدیث و سِیَر میں آج تک محفوظ ہے اور حضرت ابوبکر رض کے مقام صدیقیت کی شہادت دے رہا ہے۔ اس کے الفاظ جو حضرت استاذ اُس زمانہ میں اکثر دہرایا کرتے تھے یہ ہیں۔

"اجبارٌ فی الجاهلیة وخوارٌ فی الاسلام انّهٗ قد انقطع الوحیُ وتمّ الدّینُ أینقصُ وانا حیٌّ"[1]

[1] حاشیہ صفحۂ آئندہ پر۔

بہرحال قادیانی فتنہ کی فکر سے حضرت استاذ کی سب سے بڑی فکر تھی اور اس معاملہ میں آپ کا وہ حال تھا جو اُن بندگانِ خدا کا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ اپنا خاص کوئی کام لینا چاہتا ہے اور پھر اس کی فکر اور اُس کے لئے بے چینی اُن پر طاری کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ حضرت استاذ نے قادیانیت سے متعلق اپنے تین خواب سنائے تھے جو آپ نے دس دس سال کے فاصلہ سے دیکھے تھے۔ اپنی اس نالائقی پر آج سخت رنج و افسوس ہے کہ نہ کہیں ان کو نوٹ کیا اور نہ یاد رکھا۔ اجمالاً صرف اتنا یاد ہے کہ پہلا خواب آپ نے قیامِ دہلی کے زمانہ میں دیکھا تھا، دوسرا اُس سے ٹھیک دس سال بعد اور تیسرا اُس کے ٹھیک دس سال بعد دیکھا تھا۔

ان تینوں خوابوں میں آپ کو پنجاب کے اس متنبی کذاب کے فتنہ سے امت محمدیہ کے ایمان کی حفاظت کے لئے جدوجہد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی اور اس راستہ میں اللہ تعالیٰ کی مدد کی بشارت تھی، مجھے اجمالاً اتنا ہی یاد رہ گیا ہے۔ حضرت نے ایک موقع پر پوری تفصیل سے یہ تینوں خواب سنائے تھے، شاید حضرت کے خدام اور تلامذہ میں سے کسی اور کو یاد ہوں۔

اس فتنہ کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کام حضرت استاذ سے لئے اُن کا ذکر اچھی خاصی تفصیل کے ساتھ جناب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اپنے ایک مستقل مضمون میں کر چکے ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں دو تین باتیں ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

(۱) قادیانی فتنہ کے ظہور نے جن مسائل اور مباحث پر گفت و شنید کا سلسلہ پیدا کر دیا ہے اُن میں دو مسئلے مختلف وجوہ و اسباب سے عملی طور پر کچھ مشکل ہیں یعنی ان میں لوگوں کے لئے مغالطہ کھانے کی گنجائش بہ نسبت دوسرے مسئلوں کے کچھ زیادہ ہے۔ ایک مسئلہ حیاتِ مسیح علیہ السلام اور دوسرا ایمان و کفر کے حدود کا مسئلہ۔

یہ دوسرا مسئلہ اگرچہ فی نفسہٖ مشکل نہیں ہے بلکہ سیدھی سادی بات ہے، لیکن کچھ تو

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) لہ مطلب یہ ہے کہ تم جاہلیت میں تو بڑے سخت اور زور آور تھے اور آج اسلام کی حالت میں ایسی کمزوری اور نامردی کی باتیں کرتے ہو۔ نبوت ختم ہو چکی، وحی کی آمد کا سلسلہ ختم ہو چکا اور دین سر طرح مکمل ہو گیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں دنیا میں زندہ رہوں اور دین میں قطع و برید ہو۔

مسئلہ کے بعض پہلوؤں کی بعض مبہم اور غیر واضح تعبیروں نے اور کچھ تکفیر جیسے سنگین معاملہ میں بعض لوگوں کی بے احتیاطیوں نے مسئلہ کو اچھا خاصا مشکل بنا دیا ہے اور اُس میں ایسی اُلجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ بہت سے لوگ خواہ مخواہ اُس میں اُلجھ جاتے ہیں۔ حضرت اُستاذ نے ان دونوں مسئلوں کی طرف خود توجہ مبذول فرمائی۔

مسئلۂ حیاتِ مسیح پر پہلے ایک رسالہ "عقیدۃ الاسلام فی حیٰوۃ عیسیٰ علیہ السلام" لکھا، اس کے بعد بطور اُس کے حواشی یا ضمیمہ کے دوسرا رسالہ "تحیۃ الاسلام" تالیف فرمایا۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں اور جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حضرت کا طرزِ فکر اور طرزِ بیان و استدلال متأخرین کا سا نہیں ہے جس کا سمجھنا ہم جیسوں کے لئے زیادہ آسان ہوتا ہے بلکہ ائمۂ متقدمین کا سا ہے اس لئے افسوس ہے کہ ہر عربی دان کے لئے بھی ان دونوں رسالوں کو پوری طرح سمجھ لینا آسان نہیں ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جو سلیم القلب ان دونوں رسالوں کو سمجھ کر پڑھ لے اس کو ان شاء اللہ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہیگا کہ قرآنِ مجید کی قطعی شہادت قادیانیوں کے دعوے "مماتِ مسیح" کے خلاف ہے اور قادیانیوں کی طرف سے جو سینکڑوں بلکہ ہزاروں صفحات اس مسئلہ پر لکھے گئے ہیں اُن کی بنیاد لکھنے والوں کی جہالت پر ہے یا علمی خیانت اور دھوکہ بازی پر۔

جس سال یہ عاجز دار العلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا اسی سال ممالکِ عربیہ میں غالباً مصر کے ایک بڑے وسیع النظر عالم اور ممتاز فاضل جو مغربی علوم میں بھی خاص دستگاہ رکھتے تھے اور جرمنی میں ایک عرصہ تک ان کا قیام بھی رہا تھا دیوبند تشریف لائے تھے اور دار العلوم میں چند روز قیام فرمایا تھا۔ اُن کی تشریف آوری کا باعث جیسا کہ اُس وقت سُنا تھا صرف یہ ہوا تھا کہ حضرت اُستاذ کے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" کا نسخہ کہیں اُن کی نظر سے گذرا۔ اُس کو دیکھنے کے بعد انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس علم کا آدمی اگر دنیا میں کہیں زندہ موجود ہے تو مجھے اُس سے ضرور ملنا چاہیئے۔

دوسرے مسئلۂ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت اُستاذ نے رسالہ "اکفار الملحدین فی شیئٍ من ضروریاتِ الدین" تالیف فرمایا۔ یہ بھی عربی میں ہے اور ہر عربی دان کے لئے

یہ بھی سہل الفہم نہیں ہے لیکن کفر و اسلام کے حدود کی ایسی تنقیح غالباً اس سے پہلے نہیں ہوئی۔ اس کو سمجھ کر پڑھنے کے بعد اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کر کے اور اس کی امت نے اس کو نبی مان کے اپنے کو اسلام کے وسیع دائرہ سے اس طرح نکال لیا ہے کہ جو شخص محمد رسول اللہؐ کے لائے ہوئے دین پر ایمان نہیں رکھتا ہو وہ اب کسی طرح ان لوگوں کو مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتا اور اگر وہ قادیانیت اور قادیانیوں سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ایسا کریگا تو اس کو محمد رسول اللہؐ کے لائے ہوئے دین کے بعض اہم حصوں کی تکذیب یا آپ کی بعض واضح تعلیمات میں تحریف کرنی پڑے گی، اگرچہ وہ اپنی کج فہمی یا نادانی کی وجہ سے اپنی اس پوزیشن کو سمجھتا نہ ہو۔

"اکفار الملحدین" کا تعلق چونکہ کفر و اسلام کے مسئلہ سے تھا اور اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی امت پر کفر کا حکم لگایا گیا تھا اور بلاشبہ یہ بہت اہم معاملہ تھا۔ اس لئے حضرت نے یہ مناسب سمجھا کہ اس زمانے کے دوسرے اکابر اور مشاہیر اہل علم کی آراء بھی اس کے بارہ میں حاصل کی جائیں۔ چنانچہ کچھ اکابر اہل علم مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری وغیرہ کی آراء تو پہلے ہی اڈیشن میں شامل کر دی گئی تھیں اور اس عاجز کے پاس اسی ایڈیشن کا نسخہ ہے۔ لیکن دوسرے حلقوں کے بعض علماء و افاضل کی رائیں اور تصدیقیں بعد میں حاصل ہوئی تھیں۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی (صدر یار جنگ) مرحوم کے متعلق راقم سطور کو معلوم ہے کہ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے کافی عرصہ بعد موصوف کی تصدیق موصول ہوئی تھی مگر مجھے معلوم نہیں کہ بعد کے اڈیشنوں میں بعد والی وہ تصدیقات شامل ہوئیں یا نہیں اگر نہیں شامل ہوئی ہیں اور کہیں محفوظ ہیں تو ان کو شامل ہونا چاہیئے!

الغرض قادیانی فتنہ کی غارتگری سے محمد رسول اللہؐ کی امت کے ایمان کی حفاظت کے سلسلہ میں ایک کام تو آپ نے یہ کیا کہ ان دو مسئلوں کو خوب صاف کیا۔ لیکن چونکہ اردو میں لکھنے کی حضرت کو عادت نہ تھی اس لئے مجبوراً یہ دونوں رسالے عربی میں لکھے اور اس امید پر لکھے کہ خود علماء کے ذہن جب ان دو مشکل مسئلوں کے بارہ میں ان رسالوں سے صاف اور مطمئن

ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دیگا وہ ان کے مضامین کو حسبِ ضرورت اُردو وغیرہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل کر دیں گے۔

ایک رسالہ آپ نے مسئلۂ ختمِ نبوّت پر "خاتم النبیّین" کے نام سے فارسی زبان میں بھی تحریر فرمایا اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھا کیونکہ وہاں کے جس طبقہ کو آپ سمجھانا چاہتے تھے اُس کے لئے آپ کے نزدیک فارسی زبان ہی اچھا ذریعہ بن سکتی تھی۔

(۲) ان رسالوں کے علاوہ آپ کی فکر اور بے چینی نے آپ کے تلامذہ کی ایک اچھی خاصی تعداد کو اس طرف متوجہ کر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اُن سے اس فتنہ کی انسداد میں مختلف شکلوں میں بہت کچھ کام لیا۔ جناب مولینا مفتی محمد شفیع صاحب کے جس مضمون کا ابھی اوپر میں نے تذکرہ کیا ہے اُس سے ناظرین کو اس کی کچھ تفصیل معلوم ہوگی۔

سلوک و تصوّف

میں عرض کر چکا ہوں کہ علمی شغف و انہماک اور علمی کمال کا آپ پر اتنا غلبہ تھا کہ دوسرے تمام کمالات اور زندگی کے دوسرے پہلو اُس کے نیچے بالکل دبے ہوئے تھے۔ چنانچہ آپ کی زندگی کا وہ بلند ترین پہلو بھی جس کو "سلوک و تصوّف" سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ اس علمی کمال اور شغفِ علمی سے دبا ہوا تھا اسی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کی زندگی کے اُس رُخ سے بالکل ناواقف ہیں، یہ عاجز بھی کچھ زیادہ واقف نہیں ہے، لیکن اجمالاً اتنا ضرور جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دولت سے بھی حصّۂ وافر عطا فرمایا تھا اور یقیناً آپ آراستہ باطن اصحاب احسان میں سے تھے۔ حضرتِ گنگوہی نوّر اللہ مرقدہٗ سے مجاز بھی تھے۔ لیکن اس لائن کی باتیں کرنے کی عادت نہ تھی۔ البتہ ایک دفعہ ایک واقعہ سُنایا اور اُس سلسلہ میں جو کچھ جوش آگیا تو ایک آدھ بات ہم لوگوں کو ایسی بھی سُننی میسّر آگئی جس سے کچھ سمجھا جا سکا کہ اس فضا میں بھی حضرت استاذ کی پرواز کتنی بلند ہے —

جو واقعہ حضرت نے سُنایا وہ یہ تھا:-

فرمایا کہ ایک دفعہ میں کشمیر سے یہاں کے لئے چلا۔ راستہ کی کافی مسافت گھوڑے پر سوار ہو کر طے کرنی پڑتی تھی۔ راستہ میں ایک صاحب کا ساتھ ہو گیا، یہ پنجاب کے ایک مشہور پیر

صاحب کے مُرید تھے اور ان ہی کے پاس جا رہے تھے۔ یہ مجھ سے اپنے اس پیر صاحب کا اور اُن کے کمالات اور کرامات کا تذکرہ راستہ بھر کرتے رہے۔ ان کی خواہش اور ترغیب یہ تھی کہ میں بھی اُن پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اور اتفاق سے وہ مقام میرے راستے میں بھی پڑتا تھا، میں نے بھی ارادہ کر لیا۔ جب ہم دونوں پیر صاحب کی خانقاہ پر پہنچے تو اُن صاحب نے مجھ سے کہا کہ نئے آدمیوں کو اندر حاضر ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے میں پہلے اندر جا کر آپ کے لئے اجازت لے لوں۔ چنانچہ وہ اندر تشریف لے گئے۔ اُن بزرگ نے اطلاع پا کر خود اپنے صاحبزادے کو مجھے لینے کے لئے بھیجا اور اکرام سے پیش آئے۔ خود ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے باقی سب مُریدین وطالبین نیچے فرش پر تھے مگر مجھے اصرار سے اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ کچھ باتیں ہوئیں اس کے بعد اپنے مُریدین کی طرف مُتوجہ ہو گئے اور اپنے طریقہ پر اُن پر توجہ ڈالنی شروع کی اور اس کے اثر سے وہ بے ہوش ہو ہو کر لوٹنے اور تڑپنے لگے۔ میں یہ سب دیکھتا رہا۔ پھر میں نے کہا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اگر مجھ پر بھی یہ حالت طاری ہو سکے تو مجھ پر بھی آپ توجہ فرمائیں۔ انہوں نے توجہ دینی شروع کی اور میں اللہ تعالیٰ کے ایک اسم پاک کا مُراقبہ کر کے بیٹھ گیا۔ بے چاروں نے بہت زور لگایا اور بہت محنت کی لیکن مجھ پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے خود ہی فرمایا کہ "آپ پر اثر نہیں پڑ سکتا"۔

حضرت استاذ نے یہ واقعہ اتنا ہی نقل فرمایا اور اُس کے بعد ایک غیر معمولی جوش کے ساتھ فرمایا:۔

"کچھ نہیں ہے لوگوں کو مُتاثر کرنے کے لئے ایک کرشمہ ہے اور کچھ مُشکل بھی نہیں، معمولی مشق ہے ہر ایک کو حاصل ہو سکتا ہے۔ ان باتوں کا خدا رسیدگی سے کوئی تعلق نہیں"۔

پھر اُسی سلسلہ میں اور اُسی جوش کی حالت میں فرمایا:۔

"اگر کوئی چاہے اور استعداد ہو تو ان شاء اللہ تین دن میں یہ بات پیدا ہو سکتی ہے کہ قلب سے اللہ اللہ کی آواز سُنائی دینے لگے۔ لیکن یہ بھی کچھ نہیں، اصل چیز تو بس احسانی کیفیت اور شریعت و سُنّت پر استقامت ہے"۔

اس ایک موقع کے سوا حضرت سے کبھی کوئی ایسی بات سُننا اس عاجز کو یاد نہیں جس سے حضرت کے اس باطنی کمال کا کچھ سُراغ ہم کو مِلا ہو۔

اپنے بعض اکابر سے خصوصی تأثر

جیسا کہ میں عرض بھی کر چکا ہوں سلوک و تصوّف کے سِلسلہ کی باتیں کرنے کی حضرت استاذ کی عادت نہیں تھی۔ کم از کم اس عاجز کا علم و تجربہ تو یہی ہے اسی لئے اس سِلسلہ کے اپنے اکابر کے خاص احوال و واقعات یا اُن کی زندگی کے خاص اس شعبہ کے مُتعلق اپنے تاثّرات حضرت اُستاذ رحمۃ اللہ علیہ سے سُننے کا ہم نیازمندوں کو کبھی شاذ و نادر ہی اِتّفاق ہوتا تھا۔ ایک ہی دفعہ کی یاد ہے درس ہی میں کسی سِلسلہ میں فرمایا :-

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہیؒ کے یہاں دیکھا۔ اُس کے بعد حضرت اُستاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی شاہ عبدالرحیم صاحبؒ) کے یہاں دیکھا اور اب جو دیکھنا چاہے وہ حضرت مولٰنا اشرف علی صاحب کے یہاں جاکر دیکھے"۔

اپنے سِلسلہ کے ان اکابر کے علاوہ ہم عصر مشائخ میں سے دو اور بزرگوں کے بارہ میں بھی حضرتِ اُستاذ کے بہت بلند کلمات اس عاجز کو یاد ہیں۔ ایک حضرت مولٰنا حسین علی شاہ صاحب مجدّدی نقشبندی اور دوسرے حضرت مولٰنا احمد خان صاحب مجدّدی نقشبندی۔ ان دونوں بزرگوں کے مُتعلق حضرت فرماتے تھے کہ اس عصر میں یہ نقشبندی سلوک کے امام ہیں۔

یہ دونوں بزرگ ضلع میانوالی کے تھے۔ دونوں کے وِصال کو عرصہ ہو چکا ہے دونوں ایک ہی شیخ کے تربیت یافتہ اور مجاز تھے لیکن بعض مسائل میں نقطۂ نظر کے فرق کی وجہ سے درمیان میں کچھ بعد پیدا ہو گیا تھا لیکن حضرت استاذ دونوں کو سلوک کا امام مانتے تھے۔ یہ عاجز بھی ان دونوں بزرگوں کی زیارت سے مُشرف ہوا ہے۔ ولِلّٰہِ الحمدُ والمِنّۃ۔

بعض شمائلِ نبویؐ کی جھلک

اگرچہ شمائل و اخلاق میری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے اور غالباً ان چیزوں پر کوئی اور صاحب مستقلاً لکھیں گے۔ لیکن یہاں پہنچ کر حضرت استاذ کی دو تین عادتیں ذکر کرنے کو بھی بے اختیار جی چاہتا ہے۔

رسول اللہؐ کے جو اخلاق و شمائل کُتبِ حدیث میں روایت کئے گئے ہیں ان میں ایک یہ عادتِ مبارکہ بھی نقل کی گئی ہے کہ آپ بہت زیادہ خاموش رہتے تھے (گویا بلاضرورت بولتے ہی نہ تھے) حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔

"کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ طَوِیْلَ الصَّمْتِ"۔

یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ اس مبارک عادت کا جیسا کامل نمونہ حضرت استاذ کو دیکھا ایسا کوئی اور دیکھنا یاد نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو صرف علمی و دینی افادہ و استفادہ کے لئے اور ناگزیر ضروری باتوں ہی کے لئے زبان دی گئی ہے اور اس خاموشی میں تنفّس کی منضبط کیفیت اور ایک خاص نوعیت محسوس کرنے والے صاف محسوس کر لیتے تھے کہ پاس انفاس[۱] کے شغل میں برابر مشغول ہیں۔ اسی طرح حضورؐ کی عاداتِ مبارکہ میں صحابہ کرامؓ ذکر فرماتے ہیں کہ:۔

"مسکرانے کی تو بہت زیادہ عادت تھی لیکن کھل کھلا کر ہنستے کبھی نہیں دیکھا"۔

بالکل یہی حال حضرت استاذ کا تھا۔

اس زمانہ میں غیبت کی بیماری کس قدر عام اور متعدّی ہو گئی ہے اور اُس سے اور اُس کے اُڑتے ہوئے جراثیم سے محفوظ رہنا کتنا مشکل ہو گیا ہے اس کا اندازہ بہت سے حضرات کو شاید نہ ہو لیکن اس عاجز کو خوب ہے اور اس لئے میرا یقین ہے کہ اللہ کا جو بندہ اس دور میں غیبت سے

---

[۱] صوفیہ کے اشغال میں سے صرف پاسِ انفاس کے متعلق آپکا خیال تھا کہ اسکی اصل حدیث و سُنت سے کچھ معلوم ہوتی ہے اس لئے خود اپنا شغل بھی تھا اور رجوع کرنیوالے نیازمندوں کو تلقین بھی فرماتے تھے۔

محفوظ ہو وہ اللہ کی خاص حفاظت میں ہے اور یہ اس کی بڑی کرامت ہے۔

مگر حضرت استاذ قدس سرہٗ کو الحمدللہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے غیبت سے زبان کو ایسا محفوظ کیا تھا کہ کبھی اشارۃً یا کنایۃً بھی غیبت کی قسم کی کوئی بات سُنا یاد نہیں۔ بلکہ یہ یاد ہے کہ حضرت کے سامنے کسی نے غیبت کی قسم کی کوئی بات شروع کی اور حضرت نے فوراً روک دیا۔

حضرت استاذ کے متعلق بس یہی کچھ منتشر باتیں اس وقت اس مقالہ میں ذکر کے قابل یاد آئیں جو حوالۂ قلم و قرطاس کر دی گئیں ❊

(منقول از حیاتِ انور)

حضرت امام العصر شاہ صاحب رحمہ اللہ

اور

ان کی تصانیف

از حضرت مولینا سید محمد یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ
(سابق شیخ الحدیث و ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی۔ پاکستان

مولینا بنوری رحمہ اللہ حضرت شاہ صاحبؒ کے مایہ ناز شاگرد اور آپ کے علوم و معارف کے بہترین وارث تھے۔ پہلے جامعۂ اسلامیہ ڈابھیل میں شیخ الحدیث اور مجلس علمی ڈابھیل کے رکنِ اعلیٰ رہے ہیں اور پھر جامعہ عربیہ نیو ٹاؤن کراچی میں شیخ الحدیث اور ناظمِ اعلیٰ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ علم و عمل اور مکارمِ اخلاق میں فائق الاقران تھے۔ برصغیر کے ممتاز ادیب و مصنف اور وسیع المعلومات عالم دین تھے۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کے سعادتمند تلامذہ میں سے جس اقبالمند کو سب سے پہلے اپنے استاذِ جلیل کی سوانحِ حیات مرتب کرنے کا شرف حاصل ہوا وہ ان ہی کی ذاتِ گرامی تھی۔ انہوں نے ۱۳۵۵ھ میں "نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور" کے نام سے عربی زبان میں حضرت شاہ صاحبؒ کی سوانح حیات تالیف فرما کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس کے علاوہ ان کی متعدد گرانقدر تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں مبسوط مقدمہ مشکلات القرآن۔ بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب اور شرح ترمذی شریف قابل ذکر ہیں۔ حضرتِ شاہ صاحبؒ کے قابلِ فخر شاگرد اور علم و فضل کے ان بحرِ ذخار کے متعلق یہاں یہ عرض کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ حضرتؒ مرحوم جب فیض الباری کی اشاعت کی غرض سے مصر تشریف لے گئے تو ایک ملاقات میں شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر "جواہر القرآن" پر صاحبِ تفسیر کے روبرو تنقید کی، بے پناہ علم و فضل

کے باوجود شیخ طنطاوی اس تنقید سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ بار بار اپنی زبان سے فرمایا۔ "اَنْتَ مَلَكٌ نَزَلْتَ مِنَ السَّمَاءِ لِإِصْلَاحِیْ"

"آپ تو فرشتہ ہیں جو آسمان سے میری اصلاح کی غرض سے نازل ہوئے ہیں"

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو علوم و معارف کا یہ آفتاب بھی غروب ہو گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔
کوندو

علمی دنیا کی تاریخ میں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی شخص کے ذاتی کمالات و علوم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دنیا اُن کے کمالات سے واقف بھی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عظیم مخلوق میں اور اس کی وسیع سرزمین میں کتنی ایسی ہستیاں گذری ہونگی جن کا صحیح علم اور ان کی علمی گہرائیوں کا صحیح اندازہ کسی کو نہ ہوا ہو۔

اور یہ بھی ایک مسلّم امر ہے کہ کوئی شخص تصانیف کے محض عددی کمیت و اکثریت کی بناء پر علامۂ عصر بن جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ علماءِ اسلام کے علمی سمندر میں کثرت سے ایسے بیش بہا موتی موجود ہیں جو کبھی کسی تاجِ مرصّع کی زینت نہیں بنے۔

قدرت کے معدنی کائنات میں ایسے بے بہا جواہرات موجود ہیں کہ "کوہِ نور" نامی ہیرے اور اس کی چمک و تابانی کے سامنے ماند پڑ جائیں وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر ۲۱)

حافظ حدیث امام تقی الدین ابن دقیق العید رحمہ اللہ جیسے محقق عصر کے متعلق حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہؐ میں ایسا دقیق النظر محدث نہیں گذرا۔ اگر ان کی کتاب "احکام الاحکام" یا "کتاب الامام" شرح الالمام کی ناتمام نقول کتابوں میں نقل نہ ہوتیں تو شاید موجودہ نسل کو ان کے کمالات کا کچھ علم بھی نہ ہوتا۔ کیا کوئی یہ گمان کر سکتا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی مصری اپنی کثرتِ مصنفات کی وجہ سے ابن دقیق العید جیسے محقق روزگار سے سبقت لے جائیں گے؟

بسا اوقات دفترِ تاریخ کی ورق گردانی سے بھی اس کا پورا پورا اندازہ لگانا مشکل ہوتا

ہے۔ معاصرین فیض یافتہ، اور چشم دید کمالات کے مشاہدہ کرنے والوں کو جن علمی حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ان کے مؤلفات کے صفحات پڑھنے والوں کو پورا احساس بے حد مشکل ہے۔ پھر قدرت کا عجیب نظام ہے کہ علماءِ اُمّت اور اربابِ ولایت کے مزاج بھی اتنے مختلف ہیں کہ عقل نارسا حیران رہتی ہے۔ کوئی دینی خدمت، تعلیم و ارشاد، افادہ و افاضہ کے پیشِ نظر تالیف و تصنیف میں مشغول نظر آتا ہے۔ کوئی اصلاح و تربیت کے حرص کی خاطر حلقۂ صحبت و استفادہ کو وسیع کرنے کی فکر میں مصروف ہے۔ کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ خمول پسندی، تواضع اور شہرت سے نفرت کی بناء پر گم نامی کو اپنا شیوۂ امتیاز بنائے ہوئے ہے۔ نہ نظامِ قدرت کے عجائبات کی انتہاء ہے۔ نہ کائنات کی نیرنگیوں کا شمار ہے

سَنَنْتُ تقصر الأماني حسرى دونها ماورائهن ورائ

امام العصر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک طرف علمی تبحّر، محیّر الافکار جامعیت، حیرت افزا دقتِ نظر، فوق العادت حافظہ، کتب بینی اور مطالعہ کا عجیب شوق و ذوق عطا فرمایا۔ دوسری طرف خمول پسندی، وجاہت و شہرت سے نفرت اور تواضع و فروتنی کے کمالات سے سرفراز فرمایا۔ حضرت امام العصر کی پوری زندگی مطالعۂ کتب میں گذری اور ساری زندگی میں کچھ نہ کچھ جواہر ریزے قلم سے نکلتے رہے۔ مشکلات و حقائق پر یادداشتیں لکھتے رہے اور علمی افکار و نظریات بھی قلم بند کرتے رہے لیکن کبھی مستقل تالیف و تصنیف کا شوق دامنگیر نہ ہوا۔

کاش اگر حضرت کو اپنے علوم و معارف کے پیشِ نظر تصنیف و تالیف کا سواں حصہ بھی شوق ہوتا تو آج علمی دنیا کا دامن ان کے علوم و تحقیقات سے پُر ہوتا۔ اور ان کے علمی جواہرات سے اہلِ علم مالا مال ہوتے اور آئندہ کی نسلیں صحیح معنے میں ان کی معرفت و قدر دانی میں کوتاہی نہ کرتیں۔

لیکن تاہم الحمد للہ قرآنِ کریم، احادیث اور فقہ اسلامی کے بعض مشکلات، علمِ کلام کے مشکل ترین مسائل، خلافیاتِ اُمّت کے معرکۃ الآراء مسائل اور عقاید

محمدیہ کے اُمّہات و اصول پر چند ایسے رسائل یادگار چھوڑ گئے جن کی نظیر علمی ذخائر میں مشکل سے ملے گی۔ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھایا کیا مجال کہ بعید سے بعید نقل، دقیق سے دقیق نکتہ، عقلی و نقلی کوئی پہلو تشنہ رہ جائے۔ دُنیائے اسلام کے وسیع النظر محقق عالم شیخ محمد زاہد کوثری مرحوم نے قاہرہ میں ایک دفعہ دورانِ ملاقات میں فرمایا کہ احادیث سے دقیق مسائل کے استنباط میں شیخ ابن ہمام صاحب فتح القدیر کے بعد ایسا محدث و عالمِ اُمّت میں نہیں گذرا، اور پھر فرمایا کہ یہ کوئی کم زمانہ نہیں۔ غالباً موصوف کے الفاظ یہ تھے:۔

"لم یأتِ فی الأمۃ بعد الشیخ ابن الھمام مثلہ فی استثارۃ الأبحاث النادرۃ من الاحادیث ولیست ھٰذہ المدۃ بقصیرۃ"۔ اور حیرت یہ ہوتی تھی کہ کسی موضوع پر جب کچھ تحریر فرمایا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شاید ساری زندگی اسی ایک موضوع کی مذہ ہوئی ہے۔

ایک دفعہ ۱۳۴۷ھ میں مولینا حبیب الرحمٰن خان صاحب شیروانی مرحوم حیدرآباد سے دیوبند تشریف لائے تھے۔ اس وقت مرحوم امورِ مذہبی کے صدر الصدور کے عہدے پر فائز تھے۔ حضرت کی زیارت کے لئے قیام گاہ پر تشریف لائے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ نے مشکلات القرآن کا کچھ تذکرہ فرمایا اور بطورِ مثال سورہ مزمل کی پہلی آیتوں میں علماء کو جو علمی اشکال تھا اس کا ذکر فرما کر اپنی طرف سے ایک ایسی تفسیر بیان کر کے ایسی تحقیق کی کہ وہ مشکل حل ہو گئے۔ شیروانی صاحب نے حیران ہو کر بے ساختہ فرمایا کہ حضرت بات بالکل صاف ہو گئی۔ ۱۳۴۸ھ کا واقعہ ہے کشمیر سے واپسی پر حضرت لاہور ایک دو روز کے لئے اُترے، آسٹریلیا بلڈنگ میں قیام تھا۔ میزبان نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کو بھی دعوت دی۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے حضرت شاہ صاحب نے بہت سے علمی جواہرات بیان فرمائے۔ ان میں ایک موضوع یہ تھا کہ دُنیا میں سائنس و طبیعیات میں جو حیرت انگیز ترقیاں ہوئی ہیں انبیاء علیہم السلام کے معجزات میں ان کی نظیر موجود ہیں۔ اور انبیاء کرام کے معجزات میں یہ چیزیں قدرت نے اس لئے ظاہر

کرائیں کہ یہ آیندہ اُمّت کی ترقّیات کے لئے تمہید ہوں اور فرمایا کہ "ضربِ الخاتم" میں اسی کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ راقم الحروف نے حضرت کے ایماء پر یاد سے وہ شعر سُنائے جن میں ایک شعر یہ تھا۔

وقد قیل ان المعجزات تقدّم ٭ بما یرتقی فیہ الخلیفۃ فی صلاحٖ

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم بے حد محظوظ ہوتے ہے۔

بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی مُصنّف نے بقصدِ تقریظ لکھوانے کوئی کتاب حضرت کے سامنے پیش کی اور ظاہر ہے کسی اہم موضوع پر کوئی مُحقّق سنجیدہ اہلِ قلم یا معیاری مصنّف علمی کتب خانوں کی اس فراوانی میں کیا کسر باقی رکھے گا۔ لیکن دیکھا یہ گیا کہ حضرت سرسری نظر میں اہم ترین اصلاحات فرما کر بیش قیمت اضافہ بھی فرما دیا کرتے تھے جس سے مُصنّف حیرت میں پڑ جاتا تھا۔ افسوس کہ میں اس مختصر مقالے میں اس کے نظائر پیش نہیں کر سکتا۔ راقم الحروف کی کتاب "نفحۃُ العنبر" میں اس کی کچھ مثالیں ملیں گی جو امام العصر کی حیات کے چند صفحے اب سے اٹھائیس برس قبل راقم کے قلم سے بطورِ نقشِ اوّل نکل چکے ہیں اور اس حیرت انگیز کمال پر یہ کمال کہ جب تک کوئی شخص خود مسئلہ نہ دریافت کرے اپنی طرف سے کبھی سبقت نہ فرماتے تھے۔ درحقیقت اس حیرت ناک علمی تبحّر کے ساتھ یہ وقار و سکون اور علم کے اس مُتلاطم سمندر کے ساتھ یہ خاموشی امام العصر کی مُستقل کرامت ہے۔

مخدوم و محترم مولینا سیّد سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا ایک بلیغ جُملہ اس حقیقت کے چہرے سے پوری نقاب کُشائی کرتا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"مرحوم کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن ہو اور اندر کی گہرائیاں گراں قدر موتیوں سے معمور ہوں (معارف" غالباً جون ۱۹۳۳ء) غرضیکہ حضرت امام العصر رحمہُ اللہ نے باوجود اس بحرُ العقول جامعیت، تبحّر، کثرتِ معلومات، وُسعتِ مطالعہ، حیرت ناک استحضار اور قوّتِ حفظ کے شوق سے کبھی تالیف و تصنیف کا ارادہ نہیں فرمایا اور اُمّت کے دل میں یہ تڑپ رہی کہ "کاش کسی اہم کتابِ حدیث پر کوئی خدمت یادگار چھوڑ جاتے۔"

حضرت مولینا بدرِ عالم صاحب نے ایک دفعہ عرض کیا کہ اگر جامع ترمذی وغیرہ پر کوئی شرح تالیف فرما دیتے تو پس ماندگان کے لئے سرمایہ ہوتا۔ غصہ میں آکر فرمانے لگے کہ "زندگی میں نبی کریم صلعم کی احادیث کو پڑھا کر پیٹ پالا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مرنے کے بعد میری حدیث کی خدمت بکتی رہے۔" ہاں دینی اور کچھ علمی خدبذ تقاضوں کی وجہ سے چند رسائل یادگار چھوڑ گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ علمی دنیا کچھ نہ کچھ ان کی علمی تحقیقات و خصوصیات سے مستفید رہے۔ نیز ان کے تلامذہ و اصحاب کی وساطت سے بھی اچھا خاصا ان کے علمی کمالات کا ذخیرہ اُمت کے ہاتھ آیا۔ اس طرح یہ محققِ یگانۂ عصر حاضر کا جامع الکمالات امام، دُنیا میں علم کا آفتاب و ماہتاب بن کر چمکا۔ میرے ناقص علم میں غیر منقسم ہندوستان کی سرزمین میں جامعیت و تبحّر کے اعتبار سے ایک حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی رح اور انکے بعد حضرت علامہ امام العصر کشمیری رح کی نظیر نہیں ملے گی۔ ہندوستان کے غیر مقلد حضرات کی چیرہ دستیوں سے تنگ آکر بھی چند رسائل کی تالیف کی نوبت آئی۔ جن میں "فاتحہ خلف الامام"، "رفع یدین" اور "مسئلہ وتر" زیرِ بحث آئے ہیں۔ ضمناً اور بہت سے مسائل آگئے ہیں۔ نیز فتنۂ قادیانیت کی تردید کے سلسلہ میں چند رسائل تالیف فرما چکے ہیں جن میں اُمتِ محمدیہ کے قطعی عقیدہ "ختم نبوت" کی تحقیق بھی آگئی ہے جو دینِ اسلام کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس طرح کفر و ایمان کا مدار جن امور پر ہے ان کی تحقیق واضح طور سے ہوگئی۔ حیاتِ مسیح علیہ السّلام کے عقیدہ کی تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس طرح علمِ کلام کے چند مشکل ترین مسائل کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں۔

حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات

"فیضُ الباری" کے مقدمہ صـ۲۱ پر راقم نے لکھا تھا[1]۔

"منجملہ حضرت شیخ کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ زیادہ تر اہتمام مشکلات کے حل کرنے کا فرماتے تھے۔ بحثوں کو پھیلانے اور الفاظ بار بار استعمال کرنے پر زیادہ توجہ نہیں فرماتے تھے نیز یہ کوشش فرماتے تھے کہ موضوع کے متعلق مواد زیادہ پیش کیا جائے۔ اسکی توضیح و تشریح

[1] صرف اس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔ کوثری

کے زیادہ درپے نہیں ہوتے تھے۔ لفظوں میں اختصار اور معانی میں کثرت ان کی طبیعت وعادت بن گئی تھی۔ خواہ تدریس میں ہو یا تصنیف و تالیف میں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جب کسی بلیغ کو دیکھا تو یہ دیکھا کہ الفاظ کے اختصار کے ساتھ معانی میں تفصیل کرتا ہے۔

ابن ندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں :-

طبیعتیں نتائج کی منتظر رہتی ہیں نہ کہ مقدمات کی اور مقاصد سے خوش ہوتی ہیں نہ کہ صرف عبارت کی طوالت سے۔

مجھے پہنچا ہے کہ حضرت حکیم الامت مولینا تھانوی فرمایا کرتے کہ "بسا اوقات حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ایک جملہ کی تشریح میں ایک رسالہ کی ضرورت پڑتی ہے"۔

یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن ص۳۱ میں اور نفحۃ العنبر ص۱۵ پر راقم الحروف نے حضرت امام العصر کی تالیفی خصوصیات کو وضاحت و تفصیل سے بیان کیا ہے جس کا ماحصل یہ ہے :-

"جامعیت، دقتِ نظر، سرعت انتقالِ ذہنی اور کثرتِ آمد کی بناء پر طبیعت اختصار کی عادی بن گئی تھی۔ معلومات کی فراوانی کی وجہ سے ضمنی مضامین کثرت سے ذکر فرمایا کرتے تھے۔ حدیث کے لطائف میں جب علمِ عربیت و بلاغت کے نکات کا بیان شروع ہو جاتا تھا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ علومِ عربیت کی تحقیقات ہی شاید کتاب کے اصلی موضوع ہیں۔ بعید ترین و عمدہ ترین ماخذ سے وہ نقول پیش فرمایا کرتے تھے جن سے محققانہ شروحِ حدیث کا دامن بھی خالی ہوتا تھا۔ افسوس کہ اختصار کی وجہ سے میں اس کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔ اس لئے عام نگاہیں ان کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اور بہ مشکل عام طبیعتیں لذت اندوز ہوتی تھیں۔ حضرت کے مختصر سے مختصر رسالے کے لئے بھی سارے علوم سے نہ صرف مناسبت بلکہ مہارت ان میں ضروری ہے۔ ان تصانیف کی صحیح قدردانی وہی عالم کر سکتا ہے جسے کسی موضوع میں مشکلات پیش آئی ہوں اور پورے متعلقات کی چھان بین کر چکا ہو اور تشفی نہ ہوئی ہو۔ پھر حضرت امام العصر کی تالیف کا غور

سے مطالعہ کی توفیق ہو اس وقت قدر شناسی و قدر دانی کی نوبت آئے گی اور حقائق مطلوبہ کے چہرے سے پردے ہٹتے چلے جائیں گے۔ خالی ذہن غیر مبتلا شخص جسکو کبھی کسی مشکل کی خلش ہی پیش نہ آئی، سطحی مضامین و شگفتہ عبارت سے مانوس ہو وہ کبھی قدر نہیں کر سکتا۔"

حضرت استاذِ محترم مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کی کتاب "کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر" کی قدر اس وقت ہوئی کہ اس مسئلے پر جتنا ذخیرہ حدیث کا مل سکا سب کا مطالعہ کیا، پھر رسالۂ مذکور کو اول سے آخر تک بار بار پڑھا اس وقت اس کی صحیح قدر ہوئی۔ اب میں اس مختصر سے تمہیدی مضمون کو امام مسروق بن الاجدع المتوفی ۶۳ھ کے ایک تاریخی کلام پر ختم کرتا ہوں جس کو امام تاریخ ابن سعد نے اپنی کتاب "الطبقات" میں ذکر کیا ہے (طبقات ابن سعد جلد ۲ صفحہ ۱۱۵) باسنادِ صحیح مسروق سے روایت ہے، مسروق (کوفہ کے کبار تابعین میں سے ہیں، مخضرم ہیں یعنی عہدِ نبوت کو پاچکے ہیں) فرماتے ہیں:۔ (ترجمہ):۔

"نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کے صحابۂ کرام کی مثال تالابوں اور حوضوں جیسی ہے یعنی چھوٹا اور بڑا۔ کوئی تالاب ایک آدمی کی سیرابی کے لئے کافی ہوتا ہے، کوئی دو کے لئے، کوئی دس کے لئے کوئی سو کے لئے اور بعض ایسے تالاب ہیں اگر روئے زمین والے سب پینے کے لئے آئیں تو سب سیراب ہو کر جائیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی مثال اسی تالاب کی ہے۔

راقم الحروف کہتا ہے کہ علماءِ اُمت کی مثال بھی یہی ہے۔ اور حضرت امام العصر شاہ صاحب کی مثال عبداللہ بن مسعودؓ کی ہے، ان کا وجود پوری اُمت کی سیرابی کے لئے کافی تھا۔

اب اُن تصانیف کی فہرست پیش کرتا ہوں جو حضرت اپنے قلم حقیقت رقم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

امام العصر کی تصانیف

(۱) عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام۔ یہ کتاب ۲۲۰ صفحات

پر مشتمل ہے۔ عقیدۂ حیاتِ مسیح علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ کریم کی کیا ہدایات ہیں؟ اس کی تفصیل ہے۔ اس میں احادیث کا استقصاء و استیفاء نہیں کیا گیا ہے۔ بقدرِ ضرورت ضمنًا احادیث کا ذکر ہے اس لئے اس کا دوسرا نام ہے "حیوٰۃ المسیح بمتنِ القرآن والحدیثِ الصحیح" ضمنی مسائل کی تحقیقات کئی جگہ آگئی ہیں۔

عقیدۂ حدوثِ عالم، عقیدۂ ختمِ نبوت۔ کتابہ حقیقت ہے یا مجاز؟ ذو القرنین و یاجوج و ماجوج کی تحقیق، سدِ ذی القرنین کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔

حضرت شیخ عثمانی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ یہ کتاب حضرت شاہ صاحب کی سب کتابوں میں واضح، مفصّل اور شگفتہ ہے۔

(۲) "تحیّۃُ الاسلام فی حیوٰۃِ عیسیٰ علیہ السّلام"

یہ کتاب ۱۵۰ صفحات کی ہے۔ "عقیدۃُ الاسلام" کی تعلیقات اور اس پر اضافات ہیں۔ ادب و بلاغت کی عجیب و غریب ضمنی تحقیقات آگئی ہیں۔

(۳) "التّصریح بما تواتر فی نزولِ المسیح"

نزولِ مسیح علیہ السلام کے متعلّق احادیث و آثارِ صحابہ کو اس میں بہت تفتیش و دیزہ ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔ جن کی تعداد تقریبًا سو تک پہنچ جاتی ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا اس پر ایک نفیس مقدمہ بھی ہے۔

(۴) "اِکفارُ المُلحدین فی ضروریاتِ الدّین"۔

۱۲۸ صفحات کا ایک عجیب و غریب رسالہ ہے جس میں کفر و ایمان کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالی گئی اور اصولی طور پر بحث کی گئی ہے کہ مدارِ ایمان کیا کیا امور ہیں اور کن عقاید و اعمال کے انکار سے کفر لازم آتا ہے اور کس قسم کے عقاید میں تاویل کرنا بھی موجبِ کفر ہے؟

اس موضوع پر سب سے پہلے امام غزالیؒ نے قلم اٹھایا تھا۔ "فیصلُ التفرقہ بین الاسلام والزندقہ" ان کا رسالہ مصر و ہندوستان میں عرصہ ہوا کہ شائع

ہوچکا ہے۔ اس رسالے کی عمدہ تحقیقات حضرت شیخ نے چند سطروں میں نقل فرمائی ہیں۔ عصر حاضر میں یہ ایک اہم ترین دینی خدمت تھی وہ حضرت نے پوری فرمادی۔ اس پر سارے علماءِ دیوبند کی رائیں اس لئے لکھوادی ہیں تاکہ اہلِ حق جماعت میں اس اہم ترین مسئلہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے۔

(۵) "خاتم النبیین"

یہ عقیدۂ "ختمِ نبوت" میں عجیب رسالہ ہے جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے لیکن دقیق۔ حضرت کا خاص اسلوب علمی کمالات اور وہبی نکات کے نمونے پورے طور پر جلوہ آرا ہیں۔

حضرت مولینا سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی ایک دفعہ ایک مکتوب میں تحریر فرمایا تھا کہ بہت دقیق ہے۔ عام لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

(۶) "فصل الخطاب فی مسئلۃ اُمّ الکتاب"

مسئلۂ "فاتحہ خلف الامام" جو عہدِ صحابہؓ سے لیکر آج تک معرکۃ الآراء موضوع رہا ہے۔ اس پر ۱۰۶ صفحات کا محققانہ رسالہ ہے۔ حدیثِ عبادہ بروایت محمدؒ ابن اسحاق کی عجیب وغریب تحقیق کی گئی۔ بڑی تدقیق کے ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کردیا گیا ہے۔ لفظ "فصاعداً" کی تحقیق میں ۱۲، ۱۳ صفحات پر مشتمل دقیق ترین مضمون آگیا ہے۔ یہ مضمون چونکہ عام دسترس سے بالکل باہر تھا۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب معارف السنن شرح ترمذی (مخطوط) میں اس کی جدید اسلوبِ عصری سے اس کی تحلیل و تشریح کی ہے اور شگفتہ عربی میں اس کی تسہیل کی کوشش کی ہے۔

حضرت مولینا شبیر احمد صاحب عثمانی مرحوم کو ڈابھیل میں جب یہ مضمون سنایا تو نہایت محظوظ ہوئے اور بے ساختہ فرمایا کہ حق تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس مشکل ترین دقیق و غامض مضمون کی ایسی افصاح کی کہ شاید مقدور میں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

(۷) "خاتمۃ الخطاب فی فاتحۃ الکتاب"

مسئلۂ "فاتحہ خلف الامام" پر فارسی زبان میں لطیف رسالہ ہے۔ بلا مراجعتِ کتاب دو روز میں محرم ۱۳۲۰ھ میں یہ تالیف فرما چکے ہیں۔ مسئلہ پر جدید انداز میں استدلال ہے۔

حضرت مولینا شیخ الہند رحمۃ اللہ کی اس پر تقریظ بھی ہے۔ حضرت شیخ نے دقتِ نظر کی خوب داد دی ہے۔

(۸) "نیلُ الفرقدین فی مسئلۃِ رفع الیدین"

۱۴۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ مسئلۂ خلافیہ نماز میں رکوع سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو اُٹھانے کے موضوع پر نہایت عجیب انداز میں تحقیق فرمائی ہے اور نہایت انصاف سے محققانہ انداز میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ مسئلہ میں اختلاف عہدِ صحابہ سے ہے اور اس میں اگر اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ آیا رفع یدین کرنا بہتر ہے یا نہ کرنا بہتر ہے۔ جائز و ناجائز کا اختلاف نہیں۔ ضمنی طور پر بہت نفیس مباحث آ گئے ہیں۔

(۹) "بسطُ الیدین لِنیلِ الفرقدین"

سابق الذکر موضوع پر ۴۱ صفحہ کا رسالہ ہے۔ یہ رسالہ سابق "نیلُ الفرقدین" کا تکملہ ہے۔ اس موضوع پر قدماء محدثین سے لیکر متأخرین اور عصر حاضر تک بہت کچھ خامہ فرسائی ہو چکی ہے۔ اس پامال موضوع پر ایسے محققانہ اسلوب میں جدید استدلالات اور دقیق استنباطات پیش کرنا یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ الشیخ الامام محمد زاہد الکوثری اپنی کتاب "تأنیب الخطیب فیما ساقہ فی ترجمۃ ابی حنیفۃ من الاکاذیب" (ص۱۴۴) میں رقمطراز ہیں:۔

"رفع الیدین کے موضوع پر جانبین سے مخصوص کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اس موضوع پر بہترین کتابیں علامہ بر و بحر مولینا محمد انور شاہ صاحب کشمیری کی دو کتابیں ہیں۔ نیل الفرقدین و بسط الیدین جن میں سارا لبِّ لباب آ گیا ہے اور یہ شافی و کافی ہیں"۔ (ترجمہ)

در حقیقت صحیح قدر دانی ایسے محققین ہی کر سکتے ہیں۔

(۱۰) کشف السّتر عن صلوٰۃ الوِتر۔

مسئلۂ "وتر" کے بارے میں اُمّت میں جو اختلافات چلے آئے ہیں۔ کُل خلافیات سولہ سترہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں جو مشکل ترین وجوہ ہیں ان کی ایسی تحقیق و فیصلہ کُن تدقیق فرمائی ہے کہ کسی مُنصف مزاج کو مجالِ انکار باقی نہیں رہتا۔ رسالہ ۹۸ صفحوں میں تمام ہوا ہے دوسرے ایڈیشن میں بمقدار ایک ثُلث تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے۔ مسئلۂ آمین بالجہر، وضع الیدین علی الصدور وغیرہ مسائل کی تشفّی کُن تحقیق فرمائی گئی ہے۔ شروع میں خطبہ کے بعد ایک فصیح و بلیغ عربی کا قصیدہ ہے جو نہایت ہی مؤثر اور رقّت انگیز ہے۔ ہر حیثیت سے قابلِ دید ہے۔

(۱۱) ضرب الخاتم علیٰ حدوث العالم

"حدوثِ عالم" علم کلام و فلسفہ کا معرکۃُ الآراء موضوع ہے۔ اِس پر مُتکلّمین و فلاسفۂ اسلام نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ مستقل رسائل کا موضوعِ بحث رہا ہے۔ شیخ جلال الدین دوانی نے بھی اس پر ایک رسالہ "الزوراء" کے نام سے تصنیف کیا ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا ہے اور الٰہیات و طبیعیات اور قدیم و جدید فلسفہ کی رو سے اتنی کثرت سے دلائل و براہین قائم کئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور "حدوثِ عالم" کا مسئلہ نہ صرف یقینی بلکہ بدیہی بن جاتا ہے لیکن افسوس کہ حضرت نے ان براہین، دلائل اور شواہد کو چار سو شعر میں منظوم پیش کیا ہے ظاہر ہے کہ شعر کا دامن تفصیلات سے خالی رہتا ہے لیکن اس کے ایضاح و حل کے لئے ہزاروں حوالے کُتبِ متعلقہ کے دیئے گئے جن میں صدر شیرازی کی "اسفار اربعہ" فرید وجدی و بستانی کے دائرۃ المعارف خصوصیت رکھتی ہیں۔ راقم الحروف نے حضرت کے حکم سے متعلقہ حوالہ جات تقریباً ایک سو صفحات میں بڑی عرق ریزی سے جمع کئے تھے جس سے حضرت بے حد مسرور تھے اور میری اس ناچیز خدمت کو ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے سامنے بہت سراہا تھا۔ فرماتے تھے کہ اصل موضوع

تو "اثباتِ باری" تھا۔ لیکن عنوان میں ایک قسم کی شناعت تھی۔ اس لئے "حدوثِ عالم" کا عنوان تجویز کیا اور آخر میں دونوں کا مفاد ایک نکلتا ہے۔

(۱۲) مِرقاتُ الطارِم لحدوثِ العالَم

سابق الذکر موضوع پر ۶۲ صفحات میں رسالہ ہے۔ رسالہ کیا ہے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس رسالے میں ادلّہ و براہین کے استقصاء کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ یہ "ضربُ الخاتم" کے لئے مقدمات، تشریح اور تفسیر کا کام دیتا ہے۔ نظائر اور شواہد اس موضوع پر اتنے پیش کئے ہیں کہ عقل و بُرہان سے پہلے ذوق و وِجدان فیصلہ کر لیتا ہے۔ ترکی کے سابق شیخُ الاسلام مُصطفےٰ صبری جو قاہرہ میں جلاوطنی کے بعد مُقیم تھے اور ردِ مادیّین و دہریّین میں نہایت ہی متخصص جلیلُ القدر عالم تھے۔ ترکی و عربی میں اس موضوع پر متعدد کتابیں تالیف فرما چکے ہیں۔

۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۳۸ء میں یہ رسالہ ان کو راقمُ الحروف نے دیا تھا۔ مطالعہ فرمانے کے بعد اتنے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ فلسفہ و کلام کے دقائق کا اس انداز سے سمجھنے والا اب بھی کوئی دُنیا میں زِندہ ہے۔ اور پھر فرمایا۔

"جتنا کچھ آج تک اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے اس رسالہ کو اس سب پر ترجیح دیتا ہوں اور اس اسفار اربعہ (ان کے سامنے اس وقت تھی) پر اس رسالہ کو ترجیح دیتا ہوں۔[1]

پھر اس وقت "القول الفیصل" کے نام سے ردِ دہریّین میں ایک مبسوط کتاب تالیف فرما رہے تھے۔ اس میں اس رسالے سے بہت نقول لئے اور اس کتاب میں اس رسالہ کی بڑی تعریف کی۔

ایک حصّہ اس کا طبع ہو چکا ہے، نہ معلوم یہ عبارت اس حصّہ میں آگئی ہے یا نہیں ضِمناً اس رسالہ میں کلام و تصوّف الٰہیات و طبیعیات کے بہت سے حقائق کا فیصلہ فرمایا گیا ہے۔

(۱۳) اِزالۃُ الرّین فی الذبّ عن قرۃ العینین۔

حضرتِ شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رح کی مشہور کتاب "قرۃُ العینین فی تفضیل

---

[1] صرف ترجمہ نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ کرنیدو

الشیخین" کا حیدرآباد دکن میں کسی شیعی مزاج عالم نے رد لکھا تھا۔ حضرت امام العصر نے شاہ دہلویؒ کی تائید میں اس کی تردید لکھی۔ نہایت عمدہ کتاب ہے، ۱۹۶ صفحات میں چھپ گئی ہے۔ اس میں قال المولی المؤلف کہہ کر شاہ دہلویؒ کی عبارت نقل فرماتے ہیں۔[1] اس کتاب کا ایک نسخہ مجھے کشمیر میں مِلا تھا۔ ابتداء سے ۸ صفحے غائب ہیں۔ اس لئے نام مجھے نہ معلوم ہو سکا اور سوء اتفاق سے حضرت شیخ سے پوچھنے کی نوبت نہ آئی۔ "ازالۃ الرین" میرا تجویز شدہ نام برائے نام ہے۔

(۱۴) "سَہمُ الغیب فی کبد اھل الرَّیب"

تاریخی نام: "قِسِیُّ سہم الغیب"

ہندوستان کی سرزمین میں جہاں بدقسمتی سے بہت سے بدعات اور عقائد شرکیہ بعض سادہ لوح مسلمانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔

وَمِنْ ایک ان میں سے "عِلمِ غیب" کا عقیدہ ہے اور سید احمد رضا خاں صاحب بریلوی اور ان کے اتباع نے اس کو علمی رنگ میں پیش کیا اور ایک عرصہ تک ہندوستان میں یہ موضوعِ بحث رہا۔ ایک بریلوی شخص نے اس میں ایک رسالہ لکھا اور اہلِ حق کے مسلک کے خلاف اپنے نامۂ عمل اور نامۂ قرطاس کو سیاہ کیا۔ اور اپنا نام عبدالحمید دہلوی ظاہر کیا۔ حضرت شیخ کا قیام اس زمانہ میں دہلی میں تھا۔ آپ نے جواب ترکی بہ ترکی عبد المجید بریلوی کے نام منسوب کر کے اس کا جواب شائع فرمایا۔ رسالہ کے آخر میں حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولینا شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی رحمہم اللہ کے مناقب میں عربی میں ایک قصیدہ ہے۔ رسالہ کی زبان حضرت شیخ کے عام تصنیفی مذاق کے خلاف اُردو ہے۔

یہ چودہ تصانیف تو امام العصر شاہ صاحبؒ کی وہ ہیں کہ اپنے قلم سے تالیف فرما چکے ہیں۔

---

[1] قال المعترض سے تردید کرنیوالے کی عبارت اور اَقُوْلُ سے اس کی تردید فرماتے ہیں۔ مِنْہُ۔

اِمامُ العصر حضرت شاہ صاحبؒ کی دوسری قسم کی تصنیفات

دوسری قسم کی وہ تصنیفات ہیں کہ آپ کی یادداشتوں سے مرتّب کی کی گئی ہیں۔ ان کتابوں کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے۔

(۱) "مُشکلاتُ القرآن"

قرآنِ کریم کی جن آیاتِ کریمہ کو مُشکل خیال فرمایا تھا۔ خواہ وہ اِشکال تاریخی اعتبار سے ہو یا کلامی حیثیت سے۔ سائینس کی رو سے ہو یا کسی عقلی پہلو سے یا علومِ عربیت و بلاغت کی جہت سے ہو ان پر یادداشت مرتّب فرمائی تھی۔ اگر کہیں اس پر عمدہ بحث کی گئی ہے، اس کو نقل فرمایا، حوالہ دیا اور نہیں تو خود غور و فکر کے بعد جو حل سانح ہُوا تحریر میں لایا گیا۔ یہ یادداشت بہ شکلِ مسوّدات مختلف اوراق میں موجود تھی۔ مجلسِ علمی ڈابھیل نے مرتّب کر کے اسے شائع کیا اور راقم الحروف نے مجلسِ علمی کی خواہش پر "یتیمۃُ البیان" کے نام سے ۴۸ صفحہ کا اس کا مبسوط مُقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب ۲۸۷ صفحات پر ختم ہوئی۔ قرآنی علوم اور قرآنی معارف کا نہایت بیش قیمت گنجینہ ہے۔ اگر جدید اسلوب سے اس کو پھیلایا گیا تو ایک ہزار صفحات میں کہیں جاکر کتاب ختم ہوگی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کے متعلق کچھ اور مسوّدات بھی نکل آئے تھے، جن کی زیورِ طبع سے آراستہ ہونے کی نوبت ابھی نہیں آئی۔

(۲) "خزینۃُ الاسرار"

یہ ایک رسالہ ہے جس میں کچھ اوراد و ادعیہ کچھ مجرّبات و اذکار وغیرہ جمع کئے گئے ہیں۔ یہ سب علامۂ دمیری کی کتاب "حیٰوۃُ الحیوان" کے اقتباسات ہیں۔ کہیں کہیں حضرت شاہ صاحب کی طرف سے اِضافات بھی ہیں۔ یہ رسالہ حضرت کے قدیمی مسوّدات جو کشمیر میں تھے ان میں دستیاب ہُوا تھا۔ مجلسِ علمی ڈابھیل نے اس نام سے شائع کیا۔

(۳) "فیض الباری بشرح صحیح البخاری"

یہ حضرت شاہ صاحب کے درسِ صحیح بخاری کی اِملائی شرح ہے جس کو حضرت مولینا بدرِ عالم صاحب میرٹھی مہاجرِ مدینہ نے کئی سال کی محنت وعرق ریزی کے بعد فصیح و بلیغ عربی زبان میں مرتّب کیا ہے۔ یہ حضرت امامُ العصر کے علوم و کمالات کی سچّی تصویر پیش کرتی ہے۔ جہاں حافظ شیخُ الاسلام بدرُ الدین عینی اور قاضی القضاۃ حافظ ابن حجر عسقلانی جیسے بلند پایہ محقّق و شارحین عاجز آگئے ہیں وہاں شیخ کے خصائصِ کمالات جلوہ آرا نظر آئیں گے۔ زیادہ تر اعتنا اِن ہی معارفِ حدیث کا کیا گیا، جہاں شارحین ساکت نظر آتے ہیں۔ حضرت شیخ کے آخری عمر کے مجرب علوم و اذواق خصوصی احساسات و علمی خصوصیات، دِقّتِ نظر و تحقیقی معیار کے نمونے اہلِ علم و یارانِ نکتہ داں کے لئے صلائے عام دے رہے ہیں۔ یہ چار ضخیم جلد کا بحرِ بیکراں مصر میں آب و تاب سے شائع ہوا ہے۔ قرآن و حدیث، فلسفہ و کلام اور معانی و بلاغت وغیرہ کے نہایت بیش بہا ابحاث سے مالامال ہے۔ (اس پر راقم الحروف اور حضرت جامع و مرتب کے قلم سے دو مبسوط مقدمے ہیں، ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے) عام عبارت نہایت شگفتہ و سلیس ہے۔ بعض بعض مقامات میں خاص ادبی لطافت ہے۔

(۴) العرف الشذی بشرح جامع الترمذی۔

یہ حضرت شاہ صاحب کی درسِ جامع ترمذی کی املائی شرح ہے جس کو جناب مولینا محمد چراغ صاحب ساکنِ ضلع گجرات نے بوقتِ درس قلم بند کیا ہے اور زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکی ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا ہے۔ جامع ترمذی کے مشکلات احادیث احکام پر محقّقانہ کلام ہر موضوع پر عمدہ ترین کبارِ اُمت کے نقول اور حضرت کی خصوصی تحقیقات کا ذخیرہ ہے۔ طلبۂ حدیث اور اساتذۂ حدیث پر عموماً اور جامع ترمذی کے پڑھانے والوں پر خصوصاً اس کتاب کا بڑا احسان ہے۔

(۵) اَنْوَارُ الْمَحْمُوْد فی شرح سُنَنِ اَبی دَاؤد

یہ سُنَنِ ابی داؤد کے درس کی اِملائی تقریر و شرح ہے جس کو مولینا

محمد صدیق صاحب نجیب آبادی مرحوم نے جمع کر کے شائع کیا ہے۔ کُل دلو جلدوں میں ہے۔ مرتب وجامع نے بہت سی کتابوں کی اصلی نقول کو مراجعت کر کے لفظ بلفظ درج کر دیا ہے۔ کتاب کے تسمیہ میں حضرت شاہ صاحب اور ان کے شیخ حضرت شیخ الہند کے نام کی تلمیح کی گئی ہے۔

(۶) صحیح مسلم کی اِملائی شرح

سُنا ہے کہ ہمارے محترم دوست فاضل گرامی جناب مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی نے صحیح مسلم کے درس کی تقریر بہ قلم بنا فرمائی تھی یہ اب تک نہ طبع ہوئی نہ راقم الحروف کو دیکھنے کا شرف حاصل ہُوا ہے۔

(۷) حاشیہ سُننِ ابی ماجہ

جناب محترم مولینا سیّد محمد ادریس صاحب سکروڈوی سے سُنا تھا کہ آپ نے سُننِ ابنِ ماجہ پر کتاب کے حواشی و ہوامش پر تعلیقات اپنے قلم سے لکھی تھیں۔ راقم الحروف کو اس کے دیکھنے کا اِتفاق نہیں ہُوا۔

یوں تو حضرت نے جن کتابوں پر تعلیقات لکھی ہیں، اگر استقصاء کیا جائے تو متعدد کتابیں نکل آئیں گی۔

"الاشباہ والنظائر" جو ابن نجیم کی فقہ میں مشہور کتاب ہے اس پر تعلیقات حضرت کے قلم سے خود میں نے کشمیر میں دیکھے ہیں۔

یہ کُل اکیس (۲۱) کتابیں ہوئیں جن سے حضرت امام العصر کے کمالات کے کچھ پہلو نمایاں ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی پوری حقیقت اسوقت منکشف ہوتی کہ کتاب کے مضامین یا خصوصیات کا واضح تعارف کراتا اور جن مشکل ابحاث میں حضرت کے کمالات نظر آرہے ہیں، ان کی تفصیلات سامنے آتیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ کسی مقالے کے لئے موزون نہیں، تفصیلی تبصرہ اور علوم ومعارف کے نمونے پیش کرنے کے لیے ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہے۔

راقم الحروف کی کتاب "نفحۃ العنبر" جو حضرت کی حیاتِ طیبہ کے چند

صفحے ہیں اس میں کچھ تفصیلات ناظرین کو ہاتھ آئیں گی۔ تالیفات کے متعلق جو کچھ وہاں لکھا ہے اگر اس کی تشریح ہی کی جائے تو اس مقالہ سے کہیں زیادہ ہو گا۔ اس وقت بہت عجلت و ارتجال میں چند سطریں لکھنے کی توفیق ہوئی۔ حضرت امام العصر کے کمالات کا کوئی گوشہ بھی لیا جائے تو تفصیل کے لئے داستان کی ضرورت ہے اور جی چاہتا ہے کہ قلم اپنی جولانیاں دکھلاتا رہے۔

مدحتُكَ جهدی بالّذی انتَ اهلُهٗ
فَقَصّرَ عمّا صالحٌ فیلِ منِ جهدی

میں نے چاہا کہ جس تعریف کے آپ مستحق ہیں اتنی تعریف کر سکوں لیکن میری کوشش ناکام رہی۔ ؎

فما كلُّ مافیهِ مِنَ الخیرِ قلتهُ
ولا كلُّ مافیهِ یقولُ الّذی بعدی

جو کمالات اُن میں ہیں نہ میں کہہ سکا اور نہ میرے بعد آنے والا کہہ سکے گا۔» (حیاتِ انور)

نوٹ:۔ مندرجۂ صدر تصنیفات کے علاوہ بھی چند مزید کتابیں ہیں جن کا مختصر تذکرہ ذیل ہے:۔

۱۔ "معارف السُّنَن" کے نام سے سُنَنِ ترمذی کے کئی جز مجلسِ علمی کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ اس کتاب کے فاضل مؤلف و مُرتّب حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوری ہیں۔

۲۔ "انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری" از مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری تلمیذ حضرت شاہ صاحبؒ۔ یہ اردو میں بخاری شریف کی مشہور شرح ہے جو مجموعی طور شاہ صاحب کے علوم کی آئینہ دار ہے۔

۳۔ "الاتحاف لمذہب الاحناف" مرتبۂ مولانا محمد بن موسیٰ میاں سملکی (تلمیذ حضرت شاہ صاحبؒ) ۲۶۸ صفحات پر مشتمل اس نسخہ کو مولانا موصوف نے ۱۹۵۹ء میں لندن میں آفسیٹ پر شائع کیا ہے۔

۴۔ "النور الفائض علی نظم الفرائض"۔ فارسی زبان میں ۱۹۲ اشعار پر مشتمل ایک نظم حضرت شاہ صاحب نے مولانا فخر الدین احمد کو بطورِ یادگار عنایت فرمائی تھی، جسے موصوف نے کچھ اضافوں کے ساتھ طبع کرا دیا۔ یہ نظم علم میراث پر ہے۔

۵۔ خلاصۂ تقاریر:۔ یہ رسالہ اردو زبان میں ہے، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب کے ان خطبات کا خلاصہ ہے جو آپ نے وفات سے کئی سال پہلے سرینگر میں ارشاد فرمائے ہیں۔

۶۔ "نمونۂ حفظِ ایمان" دو جز۔ تردیدِ قادیانیت میں۔ یہ چند ورقی ٹریکٹ اُردو زبان میں ہیں۔

(کوند)

اے کہ تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم!

از حضرتِ مولینا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی مدظلہٗ العالی
(ایم، اے۔ فاضلِ دیوبند)
سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ و صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

"مولینا سعید احمد صاحب اکبر آبادی دامت فیوضہم بر صغیر ہند و پاک کے ممتاز و مقتدر علماء میں سے ہیں۔ آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے قابلِ فخر شاگرد ہیں اور اکثر فرماتے ہیں کہ مجھے ہر قدم پر یہ محسوس ہوا ہے کہ میرا وجود معنوی حضرت الاستاذ کی ہی غیر معمولی شفقت اور حسنِ تربیت کا مرہونِ کرم ہے" حضرت موصوف پہلے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں استاد اور پھر مدرسۂ عالیہ کلکتہ میں کئی سال تک پرنسپل رہے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں شعبۂ دینیات کے سربراہ (DEAN FACULTY OF THEOLOGY) مقرر ہوئے۔

اپنے شفیق استاد اور مربی حضرت شاہ صاحبؒ کی ذاتِ گرامی کے ساتھ اُنہیں کتنی عقیدت ہے اس کا اندازہ راقم الحروف کے نام اُن کے مندرجۂ ذیل مکتوبِ گرامی سے لگایا جا سکتا ہے۔

"نئی دہلی
۷۸۶
۲۴، اگست ۱۹۷۵ء

محبِ محترم و مکرم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔

آپکا محبت نامہ آیا تھا مگر میں کلکتہ چلا گیا تھا۔ اسلئے افسوس ہے جواب میں تاخیر ہوئی۔ معذرت خواہ ہوں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کس درجہ گہرا تعلق تھا اور اس طرح حضرت مجھ پر کس درجہ شفیق اور مہربان تھے۔ میں جو کچھ بھی ہوں اور میں نے جو کچھ پایا ہے وہ سب حضرتؒ کے فیضِ تلمذ و صحبت کا عطیہ ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے مجھے کشمیر، کشمیر کے لوگ اور ہر وہ چیز جس کا حضرت شاہ صاحبؒ سے تعلق ہے دل سے عزیز ہے۔ اس بنا پر میں آپکو بھی عزیز رکھتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم اور تندرست رکھے۔ آمین۔ برادرِ مکرم مولینا مسعودی صاحب کو میرا بہت بہت سلام عرض کیجئے اور مزاج پرسی بھی۔

مخلص،
سعید احمد اکبر آبادی"

مولینا اکبرآبادی صاحب کثیر التصانیف ہیں، ان کی چند مشہور اور معرکۃ الآراء کتابوں کے نام یہ ہیں :-

فہم قرآن، وحی الٰہی، مولینا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال، اور سیرتِ ابوبکر صدیق رضؓ

مولینا موصوف آج کل ندوۃ المصنفین دہلی کے مشہور علمی اور تحقیقی ماہنامہ رسالہ "برھان" کے ایڈیٹر اور انسٹیچوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ (نئی دہلی) سے وابستہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھے۔ (آمین!)

کوثر ندوی
عفی اللہ عنہٗ

حضرت الاُستاذ اپنی ذات سے چند در چند علمی کمالات و فضائل کے باعث ایک انجمن اور صحیح معنیٰ میں اس شعر کا مصداق تھے ۔

لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ ❊ اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِی وَاحِدٍ

خود میرا اپنا حال یہ تھا کہ عُلماءِ سلف کے شوقِ علم، وُسعتِ مُطالعہ قوّتِ حفظ، ذہانت، غیر معمولی وُسعتِ علم و عمیق نظر وغیرہ اور ان کے علمی و ذہنی کمالات سے مُتعلّق ایک دو نہیں سینکڑوں حیرت انگیز واقعات پڑھے تھے۔ میں انکو پڑھتا تھا اور دل میں خیال کرتا تھا کہ مؤرخین نے اپنی عام عادت کے مُطابق رائی کو پہاڑ بنا کر پیش کر دیا ہے۔ ورنہ ایک انسان میں بیک وقت اتنے کمالات کیونکر جمع ہو سکتے ہیں. مُدّتوں دماغ پر یہی خیال مُسلّط رہا لیکن جب حضرت شاہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھا اور حضرتِ موصوف کی صحبت میں بیٹھ کر سمندر سے کچھ قطرے حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی تو اب معًا وہ پہلا خیال بدلا اور یقین ہو گیا کہ جب عالمِ اسلامی کے انتہائی دورِ زوال میں بھی دیوبند نامی ایک قصبہ کے اُفق سے ایک ایسی شخصیت بُلند ہو سکتی ہے جو حفظِ حدیث میں حافظ ابنِ حجر عسقلانی اور علّامہ عینی و قسطلانی. کُتبِ قدیمہ کے علم و تبحر میں حافظ ابنِ تیمیہ اور حافظ ابنِ قیم، علمِ معانی و بیان میں سعدالدین تفتازانی اور فخرِ خوارزم جاراللہ زمخشری، منطق اور فلسفہ میں مُلا محبّ اللہ بہاری اور صدرالدین شیرازی، عربی میں جاحظ اور بدیع الزمان ہمدانی کا اور فارسی شعر و سخن میں خاقانی و انوری کا ہم پایہ اور حریف و ہمسر ہو تو پھر یہ کیونکر مُستبعد اور عقلاً محال ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اور مُسلمانوں کے دورِ شباب و ترقّی میں ایسے عُلماءِ اعلام پیدا ہوئے ہوں جن کی نظیر مادرِ گیتی کے بطن سے آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ گویا حضرت شاہ صاحبؒ کو دیکھ کر اپنے عُلماءِ سلف کی عظمت کا صحیح احساس پیدا ہُوا اور پہلی مرتبہ یہ محسوس ہُوا کہ اتنے ائمۂ سلف کی نسبت جو واقعات تاریخ کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں وہ مُبالغہ پردازی نہیں بلکہ واقعات

کا اصل اور بے کم و کاست بیان ہے ؎

جب تک نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

اس بناء پر حضرت شاہ صاحب کا حق کسی درجہ میں اُسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب کہ تن تنہا کوئی ایک شخص نہیں بلکہ ایک مجلس کی شکل میں مختلف علوم و فنون کے ماہر چند علماء ایک جگہ یکسو ہو کر بیٹھ جائیں اور وہ اپنے اپنے ذوق و استعداد کے مطابق حضرت شاہ صاحب کی تصنیفات و تالیفات اور رسائل و مقالات کا گہری نظر سے مطالعہ کر کے یہ معلوم کریں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا کس علم و فن میں صحیح مرتبہ و مقام کیا ہے اور اس علم و فن کے دوسرے ائمہ کے بالمقابل حضرت مرحوم کے امتیازات و مختصات کیا ہیں؟ حضرت شاہ صاحبؒ کا اصل میں جو ان کے لئے بقائے دوام اور حیاتِ جاوید کا ضامن ہے، وہ ہر علم و فن میں اُن کا یہی امتیاز و اختصاص ہے۔ اس بناء پر حضرت مرحوم کی کوئی سوانح عمری اُس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس میں انہیں علمی امتیازات و مختصات پر کما حقہٗ روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔

حضرت الاستاذ کا یہی علمی جاہ و جلال تھا جس کے باعث بڑے بڑے فضلاء عصر جو مسلک و مشرب کے لحاظ سے حضرت الاستاذ سے کھلا ہوا اختلاف رکھتے تھے۔ حضرت سے جب کبھی دوچار ہوتے تھے تو ان کے لئے علم و فضل کے اس مسند نشین یگانہ کے سامنے سر اطاعت و حلقہ بگوشی خم کرنے کے سوا چارہ نہ رہتا تھا۔ علامہ سید رشید المصری قاہرہ کے نامی گرامی علمی و دینی ماہنامہ "المنار" کے ایڈیٹر، تفسیر المنار اور بیسیوں بلند پایہ علمی کتابوں کے نامور مصنف، مفتی محمد عبدہٗ اور سید جمال الدین افغانی کے مخصوص صحبت یافتہ و جانشین، خود عرب اور عربی کے بلند پایہ ادیب و انشاء پرداز اور خطیب و مقرر تھے۔ ان تمام اوصاف و کمالات کے باوجود عالم اسلام کی جب اس نامور شخصیت نے دار العلوم دیوبند کی مسجد میں حضرت الاستاذ کی تقریر عربی زبان میں سنی جو مسلسل ایک گھنٹہ تک جاری رہی تھی اور جس کا

اصل موضوع "حدیث اور علمائے دیوبند" تھا۔ تو یہ مصری عالم سر تا پا حیرت بنا ہوا تھا اور آخر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندوستان کے سفر میں اسے مولانا محمد انور شاہ کی زیارت و ملاقات کا اور موصوف کی یہ تقریر سننے کا موقع نہ ملتا تو وہ سمجھتا کہ وہ ہندوستان کے سفر سے تہی داماں آیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کو کون نہیں جانتا۔ ایک نامور فلسفی شاعر ہونے کے علاوہ فلسفہ کے دقیق النظر عالم تھے۔ نیز فلسفۂ یونانی اور اسلامی کے ساتھ ساتھ عہدِ حاضر کا فلسفۂ مغرب بھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کا اسلامیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے بَرملا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنی انگریزی زبان کے چھ لیکچروں[1] کی تیاری میں حضرتُ الاُستاذ سے کافی مدد لی ہے۔ یہاں شاید اس واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ حضرتُ الاستاذ کا ایک منظوم رسالہ حدوثِ عالم کی بحث پر ہے۔ یہ رسالہ تو حجم میں بہت مختصر ہی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ (حدوثِ عالم) پر سارے قدیم و جدید فلسفہ کا عطر اور اُس پر تنقید ہے اور اس بناء پر جب تک کوئی شخص فلسفہ کا اچھا اور مُبصر عالم نہ ہو وہ اس رسالہ سے پورے طور پر نفع حاصل نہیں کرسکتا۔ یہ رسالہ چھپ کر آیا تو اُس کا ایک نسخہ حضرتُ الاُستاذ نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے پاس بھی تحفۃً ارسال فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اُس کے اعتبار سے اُن کے لئے کوئی تحفہ اس چند ورقی رسالہ سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا۔ میں اُس زمانہ میں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں مُقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر اُن کی علمی و ادبی مجلس سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کو معلوم تھا کہ مجھ کو حضرت شاہ صاحبؒ کے ادنیٰ درجہ کے تلامذہ میں سے ہی ہونے کا شرف

---

[1] یہ لیکچر "THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM" کے نام سے چھپے ہوئے ہیں اور بہت مشہور ہیں۔

حاصل نہیں ہے بلکہ اُس بارگاہِ علم و فضل میں شخصی تقرّب و اختصاص کا مرتبہ بھی میسر ہے اس بناء پر میرے ساتھ کرم و شفقتِ بزرگانہ کا معاملہ کرتے تھے اور جب کبھی حاضر ہوتا گھنٹوں بڑی بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ مختلف اسلامی مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔ اسی قسم کی ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ "میں تو مولانا انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قَالَ اللّٰہ اور قَالَ الرَّسُولؐ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی اُن کو اس درجہ درک و بصیرت اور اُس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوثِ عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔" اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا "اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا، میں نے اُن پر نشان لگا دیا ہے آپ دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحبؒ سے اُن اشعار کا مطلب دریافت کرکے آئیں۔" میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش کرکے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہنچایا لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو اُن اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اُسی میں اُن اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لے کر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہنچا دیا۔

یہ حکیم الامّت جس نے خود اپنے متعلق کہا تھا ؎

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

اُس کے دل میں حضرت الاستاذ کی کس درجہ عظمت تھی اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند میں اختلاف کے باعث جب حضرت الاستاذ نے اپنے عہدۂ صدر الاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند

روز بعد میں ایک دِن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ فرمانے لگے کہ "آپ کا یا دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تأثر ہو، میں بہرحال شاہ صاحب کے استعفے کی خبر سُن کر بہت خوش ہُوا ہوں"۔ میں نے بڑے تعجّب سے عرض کیا "کیا آپ کو دارُالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ مَلال نہیں ہے؟" فرمایا "کیوں نہیں؟ مگر دارُالعلوم کو تو صدرُ المدرّسین اور بھی مِل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے اب جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اُس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس میں زندگی کے اُن سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دُنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کو میں اور شاہ صاحب دونوں مِل کر ہی کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالمِ اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیمُ الشان ذمّہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا:-

"یہ مسائل کیا ہیں اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں ایک عرصے سے ان کا بڑے غور سے مُطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے۔ اس طرح ہم دونوں کے اشتراک وتعاوُن سے فقۂ جدید کی تدوین عمل میں آجائیگی"۔

چنانچہ باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ اسی جذبہ کے تحت ڈاکٹر صاحب مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح شاہ صاحب دیوبند کی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لاہور تشریف لے آئیں اور وہیں مُقیم ہو جائیں لیکن افسوس کہ حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ایسا نہ ہو سکا اور حضرت شاہ صاحبؒ لاہور کے بجائے ڈابھیل تشریف لے گئے جس کا ڈاکٹر صاحب کو بڑا ملال اور

صدمہ ہُوا۔

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ پنجاب کے خصوصاً اور ہندوستان کے عموماً انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں قادیانی فتنہ کی شر انگیزی و اسلام کُشی کا جو احساس پایا جاتا ہے اُس میں بڑا دخل ڈاکٹر اقبال مرحوم کے اُس لیکچر کا ہے جو ختم نبوّت پر ہے اور ساتھ ہی اُس مقالہ کا ہے جو انگریزی میں قادیانی تحریک کے خلاف شائع ہُوا تھا۔ لیکن یہ شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ان دونوں تحریروں کا اصل باعث حضرتنا الاستاذ مولینا محمد انور شاہ رح ہی تھے۔

ایک مرتبہ حضرت شاہ صاحب انجمنِ خُدّامُ الدّین کے کسی سالانہ اجتماع میں شرکت کی غرض سے لاہور تشریف لے گئے تو ڈاکٹر صاحب ملاقات کے لئے حضرتِ موصوف کی قیام گاہ پر آئے اور پھر ایک دِن اپنے ہاں رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ دعوت کا صرف ایک بہانہ تھا ورنہ اصل مقصد علمی استفادہ تھا۔ چنانچہ کھانے سے فراغت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ختم نبوّت اور قتلِ مُرتد کا مسئلہ چھیڑ دیا جس پر کامل ڈیڑھ ڈھائی گھنٹہ تک گفتگو رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی عادت یہ تھی کہ جب وہ کسی اسلامی مسئلہ پر کسی بڑے عالِم سے گفتگو کرتے تھے تو بالکل ایک طالب علمانہ انداز سے کرتے تھے۔ مسئلہ کے ایک ایک پہلو کو سامنے لاتے اور اُس پر اپنے شکوک و شبہات بے تکلفانہ بیان کرتے تھے۔ چنانچہ اب اس وقت بھی انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحبؒ کے بیان کردہ شکوک و شبہات اور ایرادات و اعتراضات کو بڑے صبر و سکون کے ساتھ سُنا اور اس کے بعد ایک ایسی جامع اور مُدلّل تقریر کی کہ ڈاکٹر صاحب کو ان دو مسئلوں پر اطمینانِ کُلّی ہو گیا اور جو کچھ خلش اُن کے دِل میں تھی وہ جاتی رہی اور اس کے بعد ہی انہوں نے ختم نبوّت پر وہ لیکچر تیار کیا کہ جو اُن کے چھ لیکچروں کے

مجموعہ میں شامل ہے اور قادیانی تحریک پر وہ ہنگامہ آفرین مقالہ سپردِ قلم فرمایا جس نے انگریزی اخبارات میں شائع ہو کر پنجاب کی فضا میں تلاطم برپا کر دیا تھا۔

بہرحال یہ دو، تین واقعات صرف اس غرض سے لکھے گئے ہیں کہ جن لوگوں کو براہِ راست یا تصنیفات و تالیفات کے ذریعہ حضرت الاستاذ کے بحرِ ناپیدا کنارِ علم سے جرعہ نوشی کا موقع نہیں ملا، وہ ایک جوہرِ گرانمایہ کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی سے کر سکیں کہ دُنیا کے جوہریوں کی رائے اس کے متعلق کیا تھی؟

شکل و صورت

قدرت نے حضرت الاستاذ کو جس طرح اقلیمِ علم کی تاجداری عطا فرمائی تھی اسی طرح جسمانی ہیئت، ڈیل ڈول، قد و قامت اور شکل و صورت میں بھی ایک خاص امتیاز عطا فرمایا تھا۔ مجھ کو ہندوستان، مصر و حجاز اور دوسرے ممالکِ عربیہ کے بڑے بڑے علماء و مشائخ کو دیکھنے کا موقع مِلا ہے لیکن جو وجاہت، جو وقار و متانت، جو دِل کشی، اور جو جاذبیت میں نے حضرت الاستاذ میں پائی وہ کہیں کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ ہزار علماء میں بھی بیٹھتے تو سب سے ہی الگ اور سب سے ہی نمایاں رہتے۔ دیکھنے والوں کی نگاہ اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہیں پر جا کر ٹھیرتی اور پھر جمتی تو اس طرح کہ وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتی۔ کشمیری الاصل تھے اس لئے خوب کھُلا ہوا سپید رنگ، کشیدہ و درازہ قامت، چوڑا چکلا سینہ، دوہرا اور گداز جسم، بڑی بڑی مگر رسیلی اور شرمیلی آنکھیں، کُشادہ و فراخ پیشانی، طویل مگر ستواں بینی، بڑے بڑے کان، پُر گوشت اور فربہ چہرہ، ابریشم اور حریر کی مانند نرم و سبک جلد۔ چلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ علم کا ایک کوہِ گراں سبک گامی کر رہا ہے، بیٹھتے تھے تو محسوس ہوتا تھا کہ علم و فضل کا ایک آفتاب نظامِ شمس

سے وابستہ ستاروں کو اپنے اردگرد لے کر بیٹھ گیا ہے۔ وہ سر پر کبھی سفید اور کبھی سبز عمامہ اور قامتِ بالا پر سبز قبا استعمال کرتے تھے۔ دیکھنے والے ڈرڈر کے دیکھتے تھے کہ کہیں نظر نہ لگ جائے کیونکہ فرمانِ نبوی ؐ ہے:
"اَلْعَیْنُ حَقٌّ"۔

غرض کوئی ایک ادا ہو تو اُس کا ذکر کیجئے، کوئی ایک خوبی ہو تو اس کو بیان کیا جائے۔ جہاں عالم یہ ہو کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم ❊ کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

وہاں خاموشی کو ہی ترجمانیٔ دل کا منصب تفویض کر دینے کے سوا اور کیا چارہ ہے۔

لطافتِ طبع

اسی حُسن و جمالِ ظاہری و باطنی کے باعث طبیعت میں لطافت بھی بہت زیادہ تھی۔ بہت صاف اور اُجلے کپڑے پہنتے تھے۔ غذا میں بھی روٹی، گوشت وغیرہ جیسی چیزیں رغبت سے نہیں کھاتے تھے۔ البتہ تازہ پھلوں اور طیور کے عاشق تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ بیس ۲۰ سال میری زندگی میں ایسے گذرے ہیں کہ میں نے پرندوں کے علاوہ کوئی اور دوسرا گوشت کھایا ہی نہیں

۱۹۲۸ء میں حضرتُ الاستاذ اپنی جماعت کے ساتھ جس میں حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد عثمانی رحؒ، مولانا سید سراج احمد صاحب رشیدی، مولانا محمد حفظُ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا بدرِ عالم، مولانا عتیقُ الرحمٰن عثمانی اور مولانا محمد ادریس صاحب سکروڈوی شامل تھے، راقمُ الحروف کی شادی میں شرکت فرمانے کے لئے آگرہ تشریف لائے (خیال جہ اس خاکسار کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ نکاح حضرت الاستاذ ہی نے پڑھا ہے) تو اگرچہ قبلہ والد صاحب مرحوم نے اس جماعتِ مقدسہ کی ضیافت کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کے باورچی کا الگ انتظام کر دیا تھا، جو دونوں وقت عُمدہ قسم کے

کھانے تیار کرتا تھا لیکن آگرہ کے نواح میں ایک مقام ہے مٹو۔ یہاں کے خربوزے مشہور ہیں؛ اتفاق سے یہ موسم انہیں خربوزوں کی فصل کا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے پہلی مرتبہ ایک خربوزہ کھایا تو بے حد پسند آیا اور والد صاحب سے فرمایا بس ڈاکٹر صاحب! اگر آپ میری خاطر تواضع کرنی چاہتے ہیں تو سُن لیجیے۔ مجھ کو آپ کی بریانی، قورمہ اور کوفتوں وغیرہ سے غرض نہیں، آپ میرے لئے تو یہ انتظام کیجیے کہ مٹو کے خربوزوں کا ایک ٹوکرہ ہر وقت بھرا ہوا میرے پاس رکھا رہے اور ساتھ ہی ایک چھری، دو پلیٹیں اور ایک طشت اور ایک بالٹی یہ چیزیں بھی رکھ دیں تاکہ میں جس وقت اور جس قدر بھی کھانا چاہوں کھا سکوں!' قبلہ والد صاحب نے ارشاد کی تعمیل کی اور پھر تو حضرت الاستاذ کا حال یہ تھا کہ کھانا برائے نام کھاتے تھے اور شکم سیری خربوزوں سے کرتے تھے۔ بھنے ہوئے مُرغ کے بھی بڑے قدرداں تھے۔

اخلاق علم و فضل میں جو سربلندی و سرفرازی اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی تھی اسی تناسب سے اخلاق بھی نہایت بلند اور پاکیزہ تھے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی سائل حضرت الاستاذ کے پاس آیا ہو اور وہ نامراد گیا ہو۔ جیب میں اس وقت جو کچھ ہوتا، روپیہ ہو یا اٹھنی سائل کے حوالہ کر دیتے۔ ایسی بات کہنے سے احتراز فرماتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ ایک مرتبہ امرتسر تشریف لے گئے وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر صاحب بھی بربنائے عقیدت خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ بیرسٹر صاحب ڈاڑھی مونچھ صاف رکھتے تھے اس لئے حضرت الاستاذ کے سامنے بیٹھے ہوئے شرمندگی سی محسوس کر رہے تھے اور بھنچے بھنچے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت الاستاذ نے اُن کی یہ دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا: "بیرسٹر

صاحب! آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہو رہے ہیں؟ ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض و غایت دونوں کی ایک ہی ہے۔ یعنی دُنیا کمانا! میں اگر مولوی ہو کر داڑھی نہ رکھوں تو مجھے کوئی روٹی نہ دے۔ اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہو کر داڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر شخص کہے گا کہ ان کو بیرسٹر کس نے بنایا ہے؟ یہ تو مُلاجی ہیں، تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام کی روٹی نہ ملے۔ پس جب ہم دونوں کی غرض ایک ہی ہے تو محض اختلافِ فعل پر آپ کیوں شرمندہ ہوں؟

مزاح

مزاح لطافتِ طبع کی نشانی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ بھی گاہے گاہے بہت لطیف قسم کا مزاح فرماتے تھے۔

ایک واقعہ لکھتا ہوں جس سے اندازہ ہو گا کہ حضرتُ الاستاذ کو مزاح کے ساتھ ساتھ چھوٹوں کی دلجوئی اور اُن کی دل دہی کا کس قدر خیال رہتا تھا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ حضرتُ الاستاذ میری شادی میں شریک ہوئے اور حضرت نے ہی میرا نکاح پڑھا تھا۔ یہ مہینہ مئی کا تھا جو آگرہ کے لئے بہت ہی شدید اور انتہائی سخت موسم ہے۔ بارات کو اعتماد پورہ جو آگرہ سے تین چار اسٹیشنوں کے فاصلہ پر ہے وہاں جانا تھا۔ ریل کے اوقات کی مجبوری کی وجہ سے دوپہر کو تقریباً دو ڈھائی بجے کے قریب ہم لوگ آگرہ سے روانہ ہوئے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اعتماد پورہ کے اسٹیشن پر پہنچ گئے مگر منزل ابھی دو میل دور تھی۔ اسٹیشن سے قیام گاہ تک جانے کے لئے اُس نواح کی مخصوص اور سخت تکلیف دہ سواری یعنے یکہ میں بیٹھنا تھا۔ پھر اس پر ستم یہ کہ راستہ نہایت ناہموار، جگہ جگہ گڈھے اور نشیب و فراز وہ کہ الامان! گرمی اپنے شباب پر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قافلہ یکّوں پر سوار ہو کر اسٹیشن سے شہر کی جانب روانہ ہوا تو راستہ کی ناہمواری اور گڈھوں کی فراوانی کے باعث بُرا حال ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحب ٹھہرے۔ اس نہایت ہی لطیف اور نازک

مزاج بزرگ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہی یکہ رکوایا اور پا پیادہ ہو گئے، چلچلاتی دھوپ پڑ رہی اور لو چل رہی ہے، چاروں طرف سے مٹی کے تودے ہیں کہ فضا میں گشت لگاتے پھر رہے ہیں اور اسی عالم میں حضرت شاہ صاحب مُنہ اور کانوں کو رُمال لپیٹے ہوئے حسبنا اللہ ونعم الوکیل پڑھتے ہوئے قدم بڑھائے۔ اعتماد پور کی آبادی کی طرف چلے جارہے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے مقام آیا۔ ایک بڑے مکان میں انتظام تھا وہاں ہم لوگوں کو پہنچا دیا گیا۔ یہاں لوگ پہلے سے موجود تھے۔ کوئی پنکھا لے کر دوڑا اور کوئی پانی سے بھرا لوٹا لے کر آیا کہ سخت گرمی میں چل کر آئے ہیں، ذرا مُنہ ہاتھ دھو کر ٹھنڈے ہو لیجئے۔ حضرت شاہ صاحب کو صدر مجلس میں ایک قالین پر بٹھا دیا گیا اور دو تین آدمی بڑے بڑے پنکھے لیکر جھلنے کھڑے ہو گئے۔ جب ذرا پسینہ خشک ہو گیا اور دم میں دم آگیا تو دودھ کے شربت کا ایک بھرا ہوا گلاس میں خود لے کر حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں تنے کو تو آگیا ورنہ حق یہ ہے کہ شرم کے مارے نگاہ نہیں اُٹھتی تھی کہ میری وجہ سے مولینا شبیر احمد صاحب اور دوسرے حضرات کو عموماً اور حضرت الاستاذ کو خصوصاً کس قدر شدید تکلیف پہنچی ہے۔ اسی قسم کے خیالات اور احساسِ ندامت و شرمندگی تھا جن سے میں اس وقت دوچار ہو رہا تھا۔ اسی عالم میں دودھ کے شربت کا گلاس حضرت الاستاذ کی طرف بڑھایا۔ حضرت میرے چہرے بشرے سے سمجھ گئے، گلاس میرے ہاتھ سے لے لیا اور خوش مزاجی کے ساتھ فرمایا ع

الا یا ایھا الساقی ادر کاساً وناولہا

پھر ایک دو گھونٹ لینے کے بعد میری طرف دیکھ کر ذرا تبسم سے فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔

اور مولوی صاحب "کہ عشق آساں نمود اوّل ولے اُفتاد مشکلہا"

اللہ اکبر! کیا اخلاق تھے؟ ایک عبدِ حقیر و بے مایہ کی کیسی دلجوئی و دلدہی تھی! ایک بندۂ گنہگار و ہیچمدان پر کیسی بزرگانہ شفقت کہ مسکراتے ہوئے متوجہ کرکے ایک خاص انداز سے حضرت حافظ شیرازی کا یہ مصرعۂ دوم پڑھنا تھا کہ میری ساری ندامت و شرمندگی اُسی وقت کافور ہو گئی اور پھر حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی بات سے یہ قطعاً محسوس نہیں ہونے دیا کہ سفر کی شدید صعوبتوں کی وجہ سے حضرت کے دل پر ناگواری کا کوئی بھی اثر ہے۔

خودداری عام اخلاق و فضائل کے ساتھ حضرت میں خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی۔ برار کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدر آباد دہلی میں آئے ہوئے تھے کہ نظام کی خواہش پر حضرت شاہ صاحب بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور ایک وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے۔ خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلالیا لیکن حضرت شاہ صاحب پہنچے تو عام آداب و شرائط کا لحاظ اور نہ کسی شاہی دستور و آئین کی پابندی۔ روبرو ہوتے ہی شاہ صاحب نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ کہا۔ نظام پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور وَعَلَیْکُمُ السَّلَام کہہ کر شاہ صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر لے جاکر بٹھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر دائرۃ المعارف کے کام سے ہی متعلق تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور اُن کے قلمی نسخوں کا ذکر کرکے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کرکے "دائرۃ المعارف" کی طرف سے شائع کردیں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطہ سے اسلام کی یہ بڑی عظیم الشان خدمت ہوگی۔ اس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفتہ وار اخبار "مہاجر" نکلتا تھا جو دارالعلوم دیوبند کی اصلاح طلب جماعت کی ترجمانی کرتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے اس ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو ایڈیٹر نے "بارگاہِ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی" یا اسی مفہوم کی کوئی اور عبارت بطورِ عنوانِ خبر لکھی۔ اتفاق سے اخبار ابھی چھپا نہیں تھا کہ

حضرت شاہ صاحب کو اس عنوان کی اطلاع ہو گئی تو حد درجہ برہم اور خفا ہوئے اور فرمایا کہ "میں ہر چند ایک مرد بے مایہ و بے بضاعت ہوں لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کر لوں۔ کیسی بارگاہِ خسروی اور کیسی اس میں باریابی؛ صاف لکھتے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات"۔

ایک مرتبہ حیدر آباد کے مولوی نواب فیض الدین صاحب ایڈوکیٹ نے حضرت شاہ صاحب کو اپنی لڑکی کی شادی میں بلایا۔ چونکہ نواب صاحب اور ان کے خاندان کو علماءِ دیوبند کے ساتھ قدیم رابطہ اور قلبی علاقہ تھا اس لئے شاہ صاحب حیدرآباد تشریف لے گئے۔ دورانِ قیام میں بعض لوگوں نے چاہا کہ حضرت شاہ صاحب اور نظام کی ملاقات ہو جائے۔ حضرت کو اس کی اطلاع ہو گئی تو فرمایا "مجھ کو ملنے میں عذر نہیں ہے لیکن اس سفر میں میں نہیں ملوں گا۔ کیونکہ اس سفر کا مقصد نواب صاحب کی بچّی کی تقریب میں شرکت تھا اور بس۔ میں اس مقصد کو خالص رکھنا چاہتا ہوں"۔ چناں چہ ہر چند لوگوں نے کوشش کی اور اُدھر نظام کا بھی ایما تھا مگر شاہ صاحب کسی طرح رضامند نہیں ہوئے۔

اسی قیامِ حیدر آباد کے زمانہ کا واقعہ ہے جو مجھ کو میرے ماموں قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی نے سنایا تھا۔ موصوف اُس زمانہ میں مستقلاً نواب فیض الدین صاحب کے مکان پر ہی رہتے تھے۔ ماموں کہتے تھے کہ شاہ صاحب کے قیام کے دنوں میں ایک روز سر اکبر حیدری کا ٹیلیفون آیا کہ میں مولانا انور شاہ صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کو یہ پیغام پہنچایا گیا تو فرمایا "میں تو یہیں ہوں ابھی کہیں جانا نہیں، حیدری صاحب آنا چاہتے ہیں تو آجائیں"۔ حیدری صاحب کو یہ پیغام پہونچا تو انہوں نے پھر ٹیلیفون پر کہا کہ بہت اچھا میں حاضر ہوتا ہوں لیکن ایک شرط ہے وہ یہ کہ میرے پہونچنے پر شاہ صاحب کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوں تو اُن کو اُٹھا دیا جائے۔ میں تنہائی میں شاہ صاحب سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت الاستاذ کو حیدری صاحب کا یہ پیغام پہونچایا گیا

تو فوراً ارشاد فرمایا "یہ نا ممکن ہے کہ میں حیدری صاحب سے باتیں کرنے کے لئے حاضرینِ مجلس کو چھوڑ کر الگ جا بیٹھوں یا اُن لوگوں سے میں کہوں کہ چلے جائیں"۔

اسلامی غیرت و حمیت

حضرت شاہ صاحبؒ طبعاً بڑے حلیم اور مُرو بار تھے، لیکن اسلامی اور دینی معاملات میں وہ کسی طرح کے تہاون، تساہل یا غفلت شعاری کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ڈابھیل سے دیوبند تشریف لے جا رہے تھے۔ میں اُس زمانہ میں مدرسۂ فتحپوری دہلی میں مدرّس تھا حضرت کو دہلی سے اسٹیشن پر دیوبند کے لئے گاڑی بدلنی پڑتی تھی اور کئی گھنٹے وہاں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اس فرصت کو غنیمت جان کر میں چند احباب کے ساتھ اسٹیشن پہونچ گیا اور جب تک دیوبند والی گاڑی چھوٹ نہیں گئی، اسٹیشن پر حضرت الاستاذ کے ساتھ ہی رہا۔ اس موقع پر دورانِ گفتگو میں حضرت الاستاذ کو معلوم ہوا کہ ابھی حال ہی میں دہلی میں قادیانیوں کا ایک جلسہ تین دن تک ہوتا رہا جس میں ہر قسم کی تقریریں کی گئیں۔ لیکن علماءِ اسلام میں سے کسی شخص نے قادیانیوں کے جلسہ میں پہونچ کر اُن کو مناظرہ کی دعوت نہیں دی۔ قادیانی فتنہ کا استیصال حضرت شاہ صاحب کے دل کو لگا ہوا تھا۔ یہ سُن کر بھی اُنہیں بے حد صدمہ ہوا اور خصوصاً اس بناء پر کہ دہلی میں دیوبند کے پڑھے ہوئے بیسیوں علماء موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قادیانی تین دن تک اطمینان سے اپنا جلسہ کر گئے اور کسی عالمِ دین کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ تقریراً یا تحریراً مسلمانوں کو اس فتنہ کی ہلاکت انگیزی سے باخبر کر دیتا۔ اس مجمع میں غالباً میں ہی ایسا شخص تھا جو حضرت الاستاذ کی توجہاتِ عالیہ کا مرکز بنا ہوا تھا مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمانے لگے "مولوی صاحب! کسی شریف آدمی کی توہین گالی سننے سے ہی نہیں ہوتی بلکہ اگر وہ کوئی اپنے مرتبہ سے گرا ہوا کام کرے تو اس سے بھی اُس کی توہین ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ گالی وغیرہ سے"۔

اس پر ایک واقعہ سُنایا کہ حضرت عمرؓ کے ہاں ایک متموّل اور باعزت شخص نے "زبرقان" نامی ایک شاعر کے خلاف شکایت کی کہ اُس نے ایک شعر میں اُس کی بڑی شدید

ہجو کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے شاعر سے جواب طلب کیا تو اُس نے کہا "امیر المومنین! میں نے تو اُس کی مدح کی ہے نہ کہ مذمت۔ چناں چہ دیکھئے میں کہتا ہوں:۔

دعِ المکارمَ لا ترحل لبغیتھا ❁ اُقعد فانّک اَنتَ الطاعمُ الکاسی

ترجمہ:۔ "تو چھوڑ بزرگیوں اور بڑی طاقتوں کو۔ مت سفر کر اُن کی طلب میں، تو بیٹھا بھی رہ (اپنے گھر کے اندر) کیونکہ تو کھانے والا بھی ہے اور پہننے والا بھی" ماشاء اللہ خوب کھاتا پیتا آدمی ہے۔"

حضرت عمرؓ نے یہ شعر سُنا تو فرمایا، شعر؟ بالکل صحیح ہے۔ درحقیقت ایک شریف انسان کی توہین اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ حصولِ مکارم کو غریبوں کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے۔

بہرحال یہ چند سطریں صرف اس مجلس میں شرکت کی غرض سے لکھی ہیں ورنہ میں خود اچھی طرح جانتا ہوں کہ ان سے حضرت الاستاذ کا حق کیا ادا ہو سکتا ہے۔

اللہ اکبر! کیسے مبارک تھے وہ لمحاتِ زندگی جو اس علم و عمل کے ایک زندہ پیکر کی معیت و صحبت میں بسر ہوئے اور کیسی لُطف آفریں اور روح پرور ساعتیں تھیں وہ جو اس شجرۂ فلاح و تقویٰ کے زیر سایہ گذریں۔ فرحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً ونوّر بُرھانہ۔

(منقول از حیاتِ انور)

حضرت الاستاذ علامہ کشمیری کے تجدیدی کارنامے

از حضرت مولٰنا سید احمد رضا صاحب بجنوری مدظلہ العالی
مؤلف "انوار الباری شرح صحیح البخاری"

"مولٰنا سید احمد رضا صاحب بجنوری دامت فیوضہم حضرت شاہ صاحب نور اللہ ضریحہ، کے نہ صرف باصلاحیت شاگرد ہیں بلکہ انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے خویش ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی چھوٹی صاحبزادی کا عقدِ نکاح ۱۹۴۲ء میں ان کے ساتھ ہوا ہے۔ نکاح حضرتِ علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے پڑھایا ہے۔

مولٰنا سید احمد رضا صاحب کئی سال تک دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ کے درس سے مستفید ہوئے اور جب حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی خدمات جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے لئے وقف کیں تو مولٰنا رضا صاحب بھی وہاں حضرت کے درس میں شامل ہو گئے۔ اس طرح سے انہیں حضرت شاہ صاحبؒ کے آخری دو سال کے درسِ بخاری شریف میں شرکت و استفادہ کی نعمت غیر مترقبہ مل گئی۔

مولٰنا بجنوری مدظلہ کئی سال تک روزنامۂ الجمعیۃ دہلی میں کام کر چکے ہیں بعد ازاں دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ نشر و اشاعت سے متعلق رہے۔ آج کل بجنور یو۔پی میں مکتبۂ ناشر العلوم سے وابستہ ہیں۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولٰنا موصوف بزمانۂ قیام ڈابھیل حضرت شاہ صاحب کی تقاریر درسِ بخاری شریف قلم بند کر چکے تھے اب کئی سال سے "انوار الباری شرح اردو صحیح البخاری" کے نام سے بخاری شریف کی شرح تحریر فرما کر بالاقساط شایع کر رہے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق شرح بخاری شریف کا یہ مجموعہ تقریباً چالیس حصوں پر مشتمل ہوگا۔ اس وقت تک اس کی پندرہ (۱۵) جلدیں شایع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کے ملفوظاتِ گرامی پر مشتمل ایک کتاب "نطقِ انور" بھی شائع کی ہے۔

بہر کیف علومِ انوری کو دوسروں تک پہنچانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ فجزاہُ اللہُ خیراً۔"

(کوندو)

حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے حالات و علمی کمالات مختصراً انوار الباری حصّہ دوم اور نطقِ انور جلد اوّل میں بیان کرچکا ہوں اور مجھ سے زیادہ بہتر و مفصّل حالات رفیقِ محترم علامہ بنوری دام فضلہم نے "نفحۃُ العنبر" میں لکھے ہیں۔ یہاں ان کے صرف چند اہم کارناموں کا تذکرہ کروں گا، وَالتوفیقُ مِنَ اللّٰہ۔

(۱) حضرتؒ کے زمانے میں قادیانی مُتنبّی کا فتنہ سب سے زیادہ ابتلاءِ عوام و خواص کا سبب بنا تھا، جو برطانوی اقتدار کی سرپرستی میں پلا بڑھا تھا، اور اس جھوٹے دعوے کے ثبوت میں بظاہر دلائل و براہین بھی اتنے مضبوط و مستحکم قائم کیے گئے تھے کہ اچھے اچھے عُلماءِ وقت بھی اُن کے مُقابلہ سے کتراتے تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کی وہ واحد ذات تھی جو سارے علمی و عملی کمالات کی بحرِ بیکراں تھی اور آپ نے میدانِ مُقابلہ میں اُتر کر تمام علماءِ حق کو جوابات و دلائل سے مُسلّح کرکے اس فتنہ کی سرکوبی کرائی۔ حضرتؒ نے اس سلسلہ میں متعدد تالیفات بھی کیں، جن میں علومِ نبوّت، ختمِ نبوّت اور حیات و نزولِ مسیح علیہ السلام پر سیر حاصل ابحاث سپردِ قلم فرمائیں۔ یہ تالیفات حضرتؒ کے علمی تعارف کا بہت بڑا ذخیرہ بھی ہیں، جن سے علماء ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔

نطقِ انور میں حضرت کے اس تجدیدی کارنامہ کا تذکرہ و تعارف زیادہ تفصیل سے آچکا ہے اس لئے اس مختصر تحریر میں صرف اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲) تاریخِ اسلام میں ہے کہ قاہرہ میں جس شان کے ساتھ بخاری شریف کا درس ہوتا تھا، اسی شان سے علامہ عینیؒ نے امام طحاویؒ کی کتاب معانی الآثار کا درس دیا تھا، جس میں فقہ حنفی کی برتری محدثانہ طور سے پیش کرتے تھے اور آپ نے اس کتاب کی دو ضخیم شرح بھی لکھی تھیں۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی بڑی تمنا تھی کہ یہ کتاب دار العلوم دیوبند وغیرہ میں بھی اسی شان کے ساتھ پڑھائی جائے، مگر ایسا نہ ہو سکا، تاہم آپ کا درسِ بخاری شریف و ترمذی شریف ایسی محدثانہ و محققانہ شان کے ساتھ ہوتا تھا کہ یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہو جاتی تھی۔

۱۹۱۲ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ایک عظیم الشان اجلاس علامہ رشید رضا مصری کی صدارت میں ہوا تھا تو اس وقت علامہ موصوف دار العلوم دیوبند بھی پہنچے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ شیخ الحدیث تھے اور دار العلوم کی طرف سے علامہ کی ترحیب قدوم کے لئے جلسہ منعقد ہوا تھا۔ علامہ نے جلسہ سے کچھ قبل کسی استاذِ دار العلوم سے سوال کیا کہ یہاں درسِ حدیث کس نوعیت کا ہوتا ہے؟ جواب ملا کہ حدیث کی شرح و تحقیق کے بعد فقہی بحث میں حنفی فقہ کی برتری واضح کی جاتی ہے۔ علامہ نے بے ساختہ فرمایا، کیا حدیث حنفی ہوگئی ہے؟ اس گفتگو کا علم حضرت شاہ صاحبؒ کو ہوگیا تو آپ نے اپنی نہایت فصیح و بلیغ عربی تقریر میں درسِ حدیث دار العلوم دیوبند کی نوعیت ہی واضح فرمائی، اور ان سب وجوہ و دلائل پر روشنی ڈالی جن کے تحت محدثانہ لحاظ سے فقہ حنفی کی برتری ثابت کی جاتی ہے۔[1]

اسی زمانہ کے "القاسم" دیوبند اور "المنار" مصر میں اس جلسہ کے حالات و تقاریر شائع ہوئی تھیں۔ علامہ نے دار العلوم کے معاینہ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر سے جو گہرے تاثرات اخذ کئے تھے وہ لائقِ مطالعہ ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث میں تیرہ سو ۱۳۰۰ سال کے اکابر محدثین کے علوم و کمالات اور ابحاث و افادات سے واقف کرایا جاتا تھا۔ نزاعی مسائل میں ہر حدیث کے رجال و طرق اور اسانید و متون پر بحث ہوتی تھی، پھر فیصلہ سنایا جاتا تھا۔

حضرتؒ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ چالیس سال کے مطالعہ و درسِ حدیث کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ فقہ حنفی ہی اوفق بالحدیث ہے بجز چند معدود مسائل کے کہ ان میں کچھ کمزوری پاتا ہوں۔

---

[1] حضرت امام اعظمؒ کے تلمیذ خصوصی اور سیدنا امام بخاریؒ کے استاذ حدیث امام عبداللہ بن مبارکؒ نے (جن کی نہایت مدح امام بخاری نے کی ہے اور یہ بھی لکھا کہ "لوگوں نے اس جلیل القدر اعلم اہل زمانہ کو چھوڑ کر جاہلوں کی تقلید کرلی" اور اشارہ امام اعظمؒ کی طرف کیا) ارشاد فرمایا کہ لوگ یوں کیوں کہتے ہیں کہ یہ مسئلہ فقہ حنفی کا ہے انکو تو یہ کہنا چاہیے کہ درحقیقت حدیث کی شرح اسی مسئلہ پر منطبق ہوتی ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ انوار الباری) منہ۔

یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ فقہ لُبُّ الدین ہے کہ قرآن مجید، حدیث و آثارِ صحابہ و تابعین کا عطر کشید ہو کر فقہ میں آگیا ہے اور یہی صحیح ترتیب ہے کہ قرآن و حدیث سے فقہ کی طرف آنا چاہیئے اور جو لوگ اپنے ذہن میں ایک مسئلہ طے کر کے پھر اسی کو حدیث و قرآن سے ثابت کرنے کی سعی کرتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں کیونکہ وہ فقہ سے قرآن و حدیث کی طرف چلنا چاہتے ہیں۔

درسِ حدیث کی اسی شان کو ہم حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک تجدیدی کارنامہ سمجھتے ہیں اور اس بارے میں آپ کا اتباع جید علماء نے کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اب رفتہ رفتہ درس کی یہ شانِ تحقیق رو بہ انحطاط ہے۔ اس دور کے بیشتر مدارس میں درسِ بخاری شریف ہونے لگا ہے جن میں اس کا حق ادا نہیں ہوتا، راقم الحروف نے مقدمہ انوار الباری میں لکھا تھا کہ صحیح بخاری شریف سے قبل تقریباً ایک سو کتب حدیث مدوّن ہو چکی ہیں، جن میں احادیث کے ساتھ صحابہ و تابعین کے آثار بھی تھے۔ مثلاً:-
(۱) مسانیدِ امام اعظمؒ، موطأ امام مالکؒ، مرویات عبداللہ بن مبارکؒ، مسند امام جعفر صادقؒ مصنفِ عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، سُننِ دارمی، مسند امام شافعیؒ و مسندِ امام احمدؒ وغیرہ، ان سب کتبِ حدیث و آثار کی روشنی میں ائمہ اربعہ مجتہدین کی فقہ مرتب ہو چکی تھیں کہ ان کے بعد امام بخاریؒ نے اپنی الگ فقہ کے مطابق احادیثِ مجردہ جمع کیں۔ آثارِ صحابہ و تابعین کی سابق حیثیت کو ختم کیا جس کے اتباع میں ہر دور کے اہلِ حدیث نے اپنی نئی نئی اور الگ فقہ بنائی اور اس طرح بیسیوں فقہ معرضِ وجود میں آگئے۔

محدث داؤد ظاہری اور ابن حزم ظاہری نے تو مستقل طور سے ظاہریت کی بنیاد قائم کر دی، جس کے ذریعہ فقہِ مذاہب اربعہ کو صفحۂ ہستی سے معدوم کرنے کے لئے ہر قسم کے حربے استعمال کر لئے گئے، تاہم ان کو نمایاں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

(۲) ابن حزم ظاہری م ۴۵۶ھ کے بعد حافظ ابن تیمیہؒ م ۷۲۸ھ کا دور آیا یہ ظاہریت میں ابن حزم سے بھی بڑھ گئے، اگرچہ دعوائے حنبلی فقہ کے اتباع کا بھی

ساتھ رہا۔ روایتی لحاظ سے دونوں اپنے اپنے وقت کے بڑے مُحدّث تھے، اگرچہ اپنے موافق احادیث کو اصل مرتبہ سے اوپر چڑھانے اور مخالف احادیث کو گرانے کی اور صحیح حدیثوں کو موضوع و باطل قرار دینے کی عادت دونوں میں رہی۔ ایسے ہی بہت سے اوصاف و عادات میں دونوں باہم مشابہ تھے، لیکن درایتی اعتبار سے دونوں کے بارے میں اکابر اُمت نے "عِلمہٗ اکثرُ مِن عَقلِہٖ" کا فیصلہ صادر کیا ہے اور بقول بعض اکابر چونکہ حافظ ابن تیمیہؒ بہت ہی حدّتی اور بے باک بھی تھے اس لئے جمہور سلف و خلف کے خلاف اِتنا کچھ لکھ گئے جس کی جُرأت ان سے قبل و بعد کسی نے نہیں کی تھی۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ درسِ حدیث اور مجالسِ علم میں حافظ ابن تیمیہؒ کے علم و فضل، جلالتِ قدر و وُسعتِ معلومات کی مدح کے ساتھ ان کے اصولی و فروعی مسائل میں تفردات پر سخت گرفت بھی فرمایا کرتے تھے اور جس اعتنا کے ساتھ متقدمین کے اختلاف پر بولتے تھے، حافظ ابن تیمیہؒ کے خلاف جمہور مختارات پر بھی کڑی نقد و بحث کیا کرتے تھے، کسی حدیث کو اگر انہوں نے اپنی درایت کے ذریعہ گرانے کی سعی کی تو اس پر ناگواری کے لہجہ میں یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ کیا حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا کا دین یا پیغمبر کی حدیث اُن کی عقل کے مُوافق اُترنی چاہیئے تھی؟ اور فرمایا کرتے تھے کہ حافظ ابن تیمیہ صرف اپنی کہتے ہیں، دوسروں کی نہیں سُنتے، عقائد کے اختلاف میں حافظ ابن تیمیہ کے استواء علی العرش کو بمعنے استقرار و تمکّن مراد لینے اور نزول باری کو انتقالِ مکانی پر محمول کرنے کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ ایسے مسائل لے کر اگر وہ آئیں گے تو اپنے دارُالحدیث میں اُنہیں گھُسنے بھی نہیں دوں گا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ حافظ ابن تیمیہؒ سے پہلے تقریباً چالیس اکابر محققین متکلمین اسلام نے قرآن و سُنت کی روشنی میں عقائدِ اسلام کے بارے میں جو فیصلے کئے تھے ان میں سے بہت سوں کو حافظ ابن تیمیہؒ نے توڑ پھوڑ کر اُلٹ پلٹ کر دیا تھا اور اسی لئے بقولِ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اس وقت کے تقریباً تمام ہی عُلماءِ اُمت نے انکی مخالفت

ے۔ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر دیکھئے

کر کے قید و بند کا مستحق ٹھہرایا تھا اور حافظ ابن قیمؒ نے ان کی طرف سے جو تاویلات کر کے جواب دہی کی اس کو علمائے امت نے درخورِ اعتناء بھی نہیں سمجھا۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے احقر نے اتنی اکابرِ امت کی وہ تنقیدات یکجا کر دی ہیں جو اب تک حافظ ابن تیمیہؒ پر کی گئی ہیں اور کچھ ضروری حصے انوار الباری قسط ۱۱ میں سفرِ زیارتِ نبویہ اور توسّلِ نبوی کے جواز کی بحث میں بھی درج ہو کر شائع ہو چکے ہیں۔

یہاں مختصراً اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ بھی ایک تجدیدی کارنامہ تھا کہ وہ اپنے درسِ حدیث میں جہاں قدیم ابحاث پر سیر حاصل بحث اور بطورِ حرفِ آخر فیصلہ کن کلام فرماتے تھے، اسی شانِ اعتناء کے ساتھ حافظ ابن تیمیہؒ کے اصولی و فروعی تفردات پر بھی مفصل کلام فرمایا کرتے تھے، اور اگر جدید سلفیت اور تیمیت کے مقابلہ میں جوابی مواد کی طرف توجہ [illegible] کی گئی، تو بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ہم لوگ جمہور امت کے عقائد و مسائل سے دور ہو جائیں گے، اور شاید اسی فتنہ کا احساس کر کے حافظ ابن حجر عسقلانی صاحبِ فتح الباری نے متبعینِ ابنِ تیمیہ کو "تیمیین" کا

---

(۲) (حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان میں سے امام طحاوی م ۳۲۰ھ، علامہ اشعری م ۳۳۰ھ، محقق ماتریدی م ۳۳۳ھ، علامہ لالکائی م ۴۱۸ھ، علامہ بیہقی م ۴۵۸ھ، علامہ ابن عبدالبر م ۴۶۳ھ، امام الحرمین م ۴۷۸ھ، امام غزالیؒ م ۵۰۵ھ، ابن جوزی حنبلیؒ م ۹۵۷ھ، امام رازی م ۶۰۶ھ وغیرہم نے ہر عقیدہ پر سیر حاصل کلام کیا ہے، مگر حافظ ابن تیمیہؒ نے سب کے خلاف اپنا عقیدہ اختراع کیا، مثلاً امام الحرمین کی مخالفت اپنے فتاویٰ میں جگہ جگہ کی ہے۔ امام غزالیؒ نے خدائے تعالیٰ کو مکان و جہت سے منزہ ثابت کیا تھا تو ان کو اشدُّ کفراً من الیہود قرار دیا۔ امام رازی کی کتاب اساسُ التقدیس کے رد میں التاسیس لکھی اور کواکب دراری، منہاج السنۃ و کتابُ العرش میں باری تعالیٰ کے لئے بذاتہٖ فوقیتِ حسیہ ثابت کی اور ان عقائد میں محدث ابن خزیمہ کا اتباع کیا جن کو تمام علماء نے علمِ کلام سے عاری قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ حافظ ابن تیمیہؒ نے بہت سے عقائد ان اساتذہ حنابلہ سے حاصل

(باقی صفحہ آئندہ پر)

لقب دیا تھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) حضرت شاہ صاحبؒ اپنے تلامذہ کو بہت ہی تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اپنے وطن جاکر تفسیر قرآن مجید کا درس دیں تاکہ عوام و خواص اور خاص کر نو تعلیم یافتہ حضرات علماء سے وابستہ ہوں اور ان میں دینی شعور و احساس اُجاگر ہو اور وہ اسلامی تعلیمات سے واقف ہوکر علماء کے دوش بدوش ملکی و مذہبی خدمات انجام دیں، چنانچہ حضرتؒ کے تلامذہ نے خاص طور سے صوبۂ سرحد، پنجاب و سندھ میں درسِ قرآنِ مجید کی طرف پوری توجہ دی جس کے نہایت عُمدہ اثرات رونما ہوئے۔

حضرتؒ کے تجدیدی کارناموں کی فہرست طویل ہے۔ اور اس مختصر مضمون میں زیادہ کی گنجایش نہیں۔ "مشتے نمونہ از خروارے" تھوڑا سا لکھ دیا ہے۔ وآخر دعوینا اَنِ الحمدُ للہ ربِّ العالمین۔

✤

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) کئے، جن کا مکمل و مُدلّل رد خود علامہ ابن جوزی حنبلیؒ لکھ چکے تھے، اور وہ رد دفع شبہۃ التشبیہ والرد علی المجسمہ ممن ینتحل مذہب الامام احمدؒ" کے نام سے شائع شدہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انوار الباری شرح صحیح البخاری جلد ۱۱)

اِمامُ العصر علّامہ محمّد انور شاہ کشمیریؒ

از حضرت مولٰینا عبد الحلیم چشتی دامت برکاتہم
(فاضلِ دیوبند۔ ایم، اے۔ کراچی پاکستان)

عنوانِ بالا کے تحت مُحدّثِ کشمیری علامہ انور شاہ رحمہ اللہ کی زندگی اور علمی کارناموں پر ایک محققانہ اور فاضلانہ تنقیدی مقالہ برصغیر کے مشہور و معروف علمی رسالہ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ میں ۱۹۶۷ء کے تین مسلسل شماروں (ستمبر، اکتوبر اور نومبر) میں شایع ہوا ہے۔

مقالہ نہایت طویل ہے لیکن تحقیقی اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ فاضل مقالہ نگار حضرت مولٰینا عبد الحلیم چشتی زید مجدہٗ نے علامہ کشمیریؒ کی علمی زندگی کے بعض ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے کسی نے بحث نہیں کی ہے۔ چنانچہ مقالہ کے آغاز ہی میں خود بھی تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ انور شاہؒ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا، یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے اور انہیں اپنی پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتناء کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ انور شاہ کی علمی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہو سکی ہے۔"

بہر حال جہاں تک مقالہ کا تعلق ہے، قابلِ مطالعہ ہے، اہلِ علم ہی اس سے حظ حاصل کر سکتے ہیں۔ مقالہ کے آغاز میں سات آٹھ صفحات پر فاضل مقالہ نگار نے حضرت فخر المحدثین علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی زندگی کے حالات (مثلاً نام، ولادت، سلسلۂ نسب، تعلیم و تربیت، سفرِ حجاز اور واپسی کے بعد مدرسۂ فیضِ عام کا قیام، دار العلوم دیوبند میں تدریس کی ابتداء، ازدواجی زندگی کا آغاز اور غیر معمولی قوتِ حافظہ وغیرہ باتیں) مختصر طور پر تحریر فرمائے ہیں۔ چونکہ زیرِ مطالعہ کتاب کے

ابتدائی صفحات میں ہم نے حضرت امام العصرؒ کے حالاتِ زندگی مفصّل طور پر قلمبند کئے ہیں اس لئے مقالہ کے اس حصّے کو دہرانا بارِ طبع ہوگا۔

کوندو

وُسعتِ معلومات و کثرتِ مُطالعہ

تحصیلِ علوم سے فراغت کے بعد آغازِ عمر ہی میں علامہ انور شاہؒ کا دائرۂ معلومات اس قدر وُسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور عُلماء جن کی وُسعتِ معلومات اور کثرتِ مُطالعہ پر ان کی تالیفات شاہدِ عدل ہیں اپنی تحقیقات علّامہ موصوف کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے نامور مُحدّث شوق نیموی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثارُ السُّنن کی کتاب الصّلوٰۃ مکمّل کر لی تو اس زمانہ کے جن اربابِ نظر اور اکابرِ اہلِ علم کو یہ کتاب بھیجی گئی ان میں ایک صغیرُ السِّن مُحدِّث علّامہ محمّد انور شاہؒ بھی تھے لیکن ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصّہ میں آئی وہ صرف علّامہ انور شاہ کی ذاتِ ستودہ صفات تھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات اور اضافۂ معلومات کا دائرہ محدّث نیموی کے مذاق تک محدود رہا ہے۔ موصوف نے متونِ احادیث، اسنادِ رجال اور جرح و تعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدّث نیموی کے مذاق کے مُطابق تھیں۔ فقہ حدیث کی بحثیں، حقائق، معارف، اسرارِ بلاغت اور توجیہاتِ حدیث سے بہت ہی کم اعتناء کیا پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دوگنا ہو گیا ہے۔ ؎۱

؎۱ علّامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام "الاتحاف الاحناف" ہے، مجلسِ علمی ڈابھیل جس کا قیام ہی علّامہ انور شاہ کے علوم کی نشر و اشاعت ہے، اس نے شاہ صاحب کے اس نادرۂ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا محدود تعداد میں فوٹو کرا کر اس کو محفوظ کر لیا ہے۔

اور اسی افادۂ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۰) میں یہ لکھا ہے "کنتُ مرافقاً فیہ" میں آثار السُّنن کی ترتیب و تدوین میں ان کا رفیق کار تھا، چنانچہ محدّث نیموی کے فرزند کا بیان ہے :-

"قوقانی کہتا ہے ناظرین باتمکین معلوم فرمائیں کہ مولینا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں جیساکہ ان ہی کی شرح فیض الباری علیٰ صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے اور علّامہ نیموی نے آثار السُّنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا۔ علّامہ نیموی کا اوشحۃ الجید، حبل المتین، رد السکین، بنیان تحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور انکا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے یہ سب مولینا انور شاہ کشمیری کی طالبعلمی کے زمانہ میں تھا، جبکہ وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے لہٰذا مولینا انور شاہ نے جو نیل الفرقدین" میں یہ لکھا ہے کہ انی کنتُ مرافقاً فیہ اس سے مراد بعد اتمام آثارُ السُّنن قبل الطباعت ہے، مولینا شوق نیموی اپنی تحقیقاتِ عجیبہ و فوائدِ غریبہ نادرۂ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لئے تسویدات آثار السُّنن قبل الطباعت بذریعہ ڈاک بھیجتے ہونگے جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السُّنن کو بھیجا ہے، مولینا انور شاہ کشمیری کو مولینا نیموی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولینا انور شاہ مدرسۂ امینیہ دہلی میں کہتے تھے کہ ہم لوگ مولینا شوق نیموی سے جو تمہارے جوار کے ہیں ملاقات کریں گے مگر چونکہ ۱۳۲۲ھ میں بروز جمعہ ۱۷ رمضان شریف مولینا نیموی کا وصال ہوگیا، اسی وجہ سے ملاقات

نہ ہو سکی۔ خلاصہ یہ کہ آثارُ السُّنن جس کی آخر کتاب الصلوٰۃ "۱۳۱۳ھ میں تمام ہوگئی اور مولٰینا انور شاہ ۱۳۱۲ھ میں کتبِ درسیۂ مُروّجہ سے فارغ ہوئے ۱۳۱۲ھ کے بعد شوق نیموی ان کو بھی اپنی تحقیقات کہ جن سے کتبِ محدّثین خالی ہیں دکھلانے کے لئے اجزاءِ آثار السُّنن بذریعہ ڈاک بھیجتے ہونگے اور علامہ کشمیری کچھ رائے دیتے ہوں گے واللّٰہ اعلم۔ اس اعتبار سے من نوع موافقت کہی جاسکتی ہے جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام ہے نہ کہ وقت تالیف۔ کیونکہ اس وقت تو مولٰینا انور شاہؒ محض طالبعلم تھے۔[1]" (القول الحسن فی الرد علیٰ ابکار المنن وفی تائید آثار السُّنن۔ از ابن نیموی ج ۱، ص ۱۹)

تبحّرِ علمی

ضبط و اتقان، ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دِقّتِ نظر، جدّتِ فکر، وُسعتِ مُطالعہ، کثرتِ معلومات، استحضارِ علوم اور تبحّر میں اپنی نظیر آپ ہی تھے، صَرف ونحو، مَعانی و بیان، شعر و ادب، منطق و فلسفہ لُغت، فقہ، اصولِ فقہ، کلام، تصوّف، تاریخ، رجال، طبقات، تفسیر، حدیث اور اصولِ حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے اور عربی و فارسی نظم و نثر پر یکساں قادر تھے، ایسی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیمُ الاُمّت مولٰینا اشرف علی تھانوی موصوف کو علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے وہ فرماتے تھے:۔

"مولٰینا انور شاہ صاحب بہت بڑے متبحّر عالِم تھے یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں؛ میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے"[2]

---

[1] شاہ صاحب کو اپنے زمانۂ طالبِ علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور اور وسیعُ النّظر محدّث کے اہم علمی کارنامہ پر اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہوگئی تھی تو یہ شاہ صاحبؒ کی وُسعتِ نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔[عہ]

[2] ملاحظہ ہو الاضافاتُ الیومیہ مِنَ الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الاُمت مولٰینا اشرف علی تھانویؒ) اشرف المطابع تھانہ بھون ۱۹۴۱ء ج ۷، ص ۱۱۱

حاشیہ صفحہ آئندہ:۔

[1] ملاحظہ ہو انباء العمر بحوالہ درس الفہارس و معجم المعاجم والمشیخات والمسلسلات از حافظ عبد الحی الکتانی المتوفی (صفحہ آئندہ)

[عہ] شاہجہاں پور سے ... صفحہ نمبر ۳۰۸ — ۳۱۰ کے مطالعہ سے اس اشکال کا حل نکل جاتا ہے۔ مرتب عفی عنہ

حفظِ حدیث علامہ انور شاہ بلا شبہ حُفّاظِ حدیث میں سے تھے۔ حفظِ حدیث کی حقیقت سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں "حفظِ حدیث" سے مُراد استحضار اور تذکر نہیں ہے یعنی احادیث کا نوکِ زبان پر ہونا، بلکہ معرفت یعنی "ملکۂ فن" مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیارِ حفظ ہے اور متاخرین ائمہ فن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرینِ حُفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے۔ موصوف انباءُ الغمر فی ابناء العمر میں حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی المتوفی سنہ ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نور الدین علی ہیثمی المتوفی سنہ ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

لَمْ نَرَ فِي هٰذَا الفَنِّ أَتْقَنَ مِنْهُ وعليهِ تخرّجَ غالبُ أهلِ عصرِهٖ ومِنْ أَخَصِّهِم بِهٖ صِهْرُهٗ شيخُنا نورُ الدينِ الهيثمي وَهُوَ الَّذي درّبه وعلّمه كيفيةَ التخريجِ والتصنيفِ وهو الّذي يعمل له خطبَ كتبِه وينسبها له، وصار الهيثمي لشدّةِ ممارستِه أكثر استحضارًا للمتونِ مِن شيخِه حتّى يظنّ مَن لا خبرةَ له أنّه أحفظ منه وليس كذالك، لأنّ الحفظَ المعرفة [1]

ہم نے فنِ حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہلِ علم نے ان ہی سے کسبِ کمال کیا ہے اور ان کے داماد ہمارے شیخ نور الدین ہیثمی ہیں۔ شیخ عراقیؒ نے انہیں بڑھایا، تصنیف اور تخریجِ احادیث کا ڈھنگ بتایا تھا۔ وہ انکی کتابوں پر دیباچے لکھتے اور ان کی نسبت بھی حافظ ہیثمی کی طرف کرتے تھے۔ ہیثمی کو مزاولت اور کثرتِ مشق کی وجہ سے احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ یاد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ جس کو حقیقتِ حال کی خبر نہ تھی وہ یہ خیال کرتا تھا کہ شیخ ہیثمی حافظ عراقی سے بڑے حافظ تھے حالانکہ

---

[1] سنہ ۱۳۸۳ھ طبع فارس سنہ ۱۳۴۶ھ ج ۲ ص ۱۹۷ و ۱۹۸ و شذرات الذہب فی اخبار من ذہب از ابن العماد حنبلی، مکتبۃ القدسی مصر سنہ ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۵۱ و ذیل طبقات الحفاظ للذہبی از حافظ جلال الدین سیوطی طبع دمشق ص ۳۸۳ و البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی، طبع قاہرہ سنہ ۱۳۴۸ھ ج ۱ ص ۴۴۲۔

واقع البسانہ تھا کیونکہ حفظ ملکۂ فن سے عبارت ہے"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ حفظِ حدیث کے لئے حافظہ میں مَلکۂ فن کا پایا جانا کافی ہے۔ استحضار و تذکر شرط نہیں ہے چنانچہ شیخ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب الالفیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ لکھنا کہ، ہیثمی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے اس بناء پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے حالانکہ نور الدین ہیثمی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا اور شیخ عراقی کو فن کا مَلکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے۔ یہ بات علامہ انور شاہ کو بھی حاصل تھی اسی لئے ہم نے ان کو حفّاظِ حدیث میں شمار کیا ہے۔ ان کو متونِ احادیث پر نہایت غائر نظر تھی اور وہ عِلل و اسانید سے واقف تھے۔ مراتب رجال کا انہیں علم تھا وہ صحیح وسقیم کو سمجھتے تھے اور فن جرح وتعدیل کے ماہر تھے۔ راویوں کا تشابہ رفع کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اور ان فنون میں ان کو بڑا اتقان اور رسوخ حاصل تھا، ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں۔

فقہ وخلافیات کا حفظ

علامہ انور شاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے۔ تذکرہ کی کتابوں میں بعض اربابِ کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے:۔

"کَانَ حَافِظًا للفقہ و الخلاف" یا "کَانَ حَافِظًا لِلْمَذَاہِب"۔

کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے۔ مذاہبِ ائمہ ان کو یاد تھے۔ یہ بات علامہ انور شاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی برزبان تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی ازبر تھے۔

ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشأ اور مبنیٰ پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی۔ فقہ پر ان کی نظر کیسی غائر تھی اور ائمہ کے اقوال جیسے انہیں کیسے مستحضر تھے، اس کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے :-

لیس عندی فنٌ اصعبُ من الفقہِ حتّٰی انّی فی الفنون کلّھا ذو رأیٍ وتجربۃٍ احکم بما ارید وانتخبُ من اقوالھم ما ارید، وافترعُ (الفرع) الآراء من عندی لا احتاج الیٰ تقلیدِ احدٍ ولکنّی فی الفقہ مقلّدٌ بحت لیس رأی سوی الروایۃ ولذا قد یصعبُ علیّ الافتاء فانّ الناس لا یکونُ عندھم الّا قولٌ واحدٌ ویکونُ عندی فیہ اقوالٌ عن الامام او عن المشائخ، والتصحیح قد یختلف ولستُ من اصحاب الترجیح وحینئذٍ افتی بما یقرب بمذاھب الائمّۃ و آثار السّلف والسُّنّۃ [1]

میرے نزدیک فقہ سے مشکل ترین فن کوئی نہیں۔ جملہ فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور ائمہ فن کے اقوال میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی طرف سے انکے راویوں پر تفریع کرتا ہوں اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں۔ لیکن فقہ میں مقلدِ محض ہوں بجز روایتِ امام کے کوئی رائے نہیں رکھتا اسی وجہ سے فتویٰ دینے میں مجھے بڑی دشواری پیش آتی ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیشِ نظر امام یا مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں۔ پھر کبھی تصحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں اصحابِ ترجیح میں سے نہیں ہوں میں ایسے وقت میں مذاہب ائمہ اور آثارِ سلف اور سنت سے قریب تر جو قول ہوتا ہے اُس پر فتویٰ دیتا ہوں۔

طبقاتِ فقہاء پر نظر

طبقاتِ فقہاء پر بھی اُن کی نظر غیر معمولی وسیع تھی اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبارِ فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آراء تھیں کہ کون کس درجہ

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۴ ص ۱۹۷!

کا فقیہ ہے، اور نقل میں اس کی کیا حیثیت ہے. کون فقیہ النفس ہے اور کون نہیں؛ چنانچہ امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

"امام طحاوی مذہب امامِ اعظم رحمۃ اللہ کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے۔ وہ امام شافعیؒ کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالکؒ سے بدو واسطہ تلمذ رکھتے تھے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ سے ان کو بسہ واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمدؒ سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے۔ طحاوی مجتہد و مجدد ہیں جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے۔

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا تجدیدی کارنامہ ہے. وہ شرح حدیث میں محمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں۔ بحث و تحقیق کرتے ہیں، اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس انوکھے طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطورِ سند و متن روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔" ؎۱

اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی بنسبت زیادہ اعتناء کیا ہے"۔ ؎۲

علامہ موصوف ملک العلماء ابو بکر بن مسعود کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ کی کتاب "البدائع و الصنائع فی ترتیب الشرائع" کی بہت تعریف کرتے تھے اور اس کے متعلق فرماتے تھے :۔

؎۱ ملاحظہ ہو العرف الشذی علی جامع الترمذی، مکتبۂ رحیمیہ سہارنپور ص ۳۶ و معارف السنن از مولانا محمد یوسف بنوری طبع کراچی ۱۳۸۳ھ ج ۱ ص ۱۴۲ نیز فیض الباری ج ۲ ص ۳۵۱ و جلد ۱ ص ۳۷۳ ؛

؎۲ فیض الباری ج ۳ ص ۶۹ "

"عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں خراسانی فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی بنسبت زیادہ رسوخ و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاشانی خراسانی ہے مگر اس کی یہ کتاب اتقان و مثبت میں فقہاء میں سے فقہائے عراق کی مثل ہے، بلکہ حسنِ ترتیب میں ہمارے فقہاءِ حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے"۔ یہ نہایت نادرُ المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم ژرف نگاہی اور دقتِ نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ فقیہُ النفس بن جائے۔ یہ کتاب مُدرّس اور مؤلف کے لئے مغنی کی بنسبت زیادہ مفید ہے۔ [۱]

مؤلف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہاء میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں، اسی طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔ فرماتے ہیں:-

انّ ابنَ نجیم افقهُ عِندی مِنَ الشّامی لِما اریٰ فیه انّ اماراتِ التّفقّه تلوحُ والشامی معاصِرٌ للشاہ عبدالعزیز الدهلوی رحمهُ الله تعالیٰ وهو افقهُ ایضاً عندی مِنَ الشّامی رحمهُ الله تعالیٰ وکذا شیخ مشائخنا رشید احمد الگنگوهی قدس سرّهٗ افقهُ عندی من الشامی [۲]

میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم، علامہ شامی سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقّہ کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں۔ فقیہ شامی شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے معاصر ہیں اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ میرے نزدیک شامی سے بڑھ کر فقیہ ہیں۔

---

[۱] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ھدی شیخ الانور از مولانا محمد یوسف بنوری ص ۸۵

[۲] ملاحظہ ہو فیض الباری علیٰ صحیح البخاری، مطبع حجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۴۱ ۲ و ج ۱ ص ۱۲۰ ؞

بعض مشاہیر ائمّہ فن کے متعلق رائے

اسی طرح دیگر ائمہ فن اور اکابر علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں۔ چناں چہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی سنہ ۶۳۰ھ، حافظ ابن تیمیہ المتوفی سنہ ۷۲۸ھ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید المتوفی سنہ ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبدالبر المتوفی سنہ ۴۶۳ھ، جمال الدین زیلعی المتوفی سنہ ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی سنہ ۸۵۲ھ کے متعلق علامہ موصوف فرماتے ہیں:-

"میرے نزدیک شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ اس اُمت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں، وہ حقائق کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور اس فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں، حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بحرِ بیکراں ہے لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور اُمت سے مُنفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور عُلماء ہیں، ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی مُنکر ہیں، البتہ مصداقِ کشف کے قائل ہیں اور وہ اس کو فراستِ مومن سے تعبیر کرتے ہیں..... ان کی طبیعت میں تیزی بہت ہے، وہ اپنی تحقیق کو وحیِ آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پروا نہیں کرتے ہیں، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہلِ علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں جیسے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید، ابن عبدُالبر اور زیلعی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت اور حدت ہوتی ہے جیسے ابن تیمیہ ہیں بعض میں شدتِ تعصب کے ساتھ بیدار مغزی بلا کی ہوتی ہے جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں[۱]۔"

---

[۱] ملاحظہ ہو فیض الباری علیٰ صحیح البخاری مطبعۂ حجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۶۴

مُصطلحاتِ فن پر اضافے

علامہ انور شاہ نے مُصطلحاتِ فن پر بھی اِضافے کیئے ہیں۔ اصولِ فقہ جو ایک نہایت دقیق اور مُشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیقُ النظر عُلماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اس اہم فن کی بعض مُصطلحات پر علاّمہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے۔

ائمۂ فن نے متواتر کی تعریف کی ہے اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتناء کیا اور نہ انہیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جُداگانہ ناموں سے ممتاز و مُتعیّن کیا۔ تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے لیکن اصولیین اور مُتکلّمین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں۔ اسلامی دنیا میں علامہ انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتناء کیا اور اس کو اقسامِ اربعہ میں مُنحصر کیا۔ اس کی ہر قسم کو ایک ایک خاص اور مستقل نام سے نامزد کیا، تواتُر کے وہ اقسامِ اربعہ حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) تواتُرُ الاسناد (۲) تواترُ الطبقہ (۳) تواترُ العمل والتوارُث

(۴) تواترُ القدر المُشترک۔

ان اقسامِ اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ نَیلُ الفرقدَین فی مسئلۃِ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علاّمہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح المُلہم بشرح صحیح مُسلِم (ص ۵) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے اور اُردو میں اس کی تشریح فیصلۂ مقدمۂ بہاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے:-

وھٰذہِ الاقسامُ الاربعۃُ للتواتُر وَاِن کانت جُزئیاتھا مُنتشِرۃٌ فی کُتُبِہِم لکنّھم لم یکونوا یذکرونھا عِندَ التقسیم و اوّلُ من ربع القِسمۃَ

یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں۔ اگرچہ اس کی جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر طور پر پائی جاتی ہیں لیکن وہ تقسیم کے موقعہ پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ جس نے پہلے

وسمّی کلّ قسم باسمہ فیما نعلمہٗ الشیخ العلامۃ الانور اطال اللّٰہ بقاءہٗ وھو تقسیم حسنٌ۔ [1]	جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم میں الشیخ علامہ انور شاہ اطال اللہ بقاءہٗ ہیں اور یہ تقسیم بہت خوب ہے۔

علامہ انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی، ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ ماہرینِ فن نے مصطلحاتِ فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور درسی کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سمیٹ لی ہیں اور گوناگوں معلومات جمع کرنے میں خود دادِ تحقیق دی ہے۔ ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں۔ [2] اسی طرح علامہ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے اور اس کو بھی اقسام اربعہ میں منقسم کیا ہے [3] اسی طرح طبقاتِ کتبِ حدیث میں بھی علامۂ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے۔ [4]

اہلِ کمال معاصرین کا خراجِ عقیدت

حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر ایسا متقن، وسیع النظر محقق اور جامع عالم پیدا نہیں ہوا۔ اور ہندوستان و پاکستان کے متاخرین محدثین میں ملا محمد عابد سندی المتوفی ۱۲۵۷ھ کے بعد علامہ انور شاہ کے سوا کوئی حافظِ حدیث نہیں گذرا ہے۔

علامہ موصوف بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے اور اس دور میں اللہ تعالیٰ کی زبردست حجت اور برہان تھے، علامہ شبیر احمد عثمانی نے

---

[1] ملاحظہ ہو (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ ص ۶۔

[2] ملاحظہ ہو کتاب التعریفات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۷۵

[3] ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۵۸

[4] ایضاً ج ۱ ص ۵۷

فتح الملہم لشرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر علامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :۔

سَأَلْتُ الشیخ العَلامۃ النقی التقی الذی لم تر العیونُ مثلہٗ، ولم یر ہو مثل نفسہ ولو کان فی سالف الزمان لکانَ لہٗ شأنٌ فی طبقۃ اہل العلم عظیم وہُوَ سیدنا ومولینا الانور الکشمیری ثم الدیوبندی اطالَ اللہُ بقاءَہٗ عن تفسیر اوائل سورۃ النجم وتحقیق رؤیتہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم ربہ فقرَّرَ الشیخ تقریراً حَسَناً بَلیغاً جامعًا لاشتاتِ الرِّوایات و اطراف الکلام منبہًا علی اغوار القرآن فالتمستُ منہُ اَنْ یُقیِّدَہٗ بالکتابۃ لتعمّ الفائدۃ فاستجابَ للملتمس وعلی اللہ اجرہٗ مع وجودِ الشّواغل الکثیرۃ۔ ؎1

میں نے خدا ترس، پاک طینت، شیخ العلامہ انور شاہ جن کا مثل ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھا، اور نہ خود انہوں نے اپنا مثل دیکھا ہے۔ اگر وہ گذشتہ زمانے میں ہوتے تو اہلِ علم کے طبقہ میں ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار مولینا انور شاہ کشمیری ثمّ دیوبندی ہیں. اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر قائم رکھے۔ میں نے ان سے سورۂ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ الٰہی کی تحقیق کے متعلق درخواست کی تھی جس کو انہوں نے شرفِ قبولیت بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ لیا ہے اور قرآنِ مجید کی گہرائیوں پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ پھر میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس سے فائدہ عام ہو جائے۔ انہوں نے گوناگون مشغلوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی. اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر دے ؛

مفسر عثمانی آیت شریفہ قُلْ یَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کی تفسیر میں حیاتِ مسیح

؎1 ملاحظہ ہو فتح الملہم لشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۵ ؛

علیہ السلام کے موضوع پر علامہ کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"اس موضوع (حیاتِ مسیح علیہ السلام) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہوچکی ہیں، مگر میں اہلِ علم کو توجہ دِلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقیدُ النظیر حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقائہٗ نے رسالۂ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل وجواہر ودیعت کئے ہیں، ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔"

اور آیتِ شریفہ قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ الآیہ کی تفسیر میں روح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس (بحث) میں میرے نزدیک قولِ فیصل وہی ہے جو بقیۃُ السلف بحرُ العلوم انور شاہ صاحب اطال اللہ بقائہٗ نے فرمایا"

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فیضُ الباری علیٰ صحیح البخاری پر جو تقریظ لکھی ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

قال الشیخ تاج الدین السبکی فی القفال المروزی، کان اماماً کبیراً و بحراً عمیقاً غوّاصاً علی المعانی الدقیقۃ، نَقِیَّ القریحۃ ثاقب الذھن عظیم المَحَلِّ کبیر الشان، دَقِیقَ النظر عدیم النظیر (فی زمانہ) اھ وحکی قول ابن السمعانی فیہ! کان وحید زمانہ فقھاً و

شیخ تاج الدین سبکیؒ نے قفال مروزی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ بلند پایہ امام اور علم کے گہرے سمندر، دقیق معانی کے غوطہ زن، پاکیزہ طبع، روشن دماغ، باعظمت بلند مرتبت، دقیقُ النظر اور یگانۂ عصر عالِم تھے۔ اور ان کے متعلق ابن السمعانی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ فقہ، حفظ حدیث اور ورع و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔ یہ کلمات میں نے اس امام موصوف کے

حِفظاً و وَرعاً. هٰذِهٖ کلمات کُنتُ
رأیتُها فی حقّ ذاك الامام و
صادفتها تصدق فی نابغة الهند
الشّهیر وعالمها بحر العلوم مولٰینا
السّیّد محمّد انور شاه الکشمیری
ثُمَّ الدیوبندی رحمه الله سواء
بسواء من غیر شطط والحراء
فکان اماماً کبیراً و بحراً عمیقاً
غوّاصاً علی المعانی الدّقیقة
الٰی آخر ما قال لم اکن فی عدد
اصحابه و تلامذته غیر انّی
وفقت للاستفادة مِن صحبته
ومجالسه ومذاکرته (فی المشکلات
والغوامض) برهة غیر قصیرة وَ
مَنْ طالع کتابی فتح المُلهم علٰی
شرح صحیح مُسلم تبیّن له ذاك[1]

بارے میں پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ
یہی کلمات ہندوستان کے مشہور و معروف
عالم، بحر العلوم محمّد انور شاہ کشمیری ثم
دیوبندی رحمہ اللہ پر بھی پورے پورے
صادق آتے ہیں اور اس میں ذرا مبالغہ
نہیں ہے کیونکہ یہ بھی بُلند پایہ امام،
علم کے گہرے سمندر تھے، انہیں دقیق
معانی تک رسائی حاصل تھی ....
میں نہ ان کے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ میرا
ان کے ہم سبقوں میں شمار ہے، بس مجھے
اُن کی صحبتوں اور مجلسوں میں ان کے
ساتھ مشکلاتِ فن اور دقیق مسائل میں
مذاکرہ سے ایک زمانۂ دراز تک استفادہ
کا موقع ملتا رہا ہے۔ جو کوئی میری کتاب
فتح الملہم بشرح صحیح مُسلم کا مُطالعہ کریگا
اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی۔

مؤرخِ ہند مولٰینا سید سلیمان ندوی نے علامۂ موصوف کی جن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے، وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:۔

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وُسعتِ نظر، قوّتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علومِ حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علومِ ادب میں بُلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے

[1] مقدمۂ فیضُ الباری ص۵۸

بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرّسول کا نعرہ بلند رکھا ۔۔۔۔ حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے مواقع ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوتے، اہلِ کمال کی یہ بڑی پہچان ہے، جب اہلِ کمال سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہ کے اصل منشأ کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دے کر خوش ہوتا ہے۔ مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وُسعتِ علمی کی نادر مثال تھے۔ ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔[۱]"

علامہ انور شاہ کی جلالتِ علمی اور رفعتِ شان کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حکیم الامّت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح جیسا عالم ربّانی کسی موقعہ پر کسی علمی مسئلہ کی وضاحت کرتا اور وضاحت کی کہیں علامہ انور شاہ سے دادِ تحقیق مل جاتی تو ان کو بڑی مسرّت ہوتی تھی، ایک موقعہ پر حکیم الامّت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رح نے موصوف کی حق پسندی اور کمالِ علمی و عملی کی دادِ تحقیق یوں دی ہے، فرماتے ہیں:۔

"مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریکاتِ حاضرہ میں بہت سرگرم تھے، اور میں بالکل علیحدہ تھا۔ لیکن باوجود اس اختلافِ مشرب کے میرے رسالہ ترجیح الراجح سے بہت متاثر تھے اور کہتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ بات نظر آئی کہ اپنی لغزشوں سے رجوع کر کے اس کو شایع کیا جاوے۔ یہی ایک بات حق پسندی اور کمالِ علمی و عملی کے لئے کافی ثبوت ہے جس کی اس وقت میں کہیں نظیر نہیں۔[۲]"

انسان کا چہرہ اس کے خیالات اور علوم کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ علامہ انور شاہ کا چہرہ اس حقیقت کا پورا پورا مصداق تھا، چہرۂ انور پر ایسا نور تھا کہ مسلمان ہی

[۱] ملاحظہ ہو "یادِ رفتگان"، مطبوعہ کراچی، ص ۱۶۹، ۱۷۰

[۲] ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ، ج ۷، ص ۲۲۷

نہیں، کافر بھی اگر نظر اُٹھا کر دیکھ لیتا تو پکار اُٹھتا تھا کہ یہ چہرہ تو کسی بہت ہی بڑے عالم کا ہے، حکیم الامّت مولٰینا اشرف علی تھانوی کا بیان ہے:-

"مولٰینا (انور شاہ) کسی جلسۂ مناظرہ (بھاگل پور) میں شریک تھے، جس میں اور بڑے بڑے علماء موجود تھے، اس جلسہ کا صدر ایک ہندو کو بنایا گیا تھا جو بہت معمر اور تجربہ کار شخص تھا، وہ جس وقت جلسہ میں آیا اس نے سب علماء کو دیکھ کر مولٰینا کے متعلق کہا کہ ان سب میں یہ بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں۔ واقعی غضب کا قیافہ شناس شخص تھا کہ محض صورت دیکھ کر پہچان گیا کہ یہ سب سے بڑے عالم ہیں حالانکہ اس وقت تک کسی کی تقریر بھی نہیں سنی تھی[۱]"

علامہ انور شاہ ورع و تقویٰ کے صفات سے آراستہ اور محاسنِ اعمال اور مکارمِ اخلاق کے پیکر تھے، حق گوئی اور اتباعِ سُنّت کے بڑے دلدادہ تھے۔ اس کے آثار ان کے چہرے بُشرے پر نمایاں تھے۔ ان کی ذات حقیقت میں نورٌ علیٰ نور تھی۔

اُردو کتابوں کے مطالعہ کا شوق

علامہ انور شاہ نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں طلبہ اور عوام کی سہولت کی وجہ سے اردو زبان کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا لیکن اُردو زبان میں حقائق و علوم چونکہ منتقل نہیں ہوئے تھے اس لئے موصوف نے اُردو میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کو پسند کیا، مگر جب اہلِ حق نے اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کر کے علوم کو عام کرنا شروع کیا تو موصوف نے بھی اُردو کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کا اندازہ حکیم الامّت مولٰینا اشرف علی تھانویؒ کے حسبِ ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:-

"مولٰینا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں، اس لئے میں کسی اردو تصنیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا۔ لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی

۱؎ ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ج ۶، ص ۱۲۱۔

تصانیف میں بھی اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اُردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا اور جو بے وُقعتی اُردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی۔ [1]

دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کی اہم خصوصیت

دارالعلوم دیوبند میں درسِ حدیث کی اہم خصوصیت اور امتیازی شان طلبہ میں حدیث فہمی کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکۂ راسخہ پیدا کرنا تھا۔ فقہ حدیث نہایت غامض علم ہے، اسی لئے محدثین اور فقہاء کے مقابلہ میں فقہاءِ محدثین کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس فن کے ماہرین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے "عجالہ نافعہ" میں مشہور ترین ائمہ فن کو نام بنام گنایا ہے، دارالعلوم دیوبند کے قیام کی اصل غایت اسی علم کی نشر و اشاعت ہے، اس فن میں اکابر دیوبند کا طریقۂ انیقہ نہایت معتدل ہے، درسِ حدیث میں علامہ انور شاہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اکابر دیوبند کے طریقۂ انیقہ کو سمجھنا ضروری ہے، اس کی وضاحت کے لئے علامہ انور شاہ کی وہ تاریخی تقریر جو موصوف نے ۱۳۳۰ھ میں عالمِ اسلام کے نہایت نامور فاضل اور وسیع النظر محدث علامہ سیّد رشید رضا المتوفی ۱۳۵۴ھ کی دارالعلوم دیوبند میں آمد کے موقعہ پر کی تھی، کافی ہے۔ اس اہم تاریخی تقریر کا موضوع فقہِ حدیث اور اکابرِ دیوبند کا طریقۂ انیقہ ہے، علامہ موصوف کی یہ تقریر عربی میں ہے لیکن طویل ہے اس لئے اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے [2]۔

"مدرسۂ دیوبند کی غایت و غرض درسِ حدیث اور فقہِ حدیث ہے۔۔۔۔۔

۔۔۔ ہمارے اکابر کا حدیث اور فقہ میں ایسا معتدل و بہتر طریقہ ہے جس میں افراط و تفریط نہیں ہے۔ میری مُراد اس سے یہ ہے کہ ائمہ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) اکثر و بیشتر اصولِ اربعہ کی پابندی کرتے ہیں اور وہ اس طرح

---

[1] الافاضات الیومیہ، ج ۷، ص ۱۱۱ ؛ [2] متنِ عربی کے لئے ملاحظہ ہو ص ۵۵۶

ہے کہ امام مالکؒ اہلِ مدینہ کے عمل کی اقتداء کرتے ہیں بلکہ کبھی وہ حدیثِ مرفوع پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام شافعیؒ ہر باب میں اصح حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ امام احمدؒ اصح، صحیح، حسن اور ضعیف حدیث سے بھی جس کا ضعف کمتر درجہ کا ہو استدلال کرتے ہیں اور وہ ان دونوں طریقے (اصح، صحیح وضعیف) کو درست سمجھتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مسند میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے اور ابوحنیفہؒ ان قسموں کی تمام حدیثوں کو قابلِ عمل سمجھتے ہیں اور اختلاف کی صورت میں ان کو ایک محل پر جمع کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے حنفیہ کے یہاں تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے یہاں راویوں پر جرح زیادہ ہے۔ امام شافعیؒ پہلے امام ہیں جو بلا مؤید و عاضد اور شاہد حدیثِ مرسل کو قابلِ حجت نہیں سمجھتے ہیں۔ فنِ حدیث کے نکتہ شناس امام بخاریؒ نے امام مالکؒ و شافعیؒ کے اصول کو اپنایا اور اپنا خضرِ راہ بنایا۔ چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اصح ما فی الباب کو لاتے ہیں اور عملِ سلف کی موافقت کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کرتے جو دوسری حدیث کے معارض و مخالف ہو، انہوں نے صلوٰۃِ کسوف کے بیان میں دو رکوع والی حدیث پر اکتفا کیا اور اپنے اصول و قواعد کی پابندی کی۔ تین چار اور پانچ رکوع والی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا۔

امام مسلمؒ نے راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کیا۔ چنانچہ انہوں نے باب الکسوف میں تین چار رکوع والی حدیثوں کو ہی نہیں بلکہ پانچ رکوع والی حدیث کو بھی جو امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے۔ (کوئی مرفوع حدیث نہیں) صحیح مسلم میں درج کیا ہے۔ امام بخاریؒ نے تحقیق و تنقیح کی ہے اور امام مسلم نے اصول و قواعد کی رعایت کی ہے۔ ایسی اختلافی صورتوں میں ہمارے مشائخ توسّط و اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، تشدّد اور تساہل سے گریز کرتے ہیں اور متعارض حدیثوں کی ایسی توجیہہ کرتے ہیں کہ جو غور سے سنتا ہے قبول کرتا ہے۔ اس کی مثال حدیثِ قلتین ہے، اس کو یزید بن زریع، کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدبہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے اِذَا بَلَغَ الْمَاءُ قُلَّتَیْنِ اَوْ

ثالثاً جب پانی دو تین قلہ (بڑا مٹکا جس میں اڈھائی مشک پانی آتا ہے)
ہو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ لفظ تنویع (اَوْ) کے ساتھ روایت کیا ہے تو یہ
تخمین و اندازہ کے لئے ہے کہ جب دو تین قلہ پانی ہوگا تو ایک طرف سے
دوسری طرف نجاست کا اثر نہ ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام
محمدؒ کا یہی اصل مذہب ہے، چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ اور شیخ ابن نجیمؒ نے
اس امر کی تصریح کی ہے، حدیثِ قلتین کے محل کے تعیّن سے جو حدیثیں اس کے
معارض تھیں وہ اپنے حال پر باقی رہیں اور معارضہ سے بچ گئیں۔ جیسے ٹھہرے
ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت والی حدیث اور برتن میں کتّے کے
منہ ڈالنے والی حدیث اپنے اپنے محل میں قابلِ عمل ہیں۔ اور اس کی مثال نے کر
امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں ہیں۔ حنفیہ نے نماز میں امام کے
پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر قرآنی آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ جب قرآن پڑھا جائے تو اُسے کان لگا کر سنو اور حدیثِ رسولؐ
واذا قرئ القرآن فانصتوا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو اور حدیثِ مَن
کان لہٗ امام فقراءۃ الامام قراءۃ لہٗ (جس کا امام ہو تو امام کی قرأت
مقتدی کی قرأت ہے) سے استدلال کیا، اور انہوں نے لا تقرؤا الا بامّ
القرآن (سورۂ فاتحہ کے بغیر اور کچھ نہ پڑھا کرو) والی حدیث کی تاویل کی۔ کیونکہ
جس نے سورۂ فاتحہ نماز میں نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوتی۔ اور یہ اس لئے کیا کہ
آیتِ شریفہ کے شانِ نزول میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے۔ لہٰذا لفظ کے عموم کا
اعتبار ہوگا (نہ خصوص مورد کا) نیز امام بیہقی نے کتاب القرأت میں امام احمدؒ سے
نقل کیا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کے بارے میں
اُتری ہے اور حدیث وَاِذَا قَرَئَ فَانْصِتُوْا جب امام پڑھے تو تم چپ رہو
صحیح حدیث ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے شاگرد ابوبکر بن الاثرم نے اس
کی تصحیح کی ہے۔ پھر امام مسلم نے باب التشہد میں حدیث کے ہر دو طریق

ابو موسیٰ اشعریؓ و ابو ہریرہؓ کی تصحیح کی ہے اور بعد ازاں ابن خزیمہ، حافظ ابو جعفر جریر طبری، حافظ ابو عمر بن عبد البر، حافظ ابن حزم اندلسی ظاہری، حافظ زکی الدین عبد العظیم منذری اور خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ یہ تو اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کا پایہ ہے اور باعتبار تعامل سلف و ائمہ تو اس پر صحابہ کرام کی بڑی جماعت امام مالک، احمد اور ابو حنیفہ کا عمل ہے۔ اور ایسی حدیث جس کے راوی ثقہ ہوں پھر سلف کا عمل بھی اس کا موید ہو تو وہ حدیث صحیح ہے، وہ نہ کسی جرح سے متاثر ہوتی ہے اور نہ کسی قدح سے اثر پذیر۔

اور حدیث مَنْ کَانَ لَہٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَۃُ الاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ کو شیخ ابن الہمام نے مسند ابن منیع سے نقل کیا ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے کیونکہ اس کی سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔ اور اب تک اس میں کسی علت کا سراغ نہیں لگ سکا، اس کی سند یہ ہے:۔

اخبرنا اسحٰق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبد اللّٰہ بن شداد عن جابر بن عبد اللّٰہ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم الحدیث۔ اور پھر ترمذی کی ایک موقوف اور حدیث کی دیگر کتب میں ایک مرسل حدیث اس کی موید اور معاضد ہے، اب تو وہ بلا شبہ صحیح ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ مولانا رشید احمدؒ نے حدیث عبادہؓ کی جو محمد بن اسحاق کے طریق سے مروی اور اس کے سیاق لعلکم تقرأون خلف امامکم قالوا نعم یا رسول اللّٰہ نہذہ ھذا قال فلا تفعلوا، الحدیث۔ شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، لوگوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا، سورۂ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو، کی توجیہہ میں فرمایا ہے یہ اباحت اور جواز کی دلیل تو ہو سکتی ہے، وجوب کی دلیل نہیں،

کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اجازت کے بغیر پڑھتے تھے، اسی بناء پر آپ نے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ شاید تم میرے پیچھے پڑھتے ہو، انہوں نے جواب دیا "جی ہاں"۔ تو آپؐ نے فرمایا بس سورۂ فاتحہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں میں سورۂ فاتحہ کا نماز کے لئے پڑھنا متعین ہو چکا ہے کہ امام اور منفرد کی نماز اس کے پڑھے بغیر نہیں ہوتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے جواز کی علّت یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں میں نماز کے لئے متعین ہو چکی ہے۔ اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ امام اور منفرد کے حق میں اس سورہ کے پڑھے بغیر نماز کا نہ ہونا ظاہر ہے اور مقتدی کے حق میں اس کا اثر کم سے کم اباحت ہوا۔ حنفیہ کا اس کے واجب ہونے پر اتفاق ہے۔ البتہ اس کی اباحت وکراہت کا مسئلہ احناف میں مختلف فیہ ہے۔

اور ہمارے مشائخ نے مسئلہ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا اور باآواز بلند آمین کہنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ سے ثابت ہے، اور اسی طرح ترکِ رفع یدین اور اخفائے آمین بھی صحیح سند سے ثابت ہے۔ چناں چہ سُننِ ابی داؤد میں امیر المومنین عمرؓ اور علیؓ سے ترکِ رفع یدین اور اسی طرح اخفائے آمین صحابہؓ کی ایک جماعت اور سلفِ صالحین سے ثابت ہے۔ تو ایسی صورت میں ان دونوں باتوں کو سُنّت ہونا چاہیئے۔ اب بحث صرف ترجیح میں رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی آغاز وانجام میں راہِ راست کی توفیق دینے والا ہے عہ

عہ فتاوائے ثنائیہ جلد اول مرتبۂ محمد داؤد راز ص ۴۴۳ میں اخبار "الحدیث" امرتسر مورخہ ۱۱ رمضان ۱۳۶۵ھ کے حوالہ سے درج ہے:۔ "مرحوم (یعنی علامہ انورشاہ کشمیریؒ) بھی رفع الیدین کے منسوخ کے قائل نہیں ہیں بلکہ اپنے شاگردوں کو فرمایا کرتے تھے کہ گاہے بگاہے اس پر عمل کرلینا چاہیئے، تاکہ قیامت میں یہ سوال نہ ہو کہ اس سُنّت کو کیوں چھوڑا، اس کے گواہ مولوی عبدالکبیر صاحب (باقی صفحہ آئندہ پر)

پھر مولینا محمد قاسم نانوتوی کی تلمذ سے ہمارے شیخ عدل، حجۃ، مسندِ وقت مولینا محمود الحسن نے علوم کی تکمیل کی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے فیوض سے مستفید فرمائے۔ وہی اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس ہیں۔ اس ملک میں ان ہی کی اسناد پر مدار ہے۔ موصوف اپنے مشائخ کے طریقِ حق پر قائم ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو روایاتِ متعارضہ میں مطابقت پیدا کرنے اور تعارض کو رفع کرنے اور مشکلاتِ حدیث کو حل کرنے کا ملکۂ خاص عطا فرمایا ہے۔ بطورِ مثال ایک واقعہ پیش خدمت ہے، انہوں نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کسوف کی نماز میں جو تعدادِ رکوع احادیث میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے، وہ آپ کے ساتھ خاص ہے۔ کسی خاص وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہے۔ لیکن امت کو آپ نے ایک ہی رکوع کی ہدایت کی ہے، چنانچہ فرمایا ہے "صلوا کاحدث صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ" جو فرض نماز کہ تم عنقریب پڑھ چکے ہو اس جیسی نماز پڑھو، یعنی صبح کی، ایسے ہی کسوف کی نماز پڑھو، میں نے عرض کیا کہ سادات شافعیہ تو اس تشبیہ کو تعددِ رکوع پر محمول کرتے ہیں، وحدتِ رکوع پر نہیں، فرمایا یہ تو بدیہی کو نظری بناتا ہے۔ کیونکہ حضورِ اکرم ؐ نے جب سب کی آنکھوں کے سامنے مجمع عام میں کسوف کی نماز متعدد رکوع سے پڑھی اور امت کے لئے تعددِ رکوع ہی کو مشروع کرنا تھا تو پھر آپ سے جو صحابہ نے مشاہدہ کیا تھا اس کا حوالہ کیوں چھوڑ دیا اور صبح کی نماز سے تشبیہ کی طرف میلان فرمایا۔ یہ محض اس لئے کہ آپ نے متعدد رکوع کسی اور عارض کی وجہ سے کئے تھے اور آپ نے امت کو نماز کے مشہور و معروف طریقہ کی

(حاشیہ متعلقہ صفحہ گذشتہ) کشمیری حال (مرتسر) ہیں"۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولوی عبد الکبیر صاحب حضرت شاہ صاحب ؒ کے تلامذہ میں سے تھے، ۱۹۷۵ء میں وفات پا گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے۔ مقامی طور بھی چند برگزیدہ حضرات نے ان سے وفات سے پہلے کئی بار اس کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے مندرجہ صدر بیان کی تائید فرمائی۔ کوندو

طرف ہدایت فرمائی۔"[1]

اس تقریر سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ بزرگانِ دیوبند نے جس طرح فقہ حدیث سے خصوصی اعتناء کیا اسی طرح اس فن کے مشکلات کے حل کرنے پر بھی خاص توجّہ دی ہے۔ علّامہ انور شاہ نے یہ کام بہمہ وجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

درسِ حدیث میں تجدیدی کارنامہ

علّامۂ موصوف درس میں کتاب ہی نہیں پڑھاتے بلکہ علوم کا درس دیتے تھے، جس سے طلبہ کے ذہن میں جلاء، نظر میں وُسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انہیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا، اور اس حیثیت سے طلبہ کے لئے یہ درس بڑی افادیت کا حامل تھا اور ان کے معراجِ کمال کے لئے یہ بھی کچھ کم نہ تھا لیکن درسِ حدیث میں علاوہ موصوف کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجراء کیا اور جس طرح علّامہ شرف الدین طیبی شافعی المتوفی ۷۴۳ھ نے احادیث کی شرح میں فقہِ حدیث کے فن کو برتا اور فنِ بلاغت کے اسرار و معارف اور لغت و کلام کے نکات کو سمجھایا اور ان فنوں کو شرح حدیث میں جاری کر کے دکھایا ہے، اسی طرح علّامہ انور شاہ نے درسِ حدیث میں تمام متداول علوم و فنون کو حدیث کی شرح میں برتا اور ان کے اجراء کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے، اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مغزِ حدیث تک رسائی کے لئے جملہ علوم میں دستگاہ ضروری ہے۔

اس درس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ علّامہ نے اس میں مُشکلاتِ علوم کو حل کیا ہے اور فن کی دقیق باتوں کو سمجھایا ہے، ہندوستان اور پاکستان میں ایسے بہت سے جیّد عُلماء گزرے ہیں جن کے حواشی و شروح نے مُشکل سے مُشکل کتاب کو پانی کر دیا ہے اور ان سے استفادہ آج آسان ہوگیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو القاسم ج ۳، شمارہ نمبر ۲ ۱۳۳۰ھ دیوبند، ص ۲۹ - ۳۲۔

لیکن ایسے علماء جنہوں نے کسی خاص فن کے مشکلات کو حل کیا ہے خال خال ہی ہیں، صرف علّامہ انور شاہ کے متعلق یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی علوم کے مشکلات کو موصوف ہی نے سب سے زیادہ حل کیا ہے، ان وجوہ سے ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوّع پایا جاتا ہے وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، ادب اور نحو کی متعدد امالی زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں اور یہ سب ائمہ فن کی امالی ہیں اور بعض امالی تو ایسے ائمہ فن کی ہیں جن کو ہفت علوم میں اجتہاد کا دعوٰی ہے مگر ان میں سے کسی میں اس نوع کا تنوّع اور ہمہ گیری نہیں ہے۔ فقہ کی امالی میں فقہی مسائل ہی سے بحث ہے اور لغت کی امالی کا دائرہ شعر و ادب تک محدود ہے نحو کی امالی کا تعلّق نحوی مسائل سے ہے۔ علّامہ انور شاہ کی امالی میں ہر فن سے اعتناء ہے اور اس کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے اس لئے اس میں تنوّع پایا جاتا ہے اور موصوف کو اگرچہ نہایت محنتی اور ذکی تلامذہ ملے جنہوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے درس کی تقریروں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے قلمبند کیا اور ان کے علوم نے علمی دنیا کو متعارف کرایا، جو ان کا ناقابلِ فراموش علمی احسان ہے۔

ضبطِ امالی کے صفاتِ اربعہ

لیکن یہ حقیقت ہے کہ علّامہ موصوف کے علوم کو قیدِ تحریر میں لانے کے لئے محض ذکاوت و محنت ہی کافی نہ تھی بلکہ علوم و فنون میں تبحّر اور وسعتِ نظر بھی درکار تھی جو ان صفاتِ اربعہ سے آراستہ ہوتا وہی ان کے درس سے پورا پورا استفادہ کرسکتا اور ان کی درس کی تقریروں کو اچھی طرح قیدِ تحریر میں لاسکتا تھا۔ اس موقعہ پر علّامہ انور شاہ کے درس کے متعلق بے ساختہ وہ فقرہ زبانِ قلم پر جاری ہوجاتا ہے‘ ...... جو علّامہ محقّق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے علامۃ الدہر شیخ محمّد بن محمد المشدالی‘ المتوفی ۸۶۴ھ کے

درس کے متعلق کہا تھا کہ :-

هذا الرجل لا ينتفع بكلامه و لا ينبغي ان يحضر درسه الا حذاق العلماء - [1]	اس مردِ کامل کی باتوں سے ماہر فن عُلماء ہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور انہی کو اس کے درس میں حاضر ہونا سزاوار اور لائق بھی ہے۔

علّامہ انور شاہ کے تلامذہ کو علوم میں وہ حذاقت و مہارت حاصل نہ تھی جس سے وہ امام عصر کی درسی تقریروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے اور قیدِ تحریر میں لا سکتے، دورانِ مُطالعہ میں امام عصر کی امالی میں کہیں کہیں جو بعض موٹی موٹی غلطیاں نظر آجاتی ہیں وہ اسی کا نتیجہ ہیں کہ اس اہم کام سے عہدہ برآ ہونا ان کے تلامذہ کے بس کا کام نہ تھا۔ مجھے اس کا اندازہ مولٰینا سیّد مناظر احسن گیلانی کی امالی صحیح مُسلم کے دیکھنے سے ہوا جو انہوں نے مسلم شریف کے سبق میں علّامہ موصوف سے سُن کر قلم بند کی تھیں۔ حالانکہ مولٰینا مناظر احسن گیلانی نے علوم کی تحصیل اس دَور کے اربابِ کمال سے کی تھی اور فقہ، منطق، فلسفہ، اصول اور کلام وغیرہ کی چوٹی کی کتابیں ان اساتذہ سے پڑھی تھیں جن کے درس کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی لیکن انہوں نے جیسی کچھ درسی تقریریں سمجھی اور لکھی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے محنتی اور ذکی طالبِ علم بھی امام عصر کی پوری باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے اپنے عجز کا اعتراف امالی صحیح مسلم[2] میں کیا ہے۔ اور جس مقام پر جو بات سمجھ میں نہیں آئی ہے، وہاں نقطے ڈال دئے ہیں، علّامہ موصوف کے علوم کی عظمت ان کے دل و دماغ میں ایسی

---

[1] ملاحظہ ہو البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ ج ۲ ص ۲۴۸ ؛

[2] امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علّامہ شبیر احمد عثمانی رہ کے ہاتھ آگیا تھا۔ موصوف نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا ہے اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ (فتح الملہم ج ۳ ص ۳۲۳) لیکن نہ معلوم کیوں جامع امالی مولٰینا مناظر احسن گیلانی رہ کا نام لینے سے گریز کیا۔ ہمیں مولٰینا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم کے توسط سے یہ مجموعہ علّامہ عثمانی رہ کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لئے مِلا تھا۔ گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں مگر علّامہ انور شاہ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد کا حامل ہے ؛

بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ امالی ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی، اس کے گم ہو جانے کا ان کو ساری عمر افسوس رہا اور وہ اس کی گمشدگی پر بڑی حیرت سے یہ شعر جس کو مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں بکثرت نقل کرتے ہیں، پڑھتے تھے ؎

آنچہ از من گم شدہ گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان ہم پری ہم اہرمن بگریستے

علامہ انور شاہ کے تلامذہ کا ان کے علوم کو کما حقہ، مدوّن نہ کر سکنے پر ہمیں امام شافعیؒ کا وہ قول یاد آتا ہے جو انھوں نے امام مالکؒ کے معاصر امام لیثؒ بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ کے متعلق فرمایا تھا، امام شافعیؒ کا قول یہ ہے :-

اَللَّیْثُ اَفْقَہُ مِنْ مَالِکٍ اِلَّا اَنَّ اَصْحَابَہٗ ضَیَّعُوْہُ۔

"امام لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے لیکن امام لیث کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا۔"

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے :-

"یعنی لم یدوّنوا فقھہٗ کما دوّنوا فقہ مالک وغیرہ و ان کان بعضھم قد جمع منھا شیئًا" [1]

امام شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام لیث کے شاگردوں نے انکی فقہ کو مدوّن نہیں کیا جس طرح امام مالک وغیرہ کی فقہ کو شاگردوں نے مدوّن کیا ہے، گو بعض تلامذہ نے ان کے کچھ مسائلِ فقہیہ کو جمع کیا ہے۔ (لیکن وہ قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے۔)

یہی صورت علامہ انور شاہ کے ساتھ پیش آئی، ان کے شاگردوں نے ان کے علوم کو مدوّن نہ کر کے ان کو ضائع کر دیا، آج ان کی جو امالی ہم کو ملتی ہیں وہ ان کے علوم کا ایک کرشمہ ہیں اور یہ بھی وہ باتیں ہیں جو ان کے شاگردوں نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق لکھ لی تھیں اور علامہ نے بھی طلبہ کی استعداد کے

---

[1] ملاحظہ ہو الرحمۃ الغیثیۃ بالترجمۃ اللیثیۃ فی مناقب سیدنا الامام اللیث بن سعد از ابن حجر عسقلانی طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ ص ۹ ؎

پیش نظر بغیر طلب عام واقفیت کے لئے بیان کردی تھیں. اگر سائل محقق ہوتا، اور سوالات بھی علمی کرتا تو امالی کا رنگ ہی کچھ اور رہوتا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی کو حافظ شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی المتوفی ۹۰۲ھ مل گئے، کہ جب جی چاہا تقریر ضبط کرانے کے لئے خادم کو بھیجکر بلا لیا، یا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح انہیں بھی کوئی محمد عاشق پھلتی مل گیا ہوتا، جو باصرار اُن سے ان کے علوم کو مدوّن کراتا تو علمی دنیا ان کی امالی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی۔

علامہ انور شاہ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزون ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تھی، وہ بڑے ذہین، طباع اور علوم معقول و منقول میں حاذق تھے، انہیں افہام و تفہیم کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، زورِ بیان اور حسنِ ترتیب کا بھی ملکہ تھا۔ عربی تحریر و تقریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ علامہ انور شاہ کو بھی ان کے فہم و فراست پر پورا اعتماد تھا اور یہ بھی علامہ موصوف کی جامعیت، ژرف نگاہی اور وسعت معلومات کے قائل اور قدردان تھے، اسی لئے فتح الملہم بشرح صحیح المسلم میں جگہ جگہ ائمہ فن اور کبارِ علماء کے اقوال کے ساتھ علامہ انور شاہ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں بڑی محنت کی، اپنی پوری جوانی اس میں لگادی تھی پھر بھی وہ پوری نہ ہوسکی، قرآنِ مجید پر اردو میں حواشی اور تفسیر ان کا بڑا کارنامہ ہے جس کے لئے آیندہ نسلیں ان کی ممنون ہوں گی۔ لیکن ان کے مرتبہ کا کام یہ تھا کہ وہ حجۃ الاسلام مولینا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے مضامین اپنی زبان میں بیان کرجاتے تو عوام و خواص دونوں ان سے استفادہ کرسکتے، یا علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی صحاحِ ستہ پر امالی (درسی تقریروں) کو قیدِ تحریر میں لاتے تو یہ علمی دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوتا اور ان کی بقا کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے یہ کام نہیں کیا، ان کے مقابلہ میں حضرت انور شاہؒ نے

اپنی فطری صلاحیتوں سے وہی کام لیا جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ان کی اس دماغی فوقیت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوتوں سے وہ کام لیا جو ان کے ہم عصروں کی دسترس سے باہر تھا۔ علوم قرآن و حدیث، فقہ، اصول، کلام اور فلسفہ سے متعلق اپنی تالیفات اور امالی میں جس قدر مواد یکجا کر دیا ہے، وہ علوم کا گویا نچوڑ ہے۔ تاہم علامہ انور شاہ کے بعض تلامذہ نے ان کے علوم کو جس قدر اور جس صورت میں بھی مرتب و مدون کر دیا ہے، وہ بھی اہل علم کے لئے بڑا کار آمد اور قیمتی سرمایہ ہے اور آج علامہ موصوف کے گونا گوں علوم میں تبحر کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ یہی امالی ہیں۔ گویا ایک ہوشمند عالم کو مختلف موضوع پر ان کے مختصر رسالوں کے مطالعہ سے ان کی جامعیت، جلالتِ شان اور ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے لیکن جو تنوع ان کی امالی میں ہے وہ تالیفات میں نہیں، کیونکہ ان کے موضوع خاص ہیں، جن کی بحث کے گوشے بھی مخصوص اور محدود ہوتے ہیں اس کے برعکس درس کے حدود نہایت وسیع ہیں۔ اس میں بہت سے مسائل زیرِ بحث آجاتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں لیکن "العرف الشذی علی جامع الترمذی" "فیض الباری علی صحیح البخاری" اور "معارف السنن" جس میں علامہ موصوف نے مشکلاتِ علوم کی توضیح و تشریح کی ہے۔ امالی علی صحیح مسلم، امالی علی سنن ابی داؤد اور امالی علی سنن ابن ماجہ زیادہ اہم ہیں۔ اول الذکر تین کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کی سرزمین پر پہلی اور آخری ہیں۔ ہندو پاک میں علوم سے معمور ایسی مفید اور جامع کتابیں کبھی نہیں لکھی گئیں۔ میں جب ان امالی کو دیکھتا ہوں تو استاد اور شاگرد دونوں کو دعائیں دیتا ہوں۔

ان امالی میں علامہ انور شاہ ؒ نے اس زمانہ میں حنفی مذہب کو حدیث کی بنیاد پر جس طرح مستحکم کیا ہے وہ حقیقت میں ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اکثر

مواقع پر علامہ موصوف کی دقّتِ نظر اور علوم و فنون میں حذاقت ان کو متقدمین کی صف میں بھی ممتاز و نمایاں کر دیتی ہے، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ۔ پھر کمال یہ ہے کہ ان کی تنقید کے الفاظ میں ایسی احتیاط ہے کہ ادب کا پہلو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ موصوف باایں ہمہ علم و فضل، اخلاق و تقویٰ کے کیسے بلند مقام پر فائز تھے۔

اکابرِ دیوبند کے کمالات کے جانچنے کا معیار

اکابرِ دیوبند میں محقق عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، امام سنّت مولانا رشید احمد گنگوہی، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم کے علمی و عملی کمال کے جانچنے کا جو صحیح ترین معیار ہے، بحمد اللہ اس معیار پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ پورے اترتے ہیں، یہ حقیقت پسندانہ معیار بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے بنا دیا ہے، فرماتے ہیں:-

"لوگ کہتے ہیں کہ رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہو گئے، مگر بالکل غلط ہے، ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی، بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی، مر جانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ اور پچاس برس گذر جانے کے بعد قدس سرہ ہو جاتے ہیں اور تماثل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے۔ ان کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے اور ان حضرات کی بھی، اس سے معلوم ہو جائے گا۔"[1]

عارف تھانویؒ حسن العزیز میں فرماتے ہیں:-

"ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرا دیا جائے اور بتلایا نہ جائے تو دیکھنے والے رازی، غزالی کے زمانہ کی بتلا دیں گے"[2]

---

[1] ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافاضات القومیہ طبع کراچی ج ۲ ص ۲۹۹ و ۳۰۰۔

[2] ملاحظہ ہو حسن العزیز (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) شائع کردہ تالیفاتِ اشرفیہ تھانہ بھون، بھارت ج ۲، ص ۴۳۸

جس کو اس امر میں تامّل ہو وہ علامہ موصوف کی تصانیف کا موازنہ قدماء کی تصانیف سے کر کے دیکھ لے، حقیقت آشکارا ہو جائے گی، مثلاً تکفیر کے موضوع پر جن ائمہ فن نے قلم اُٹھایا ان میں حجۃ الاسلام امام غزالی، ابن حزم، ابن تیمیہ اور ابن قیم وغیرہ کا نام سر فہرست ہے لیکن جیسی جامعیت استیعاب مباحث اور تنقیح مناط علامہ انور شاہ کے رسالہ "اکفار الملحدین فی ضروریات الدین" (مجلس علمی ڈابھیل، سورت) میں ہے، ان ائمہ کے یہاں نہیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے۔

علامہ موصوف نے اپنی خداداد فہم و فراست اور ذکاوت و بصیرت سے اپنے رسائل اور امالی میں مشکلات علوم کو جس طرح حل کیا ہے، ان کو بلحاظ جامعیت، وسعتِ نظر، عالمانہ تدقیق اور کمالِ فن بڑے بڑے اہلِ کمال ائمہ کی تحقیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی توضیح سے یہ مضمون کتاب بن جائیگا اس لئے ہم اس کی چند مثالوں پر اکتفاء کرتے ہیں۔

کتاب الایمان کی معرکۃ الآراء بحث "الایمان یزید وینقص" میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شیخ عبد الوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ اور علامہ ابو محمد علی بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ کا قول پیش کرنے کے بعد علامہ انور شاہ کا قول نقل کیا ہے[1]۔

اس مسئلہ پر کہ کفار بھی معاملات میں مخاطب ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ اور علامہ بدر الدین عینی کا کلام نقل کرنے کے بعد حافظ انور شاہؒ کا فیصلہ نقل کیا ہے۔[2]

نزول عیسیٰ کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم میں علامہ انور شاہ کی پُر مغز بحث کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح معراج کے باب میں آیت شریفہ ولقد راٰہ نزلۃً اُخریٰ کی توضیح و تشریح اور آنحضرت صلی اللہ

---

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۵۹ ؛ [2] فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۸۰

علیہ وآلہ وسلم کے دیدارِ الٰہی کی بحث میں علامہ عثمانی نے صرف علامہ انور شاہ کے کلام کو نقل کیا ہے اور کسی محقق کے کلام کو پیش کرنے کی حاجت نہیں سمجھی ہے۔

حدیث شریف نوشُ اُمّتی امراءُہٗ کی تشریح میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں مشہور شارحِ بخاری شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی مارزی مالکی المتوفی ۵۳۶ھ کا قول نقل کرنے کے بعد علامہ انور شاہ کا قول پیش کیا ہے، پھر یہ لکھا ہے ولا یخفیٰ مافیہ من اللطافۃ۔

اسی طرح مسح ربع رأس (چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت) کی بحث میں علامہ عثمانی نے فقیہ ابو الولید محمد بن رشید مالکی المتوفی ۵۹۵ھ اور محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ وغیرہ کی بحث کے بعد علامہ انور شاہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔[1]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وضو میں سات مرتبہ پاؤں دھونے کے متعلق حافظ ابو زکریا محی الدین نووی المتوفی ۶۷۷ھ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ عثمانی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کی توجیہہ پیش کی ہے اور علامہ انور شاہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو مستدل پیش کیا ہے، وہ نقل کیا ہے، یہ مستدل ان دونوں حفاظِ حدیث کی نظر میں نہیں ہے۔ علامہ موصوف کی تحقیقات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا فیضان آج بھی اس امت پر ویسا ہی جاری وساری ہے جیسا کہ پہلے تھا، ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ نے حدیث ان اللہ یبعث علیٰ رأس کل مائۃ من یجدد لہا دینہا پر بحث کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے:

ان ھذا التجدید امر اضافی لان العلم کل السنۃ فی التنزل کما ان الجہل کل عام فی الترقی وانما یحصل ترقی علماء زماننا بسبب تنزل

یہ تجدید ایک امر اضافی ہے کیونکہ علم سال بسال گھٹتا جا رہا ہے اور جہل بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارے دور کے علماء کی ترقی ہمارے علم کے تنزل کے سبب سے ہے ورنہ متقدمین

۱؎ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۹۰

العلم فی اواننا و الا فلا مناسبۃ بین المتقدمین و المتأخرین علما وعملاً وحلماً وفضلاً وتحقیقاً وتدقیقاً۔ ؎١

اور متاخرین علماء میں علم و عمل، حلم و فضل اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔

یہ کوئی حکمِ کُلّی نہیں ہے متاخرین علماء میں جو اربابِ کمال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ان میں علامہ انور شاہ بھی داخل ہیں۔ سچ ہے:-

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان است
خم و خم خانہ با مہر و نشان است
نقصان نہ قابل است وگرنہ علی الدوام
فیض سعادتش ہمہ کس را برابر است

موصوف کی علامہ انور شاہ کے الفاظ سے شہرت کی وجہ

علامہ انور شاہ کشمیری رح اکثر ایسی اونچی بات کہتے ہیں جس کو بغیر تمہید و ترتیب مقدمات طلبہ کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اس امر کا صحیح اندازہ ایک مدرس مزاج انسان ہی کر سکتا ہے جس طرح علمی دنیا میں دقتِ نظر، علوم عقلیہ میں مہارت اور جلالتِ علمی کی وجہ سے علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ کو علامہ سید شریف جرجانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد انور شاہ کو اہلِ علم کے طبقہ میں علامہ محمد انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

جن اہلِ علم نے اس خوانِ علم کی زلّہ رُبائی کی وہ آسمانِ علم کے درخشان ستارے بنے اور اس عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا۔ ان میں جو وسعتِ نظر پیدا ہوئی وہ علامہ انور شاہ کے حلقۂ درس کا فیضان ہے، ایسے ہی نامور تلامذہ کو مولانا سید سلیمان ندوی نے "دائرۂ علم" سے تعبیر کیا ہے، "یادِ رفتگان"

؎١ ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از ملا علی قاری طبع میمنہ مصر [illegible]

میں لکھتے ہیں :-

"بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں، مولینا مناظر احسن گیلانی، مولینا ابوالمآثر محمد حبیب الرحمٰن اعظمی مئو، مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولینا محمد یوسف صاحب بنوری، ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے" [۱]

مُشکل پسندی اور مختصر نگاری

حقیقتاً وصداقت، عقیدت و مُحبّت سے بلند ہے اس لئے علامہ انور شاہ کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ ان کی طبیعت میں مُشکل پسندی اور مختصر نگاری تھی اس لئے ان کی تحریر و تقریر کو عوام کیا خواص کے لئے بھی سمجھنا مُشکل ہے۔ ان کی تقریر کے متعلق حکیم الاُمّت مولینا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے، فرماتے ہیں :-

"وہاں (شملہ) کے بعض معزّزین تعلیم یافتہ صاحبوں نے مولینا انور شاہ صاحب سے جو کہ اس سفر میں تھے اعجاز القرآن پر بیان کرنے کی فرمائش کی چنانچہ بیان کیا گیا۔ مضمون غامض تھا، وہ لوگ بھی نہیں سمجھے۔ پھر ان پر اعتراض کیا گیا کہ ایسے بیان سے کیا نفع جو سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ یہ بیان تو مدرسۂ دیوبند میں بیٹھ کر کرنا تھا، اس کا جواب بھی وعظ میں میں نے ہی دیا کہ شاہ صاحب نے جو ایسا بیان کیا ہے وہ اضطراراً نہیں کہ سہل بیان پر قادر نہیں بلکہ ایک مصلحت سے قصداً بیان کیا ہے اور مصلحت یہ ہے کہ آج کل مُدعیانِ علم بہت زیادہ پیدا ہو گئے ہیں، اور اجتہاد کا دروازہ کھل گیا ہے حتّٰی کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر قرآن وحدیث کا اُردو ترجمہ دیکھ کر علوم میں دخل دینے لگے ہیں، تو شاہ صاحبؒ نے دِکھلا دیا

---

[۱] مُلاحظہ ہو "یادِ رفتگان" طبع کراچی، ۱۹۵۵ء ص ۴۵۲

کہ تم اہلِ علم کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ قرآن و حدیث میں اجتہاد کر سکو۔

بتلائیے اس بیان سے یہ نفع تھوڑا ہوا کہ تم کو اپنے جہل پر اطلاع ہو گئی، سب شرمندہ ہو گئے، مجھ کو جاہلوں کا علماء پر اعتراض کرنا بھی ناگوار ہوتا ہے، اس لئے بھی یہ جواب دیا گیا۔"[1]

اسی مشکل پسندی اور مختصر نگاری کی بناء پر ان کے قلم سے جو دو چار رسالے نکل گئے ہیں ان کو بڑے سے بڑا محقق بار بار مطالعہ کئے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ فاتحہ خلف الامام جیسے پامال موضوع پر جب قلم اٹھایا تو ایسا رسالہ لکھا کہ اہلِ علم کو اشتہار میں یہ لکھنا پڑا کہ بڑے بڑے علماء اس کو مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، اس لئے معمولی استعداد کے لوگ اس کو طلب کرنے کی زحمت نہ کریں۔

یہ عجیب و غریب اشتہار مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی نے کلیات شیخ الہندؒ کے سرورق کی پشت پر دیا تھا کہ:

"فصل الخطاب، فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ مضامین کا فی الحقیقت بے مثل رسالہ جو اکابر محدثین کی تصنیفات کا سچا نمونہ ہے، دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی زبان میں بکمالِ انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرماویں۔"[2]

علامہ انور شاہؒ میں اگر تصنیف و تالیف کا اچھا سلیقہ ہوتا، اور ان میں مشکل پسندی، ایجاز اور مختصر نگاری نہ ہوتی اور ان کو اپنے معاصر

---

[1] ملاحظہ ہو الافادات الیومیہ من الافاضات القومیہ ج ۶، ص ۱۶۶

[2] ملاحظہ ہو کلیاتِ شیخ الہند مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ

مُحدّث ناقد شیخ محمد زاہد کوثریؒ کا پیرایۂ بیان اور ترتیب و تہذیب ملی ہوتی، اور یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پاتا، تو دنیا میں صحاحِ ستّہ کے سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہ جاتی، اور کسی کو اس پر قلم اُٹھانے کی گنجایش باقی نہ رہتی۔ مگر ان سب بے نفسوں کو اخفائے حال میں اتنا اہتمام تھا کہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ دُنیا میں ان کو عالم کی حیثیت سے پہچانا جائے، بزرگوں کے جبر نے تدریس پر بھی آمادہ کیا، ورنہ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا۔

بحرالعلوم ـــــــ مولٰینا انور شاہ کشمیری

از فخرِ ملتِ اسلامیہ حضرت اقدس مولٰینا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم
(ناظمِ اعلیٰ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

حضرت مولٰینا انور شاہ کشمیریؒ اس دور کے عظیم علماءِ ربانیین میں تھے۔ قوتِ حفظ، تبحرِ علمی اور سلف کے کارناموں کے بارے میں جن لوگوں کو شبہ تھا انہیں شاہ صاحب کو دیکھ کر ان روایات پر یقین کرنا پڑا۔ مجھے ان سے تلمّذ کا شرف حاصل تو نہیں لیکن ان کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان کے تلامذہ سے مِل کر اپنے کو بھی ان کے تلامِذہ میں سمجھنے کا ایک احساس ہوتا تھا، لاہور اسٹیشن پر ایک بار دیوبند یا سرینگر جاتے ہوئے ایک ملاقات یاد ہے، میں مولٰینا احمد علی صاحب لاہوری کے ساتھ (جن کو حضرت شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی) اسٹیشن پر حاضر ہوا، بھاگ دوڑ اور مسافروں کے ہنگامہ کے دَوران بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی مجلس ایک پُر شکوہ محفلِ مذاکرہ اور مجلسِ علمی میں تبدیل ہوگئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا علم کے دفتر کھُل گئے ہوں۔

۱۳۵۰ھ میں دارُالعلوم دیوبند میں میرا طویل قیام تھا، تب شاہ صاحب ڈابھیل سے تشریف لائے تھے، میں پہلی مرتبہ اپنے بڑے بھائی اور مُربّی مولٰینا حکیم ڈاکٹر عبد العلی صاحب کا (جو ان کے عزیز شاگرد تھے) سلام پہنچانے دولت

خانے پر حاضر ہوا، شاہ صاحب نے بڑی محبّت سے جواب دیا اور خیریت دریافت کی۔ اس کے علاوہ بھی طلبہ کے ساتھ ان کی خدمت میں کئی بار حاضر ہوا اور علم کے اس پیکر اور سلف کی ایک نادر یادگار کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کیں جس پر مجھے فخر ہے۔ ہندوستان کے تمام علماءِ حق اور ممالکِ عربیہ کے باخبر علماء کو شاہ صاحب کے علمی کمالات کا معترف پایا۔

شدید مصروفیت اور طبیعت کی ناسازی کی حالت میں بستر پر لیٹے لیٹے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں جو کسی طرح ایسی باکمال ہستی کے شایانِ شان نہیں۔ اللہ تعالیٰ ملّتِ اسلامیہ کو پھر ایسا سرآمد روزگار عالم اور ایسا بحرُ العلوم عطا کرے۔ وَالسّلام

حضرت شاہ صاحبؒ ـــــ ایک مکمل لائبریری

از سحبان الہند حضرت مولینا احمد سعید صاحب دہلوی مرحوم

حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کے موقعہ پر جامع مسجد دہلی میں جو ماتمی اجلاس منعقد ہوا اس میں ملک کے نامور مقرر، فصیح اللسان واعظ اور قومی رہنما حضرت مولینا احمد سعید صاحب دہلوی نے جو فاضلانہ تقریر ارشاد فرمائی ہے وہ اس قدر جامع ہے کہ ہم اس کو بطور ایک مضمون کے یہاں شامل کرنا موزوں خیال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس اجتماع کی صدارت حضرت علامہ مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب مرحوم نے فرمائی تھی۔ (گوندو)

"حضرات! میں نے صدارت کی تحریک کے سلسلہ میں عرض کیا تھا کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح حالات اور ان کے حقیقی اوصاف و کمال تو حضرت مفتی صاحب قبلہ ہی بیان فرمائیں گے کیونکہ ؎

"قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری"

حضرت مفتی صاحب قبلہ نہ صرف شاہ صاحبؒ کے ہم عصر اور ہم سبق ہیں بلکہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی شاگردی کے فخر میں دونوں شریک ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک ہی چشمۂ فیض کے دو دریا ہیں جو ایک ہی منبع سے جاری ہوئے ہیں یا ایک دریا کی دو نہریں ہیں یا ایک بحرِ ناپیدا کنار سے نکلے ہوئے دو سمندر ہیں اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق صحیح معلومات اور حقیقی حالات تو مفتی صاحب بیان فرمائیں گے۔ مجھ جیسا جاہل حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و فنون اور ان کے کمالاتِ ظاہریہ و باطنیہ کے متعلق کیا عرض کر سکتا ہے۔ ایک وہ شخص جو سمندر کے کنارے کھڑا ہوا ہو اور جس کو سمندر کی گہرائی اور عمق میں کبھی غوطہ لگانے کی نوبت نہ آئی ہو، وہ

اس تجربہ کار غوّاص کے متعلق کیا رائے ظاہر کرسکتا ہے جو ہمیشہ سمندر کے عمق میں سے موتی نکالا کرتا ہے، جس نے بڑے بڑے طوفانوں میں جہاز رانی کی خدمت انجام دی ہو اور جو تمام خطرناک طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا ہو اور جس نے بڑے بڑے جہازوں کی ناخدائی کی ہو اور جو بڑے بڑے سمندروں کی شناوری کا فخر حاصل کرچکا ہو۔ اس کے اوصاف و کمالات وہ خشکی کا کیڑا کیا بیان کرسکتا ہے جس نے سمندر کی صورت بھی نہ دیکھی۔ جس طرح ایک خشکی کا کیڑا اور نام سُنائے بحر اس مگرمچھ کے کمالات ظاہر کرنے سے عاری ہے جو چوبیس گھنٹے پانی کی گہرائیوں اور سیلاب کے بے پناہ جھکولوں سے کھیلتا رہتا ہے۔ اسی طرح مجھ جیسا جاہل حضرت مولینا انور شاہ صاحب کے کمالات و اوصاف کے بیان سے قاصر و عاجز ہے۔

وَاللّٰہُ عَلٰی مَا اَقُوْلُ وَکِیْلٌ ؕ

علم کی فضیلت

حضرات! میں چاہتا ہوں کہ اس مختصر وقت میں آپ کے سامنے صرف تین باتیں عرض کروں، ایک علم کے متعلق، دوسری علماء کے متعلق اور تیسری حضرت شاہ صاحب کی وفات کے سلسلہ میں۔

علم کی فضیلت کا تذکرہ آپ نے بارہا سُنا ہوگا بالخصوص عربی مدارس کے جلسوں میں تو عام طور پر علم کے فضائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ علم کی شان اور اس کا مرتبہ صرف اس دُعا سے معلوم ہو سکتا ہے جو اللہ جلّ ذکرہٗ نے نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو تلقین کی ہے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو ایک دُعا تعلیم فرماتے ہیں یعنی ہمارے حبیب! ہم سے فلاں چیز طلب کرو۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ایک چیز اپنے حبیب کو دینا چاہتے ہیں تو وہ کیا چیز ہوگی۔ پھر دینا بھی اس طرح چاہیئے کہ خود فرماتے ہیں کہ پہلے مجھ سے مانگو تاکہ اس شے کی اہمیت اور زیادہ ہو جائے۔ خیال ہوتا تھا کہ شاید مال و دولت طلب کرنے کی ہدایت کی جائے گی یا اولاد کی طلب کے متعلق ارشاد کیا جائیگا

یا کہا جائیگا کہ جنت مانگو۔ لیکن دیکھئے ان میں سے ایک چیز بھی نہیں بلکہ ارشاد ہوتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ط آپ ہم سے علم کی زیادتی طلب کیجئے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی نظرِ انتخاب نے اپنے محبوب کے لئے جو چیز مفید اور نافع اور ان کی شان کے لائق ضروری سمجھی اور جس کے طلب کرنے کی ہدایت کی وہ علم کی زیادتی تھی۔ جس پیغمبر کی شان میں وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ اور وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ط ارشاد فرما چکے تھے اسی پیغمبر کو تعلیم فرماتے ہیں کہ زیادتی علم ہم سے طلب کرو۔ اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ علم کا مرتبہ اور علم کی شان کس حد تک بلند ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اور بھی عرض کیا جا سکتا ہے لیکن قلتِ وقت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صرف ایک ہی بات پر اکتفا کرتا ہوں۔

عُلماء کی فضیلت

معزز حاضرین! ہر چند کہ علم کی فضیلت سے اہلِ علم کی فضیلت معلوم ہوتی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کے متعلق صرف ایک حدیث بیان کروں۔ اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ نے بارہا اہلِ علم کی فضیلت کا بیان سُنا ہوگا کہ طالبانِ علم کے قدموں کے نیچے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں، آپ نے سُنا ہوگا کہ مچھلیاں دریاؤں اور چیونٹیاں اپنے سوراخوں میں عُلماء کی بقاء زندگی کے لئے دُعاء کیا کرتی ہیں آپ کو معلوم ہوگا کہ قیامت میں شہداء کا خون اور مُفتیانِ دین کے فتاویٰ کی سیاہی، یہ دونوں چیزیں ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر وزن کی جائیں گی تو فتاویٰ کی سیاہی کا وزن شہداء کے خون کے وزن سے زیادہ ہوگا۔ حالانکہ خون ایک بہت وزنی چیز ہے لیکن اہلِ علم کے فتووں کی سیاہی اس وزن پر بھی غالب آ جائے گی۔

آپ کو شاید پتہ ہوگا کہ علماء دنیا میں علم الٰہی کے خیمے ہیں جب کوئی

عالم مر جاتا ہے تو گویا علم الٰہی کا ایک خیمہ زمین سے اُٹھا لیا جاتا ہے۔ اہل علم اور حضرات علماء کا گروہ وہ ہے جن کی ضرورت مسلمانوں کو جنت میں بھی پیش آئے گی حالانکہ جنت عمل کی جگہ نہیں ہے۔ وہاں کسی عمل پر استفسار نہ ہوگا بلکہ طلب انعامات کے سلسلہ میں علماء کی ضرورت واقع ہوگی۔ حضرت حق کی طرف سے گھڑی گھڑی انعامات کے طلب کا تقاضا ہوگا۔ کہا جائیگا کہ مانگو کیا مانگتے ہو۔ اب یہ کون بتائیگا کہ کیا مانگا جائے۔ اس لیئے اہل علم کی ضرورت ہوگی کہ ہماری رہنمائی کیجیئے اور ہم کو بتایئے کہ اللہ جل ذکرہٗ سے کیا مانگیں۔ یہ تمام وہ فضائل ہیں جو آپ کو بار بار سُننے کا اتفاق ہوا ہوگا لیکن میں آپ کو صرف ایک روایت کی طرف توجہ دِلانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا ہے فضلُ العالِمِ علی العابد کفضلی علیٰ ادناکم۔ اس حدیث میں سرکار دوعالم ؐ نے ایک جاہل عابد پر عالم کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا ہے اور اس طرح تشبیہہ دی ہے کہ ایک عابد پر عالم کو ایسی بزرگی حاصل ہے جیسے میری بزرگی ایک ادنیٰ مسلمان پر۔ اب آپ خیال کیجیئے کہ نبی کریم ؐ کو اپنے ایک اُمتی پر کس قدر بُلندی اور برتری حاصل ہے۔ کہاں حضور ؐ کی ذاتِ اقدس اور کہاں آپ کا ایک ادنیٰ اُمتی۔ جو فرق ان دونوں مرتبوں کے مابین ہے وہی فرق ایک عابد اور عالم کے مابین ہے۔

حضرت شاہ صاحب

معزز حاضرین! میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ مجھے حضرت شاہ صاحب کی ذات کے متعلق بھی کچھ عرض کرنا ہے اگرچہ ان کے حقیقی کمالات واوصاف تو مفتی صاحب ہی بیان فرمائیں گے۔

حضرات! میں اس امر کو ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کو ہندوستان میں جو کچھ علمی اثرات اور اہل علم کا وجود نظر آرہا ہے، یہ سب دہلی کے اس خاندان کا فیض ہے جو شیخ نرور کے چھتے میں دفن ہے اور جس کا یہ

احسان ہے کہ اس نے ہندوستان کو احادیثِ رسول اللہؐ سے آشنا کیا ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد جس خاندان کو خدمتِ حدیث کا شرف حاصل ہے وہ شاہ عبدالرحیم صاحب کا خاندان ہے۔ اسی خاندان کے بزرگوں میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ہیں۔ یہ تمام حضرات اس مبارک خاندان کے افراد ہیں۔ ان میں بعض حضرات ہجرت فرما کر مکۂ معظمہ تشریف لے گئے اور بعض) آج بھی شیخ نور کے چھتہ میں جس کو آج مہندیان کہتے ہیں، آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ دہلی والے جانتے ہونگے کہ ایک زمانہ ہوا جب اس قبرستان کی مسجد میں شبینہ بھی ہوا کرتا تھا۔ یہی قبرستان ہے کہ جہاں علم کے سمندر دفن ہیں۔ آج جو علماءِ دیوبند کے نام سے مشہور ہیں مثلاً مولینا رشید احمد صاحب، مولینا محمد قاسم صاحب وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ یہ سب اسی خاندان کے شاگرد ہیں۔ گویا دارُ العلوم دیوبند اس تلاطم خیز سمندر کا ایک ٹکڑا ہے جو کبھی ترکمان دروازے کے باہر موجیں مارا کرتا تھا اور جس کی بے پناہ طغیانیاں سچ مچ آسمان سے باتیں کرتی تھیں اور آج بھی جس کی خاموش روانی اہلِ بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔

حضرات دیوبند اسی خاندان سے عبارت ہے جس کا نام شاہ عبدالرحیم صاحبؒ کا خاندان ہے، دارُالعلوم دیوبند کے لوگوں کو جس طرح علم ظاہر اور باطن میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے خاندان سے منسوب کیا جاتا ہے اسی طرح علم باطن میں ان لوگوں کی نسبت حاجی امدادُ اللہ صاحب رحمۃُ اللہ علیہ کے ساتھ کی جاتی ہے جو خلیفہ تھے میاںجی نور محمد صاحب کے۔

شاہ عبدالرحیم دہلوی اور میانجی نور محمد جھنجانوی

میری اس مختصر تفصیل کے بعد آپ یقیناً اس نتیجہ پر پہونچے ہوں گے کہ اس دارالعلوم دیوبند میں جو کچھ ہے وہ مولینا شاہ عبدالرحیم

صاحب دہلوی اور میاں جی نور محمد صاحب جھنجانوی کی تعلیم کا خلاصہ ہے جو چمن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی کے ایک چھتہ میں لگایا تھا جس کو شیخ نزور کا چھتہ کہا جاتا تھا۔ اسی چمن کی یہ عطر بیزیاں اور اسی گلستان کے یہ پھول ہیں جس سے آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا اُن کی خوشبو سے مہک رہی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک بنجر اور خشک زمین میں اپنے کمالات علمیہ کی تخم ریزی کی تھی اور اس دار الحرب میں قرآن اور حدیث کی اشاعت اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ کا درس شروع کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ شاہ صاحب کی یہ مُخلصانہ سعیِ مشکور بارآور ہوئی۔ اسی خشک زمین میں علم نبوی اور علمِ الٰہی کے سمندر ناپیدا کنار بنکر بہے اور چمنستانِ نبوی کی شاخیں دہلی اور دیوبند سے گذرتی ہوئی تمام عالم پر سایہ فگن ہوئیں۔

حضرات! مولانا محمد انور شاہ صاحب کون تھے؟ اسی چمنِ ولی اللّٰہی کے ایک بارآور اور ثمردار درخت تھے جو اپنے گنجان سایہ سے تمام عالم کو مُستفید کر رہے تھے اور جس درخت کے شیریں پھلوں سے ایک عالم اپنی گرسنگی کو دور کر رہا تھا، حضرت شاہ صاحب ایک فیض جاری کے ایسے سرد اور شیریں چشمہ تھے جس کے پانی کا بہاؤ نہ صرف ہندوستان تک محدود تھا بلکہ تمام عالم اسلامی اسی چشمہ سے سیراب ہو رہا تھا۔ اس کا منبع اگرچہ دیوبند میں تھا لیکن اس کا دھارا چین، بُخارا، جاوا، مصر اور ترکی میں پڑتا تھا۔

برادرانِ محترم! ایسے باکمال حضرات کیا روز روز پیدا ہوتے ہیں۔ صدیوں میں کہیں امت میں ایسے آدمی پیدا ہوتے ہیں؟ شاہ صاحب کا علمی تبحر، ان کا حافظہ ان سے دریافت کیجئے جن لوگوں کو شرفِ صحبت حاصل ہے۔

آپ حافظ ابن تیمیہؒ کو "بحرٌ لا ساحلَ لہٗ" فرمایا کرتے تھے لیکن خود بھی شاہ صاحب "بحرٌ لا ساحلَ لہٗ" تھے۔ حافظہ کی یہ حالت تھی کہ برسوں کی

پڑھی ہوئی کتاب کو جب کسی حوالہ کی غرض سے کھولنا چاہتے تھے تو خود فرماتے تھے "حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ" یہ جملہ کہہ کر کتاب کھولا کرتے تھے اور وہی صفحہ نکل آیا کرتا تھا جہاں سے شاہ صاحب کو حوالہ دینا مقصود ہوتا تھا۔

ابھی آپ نے مولانا سلطان محمود صاحب سے سُنا کہ فتح القدیر جیسی بڑی کتاب شاہ صاحب نے اکیس دِن میں ختم کر دی تھی۔ ایک دفعہ شاہ صاحب غریب خانہ پر تشریف لائے۔ اثناءِ گفتگو میں حیات الحیوان کا ذکر نکل آیا۔ فرمانے لگے، ہاں! دمیری نے خوب کتاب لکھی ہے۔ میں نے تین دفعہ اس کو بالاستیعاب پڑھا ہے۔

کسی کتاب کا شاہ صاحب کے سامنے نام لیجئے۔ وہ کتاب نہ صرف شاہ صاحب کی پڑھی ہوئی ہوگی بلکہ اس کی عبارتیں اور صفحات کے صفحات شاہ صاحب کو حفظ یاد ہوں گے۔ کسی واقعہ کا تذکرہ شاہ صاحب کے سامنے آیا اور شاہ صاحب نے اس کے تمام متعلقات بیان کرنے شروع کر دیئے۔ مطبوعہ کتُب کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کو صدہا قلمی کتب کی عبارتیں محفوظ تھیں جو کتابیں آج تک پریس اور مطابع کی مرہونِ منت نہیں ہیں شاہ صاحب کو ان کے بھی صفحات حِفظ تھے۔ شاہ صاحب سے کسی مسئلہ میں گفتگو کیجیئے اور کسی وقت کیجئے آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ شاہ صاحب اس مسئلہ کے لئے بڑی دیر سے مستعد بیٹھے ہوئے اس امر کا انتظار کر رہے تھے کہ یہ مسئلہ کوئی مجھ سے دریافت کرے اور میں اس کا جواب دوں۔

زندہ لائبریری

معززحاضرین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ نے دوشنبہ کی شام کو دیوبند کی خاک میں کسی انسان کو دفن نہیں کیا ہے بلکہ آپ نے ایک ایسے مکتبہ کو خاک میں مِلایا ہے جس میں ہر فن کی بے شمار کتابیں الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے ایک ایسے کتب خانہ کو زمین کی تہہ

میں چھپا دیا ہے جس کی کتابیں احاطۂ احصاء و شمار سے خارج تھیں۔ ہائے! مسلمانوں کی بدقسمتی! ہائے قوم کی حرماں نصیبی، کیا چیز ان کے ہاتھ سے تلف ہوگئی، ہم جیسے جاہلوں کی ہزاروں زندگیاں بھی شاہ صاحب پر قربان کر کے شاہ صاحب کو زندہ رکھا جاتا تب بھی شاہ صاحب کی زندگی بہت سستی تھی۔ کسی لائبریری میں تو کتاب کے تلاش کرنے اور عبارت کو ڈھونڈنے میں کچھ دقت اور دشواری بھی ہوتی ہے لیکن حضرت شاہ صاحب کے استحضار کی تو یہ حالت تھی کہ ادھر سائل کے منہ سے فقرہ نکلا اور ادھر شاہ صاحبؒ نے کتاب کی عبارت پڑھنی شروع کی۔

دُنیا سے بے رغبتی اس علمی تبحّر اور کمالاتِ ظاہری اور باطنی کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ کی یہ حالت تھی کہ جس طرح وہ اپنے علم میں تمام معاصرین سے ممتاز تھے، اسی طرح زہد و تقویٰ اور اپنے ورع و پرہیزگاری میں بھی بے مثل تھے۔ کون نہیں جانتا کہ ان کو ڈھاکہ یونیورسٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ نے بار بار طلب کیا۔ بڑی بڑی تنخواہیں پیش کیں۔ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں وفود حاضر ہوئے لیکن شاہ صاحب نے کبھی بڑی تنخواہ کو ترجیح نہیں دی اور ہمیشہ دیوبند اور ڈابھیل کے خشک ٹکڑوں کو پسند فرمایا۔ ۱۳۱۵ھ میں پہلی مرتبہ دیوبند سے تشریف لائے اور مدرسۂ امینیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ مدرسۂ امینیہ کی وہ ابتدائی حالت تھی۔ میں کیا عرض کروں کہ مولینا امین الدین اور مولینا انور شاہ صاحبان نے کس عسرت کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس کی پوری تفصیل تو حضرت مفتی صاحب آپ کے روبرو بیان کریں گے۔ ان واقعات کو کم و بیش ۳۰، ۳۵ سال گذر چکے ہیں۔ آج ان باتوں کے جاننے والے شاید چند ہی حضرات ہونگے۔

شاہ صاحب کی موت کا صدمہ حضرات! جس طرح شاہ صاحب جیسے بزرگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح ایسے بزرگوں کی موت

صدیوں خون کے آنسو رُلایا کرتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ موت ہر شخص کو آتی ہے۔ موت سے بچنے والا کوئی شخص نہیں ہے۔ شاہ صاحب کی موت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے بھی اکابر وفات پا چکے ہیں۔ قدرت کا یہ خاص شغل ہے وہ ہمیشہ بناتی بگاڑتی رہتی ہے۔ خود ہی ایک پودے کی پرورش کرتی ہے۔ اس میں پھل اور پھول پیدا کرتی ہے۔ اس کی ہری ہری ٹہنیوں کو ٹھنڈا اور خوشگوار سایہ عطا کرتی ہے۔ ایک چھوٹے سے پودے کو اتنا اونچا کرتی ہے کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ جب یہ پودا عجائباتِ قدرت پر ایک شاہد ہو جاتا ہے تو اس کو فنا کر دیتی ہے اور قدرت اس حصۂ زمین کو ان پودوں کے لئے خالی کرا لیتی ہے جو بیج کی خاموشیوں اور تخم کی گہرائیوں میں گوشہ نشین ہوا کرتے ہیں۔ الغرض قدرت کا یہی کام ہے۔ موت وحیات روزمرہ کا کھیل ہے۔ نہ کسی کی زندگی مسرت افزا ہے، نہ کسی کی موت روح فرسا ہے اور یہی مطلب ہے "لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ" کا۔

میرے معزز دوستو! میں اسے تسلیم کرتا ہوں، میں بھی سمجھتا ہوں کہ موت مِن حیثُ الموت شاہ صاحبؒ کی موت کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن میرے بھائی شاہ صاحب کی موت ایسے زمانہ میں واقع ہوئی ہے جو زمانہ ہے قحطُ الرِّجال کا، جو دور ہے فقدانِ کمال کا۔ شاہ صاحب اگر ایسے عہد میں مرتے کہ جس زمانہ میں شاہ صاحب کا جواب اور ان کا مِثل یا ممکن موجود ہوتا تو یقیناً اس قدر صدمہ اور رنج کی ضرورت نہ تھی۔ رونا تو یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے زمانہ میں وفات پائی ہے جب کہ ان کا قائم مقام کوئی نظر نہیں آتا۔ قلق تو یہ ہے، غم تو یہ ہے، صدمہ تو اسی کا ہے کہ اس فقدانِ رجال کے عہد میں شاہ صاحب کی موت ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا موجب ہے، مستقبلِ قریب تو قریب، میں تو عرض کرتا ہوں مستقبلِ بعید میں بھی شاہ صاحبؒ

کی تلافی کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔

حجاج بن یوسف کا ظلم

آپ حضرات نے غالباً حجاج کا نام سُنا ہوگا۔ یہ وہ ظالم ہے جس کے دامن پر ستّر ہزار بے گناہوں کے خون کے دھبّے پڑے ہوئے ہیں۔ اسی کے متعلّق حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر تمام انبیاء اپنی اُمّتوں کے ظالم قیامت میں لے کر آئیں تو اُمّتِ محمّدیہ کی طرف سے حجاج ہی کا وجودِ نا مسعود سب کا جواب ہو جائے گا۔

حجاج مروانیوں کے دَور میں امیر تھا۔ اہلِ بیت اور ان کے معاونین کا بدترین دشمن تھا۔ صدہا تابعین کو تو محض اس جرم میں قتل کرا چکا تھا کہ وہ سیّدنا حسنؓ اور سیّدنا حسینؓ کو ذُرّیتِ رسولؐ کیوں کہتے ہیں۔ یہ کہا کرتا تھا کہ ذُرّیت کا تعلُّق تو لڑکے کی اولاد سے ہوتا ہے۔ اگر رسول اللہؐ کا کوئی بیٹا ہوتا تو بے شک اس کی اولاد ذُرّیتِ رسولؐ ہو سکتی تھی۔ حضرتِ فاطمہؓ کی اولاد کو ذریتِ رسولؐ کہنا غلط ہے۔ اسی لغو اور فاسد خیال کی بناء پر اس نے سینکڑوں علماء اور صُلحاء کو قتل کر دیا تھا

حضرت شعبی کا واقعہ

حُسنِ اتفاق دیکھئے اسی زمانہ میں ایک بزرگ علاّمہ شعبی بھی تھے جو اپنے عہد کے بہت بڑے تابعی بھی تھے' ان کے متعلق بھی یہ مشہور تھا کہ وہ سیّدنا حسینؓ کو ذرّیت رسولؐ کہتے ہیں۔ اس ظالم نے ان کو بھی گرفتار کر لیا اور جب وہ دربار میں اس موذی کے سامنے پیش ہوئے تو اس نے سخت غصّے کے لہجے میں ان سے کہا کہ کیا تم حسن اور حُسین کو ذریتِ رسولؐ کہتے ہو؟ انہوں نے کہا بے شک، اس نے کہا اچھّا اس بات کو قرآن سے ثابت کر دو، ورنہ کھانا کھانے سے پیشتر تم کو قتل کرا دوں گا۔ اور دیکھو وہ آیت "نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَکُمْ" نہ پڑھنا اس کا مطلب ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔

اہلِ باطل اور گمراہ لوگوں کا ہمیشہ قاعدہ رہا ہے کہ یہ بدبخت حدیث کو چھوڑ کر قرآن سے دلیل مانگا کرتے ہیں اور اس خبیث نے تو یہ کیا کہ قرآن کی بھی ایک آیت کو مستثنیٰ کرلیا۔ اور آیتِ مباہلہ جو اس بارے میں بالکل صاف تھی اس سے ان کو استدلال کرنے کو منع کر دیا۔ جب اس نے اس آیت کے علاوہ ان سے استدلال طلب کیا تو حضرت شعبی نے بے ساختہ وَتِلْكَ حُجَّتُنَا کا رکوع پڑھنا شروع کیا اور اس کی رکوع کی یہ آیت كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ وَأَيُّوبَ وَيُوسُفَ وَمُوسَىٰ وَهَارُونَ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيَىٰ وَعِيسَىٰ وَإِلْيَاسَ كُلٌّ مِنَ الصَّالِحِينَ یہ پوری آیت پڑھی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ نبیوں کا ذکر فرمایا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کو بھی ذریتِ نوح میں شمار کیا گیا ہے۔ حضرت شعبی نے آیت پڑھ کر فرمایا اگر حضرت عیسیٰؑ جو مریمؑ کی اولاد ہیں اور جن کا باپ کوئی نہیں ہے، ایک عورت کے بطن سے پیدا ہو کر حضرتِ نوحؑ کی ذریت ہو سکتے ہیں تو امام حسنؑ اور امام حسینؑ فاطمہؑ کے بطن سے پیدا ہو کر رسول اللہؐ کی اولاد کیوں نہیں ہو سکتے۔ حجاج یہ سن کر دنگ رہ گیا اور کہنے لگا "خدا کی قسم میں نے تو آج تک اس آیت پر غور ہی نہیں کیا۔ شعبی اگر تم کہو تو تم کو کسی بڑے عہدے پر فائز کر دیا جائے۔ اور اگر تمہاری خواہش ہو تو تم کو واپس تمہارے وطن میں پہنچا دیا جائے۔" علامہ شعبیؒ نے فرمایا "اس سے زیادہ میری کوئی خواہش نہیں ہے[1]۔"

سعید بن جبیرؒ

حجاج نے اپنے مظالم کے آخری دور میں ایک دوسرے تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ کی گرفتاری کا حکم صادر کیا اور سپاہیوں کا ایک دستہ روانہ کیا تاکہ سعید بن جبیرؒ کو گرفتار کر کے پیش کیا جائے۔ سپاہی جب روانہ ہوئے تو ان کو طلاق و عتاق کی قسمیں دلائی گئیں۔ یہ لوگ گئے اور حضرت جبیرؒ کو انہوں نے گرفتار کر لیا۔ سپاہیوں نے سعید سے معذرت کی اور اپنی مجبوری کا اظہار کیا لیکن سعید خوشی خوشی ان کے ہمراہ روانہ

---

[1] یعنی وطن واپس جانے کے بغیر

ہو گئے۔ راستہ میں ایک راہب کا صومعہ تھا جہاں سپاہیوں نے منزل کی اور سعید سے اصرار کیا کہ وہ رات کو صومعہ میں رہیں کیونکہ وہاں شب کے وقت شیر آیا کرتا تھا لیکن سعید نے صومعہ میں پناہ لینے سے انکار کر دیا اور سپاہیوں سے وعدہ کیا کہ مجھ سے اطمینان رکھو میں جاؤں گا نہیں۔ سپاہی رات کو صومعہ میں پناہ گزین ہو گئے، اور سعید صومعہ سے باہر رات بھر نماز پڑھتے رہے۔ رات کو شیر آیا اور سعید بن جبیر کے تلوے چاٹتا رہا۔ سپاہیوں نے بھی دروازے میں سے یہ واقعہ دیکھا صبح کو تمام سپاہی سعید بن جبیر کی انتہائی خوشامد کرنے لگے اور اپنا قصور معاف کرانے کی خواہش ظاہر کی۔ سعید بن جبیر نے فرمایا، تمہارا کیا قصور ہے مجھے تو شہید ہونا ہے۔ ہاں اتنا بتا دیتا ہوں کہ میرا قتل آخری قتل ہوگا۔ میرے بعد حجاج کسی اور بے گناہ کو قتل نہ کر سکے گا۔ بہر حال سعید بن جبیر حجاج کے قلعہ میں پہنچے اور حجاج کو اطلاع دی گئی کہ ملزم حاضر ہے۔ حجاج نے سعید کو اپنے روبرو پیش کرنے کا حکم دیا اور نہایت خشم آلود لہجے میں دریافت کیا کہ تیرا نام کیا ہے؛ سعید نے جواب میں کہا "سعید بن جبیر"۔ حجاج نے کہا نہیں بلکہ "شقی بن کُسیر"، سعید نے فرمایا میری ماں میرا نام تجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ یعنی نام تو اصل میں وہی ہے جو میری ماں لیا کرتی تھی، کیونکہ اس نے ہی نام رکھا تھا اور وہی میرا نام خوب جانتی ہے۔ اس پر حجاج نے غصہ میں کہا تو بھی بد نصیب اور تیری ماں بھی شقی۔ سعید بن جبیر نے فرمایا؛ غیب کا علم کسی اور ہی کو ہے وہی خوب جانتا ہے کہ شقی کون ہے اور سعید کون ہے؛ حجاج نے کہا میں تجھ کو دُنیا سے اب بھڑکتی ہوئی آگ میں روانہ کرتا ہوں۔ سعید نے فرمایا اگر میں سمجھتا کہ آگ میں بھیجنا تیرے قبضے میں ہے تو شاید تجھ کو معبود بنا لیتا۔ حجاج نے کہا محمدؐ کے متعلق تیری کیا رائے ہے؛ سعید نے فرمایا وہ نبی رحمت ہیں۔ حجاج نے کہا علی کے متعلق کیا کہتا ہے؛ وہ جنت میں ہیں یا دوزخ میں؛ سعید نے فرمایا، میں نہ جنت میں گیا ہوں نہ دوزخ میں۔ مجھ کو کیا معلوم کہ جنت میں کون

ہے اور دوزخ میں کون۔ حجاج نے کہا خُلفاء کے متعلق تیری کیا رائے ہے۔؟

سعید نے فرمایا میں ان پر داروغہ نہیں ہوں۔ حجاج نے کہا اچھا ان سب میں تیرے نزدیک اچھا اور عمدہ کون ہے؟ سعید نے فرمایا جو اپنے خالق کو پسندیدہ ہے۔ حجاج نے کہا خالق کو کون پسندیدہ ہے؟ سعید نے فرمایا اس کا علم اس کو ہے جو ہر کھُلی چھُپی چیز کو جانتا ہے۔ حجاج نے کہا کہ میں نے سُنا ہے تو ہنسا نہیں کرتا۔ سعید نے فرمایا، جو شخص مٹی سے بنا ہے اور پھر مٹی کو آگ میں داخل ہوتا ہے، وہ کیا ہنسے گا؟

حجاج نے ان کے سامنے آلاتِ لہو ولعب پیش کیے۔ اس پر سعید بن جبیر کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حجاج نے کہا سعید تیرے لئے خرابی ہو۔ سعید نے فرمایا خرابی تو اس کے لئے ہے جو جنّت سے محروم رہا اور دوزخ میں داخل کیا گیا، حجاج نے کہا سعید تجھ کو کس طرح قتل کیا جائے اور تو کون سے طریقۂ قتل کو پسند کرتا ہے۔ سعید نے فرمایا، یہ مجھ سے دریافت کرنے کی بات نہیں ہے تو جس طرح مجھ کو قتل کریگا، خدا تعالیٰ اسی طرح تجھ کو قتل کریگا لہٰذا تو خود طریقۂ قتل پسند کر۔ جو طریقہ تجھ کو پسند ہو اسی طرح مجھ کو قتل کردے"۔ حجاج نے کہا، میں چاہتا ہوں تجھ کو مُعاف کردوں۔ سعید نے فرمایا اگر یہ معاف کرنا اللہ کی جانب سے ہو تو میں اس کو قبول کرتا ہوں، اور اگر تیری طرف سے ہو تو مجھ کو قبول نہیں۔ حجاج نے جلّاد کو حُکم دیا کہ لے جاؤ، اس کو قتل کردو۔ سعید کو جلّاد لیکر جب دروازہ پر پہنچا تو سعید ہنس دئیے۔ حجاج نے کہا اس کو لوٹا کر لاؤ۔

جب دوبارہ حاضر کئے گئے تو حجاج نے دریافت کیا تم کیوں ہنسے؟ سعید نے فرمایا، تیری جُرأت اور اللہ کے حِلم پر مجھ کو ہنسی آگئی۔ حجاج نے حکم دیا۔ ہمارے سامنے اس کو قتل کردو۔ چناں چہ آپ قبلہ رُخ ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا:-

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ط

حجاج نے کہا اس کا مُنہ قبلہ کی طرف سے پھیر دو۔ چنانچہ سعید کا مُنہ قبلہ کی جانب سے پھیر دیا گیا۔ اس پر سعید نے فرمایا "وَلِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ حجاج نے حکم دیا اس کا مُنہ اوندھا کر دو اور اوندھا کر کے زمین پر لٹا دو۔ اس پر سعید نے کہا مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی۔ چنانچہ حجاج لاچار ہو گیا اور اس نے قتل کا حکم دے دیا۔ سعید بن جبیر نے کلمۂ شہادت پڑھا اور شہید ہو گئے۔

حضرت حسن بصریؒ کو جب سعید بن جُبیرؒ کی شہادت کا علم ہُوا تو بہت روئے اور فرمایا اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَقِیْبٌ عَلٰی فَاسِقٍ شَقِیْفٍ و اللّٰہ لو ان اھل المشرق والمغرب اشترکوا فی قتلہ لَاَکَبَّھُمُ اللّٰہُ فی النَّارِ

حضرت حسن بصری رحمۃُ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سعید بن جبیر اس مرتبہ کے آدمی تھے کہ اگر ان کو اہلِ مشرق و مغرب مِل کر بھی قتل کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سب کو مُنہ کے بَل دوزخ میں ڈال دیتا۔ اس واقعۂ دلخراش کے بعد حجاج زیادہ نہ جی سکا اور مر گیا۔

امیر المؤمنین عمر بن عبدالعزیز نے اس کو خواب میں دیکھ کر حالت دریافت کی، تو حجاج نے کہا ہر مقتول کے بدلہ میں ایک ایک مرتبہ قتل کیا گیا لیکن سعید بن جبیر کے قتل کی پاداش میں سترؔ مرتبہ قتل کیا گیا ہوں۔ علاّمہ دمیری نے اس قصّہ کو نقل کر کے شبہ کیا کہ سعید بن جبیر تابعی تھے۔ ایک تابعی کے قتل کی پاداش میں سترؔ مرتبہ قتل کیوں کیا گیا؛ حالانکہ یہ صحابہ کو بھی قتل کر چکا تھا۔ جیسا کہ عبد اللہ بن زبیرؓ کو صراحتًا اور عبداللہ بن عمرؓ کو کنایۃً و اشارۃً۔

شبہ کی وجہ یوں سمجھئے کہ صحابہ کے قتل کے سلسلہ میں تو صرف ایک مرتبہ قتل ہو، حالانکہ صحابی کا مرتبہ تابعی سے افضل ہے اور اس شبہ کا جواب دمیری نے یہ دیا کہ سعید بن جبیر کو جس وقت قتل کیا گیا اس وقت سعید کی مثل مسلمانوں میں کوئی شخص موجود نہیں تھا اور دوسرے حضرات کے قتل کے وقت اور حضرات موجود تھے۔

جو کم و بیش مرنے والوں کی جگہ پُر کر سکتے تھے۔

حاصلِ کلام آپ حضرات مُعاف کیجئے، میری تقریر طویل ہو گئی یہ تو ضمنی طور پر آ گیا اور یہ آیا بھی کیوں صرف اس لئے کہ قحط الرجال اور فقدانِ باکمال کے عہد میں شخصِ واحد کی موت ہزاروں اور لاکھوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ حضرتِ مولینا انور شاہ صاحب کی موت ایسے دَور کی مَوت ہے جس کے بعد ان کا مثل اور جانشین کوئی نہیں ہے۔ سب سے بڑی وجہ رنج و اَلم یہ نہیں کہ شاہ صاحب کی وفات کیوں ہو گئی؛ شاہ صاحب تو بہر حال یہاں سے زیادہ آرام و آسائش میں تشریف لے گئے۔ وہ اب بہترین زندگی میں ہیں۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً۔ سوال شاہ صاحب کا نہیں ہے سوال تو اپنی حرماں نصیبی کا ہے۔ جو چیز کہیں نہیں ملتی تھی، جو مسئلہ تلاش کرنے سے دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ جو واقعہ کتُب کی ورق گردانی سے مُیسّر نہ ہوتا تھا، وہ شاہ صاحب کے حافظہ کے "کتبُ خانہ" میں مِل جاتا تھا۔

شاہ صاحب کا سیاسی عقیدہ دورِ حاضر کی سیاست کا جہاں تک تعلق ہے اور عہدِ حاضر میں آزادئ وطن اور آزادئ ہندوستان کا جہاں تک سوال ہے کون نہیں جانتا کہ اس میں شاہ صاحب کا وہی مَسلک تھا جو عام طور پر اپنے اکابر کا مَسلک رہا ہے۔ وہ باوجود اس ضعف و ناتوانی کے بھی جیل جانے کے لئے آمادہ تھے۔ انہوں نے لاہور میں ایک دفعہ لائن والی مسجد میں علماء کو خطاب کر کے فرمایا تھا۔ "کچھ کر لو، یہ وقت بار بار نہیں آتا۔ میں علماء سے کہہ رہا ہوں تم کو نوروٹی ٹکیا دین کے نام پر ملتی ہے۔ دین کے لئے تم بھی کچھ کرو۔ میں اس قدر ضعیف ہو گیا ہوں کہ اب ضعف کی وجہ سے چلنا پھرنا بھی مجھ کو مشکل ہو گیا ہے لیکن اس ضعف و ناتوانی کے باوجود بھی میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔"

ان الفاظ سے شاہ صاحب کی جرأت و ہمّت اور آزادئ وطن کے جذبہ کا بآسانی حال معلوم ہو سکتا ہے۔ حضرت مُفتی صاحب کو جو خط شاہ صاحب نے جیل میں لکھا ہے جب

آپ اس کو سُنیں گے تو اس امر کا خود اندازہ لگائیں گے کہ حضرت شاہ صاحب (اُس زمانہ کی) کانگریس کے کس قدر حامی تھے اور مُلک کی موجودہ تحریکات سے مرحوم کو کس قدر دلچسپی تھی۔ اس سنگلاخ اور پتھریلی راہ میں ان کا وہی نظریہ تھا جو ان کے اکابر کا تھا اور بالخصوص جو حضرت شیخ الہندؒ کا تھا۔

نمک کی تحریک

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ جب گاندھی جی نے نمک کے قانون کی سول نافرمانی شروع کی تھی تو لوگوں نے مذاق شروع کر دیا تھا۔ بالخصوص مُسلمان تو اس تحریک کا بہت ہی مذاق اُڑاتے تھے اور بعض نے تو اس تحریک کا نام "نمکین سول نافرمانی" رکھ دیا تھا۔ مُسلم اخبارات جو ملکی تحریکات سے علیحدہ تھے انہوں نے اس تحریک پر سوقیانہ پھبتیاں بھی اُڑائی تھیں لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے اس زمانہ میں یہ اعلان کیا تھا کہ مذہب اسلام میں نمک مباحُ الاصل ہے، جیسا کہ ہوا، پانی اور خود رَو گھاس۔ شاہ صاحبؒ کے اس اظہارِ خیال پر اکثر حضرات بہت کچھ چراغ پا ہوئے تھے اور بعض اصحاب نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ آج جب گاندھی جی نے نمک کی سول نافرمانی شروع کی ہے تو شاہ صاحب کو بھی نمک کی روایت مِل گئی حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس قسم کے اعتراضات نہایت لغو اور مُہمل تھے اور یہ اعتراضات وہی لوگ کرتے تھے جو نہ مذہب سے واقفیت رکھتے تھے اور نہ جن کو تہذیب و دیانت سے کوئی حصّہ ملا ہے۔

شاہ صاحب کا کسی مسئلہ کو ضرورت کے موقع پر بیان فرمانا یا اس کو ظاہر کر دینا یہ قابلِ تحسین وقابلِ تشکُّر و اطمینان تھا۔ مسلمانوں کو اس پر خوشی اور مسرّت کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ آج دُنیا کے عُقلاء جس چیز کی خوبی کو سمجھتے ہیں الحمدُ للہ مقدس مذہبِ اسلام میں وہ چیز چودہ سو برس پہلے موجود تھی۔ نمک کے ٹیکس کی خرابی اور نمک کے ٹیکس کو ظلم بتلانے والے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے والے آج پیدا ہوئے لیکن مذہبِ اسلام کی حق پسندی اور انصاف کو ملاحظہ کیجیے کہ وہ چودہ سو برس پہلے اس چیز کو ناجائز کر چکا ہے۔ یہ موقع فخر و مباہات اور حقانیتِ اسلام کے

اظہار کا تھا یا شاہ صاحب مرحوم پر اعتراض کا۔ لیکن ان لوگوں کا کیا علاج ہو سکتا ہے جن کی بصیرت اللہ تعالیٰ نے سلب کرلی ہو اور جنہوں نے آنکھیں بند کرکے استعمار و استبداد کی حمایت کو اپنا شعار بنالیا ہو۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔

بہرحال شاہ صاحب کے اس اعلانِ حق کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کے عام طبقہ کو نمک کی تحریک سے ہمدردی ہوگئی۔ برادرانِ ملت! شاہ صاحبؒ خدا کے فضل و کرم سے اتنی خوبیوں کے مالک تھے کہ ان کے اوصاف و کمالات کا احصاء و استقصار مجھ جیسے جاہل کے لئے ناممکن ہے۔ شاہ صاحب نے جو کچھ کابراً عن کابرٍ شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور میاں جی نور محمد صاحبؒ سے حاصل کیا تھا اس کے بیان کو دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہیں۔ اگر مزید تفصیل معلوم کرنی ہے تو جناب صدر کی تقریر کا انتظار کیجئے، میں اپنی تقریر کو اپنے عجز و قصور کے اعلان کے ساتھ ختم کرتا ہوں اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔

اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتَهٗ، وَاٰمِنْ رَوْعَتَهٗ، وَلَقِّنْ حُجَّتَهٗ، وَبَيِّضْ غُرَّتَهٗ، وَارْحَمْ غُرْبَتَهٗ، وَتَقَبَّلْ حَسَنَاتِهٖ وَكَفِّرْ سَيِّاٰتِهٖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ ۝

(مطبوعہ ماہنامہ دارالعلوم جولائی ۱۹۶۶ء)

کمالاتِ انوری

(از حضرت مولانا محمد انوری صاحب لائل پوری رحمۃ اللہ علیہ)

"مولانا محمد صاحب لائل پوری (المعروف محمد انوری) حضرت شیخ الہند کے دستِ مبارک پر بیعت شدہ مرید اور صحبت یافتہ تھے اور حضرت شاہ صاحب کے تلمیذِ ارشد رہے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ محبت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو "انوری" لکھتے تھے۔ موصوف حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری کے فیوض و کمالاتِ روحانی سے بھی مستفید ہوئے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے تلامذۂ کرام میں انہیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ آپ اہلِ قلم تھے اور معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں حضرت موصوف نے اپنے استاذ جلیل حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی سوانح حیات "انوارِ انوری" بھی مرتب کی تھی جو کہ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے لیکن احقر کی نظروں سے ابھی وہ نہیں گذری۔ اس کے علاوہ ان کی بعض تالیفات قیمہ میں "السنن والآثار" (۲ جلد ضخیم) "اربعین من احادیث النبی الامین" اور "سیرۃ النبی" (۳۰۰ صفحات) کافی مشہور ہیں۔

آپ نے مسلمان بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لئے "مدرسۃ البنات" کے نام سے متعدد مدارس قائم کر کے نہایت عظیم دینی کارنامہ انجام دیا ہے جہاں سے لڑکیوں کی خاصی تعداد دینی تعلیم سے فیض یاب ہو کر فارغ التحصیل ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ آخر علم و فضل کا یہ آفتاب ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو لائل پور میں غروب ہو گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق ایک لاکھ مسلمان ان کی نمازِ جنازہ میں شامل تھے۔

عنوانِ بالا کے تحت مولانا مرحوم کے متعدد معلوماتی مضامین سالہا سال سے رسالہ

دارالعلوم میں شایع ہوئے ہیں۔ جنہیں اگر یکجا کیا جائے تو حضرت شاہ صاحب کے حالات پر ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ بہرحال مشکل سے رسالۂ مذکور کے چند شمارے احقر کے ہاتھ آئے۔ قلتِ گنجائش کی وجہ سے نہیں بعینہٖ من وعن شاملِ کتاب نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے چند پرچوں کے کچھ منتخب حصے (بقیدِ ماہ و سال) عنوانِ بالا کے تحت ہدیۂ ناظرین ہیں۔ (گوندوی)

۱- ایک دفعہ بہاولپور میں ابیّ کی شرح مُسلم سے حوالہ نکالنا تھا۔ کتاب ہمارے پاس نہ تھی، قادیانی مختار مقدمہ کے پاس یہ کتاب تھی۔ حضرت نے فرمایا "جج صاحب لکھئے ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکہ دیا ہے، یہ کتاب میرے پاس نہیں ہے، اسکو کہو کہ عبارت پڑھے، جب اُس نے عبارت نہ پڑھی تو آپؒ نے خود کتاب اُس سے لیکر حَسْبُنَا اللّٰہُ فرمایا اور فوراً حوالہ نکال لیا، وہ لوگ دیکھتے ہی رہ گئے۔

۲- وہیں بہاولپور کا واقعہ ہے کہ قادیانی شاہد نے حضرت سے سوال کیا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ:-

" ہمارا دین متواتر ہے اور تواتر کے اقسام میں سے کسی ایک قسم کا مُنکر بھی کافر ہے، آپ کو چاہیئے کہ امام رازی پر کفر کا فتویٰ دیں کیونکہ "فواتح الرحموت شرحِ مُسلّم الثبوت" میں علامہ بحر العلوم نے لکھا ہے کہ امام رازی نے متواترِ معنوی کا انکار کیا ہے۔"

ہمارے پاس اتّفاق سے وہ کتاب بھی نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فوراً فرمایا:-
"جج صاحب لکھئے میں نے بتیس ۳۲ سال ہوئے یہ کتاب دیکھی تھی، اب ہمارے پاس یہ کتاب نہیں ہے، امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ جو حدیث ہے "لا تجتمع اُمّتی علی الضّلالۃ" یہ حدیث تواتر معنوی کے رُتبے کو نہیں پہنچی۔ اس حدیث کے متواتر معنوی ہونے کا انکار فرمایا ہے نہ کہ تواتر معنوی کے حجت ہونے کے مُنکر ہیں"۔ مولٰنا عبداللطیف صاحب ناظمِ مظاہر العلوم سہارنپور اور مولٰنا مرتضیٰ حسن صاحب (جو اس مجلس میں موجود تھے) حیران تھے کہ حضرت کیا جواب دیں گے، سُن کر حیرت میں رہ گئے۔

"ان صاحب نے حوالہ پیش کرنے میں دھوکے سے کام لیا ہے اس کو کہو کہ عبارت پڑھے ورنہ میں ان سے کتاب لے کر عبارت پڑھتا ہوں" چنانچہ قادیانی شاہد نے عبارت پڑھی، بعینہٖ وُہی عبارت نکلی جو حضرت نے پہلے حفظ پڑھ کر سنائی تھی۔ جج صاحب خوشی سے اُچھل پڑا۔ حضرت مولینا غلام محمد صاحب دین پوری بھی اس مجمع میں تھے۔ حضرت موصوف کا چہرۂ مبارک مسرت سے کھِل گیا۔ (یہ حضرت، حضرت مولینا عبیداللہ صاحب کے مُربّی تھے اور مولینا احمد علی صاحب لاہوری مرحوم کے بھی پیر تھے، اولیاء اللہ میں سے تھے)۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ "جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم (لاجواب) کرنا چاہتے ہیں، میں چونکہ طالب علم ہوں، میں نے دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں انشاءاللہ ان سے مفحم نہ ہوں گا۔

۲۔ حضرت مولینا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے ایک اجتماع کیا تھا وہاں حضرت مولینا شیخ الہندؒ، حضرت مولینا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ اور اکابرِ دیوبند و سہارنپور مدعو تھے۔ ہزاروں ہزار علماء مجتمع تھے۔

قادیانیوں نے کہا کہ ہر دو مناظرین عربی زبان میں تقریر کریں گے۔ حضرت شاہ صاحب بھی مدعو تھے۔ حضرات نے حضرت شاہ صاحبؒ کو تیار کر دیا۔ حضرت (شاہ صاحب) نے فرمایا کہ دونوں مناظرین عربی اشعار میں اپنا مافی الضمیر ظاہر کریں گے اور فی البدیہہ بولتا ہوگا اور کوئی کاغذ، کوئی کتاب اپنے پاس نہ رکھیں گے، وہ لوگ تیار نہ ہوئے۔

یہ قصہ حضرت رائپوریؒ کو لاہور میں مولینا ابراہیم صاحب میاں چنوں والوں نے بھی سُنایا تھا۔ مولینا ابراہیم صاحب اُس وقت بہاولپور میں مُدرِّس تھے۔ مولینا فرماتے تھے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمنؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ نے خود بھی درسِ ترمذی میں ہمیں سُنایا تھا۔ پھر فرمایا،

"جاہلین! تم نے کیا سمجھا، میں اِن شاء اللہ اس پر قادر ہوں۔"

مولینا ابراہیم صاحبؒ نے یہ بھی سُنایا تھا کہ پھر حضرت شاہ صاحب نے عربی زبان میں تقریر فرمائی۔

۴۔ ایک دفعہ کشمیر تشریف لے جا رہے تھے۔ بس کے انتظار میں سیالکوٹ کے اڈے پر تشریف فرما تھے، ایک پادری آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے چہرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمانوں کے بڑے عالمِ دین ہیں۔ فرمایا، نہیں میں ایک طالب العلم ہوں۔ اس نے کہا کہ اسلام کے متعلق آپ کو علم ہے؟ فرمایا، کچھ کچھ، پھر انکے صلیب کے متعلق فرمایا کہ تم غلط سمجھے ہو، اس کی یہ شکل نہیں ہے، پھر نبی کریم ؐ کی نبوت پر چالیس ۴۰ دلائل دیئے، دس قرآن سے، دس توریت سے، دس انجیل سے، دس عقلی۔ وہ پادری آپ کی تقریر سُن کر کہنے لگا، اگر مجھے تنخواہ کا لالچ نہ ہوتا تو میں آپ کی تقریر، آپکا علوم میں اس قدر استحضار دیکھ کر مُسلمان ہو جاتا۔ نیز یہ کہ مجھے بہت سی باتیں اپنے مذہب کے متعلق آپ سے معلوم ہوئیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا "جب آپ کو حق معلوم کر کے بھی توفیق نہ ہوئی کہ ایمان لے آتے، تو معلوم ہوا کہ ایمان کی کوئی قدر و قیمت آپ کے ہاں نہیں، محض تنخواہ کا لالچ ہے۔ اِنّا لِلّٰہ و اِنّا الیہ راجعون۔" وہ پادری نہایت شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

۵۔ مولینا عبد العزیز محدّث گوجرانوالہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولینا عبید اللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ اس قسم پر کوئی کفارہ نہیں جو اس امر پہ کھائی جائے کہ "مولینا انور شاہ صاحبؒ اس زمانہ میں بے نظیر عالِم ہیں۔" مولینا غلام رسول اَنّی والے اُستاد رحمۃ اللہ نے پہلی بار جب قادیان میں (مسئلۂ ختمِ نبوّت پر) حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر سُنی تو فرمایا کہ "علم ہو تو انور شاہ والا ہو، ورنہ ہمارے علم سے تو جاہل ہی اچھے"۔ مولینا ابراہیم میر صاحب سیالکوٹیؒ نے اُسوقت فرمایا تھا یعنی قادیان ہی میں کہ:

"مجسّمِ علم دیکھنا ہو تو شاہ صاحب کو دیکھ لو۔"

حضرت مولینا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے حضرت شاہ صاحب کی وفات پر دیوبند میں تعزیتی جلسے میں فرمایا تھا کہ میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں، ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالمِ دین کہ کتب خانہ کا کتب خانہ ہی سینہ میں محفوظ ہو، سوائے حضرت مولینا انور شاہ کے کوئی نہیں دیکھا۔

۶۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ "جی چاہتا ہے کہ شاہ صاحب کے چہرے کو دیکھتا رہوں۔" اگست ۱۹۳۲ء میں "زمیندار" کے ایک شمارے میں ایک طویل مقالہ حضرت شاہ صاحب کے مناقب و کمالات پر لکھا، لکھتے ہیں کہ "حضرت مولانا انور شاہ صاحب مدظلہ کی نظیر علوم میں خصوصاً علم حدیث میں پیش کرنے سے تمام اشیاء عاجز ہے"۔

(ملتقطاً و مختصراً) رسالہ "دار العلوم" دیوبند ج ۲۷، شمارہ ۴ جولائی ۱۹۶۴ء

۷۔ حضرت اقدس شاہ صاحب قدس سرہٗ کا وعظ سادہ ہوتا تھا چھوٹے چھوٹے جملے جو پوری طرح ذہن نشین ہو جائیں ارشاد فرماتے تھے۔

لدھیانہ میں ایک دفعہ وعظ فرمایا، غالباً ۱۳۴۳ھ تھا۔ (فرمایا) تمام عالم کی روح ذکر اللہ ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی یاد قائم رہیگی، عالم قائم رہیگا، جب دنیا اللہ تعالیٰ کی یاد چھوڑ دے گی تو سمجھو کہ عالم کے کوچ کا وقت آ گیا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم ؐ نے ارشاد فرمایا "لا تقوم الساعۃ حتّٰی یقال فی الارض اللّٰہ اللّٰہ" قیامت قائم نہ ہوگی جب تک ایک متنفس بھی اللہ اللہ کرنیوالا نہ جائے گا۔ جب ایک بھی اللہ اللہ کرنیوالا نہ رہے گا، تو قیامت قائم ہو جائے گی، کیونکہ جب روح نہ رہی تو ڈھانچہ کسی کام کا نہیں، اُسے گرا دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ سارے عالم کی روح اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔ مقصود اصلی ذکر الٰہی ہے۔ اور یہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ احکام سب اس کے پیرائے ہیں۔ بخاری شریف میں حدیث ہے کہ جب بندہ ایک دفعہ اخلاص سے سُبحان اللّٰہ کہتا ہے تو آدھا پلّہ آخرت کی ترازو کا بھر جاتا ہے، آخرت کی ترازو اتنی بڑی ہے جتنا کہ زمین اور آسمان کا درمیانی حصہ نظر آتا ہے، اور جب بندہ الحمد للّٰہ کہتا ہے صِدقاً مِن قلبِہٖ تو نصف پلّہ باقی بھر جاتا ہے، "سُبحان اللّٰہ نصف المیزان والحمدُ للّٰہ تملأ المیزانَ" اور جب کہتا ہے "ولا اِلٰہ اِلّا اللّٰہُ واللّٰہُ اکبر" تو اس کی سمائی زمین و آسمان میں نہیں ہوتی، چیر کر عرش کو نکل جاتا ہے، اور ترمذی شریف میں یہ بھی آیا ہے کہ "ولا حول ولا قوّۃ اِلّا باللّٰہ العلیّ العظیم" جنت کے خزانوں میں سے ایک مخفی خزانہ ہے، اس کا ثواب آخرت میں کھلے گا۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کو اس حدیث پر ختم فرمایا ہے "کلمتانِ خفیفتان علی اللسانِ ثقیلتانِ فی المیزانِ حبیبتانِ الی الرحمٰن سُبحان اللہِ وبحمدہٖ سُبحان اللہِ العظیم دو کلمے ہیں جو زبان پر خفیف ہیں، آسانی سے ادا ہو جاتے ہیں، آخرت کی ترازو میں بڑے وزنی ہیں، (حضرت) رحمٰن کو بہت محبوب ہیں۔ (وہ یہ ہیں) سُبحان اللہِ وبحمدہٖ۔ سُبحان اللہِ العظیم ٥ خیال فرمائیں کہ جو شخص ان کا ورد ہر وقت رکھتا ہے کس قدر ثواب اس کو ملیگا......" (ملتقطاً ومختصراً) دار العلوم جلد ۱۸ شمارہ ۲ نومبر ۱۹۶۴ء۔

۸۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ "یہ جو حدیث شریف میں آیا ہے "انما اراکم من وراء ظهری" یہ دیکھنا بطورِ معجزہ تھا۔ ایسا ہی ثابت ہے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ سے اور فلسفۂ جدیدہ نے ثابت کر دیا کہ قوتِ باصرہ تمام اعضاءِ بدن میں ہے"۔

۹۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ "جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر اقبالؒ نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب علومِ قرآن وحدیث پر کافی دسترس رکھتے تھے اور انہوں نے مولینا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھا تھا"۔

(ملتقطاً ومختصراً) "دار العلوم" اپریل ۱۹۶۵ء

۱۰۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ: امام اعمشؒ نے ایک صاحب کو تعزیت نامہ لکھ کر بھیجا۔ انا نعزیک لا انا علی ثقۃٍ ❊ من البقاءِ ولکن سُنۃ الدین
فلا المعزی بباقٍ بعد میتہٖ ❊ ولا المعزی وان عاشا الی حین[1]

ترجمہ: ہم آپ کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ہماری زندگی کا کچھ اعتبار نہیں، لیکن یہ سنت ہے دین کی پس نہ تو معزی باقی رہیگا اپنی میت کے بعد نہ تعزیت کرنے والا، اگرچہ ایک زمانے تک جیتے رہیں۔ (آخر سب کو موت ہے)

۱۱۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ: "حافظ ابو زرعہ رازی نے فرمایا کہ جرجان میں آگ لگنے سے ہزار ہا گھر جل گئے اور قرآن بھی جلے، لیکن یہ آیات نہ جلیں:۔

"ذٰلک تقدیر العزیز العلیم ۔ وعلی اللہِ فلیتوکل المؤمنون ۔ ولا تحسبن اللہَ غافلاً

---

[1] "الاذکار" میں امام محی الدین نوویؒ نے ان اشعار کو امام شافعیؒ کی طرف منسوب کیا ہے ممکن ہے کہ اصل اشعار امام اعمش کے ہوں اور امام شافعیؒ نے کسی جگہ ان کا استعمال کیا ہو جس سے مغالطہ ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم ❊ (کوندو)


عمّا یعمل الظالمون۔ وان تعدّوا نعمۃ اللّٰہ لا تحصوھا۔ وقضیٰ ربّک ان لا تعبدوا الا ایاہ۔ تنزیلاً ممن خلق الارض والسمٰوات العلیٰ۔ الرحمٰن علی العرش استویٰ۔ لہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وما بینھما وما تحت الثریٰ۔ یوم لا ینفع مالٌ ولا بنون الا من اتی اللّٰہ بقلبٍ سلیم۔ ائتیا طوعاً او کرھاً قالتا اتینا طائعین۔ وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون۔ ما ارید منھم من رزقٍ وما ارید ان یطعمون۔ ان اللّٰہ ھو الرزاق ذو القوۃ المتین۔ وفی السماء رزقکم وما توعدون۔ فوربّ السماء والارض انہ لحقٌ مثل ما انکم تنطقون ط

فرمایا، یہ تجربہ ہے کہ آیاتِ مذکورہ لکھ کر کسی برتن میں بند کر کے دکان یا گھر یا سامان میں رکھنا حفاظت کے لئے مجرّب ہے۔

فرمایا، کہ ایک آدمی یا کئی آدمی مل کر ہر سورت کی آخری آیت پڑھ کر پانی پر دم کردیں تو لا علاج مرض کے لئے مفید ہے۔ یہ ایک سو چودہ دم ہو گئے۔

۱۰۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ :۔ "علم نحو عراق میں مدوّن ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کی ابتداء حضرت علیؓ سے ہوئی۔ آپ نے ایک آدمی کو سنا کہ یہ آیت" انّ اللّٰہ بریءٌ من المشرکین ورسولہٗ" میں رسولہ، کو کسرہ سے پڑھ رہا تھا، تو آپ کو فکر ہوئی کہ اُمّت کو ان مہالک سے کس طرح بچایا جائے؟ تو آپ نے ابو اسود دؤلی کو فرمایا کہ ایک قانون ایسا بناؤ کہ خطاءِ لفظی سے لوگ محفوظ رہیں۔ پھر خود آپ نے ان کو ایک اصول بتایا :۔ "کلُّ فاعلٍ مرفوعٌ وکلُّ مفعولٍ منصوبٌ وکلُّ مضافٍ الیہ مجرورٌ۔" پھر فرمایا :۔ "اُنحُ نحوَہٗ" پھر اسود دؤلی نے اس کی تدوین افعالِ تعجّب سے شروع کی۔ حضرت علیؓ سے تصویب فرمائی، پھر حروفِ مشبّہ بالفعل لکھے مگر "لکن" کو چھوڑ گئے۔ حضرت علیؓ کے فرمانے پر اس کو بھی لکھا۔ الخ

(ملتقطاً ومختصراً) "دار العلوم" دیوبند جلد ۲۹ شمارہ ۵ ماہ مئی ۱۹۶۵ء



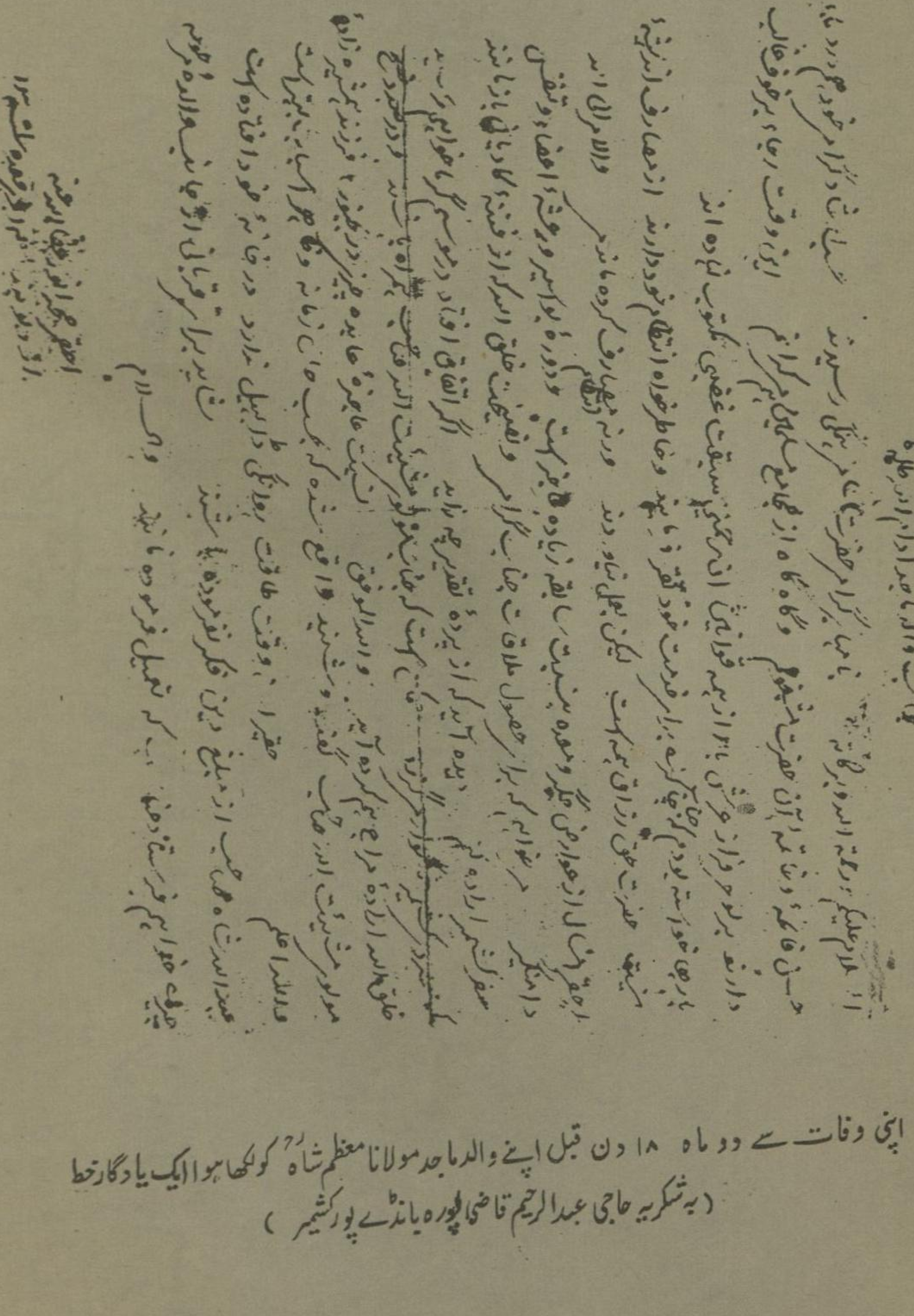
باسمه سبحانه

المهر دين كسائر الديون لا يسقط الا بالاداء او بالابراء — و يحبس فيه ان كان معجلا او تعجل

حکم مسئله هذا آنکه مهر بذمه شوهر دین لازم الاداست تا آنکه شوهر بسبب زن ادا نکند و یا زن شوهر را ابرا نکند ساقط نگردد — مهر اگر معجل باشد و یا به طلاق معجل گردیده باشد شوهر را در آن حبس تواند کرد — والله اعلم

راقم محمد انور عفی عنه

مہر کے متعلق حضرت شاہ صاحبؒ کا ایک فتویٰ ۔ (بہ شکریہ غلام محمد شاہ درگمولہ)



اپنی وفات سے دو ماہ ۱۸ دن قبل اپنے والد ماجد مولانا معظم شاہؒ کو لکھا ہوا ایک یادگار خط
(بہ شکریہ حاجی عبدالرحیم قاضی پورہ بانڈے پور کشمیر)

بسم الله

و شرائط صحتها فی الواهب العقل والبلوغ والملك وفی الموهوب ان یکون مقبوضا غیر مشاع ممیزا غیر مشغول و تتم بالقبض

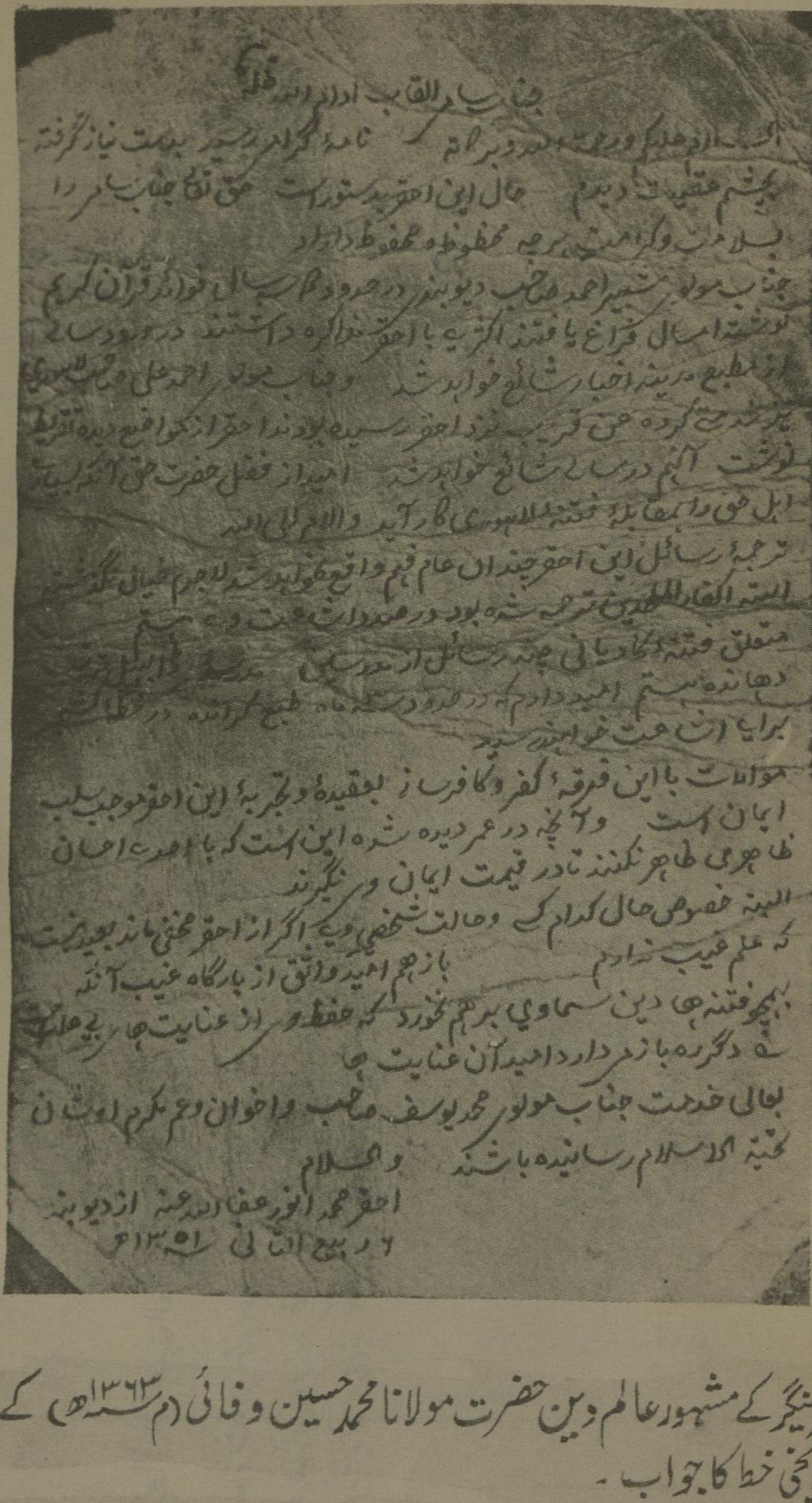
شنیده شد که مسماة شاه مالی تمام املاک خویش بحال صحت وثبات حواس بپسر خود احد بابا و بعد ازان زوجه وی قضا کرد اکنون وارثان مسماة مذکوره و عرفات وی نافذ و صحیح باشند مر شوهر ثانی خود احد بابا را هبه و تملیک کرده قبض کامل کرانند به بینهٔ عادله تنویر کنند پس ورثهٔ شاه مالی را با املاک مذکوره هیچگونه تعلق نمانده است و تعلق بعد ادت شهود بدون اثبات عدالت ... قابل اصغا نیست در ینصورت قضیه شرعیه لگه اگر مدعیان هبه دعوای خود را هبهٔ مسطوره هستند

والله اعلم

راقم محمد انور غفر الله عنه

حضرت علامہ کشمیریؒ کا یہ فتوے درباره ہبہ ہے کہ واہب عاقل و بالغ ہو اور ہبہ میں قبضہ کیا جائے ۔

(بہ شکریہ مولانا مفتی غلام حسن ۔ مفتی سوپور)



جناب ... القاب ادام الله فضله

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته نامهٔ گرامی رسید بدست نیاز گرفته
بچشم عقیدت دیدم حال این احقر بدستور است حق تعالی جناب را
بسلامت وکرامت ہر جہت محفوظ ومحفوظ دارد
جناب مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی در حدود دو سال فوائد از قرآن کریم
نوشته امسال فراغ یافتند اکثرے با احقر مذاکره داشتند در حدود سالے
از مطبع مدینه اخبار شائع خواہد شد و جناب مولوی احمد علی صاحب لاہوری
نیز ترجمه کرده حق [illegible] رسیده بودند احقر از کم [illegible] دیده [illegible]
نوشت آنہم در [illegible] شائع خواہد شد امید از فضل حضرت حق آنکه [illegible]
اہل حق را بمقابلهٔ فتنهٔ [illegible] کار آید والامر الی الله
ترجمهٔ رسائل این احقر چندان عام فہم واقع نخواہد شد لاجرم خیال نکردم
البته اکفار الملحدین ترجمه شده بود در [illegible]
متعلق فتنهٔ قادیانی چند رسائل از [illegible]
[illegible] امید دادم که در حدود [illegible] طبع کرانده [illegible]
برای اشاعت خواہند سپرد
موالات با این فرقهٔ کفر وکافر [illegible] بعقیدهٔ وتجربهٔ این احقر موجب سلب
ایمان است و آنچه در عمر دیده شده این است که با احدے احسان
ظاہری ظاہر نکنند تا در قیمت ایمان وی نگیرند
البته خصوص حال کدام کسے وحالت شخصی وے اگر از احقر مخفی ماند بعید نیست
که علم غیب ندارم
باز ہم امید واثق از بارگاه غیب آنکه
ہیچ فتنه ہا دین سماوی برہم نخورد که حفظ وے از عنایت ہا [illegible]
[illegible] دیگر [illegible] دارد امید آن عنایت ہا
بعالی خدمت جناب مولوی محمد یوسف صاحب واخوان وعم مکرم اوشان
تحیهٔ اہل اسلام رسانیده باشند والسلام
احقر محمد انور عفا الله عنه از دیوبند
۶ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ

سرینگر کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد حسین وفائی (م ۱۳۶۳ھ) کے ایک تاریخی خط کا جواب۔

(بہ شکریہ مولوی عبدالرحمٰن صاحب وفائی استاذ جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل

علامہ محمد انور شاہؒ

اور

فتنۂ قادیانیت

از فاضل گرامی مولینا بدر الحسن دربھنگوی، مدیر "الداعی" دیوبند

شیخ الاشراق شہاب الدین مقتول ۵۸۷ھ نے اپنی مایہ ناز تصنیف حکمۃ الاشراق کے اندر ایک جگہ بڑے اعتماد سے لکھا ہے کہ "العلم لیس وقفا علی قوم" یعنی علم وفن پر کسی خاص عہد کے لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ یہ ممکن ہے کہ زمانہ کے لحاظ سے بعد میں آنے والا شخص علمی قابلیت اور فنی لیاقت وصلاحیت میں اپنے بہت سے پیش روؤں پر بھی سبقت لے جائے۔

قریب قریب یہی بات مولینا محمد قاسم نانوتویؒ متوفی ۱۲۹۷ھ نے بھی اپنے ایک فارسی مکتوب میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کے علمی تبحر اور دقت نظر کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرمائی ہے۔ مولینا کے بعینہ الفاظ یہ ہیں:۔

"تقدم و تاخر زمان را در اعتبار علم وعلماء آں دخلے نیست۔ اگر مارا پرسند مارا دریں قدر ہرگز تامل نیست کہ شاہ صاحب قدس اللہ اسرارہ در فہم دقائق از اکثر پیشینیاں گوئے سبقت بردہ اند"۔

(قاسم العلوم مکتوب سوئم ص۴۴)

اور غالباً یہی مفہوم اس روایت کا بھی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "نہ معلوم میری امت کا اول بہتر ہے یا آخر!" او کما قال۔

شاعرانہ حیثیت سے ابوالعلاء معری نے بھی اس مفہوم کو خوب ادا کیا ہے ؎

اِنِّیْ وَ اِنْ کُنْتُ الْاَخِیْرَ زَمَانَہٗ
لَاٰتٍ بِمَا لَمْ تَسْتَطِعْہُ الْاَوَائِلُ

متقدمین کے فضل و تقدم کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے اور تاریخی واقعات و شواہد اس کی تائید کرتے ہیں کہ بعد کے زمانوں میں بھی وقفہ وقفہ سے بعض بڑی ہی فقید المثال اور نادرۂ روزگار شخصیتیں اُبھری ہیں جن کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے علوم و فنون کی جامعیت، دِقتِ نظر اور غیر معمولی تبحّر و استحضار کے لحاظ سے اپنے بہت سے پیش روؤں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

قریب کے زمانہ میں اس کی عمدہ مثال علامہ محمد انور شاہ کشمیری رحؒ کی ذات ہے۔ جن کے بارے میں ان کے جلیل القدر معاصر اور اپنے عہد کے نامور محدث علامہ زاہد بن الحسن الکوثری کی شہادت یہ ہے کہ:۔

"علامہ ابن الہمام (متوفی ۸۶۱ھ) کے بعد انور شاہ صاحب کے پایہ کا کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متنِ احادیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ (شاہ صاحب اور ابن ہمام کے درمیان) کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے"۔ (مقدمۃ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح از شیخ عبد الفتاح ابو غدہ ص ۳)

محقق عصر علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ جنہیں شاہ صاحب کی صحبت و رفاقت حاصل تھی اپنی بلند پایہ کتاب "فتح الملہم" میں علامہ انور شاہ صاحبؒ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:۔

لم تر العیون مثلہ، ولم یر ھو مثل نفسہ[۱] (فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۵) "نہ تو دنیا کی آنکھوں نے ان کی نظیر دیکھی اور نہ خود آپ نے اپنے کسی ثانی اور مماثل کو دیکھا"۔

---

[۱] اس جملہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں چند ہی خوش نصیب اور یگانۂ روزگار کے نام ملتے ہیں جنہیں ان کے بلند پایہ معاصرین نے اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

(۱) سب سے پہلا نام اس سلسلہ میں مشہور عارف و محدث شیخ ابو القاسم قشیریؒ متوفی ۴۶۵ھ کا ملتا ہے جن کا رسالۂ قشیریہ فنِ تصوف کی اہم ترین کتابوں میں شمار ہوتا ہے ان کے عہد میں اگرچہ اربابِ علم و فضل کی کمی نہیں تھی لیکن ظاہر و باطن کی جامعیت اور دقتِ نظر میں شیخ ابو القاسم اپنی نظیر آپ تھے۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے علمی کارناموں کا دائرہ تو بے حد وسیع اور انکی افادیت بڑی ہمہ گیر تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کا وہ کارنامہ جو انہوں نے اصولی حیثیت سے دین کے بقاو تحفظ کے لئے انجام دیا ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

انہیں اپنی زندگی کے آخری ایام میں دو چیزوں کا زبردست احساس تھا جن میں سے ایک تو الحاد و دہریت کا زور ہے، دوسرے مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ نبوت کا فتنہ۔ ان دو باتوں کے احساس نے ان کو کافی فکرمند کر رکھا تھا۔

اول الذکر فتنہ کے استیصال کے لئے ان کے پیشرو اور ممدوح امام وقت

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۲) قشیریؒ کے بعد اس کا مصداق حجۃ الاسلام امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ کو قرار دیا گیا اور بلاشبہ امام غزالیؒ اس کے صحیح مصداق تھے، انھوں نے فی الواقع ان کی نظیر نہیں دیکھی شریعت و طریقت دونوں کی جامعیت کے ساتھ عقلی علوم میں تبحر، بے مثل ذکاوت و ذہانت، مشکلات فن کو نہایت سلیس اور شگفتہ اسلوب میں حل کرنے کی اہلیت، یہ تمام اوصاف انمیں بیک وقت جمع تھے۔

(۳) امام غزالیؒ کے بعد مشہور فقیہہ و محدث ابن قدامہ حنبلیؒ متوفی ۶۸۲ھ جن کی المغنی فقہ کی بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں ان کے معاصر ابن حاجب مالکی نے کہا تھا: "لم تر العیون مثلہ، ولم یر ھو مثل نفسہ"۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ورع و تقویٰ کے علاوہ ابن قدامہؒ کو فقہاء کے مذاہب پر بڑا عبور حاصل تھا اور یقیناً وہ اپنے زمانہ کے عدیم النظیر محقق اور مسلم امام تھے۔

(۴) ابن قدامہ حنبلیؒ کے بعد اس جملہ کا استعمال امام تقی الدین ابن دقیق العید متوفی ۷۰۲ھ کے بارے میں ابن سید الناس یعمری نے کہا تھا کہ "لم تر العیون مثلہ"

اور بلاشبہ حفظ و اتقان، دقت نظر، نکتہ رسی اور استنباط فوائد و لطائف میں ابن دقیق العید کی نظیر نہیں ملتی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ محدث دہلوی نے اپنی محققانہ تصنیف "بستان المحدثین" کے اندر ان کے بارے میں لکھا ہے۔ عہد صحابہ رضؓ کے بعد سے ساتویں صدی ہجری تک متن حدیث سے دقائق و اسرار اور لطائف و نکات کے استنباط و استخراج میں امام ابن دقیق العید کا مثیل پیدا نہیں ہوا انہوں نے حضرت براء بن عازبؓ کی صرف ایک روایت سے چار سو فوائد مستنبط کئے تھے۔ انکی کتاب احکام الاحکام اور امام شرح الالمام اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ علم و فضل کے ساتھ خدا

(باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد قاسم نانوتوی متوفی ۱۲۹۷ھ نے اپنی تالیفات کے اندر گرانقدر مواد فراہم کردیا تھا۔ پھر بعض وجوہ سے ان دنوں قادیانیت کے فتنہ نے زیادہ زور اختیار کرلیا تھا۔ جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے انتہائی خطرناک چیلنج تھا اس لئے علامہ نے زیادہ توجہ اس کے استیصال اور اُمت کو اس کی تباہ کاری سے محفوظ رکھنے کی طرف مبذول رکھی۔

تاہم الحاد و دہریت کے سدِّباب کے لئے بھی آپ کے دو رسالے یادگار ہیں۔ ایک تو ضربُ الخاتم جو حدوثِ عالم اور اثباتِ وجودِ باری پر آپ کی بے مثال نظم ہے جو چارسو اشعار پر مشتمل ہے۔ اس نظم کی فنی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر اقبالؒ جیسا فلسفہ کا مبصر بھی اس نظم پر وجد کیا کرتا تھا۔

اس نظم کے استناد کے لئے جہاں آپ نے صدرالدین شیرازی کی اسفارِ اربعہ اور فرید وجدی اور بُستانی کی دائرۃ المعارف کے بکثرت حوالے دئے ہیں وہیں امام

(بقیہ صفحہ گزشتہ) نے ابن دقیق العیدؒ کو زہد و تقویٰ اور کرامات و خوارق سے بھی نوازا تھا۔ وہ بلاشبہ فقید المثال انسان تھے۔

(۵) ابن دقیق العیدؒ کے بعد اس جملہ کا استعمال امام ابن تیمیہؒ متوفی ۷۲۸ھ کے لئے ہوا اور اس میں شک نہیں کہ ابن تیمیہؒ بجا طور پر اس کے اہل تھے۔

روایت و درایت دونوں سے کامل مناسبت، جملہ فنون کا غیر معمولی استحضار، سلف و خلف کے مسلک پر محیرُ العقول دسترس کے ساتھ بے پناہ جرأت و ہمت اور شجاعت و بہادری کے اندر دُنیا نے انکی نظیر نہیں دیکھی۔ البتہ اپنے بعض نظریات پر وحی آسمانی کی طرح ان کے یقین و اعتماد نے بعض جلیل القدر معاصرین اور بعد کے عُلماء کو ان پر زبانِ طعن دراز کرنے کا موقعہ دیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ "ان کا علم ان کی عقل سے بھی بڑھ گیا تھا"۔

(۶) امام ابن تیمیہؒ کے بعد حافظ شمس الدین ذہبیؒ نے جو فقہ میں امام شافعیؒ کے متبع اور عقیدۃً حنبلی ہیں اپنے شیخ اور شام کے نامور محدث حافظ ابوالحجاج مزی شافعی متوفی ۷۴۲ھ کے بارے میں فرمایا تھا کہ لم تر العیون مثلہ، " اور ذہبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا صحیح تھا اس لئے کہ حافظ مزی فنِ حدیث میں بے مثال آدمی تھے۔ (نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۱۹۱ تا ص ۱۹۳)

وقت مولینا محمد قاسم نانوتوی کی تقریر دلپذیر اور مکاتیب قاسم العلوم میں سے ساتویں مکتوب کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری اہم کتاب "مرقاۃ الطارم" ہے۔ یہ بھی حدوثِ عالم ہی کے موضوع پر ہے۔ اس کا ذکر پہلے ایک نوٹ میں آچکا ہے۔

قادیانیت کے فتنہ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے کمالِ بصیرت سے یہ اندازہ فرما لیا تھا کہ اس کی فتنہ سامانی اور شر انگیزی دنیا کے تمام فتنوں سے بڑھ کر ہے چنانچہ اس کو مٹانے کے لئے پورے طور پر سرگرم ہو گئے، اپنے اجلّۂ اصحاب اور تلامذہ کو بھی اس کام کے لئے آمادہ کیا اور خود بھی تا دمِ مرگ اس مبارک کام میں مصروف رہے۔

آپ کے تلامذہ میں سے جن لوگوں نے آپ کے اس مشن کو کامیاب بنانے کی سعی کی ان میں مولینا بدرِ عالم میرٹھی، مولینا محمد ادریس کاندھلوی، مولینا مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولینا محمد یوسف بنوری خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

علامہ محمد انور شاہ صاحب کو اس فتنہ کی خطرناکی کا احساس کتنا شدید تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اپنے بیان کے مطابق مسلسل چھ مہینے تک وہ اس کی وجہ سے انتہائی کرب اور قلبی اذیت میں مبتلا رہے حتیٰ کہ نیند تک اچاٹ ہو گئی تھی جس کا صحت پر بھی ناخوشگوار اثر مرتب ہونے لگا تھا۔[1]

اس شدتِ احساس ہی کا اثر تھا کہ تصنیف و تالیف کی طرف طبعی میلان نہ ہونے کے باوجود آپ نے قادیانیت پر متعدد تالیفات کیں اور آئندہ کام کرنیوالوں کے لئے انتہائی بیش قیمت علمی مواد فراہم کر دیا حتیٰ کہ بسترِ مرگ پر بھی آپ کو اسی کا خیال دامنگیر رہا۔ چناں چہ آپ کی سب سے آخری تصنیف جو "خاتم النبیین" کے نام سے موسوم ہے وہ عین مرض الموت کی یادگار ہے۔ اس کی تبییض بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیغامِ اجل آ پہونچا۔

درسِ حدیث میں بھی موقع بموقع مرزا غلام احمد قادیانی کے استدلالات کی کمزوری اور اس کی محرفانہ سرگرمیوں پر متنبہ فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ فیض الباری کے ج۳

---

[1] نفحۃ العنبر ص۱۴۳

ص ۴۲۳، ج ۴ ص ۲۴۹ و ص ۲۵۰ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔

آپ کے اس مجاہدانہ کارنامہ میں درحقیقت وہی روح کارفرما تھی جو ولی اللٰہی مکتب فکر کے اساطین و اعیان کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے عہد میں شیعیت کا فتنہ زوروں پر تھا جس سے دین کا بڑا حصہ متأثر ہو رہا تھا اس لئے حضرت شاہ ولی اللہؒ نے جہاں نئے دور کے تغیرات کا اندازہ کر کے پورے دینی نظام کی اور حکیمانہ تشریح و ترجمانی فرمائی وہیں دونوں بزرگوں نے شیعیت کا زور توڑنے کے لئے بھی بھرپور سعی کی جس کا اندازہ ازالۃ الخفاء اور تحفۂ اثنا عشریہ جیسی محققانہ کتابوں سے ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے عہد میں شرک و بدعت کا زور تھا اس لئے جہاں انہوں نے سید احمد شہیدؒ کی قیادت و رفاقت میں دین کو سربلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دی وہیں مسلمانوں کی زندگی سے شرک و بدعت کے مہلک جراثیم دور کرنے کے لئے بھی انتہائی جدوجہد فرمائی اور "ایضاح الحق الصریح" اور "تقویۃ الایمان" جیسی محققانہ اور انقلاب انگیز کتابیں تحریر فرمائیں۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عہد میں ایک طرف تو کفر و الحاد کا زور اور جدید عہد کے تقاضے تھے اور دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کی مشترکہ یورش نے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے انتہائی سنگین اور نازک صورت حال پیدا کر دی تھی۔

اس لئے انہوں نے ایک طرف تو حقائق و معارف کے بیش بہا اصول مدوّن کئے اور علم کلام کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھی جو علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے بقول تاقیامت کار آمد رہیں گے۔

دوسری طرف عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کا جم کر مقابلہ کیا اور علمی حیثیت سے ان کے سارے استدلالات کی کمزوری واضح کر دی۔ [1]

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی فاضلانہ کتاب سوانح قاسمی کی دوسری جلد۔

علامہ محمد انور شاہ صاحبؒ کے زمانے میں قادیانیت کا فتنہ اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دینِ مجید کے خلاف ایک منظم بغاوت تھی اس لئے انہوں نے اس فتنہ کا بھرپور مقابلہ کیا اور اس موضوع پر ایسی فاضلانہ اور تحقیقی کتابیں تصنیف فرمائیں جو ان کی علمی عظمت اور غیر معمولی عبقریت کا لازوال شاہکار ہیں۔ بقول مولانا محمدؐ یوسف بنوری "اگر علامہ نے اور کوئی کام اپنی زندگی میں انجام نہ دیا ہوتا صرف ردّ قادیانیت پر آپ نے جو کام کیا ہے وہی ایک عمل آپ کے نامۂ اعمال میں ہوتا تو آپ کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی تھا۔[1]"

جیساکہ عرض کیا گیا علامہ انور شاہ صاحبؒ کو اس فتنہ کی سامانی کا احساس بڑا شدید تھا اس لئے آپ کی اس سلسلہ کی تمام تحریروں سے خواہ وہ نظم میں ہوں یا نثر میں ایمانی غیرت وحمیت اور جوش وخروش کا اندازہ ہوتا ہے۔

مستقل طور پر اس موضوع پر آپ کی پانچ کتابیں یادگار ہیں:۔

(۱) "التصریح بما تواتر فی نزول المسیح"

یہ اپنے موضوع پر سب سے جامع ترین کتاب ہے اس کے اندر آپ نے نزولِ مسیح سے متعلق احادیث و آثار جمع کئے ہیں۔ اس کی جامعیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ قاضی شوکانی جیسے وسیع النظر محدث نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو انہیں کل ۲۹ حدیثیں مل سکیں جبکہ علامہ انور شاہ صاحبؒ نے ستّر نہایت ہی واضح اور صریح روایتیں جمع کردی ہیں۔

کتاب پہلے مفتی محمدؐ شفیع صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ہندوستان میں چھپ چکی تھی۔ اب عالمِ اسلام کے نامور محقق شیخ ابو الفتاح ابو غدہ کی تعلیقات کے ساتھ دوبارہ بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ ابو غدہ کی تعلیقات نے کتاب کی افادیت دوچند کردی ہے۔

(۲) "اکفار الملحدین" یہ اس سلسلے کی دوسری اہم اور محققانہ

---

[1] نفحۃ العنبر صفحہ ۱۲۳۔

تصنیف ہے۔ تکفیر کا مسئلہ بڑا ہی نازک اور دقیق ہے۔ اس طرح کے پیچیدہ مسئلے کے بارے میں مُبصرانہ اور فیصلہ کُن رائے دینا انور شاہ جیسے عبقری وقت ہی کا حصّہ تھا۔ آپ نے پوری تحقیق و تدقیق کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی کہ کسی شخص کو دین سے خارج کب متصور کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے لئے اصول و ضوابط کیا ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کسی مسلمان کی تکفیر ایک سنگین جرم ہے اسی طرح کسی ایسے شخص کو جو دین کی بیخ کنی پر آمادہ ہو اور ضروریاتِ دین کو بھی بے چون و چرا تسلیم نہ کرتا ہو بلکہ شریعت کے واضح احکام و ہدایات کو اپنی تحریف و تاویل کا نشانہ بناتا ہو، اُسے بدستور مُسلمانوں کے زمرہ میں شامل سمجھنا اور اس کی تکفیر کے سلسلہ میں ایسی احتیاط برتنا جس سے دین کی بنیاد منہدم کرنے والوں کو اپنی سرگرمیاں تیز کرنے کا اور موقع ملے بدترین قسم کی مداہنت ہے۔ شریعت کی رو سے اس کا جواز ہرگز نہیں ہے۔

علّامہ محمّد انور شاہؒ نے مسئلہ کے ہر پہلو پر قرآن و حدیث کی روشنی میں انتہائی سیر حاصل بحث کی ہے اور تمام سربرآوردہ مُفسّرین و مُحدّثین اور فُقہاء و مُتکلّمین کی شہادتیں اس سلسلہ میں جمع کر دی ہیں اور مُحقّقین کی کتابوں کے بعض ایسے ابواب سے مواد اکٹھا کر دیا ہے جہاں عام طور پر دوسروں کا ذہن منتقل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سے پہلے امام غزالیؒ جیسے یگانۂ روزگار اور اُمّت کے بعض دوسرے اساطین نے بھی اس موضوع پر قلم اُٹھایا تھا۔ "فیصلُ التّفرقہ بین الاسلام والزندقہ" امام غزالیؒ کی مشہور کتاب ہے۔ خود علّامہ انور شاہ صاحبؒ نے بھی اسکا جوہری خلاصہ اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن دونوں کتابوں کے تقابلی مُطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے "اکفار الملحدین" کے مصنّف کی ذہنی پرواز کتنی بلند ہے۔ بعد میں آنے والوں کے اس طرح کے مآثر و مفاخر جب سامنے آتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ کم ترک الاوّل للآخر فجزاھم اللّٰہ عن المسلمین خیر الجزاء۔

(۳) عقیدۃُ الاسلام

اس کتاب کا اصل موضوع خود علّامہ کی صراحت کے مُطابق حضرت عیسیٰؑ کی

حیاۃ اور ان کے دوبارہ نزول کے بارے میں قرآنِ حکیم کے بیان کردہ دلائل کو جمع کرنا ہے۔ لیکن ضمنی طور پر اس کتاب میں اتنے اہم اور گراں قدر مسائل زیرِ بحث آئے ہیں جن کا احصاء بھی مشکل ہے۔

(۴) تحیۃُ الاسلام:۔

یہ سابق الذکر کتاب پر خود علامہ کے قلم سے انتہائی بصیرت افروز اور محققانہ حاشیہ ہے اس لئے ان دونوں کتابوں کو ایک بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

علامہ نے یہ کتاب کس تحقیق و تدقیق کے ساتھ تصنیف فرمائی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عقیدۃُ الاسلام اور تحیۃُ الاسلام میں بلا واسطہ جن کتابوں کا حوالہ مذکور ہے ان کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے جن میں تفسیر و حدیث، فقہ و اصول، تصوّف و حقائق، لغت و نحو، معانی و بیان، تاریخ و سِیَر، فلسفہ حتیٰ کہ عہد نامہ جدید و عتیق سب ہی طرح کی کتابیں شامل ہیں۔

اس کتاب کے مطالعہ کے وقت اندازہ ہوتا ہے کہ صدر الدین شیرازی کی "اسفارِ اربعہ"، فرید وجدی اور بستانی کی "دائرۃ المعارف"، شیخ محی الدین ابن عربی کی "فتوحاتِ مکیہ" جیسی کتابوں کا ایک ایک صفحہ علامہ کی نظروں کے سامنے تھا۔

یہی وجہ ہے کہ شیخ زاہد بن الحسن الکوثری رحؒ، علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ اور دوسرے اربابِ علم و فضل نے اسے اپنے موضوع پر منفرد کتاب تسلیم کیا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحؒ اپنے تفسیری فوائد میں لکھتے ہیں:۔

"اس موضوع پر میری نظر میں ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی"۔

(ترجمۂ شیخ الہند ص۴۴)

خود شاہ صاحب رحؒ کی زندگی میں ایک وسیع النظر عالم جو جرمنی وغیرہ میں بھی رہ چکے تھے جب ان کی نظر سے یہ کتاب گذری تو انہوں نے خاص اس غرض سے دیوبند کا سفر کیا کہ اگر دنیا میں اس پایہ کا کوئی محقق موجود

ہے تو اس کے شرفِ ملاقات سے ہمکنار ہونا چاہیئے۔ ؎۱

(۵) "خاتمُ النبیّین"

مذکورہ بالا کتابوں کے برخلاف اس کی زبان فارسی ہے جو آپ نے خاص اپنے وطن کشمیر کے لوگوں کو قادیانیوں کی تلبیس سے بچانے کے لئے تصنیف فرمائی تھی۔

اس کتاب کا اصل موضوع آیت ختم نبوّت کی تفسیر ہے یہ رسالہ مختصر ہونے کے ساتھ خاصا دقیق ہے۔ علّامہ کی دوسری تصانیف کی طرح اس سے بھی صحیح معنوں میں علماء ہی فایدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

ہر چند کہ یہ تمام کتابیں ردّ قادیانیت کی غرض سے تالیف کی گئی ہیں لیکن ان کی حیثیت محض مناظرانہ کتابوں کی نہیں ہے بلکہ صحیح علمی ذوق رکھنے والوں کو بسا اوقات ان کتابوں کا ایک صفحہ پڑھ کر ایسی نادر تحقیقات، علمی نکات و لطائف اور اچھوتے افکار ہاتھ آتے ہیں جو ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی بمشکل مل سکتے ہیں۔

بہر کیف! اس وقت مقصود صرف یہ تھا کہ قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ صاحب رح کے کارنامہ کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ اگر توفیق نے مساعدت کی تو "مولینا محمّد قاسم نانوتوی رح اور علامہ انور شاہ رح کے اچھوتے اور نادر علمی تحقیقات سے آیندہ لوگوں کو روشناس کرنے کی سعی کروں گا۔ واللّٰہُ الموفّق وبیدہٖ اذمّۃُ التحقیق۔

أئمۂ فن کے فکر و نظر کی بلندی اور علم کی گہرائی کو جانچنے کا معیار محض تصانیف کی عددی کثرت ہرگز نہیں ہے بلکہ اصل چیز کیفیت ہوتی ہے کمیت نہیں۔

مولینا محمّد یوسف بنوری نے اس سلسلہ میں بڑا ہی پُرلطف استدلال

؎۱ ملاحظہ ہو "حیاتِ انور" میں مولینا محمّد منظور نعمانی کا مضمون ص ۱۵۲

کیا ہے کہ شیخ جلال الدین سیوطی انتہائی کثیر التصانیف ہیں۔ اس کے برخلاف امام ابن دقیق العید رح کی اصل تصانیف کُل دو ہیں۔ ان میں بھی ایک تو دستیاب ہے اور دوسری کے منتشر اور نا تمام اقتباسات ائمہ فن کی کتابوں میں ملتے ہیں مگر اس کے باوجود ابن دقیق العید رح کی دقتِ نظر پر شیخ جلال الدین سیوطی کی کثرتِ تصانیف کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

اس سلسلہ کا یہ واقعہ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ شیخ الاسلام مصطفےٰ صبری نزیل قاہرہ جو اپنے زمانے کے بلند پایہ متکلم تھے۔ عربی اور ترکی زبانوں میں ان کی متعدد تصانیف موجود ہیں۔ انہیں ۱۳۵۷ھ میں جب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے علامہ انور شاہ صاحب کا مختصر رسالہ "مرقاۃ الطارم علیٰ حدوثِ العالم" پیش کیا تو انہوں نے اس رسالہ کو پڑھ کر فرمایا کہ:-

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی اس پایہ کا محقق بھی ہو سکتا ہے۔"

پھر صدرالدین شیرازی کی اسفارِ اربعہ (جس کے صفحات ہزاروں تک پہنچتے ہیں) کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "میں اس چند ورقی رسالہ کو اس کتاب پر ترجیح دیتا ہوں۔ (مقدمہ عقیدۃ الاسلام ص۳)

یہ واقعہ خود شیخ مصطفےٰ صبری رح کی عظمت کا بھی آئینہ دار ہے کہ ان کی حقیقت بین نظروں میں محض کاغذ کے پشتاروں کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اصل چیز علمی گہرائی اور فکر و نظر کی پختگی ہے ؎

(منقول از "دارالعلوم" دیوبند).

فرعیات کے بارے میں
حضرت شاہ صاحبؒ کا طرزِ فکر

از حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندیؒ (سابق مفتی اعظم پاکستان)

"ممتاز علماءِ اسلام کا طرزِ فکر" کے عنوان سے ایک مقالہ پندرہ روزہ "ترجمان" دہلی کے اکتوبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں خاص طور پر حضرت مولینا اشرف علی صاحب تھانوی، حضرت مولینا محمد انور شاہ کشمیری، حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولینا سید سلیمان ندوی اور حضرت مولینا ابو الکلام آزاد (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا تذکرہ آیا ہے۔

میں استاذی المکرم مولینا محمد نور الدین صاحب زید مجدہٗ کا ممنونِ کرم ہوں جنھوں نے میری توجہ اس گرانقدر مقالہ کی طرف مبذول کی۔

میرے ایک خط کے جواب میں اخبار "ترجمان" دہلی کے مدیرِ اعلیٰ محترم المقام عبد السلام صاحب رحمانی کا بیان ہے کہ "یہ مضمون پاکستان کے اخبار "جنگ" میں شائع ہوا تھا، جسے ہم نے افادیت کے خیال سے شائع کر دیا۔"

بہر حال حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق اس میں جو اقتباس ہے، اسے مِن وعَن نقل کر کے شاملِ کتاب کیا گیا اور یہ اقتباس مولینا محمد شفیع صاحبؒ کے قلم سے ہے۔

یہاں یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ "وحدتِ اُمت" کے نام سے مولینا مرحوم کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جس میں حضرت مفتی صاحبؒ نے ان زرین خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔" (کوندو)

"قادیان میں ہر سال ہمارا جلسہ ہُوا کرتا تھا اور مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ بھی اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے۔ ایک سال اسی جلسہ میں تشریف لائے، میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہُوا تو دیکھا کہ حضرتؒ سر پکڑے ہوئے بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ میں نے پُوچھا حضرت! کیسا مزاج ہے؟ فرمایا ہاں ٹھیک ہے۔ میاں مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کردی! میں نے عرض کیا حضرت آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں اور دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ ہزاروں آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمتِ دین میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟ فرمایا میں تمہیں صحیح کہتا ہوں عمر ضائع کردی۔ میں نے عرض کیا حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کردیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں اور دوسرے ائمہ کے مسائل پر آپ کے مسلک کی ترجیح ثابت کریں۔ یہ رہا ہے خلاصہ خود ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔

اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں؟ کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا۔ وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔ اور امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو "صواب محتمل الخطا" (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کردیں اور دوسرے کے مسلک کو "خطا محتمل الصواب" (غلط مسلک جس کے

حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں، ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔ پھر فرمایا ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا؛ اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح ہے اور وہ بھی صحیح۔ یا یہ کہ یہ صحیح ہے لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو، اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی۔ قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا؛ آمین بالجہر حق تھی یا (آمین) بالسّر حق تھی۔ برزخ میں اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہو گا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے الفاظ یہ تھے:۔

"اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابو حنیفہؒ کو نہ مالکؒ کو نہ احمدؒ بن حنبل کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے۔ جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چارسو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنّت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کریگا کہ وہاں میدانِ محشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابو حنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا، یا اس کے برعکس یہ نہیں ہو گا۔ تو جس چیز کو نہ دنیا میں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں اور نہ محشر میں اس کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی، اپنی قوّت صَرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی۔ مجمع علیہ اور سب ہی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سب ہی کے نزدیک اہم تھیں جن کی دعوت انبیاءِ کرام لے کر آئے تھے جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی آج یہ دعوت

تو نہیں دی جا رہی ہے۔ یہ ضروریات دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہے ہیں اور اپنے و اغیار ان کے چہرے مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے رہنا چاہیئے تھا وہ پھیل رہے ہیں۔ گمراہی پھیل رہی ہے۔ الحاد آ رہا ہے، شرک و بُت پرستی پل رہی ہے۔ حرام و حلال کا امتیاز اُٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی و فروعی بحثوں میں"۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی ؎

حضرت شاہ صاحبؒ کے درسِ حدیث کی خصوصیات

از حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلوی مرحوم
سابق شیخ الحدیث جامعۂ اشرفیہ لاہور، پاکستان

حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذ رشید رہے ہیں۔ موصوف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و کمالات کو بطورِ جذب مقناطیسی حاصل کر کے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں کو منوّر فرمایا تھا۔ نہایت جلیل القدر محدّث و مُفسّر، بے نظیر ادیب و متکلّم، مشہور مؤلِف و مُصنّف، وسیع المطالعہ، کثیر التصانیف اور تقی و نقی عالمِ دین تھے۔ حضرت شاہ صاحب سے بیعت و سلوک کا شرف و امتیاز بھی انہیں حاصل تھا۔ پہلے دار العلوم دیوبند میں تفسیر، حدیث اور فقہ کے اُستاد تھے اور بعد ازاں جامعہ اشرفیہ لاہور میں شیخ الحدیث کے منصبِ عظیم پر فائز ہو کر تشنگانِ علوم کی پیاس بُجھا رہے تھے۔ ۷ رجب ۱۳۹۴ھ کو آپ کا انتقال ہُوا۔ رَحِمَہُ اللّٰہُ رَحْمَۃً وَّاسِعَۃً۔

خدمتِ حدیث میں "شرح مشکوٰۃ المصابیح" مطبوعہ دمشق ان کا محدثانہ کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مقدمۃ البخاری، مقدمۃ الحدیث، تحفۃ القاری بحلِ مشکلات البخاری، جلاء العینین فی رفع الیدین اور تقلید و اجتہاد وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ "حضرت الاستاذ محدث کشمیری" کے عنوان سے آپ کا ایک گرانقدر مقالہ حیات انور میں شامل ہے۔ قلتِ گنجائش کی وجہ سے اگرچہ ہم نے اسے مِن وعن جُزوِ کتاب نہ بنایا لیکن تاہم اس سے کافی استفادہ کیا۔ مولینا مرحوم نے اور باتوں کے علاوہ اس مقالہ میں حضرت شاہ صاحب کے درسِ حدیث کی

امتیازی خصوصیات" پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس لئے مضمون کے اس حصے کو ذیل میں درج کیا گیا۔

اپنے فاضلِ اجل استاد کے تبحّرِ علمی اور آفتابِ فضل و کمال کی ضیا باری کا طرزِ جمیل کن الفاظ میں بیان فرمایا ہے، قابلِ مطالعہ ہے" (کوثر)

"حضرت کے درس کی شان عجیب تھی جس کو اب دکھلانا تو ممکن نہیں البتہ بتانا کچھ ممکن ہے

(۱) درسِ حدیث میں سب سے اوّل اور زیادہ توجہ اس طرف فرماتے تھے کہ حدیثِ نبوی ؐ کی مُراد باعتبارِ قواعدِ عربیت و بلاغت واضح ہو جائے۔ حدیث کی مُراد کو علمی اصطلاحات کے تابع بنانے کو پسند نہ فرماتے تھے کیونکہ اصطلاحات بعد میں پیدا ہوئیں اور حدیث نبوی ؐ زماناً و رُتبۃً مقدم ہے۔ حدیث کو اصطلاح کے تابع کرنا خلافِ ادب ہے۔

(۲) خاص خاص مواضع میں حدیثِ نبوی ؐ کا ماخذ قرآنِ کریم سے بیان فرماتے اور اسی مناسبت سے بہت سی مشکلاتِ قرآنیہ کو حل فرما دیتے تھے۔

(۳) حسبِ ضرورت اسماءُ الرّجال پر کلام فرماتے۔ خصوصاً جن رُواۃ کے بارے میں محدثین کا اختلاف ہوتا تو اس جرح و تعدیل کے اختلاف کو نقل کر کے اپنی طرف سے ایک قولِ فیصل بتلا دیتے کہ یہ راوی کس درجہ میں قابلِ قبول ہے۔ اسکی روایت حسن کے درجہ میں ہے یا صحیح کے، یا قابلِ رد ہے یا قابلِ اغماض یا لائقِ مسامحت، اور اغماض و مسامحت میں جو فرق ہے وہ اہلِ علم سے مخفی نہیں۔ زیادہ تر فیصلہ کا طریقہ یہ بھی رکھتے کہ جب کسی راوی کی جرح و تعدیل میں اختلاف ہوتا تو یہ بتلا دیتے کہ یہ راوی ترمذی کی فلاں سند میں واقع ہے اور امام ترمذیؒ نے اس روایت کی تحسین یا تصحیح فرمائی ہے۔

(۴) فقہ الحدیث پر جب کلام فرماتے تو اوّلاً ائمہ اربعہ کے مذاہب نقل فرماتے اور

پھر اُن کے وہ دلائل بیان فرماتے جو ان مذاہب کے فقہاء کے نزدیک سب سے زیادہ قوی ہوتے پھر اُن کا شافی جواب اور امامِ اعظمؒ کے مسلک کی ترجیح بیان فرماتے تھے۔

(۵) نقلِ مذاہب میں قدماء کی نقول پیش فرماتے اور اُن کو متاخرین کی نقول پر پیش فرماتے اور اُن کو متاخرین کی نقول پر مقدم رکھتے۔ ائمہ اجتہاد کے اصل اقوال پہلے نقل فرماتے پھر مشائخ کے اقوال ذکر فرماتے تھے۔

(۶) مسائلِ خلافیہ میں تفصیل کے بعد یہ بھی بتلا دیتے کہ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے، گویا وہ ایک قسم کا فیصلہ ہوتا جو طلبہ کے لئے موجبِ طمانیت ہوتا۔

(۷) درسِ بخاری میں تراجم کے حل کی طرف خاص توجہ فرماتے، اولاً بخاری) کی غرض و مُراد واضح فرماتے، بہت سے مواقع میں حل تراجم میں شارحین کے خلاف مُراد منقح فرماتے تھے۔ ثانیاً یہ بھی بتلاتے کہ اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری نے ائمہ اربعہ میں سے کس امام کا مذہب اختیار فرمایا ہے اور پوری بخاریؒ آپ سے پڑھنے کے بعد یہ واضح ہوتا کہ سوائے مسائل مشہورہ کے اکثر جگہ امام بخاری نے امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ کی موافقت کی ہے۔

(۸) حافظ ابن حجر عسقلانی چونکہ امام شافعیؒ کے مُقلِد ہیں اس لئے امام شافعی کی تائید میں جابجا امام طحاوی کے اقوال اور استدلال نقل کر کے اس امر کی پوری سعی کرتے ہیں کہ امام طحاوی کا جواب ضرور ہو جائے، بغیر امام طحاوی کا جواب دئے گذرنے کو حافظ عسقلانی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے حقِ شافعیت ادا نہیں کیا۔ درس میں حضرت شاہ صاحبؒ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ مسائلِ فقہیہ میں بغیر حافظ کا جواب دئے نہ گذریں۔

(۹) اسرارِ شریعت میں شیخ محی الدین بن عربی اور شیخ عبدالوہاب شعرانی کا کلام زیادہ نقل فرماتے تھے۔

(۱۰) درسِ حدیث کی تقریر موجز و مختصر مگر نہایت جامع ہوتی تھی (جس سے

ذی علم مستفید ہو سکتے تھے۔) ہر کس و ناکس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔

خلاصہ یہ کہ آپ کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر محدثین سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، جب متونِ حدیث پر کلام فرماتے تو یہ معلوم ہوتا کہ امام طحاویؒ یا بخاریؒ و مسلمؒ بول رہے ہیں۔ فقہ الحدیث پر بولتے تو امام محمد بن الحسن الشیبانی معلوم ہوتے۔ حدیث کی بلاغت پر گویا ہوتے تو تفتازانی اور جرجانی کا خیال گذرتا۔ اسرارِ شریعت بیان فرماتے تو ابن عربی و شعرانی کا گمان ہوتا تھا +

قادیانیت کے خلاف حضرتِ محدّثِ کشمیریؒ کا جہاد

مرتبہ کوندو

آج سے تقریباً ۵۷ سال قبل یعنی ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۰ء کے قریب قادیانی فتنہ اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ پورے ہندوستان کے اطراف و اکناف میں اور خصوصاً پنجاب میں ایک طوفانی صورت سے اُٹھا۔ سادہ لوح اور بھولے بھالے لوگوں کی نہ جب کمی تھی اور نہ اب ہے۔ اس لئے اُس زمانہ میں بہت سے لوگ قادیانی فتنہ کے شکار ہو گئے۔ یہ بات مُسلّمہ ہے کہ اس فتنہ کو انگریزی حکومت کی پُشت پناہی حاصل تھی اور یہ لوگ بھی انگریزی حکومت کے قدم کو مضبوط کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جیسا کہ مرزا قادیانی نے خود بھی اپنی کئی تصانیف میں متعدد جگہوں پر اظہار کیا کہ ان پر انگریزوں کی وفاداری فرض ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر لکھتے ہیں :-

"سب سے پہلے میں یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میں ایسے خاندان میں سے ہوں جس کی نسبت گورنمنٹ نے ایک مُدّتِ دراز سے قبول کیا ہُوا ہے کہ وہ خاندان اوّل درجہ پر سرکار دولت مدار انگریزی کا خیر خواہ ہے ...... میرے والد صاحب اور خاندان ابتداء سے سرکارِ انگریزی کے بدل وجان ہو اخواہ و وفادار رہے اور گورنمنٹ عالیہ انگریزی کے معزز افسروں نے مان لیا کہ یہ خاندان کمال درجہ پر خیر خواہ سرکارِ انگریزی ہے ...... یہی وجہ ہے کہ میرا باپ اور میرا بھائی اور خود میں بھی روح کے جوش سے اس بات میں مصروف رہے کہ اس گورنمنٹ کے فوائد اور احسانات کو عام لوگوں پر ظاہر کریں اور اسکی اطاعت کی فرضیت کو لوگوں کے دلوں میں جمادیں۔"[1]

---

[1] درخواست بحضور لفٹننٹ گورنر منجانب خاکسار غلام احمد از قادیان مورخہ ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم ص ۹ مولفہ میر قاسم علی قادیانی۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

فتنۂ ملّت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلمان کو سلاطین کا پرستار کرے

بہرحال اس فتنہ کا مرکز قادیان (مشرقی پنجاب) تھا۔ (اور بعد ازاں ربوہ میں جو پاکستان میں واقع ہے، منتقل ہوچکا تھا وہاں بھی اب اللہ کے فضل سے اس کا کلّی طور خاتمہ ہی ہوا، کیونکہ حکومتِ پاکستان نے عُلماءِ اسلام کے مشورہ سے اس فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا) اور آہستہ آہستہ اس کے اثرات ساری دُنیا میں پھیلنے لگے۔ یہاں تک کہ جاہل لوگوں سے گذر کر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس سے متاثر ہونے لگا۔ برصغیر میں انگریزی پڑھے لکھے لوگ جو عموماً اسلام سے ناواقف تھے اور مرزا قادیانی کی عیاری اور مکّاری کو تاڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اس فتنہ کے شکار ہوتے گئے۔ اس لئے اس فتنہ کا خاتمہ کرنے کے لئے عُلماءِ ربّانی کمربستہ ہوئے جن میں امام العصر حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ والبرکات کا نامِ نامی سرِفہرست ہے۔

فتنۂ قادیانیت کے خاتمہ کے لئے مشہور اہلحدیث عالم اور مفسرِ قرآن حضرت مولینا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ[1] کی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں۔

---

[1] امام المناظرین حضرت مولینا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری رحمہ اللہ اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط میں امرتسر میں پیدا ہوئے ہیں۔ حضرت موصوف کی خود نوشت سوانح حیات کے مُطابق ان کے والدِ ماجد علاقۂ ڈورو اسلام آباد کشمیر کے رہنے والے تھے جو کشمیر سے امرتسر پشمینہ کا کاروبار کرنے کے لئے آتے تھے اور بعد ازاں امرتسر میں ہی سکونت پذیر ہوئے۔ ان کے بیان کے مطابق کشمیری اقوام میں ایک گوت "منٹو" جو کہ یہاں کے برہمنوں کی ایک شاخ ہے، کے ساتھ ان کا تعلق تھا۔

مولینا مرحوم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ اس عظیم المرتبت مردِ مجاہد نے اپنی تمام عمر اسلام کی خدمت میں صرف فرمادی۔ (باقی صفحۂ آیندہ پر)

حضرت موصوف قدس سرہٗ حضرت شاہ صاحبؒ کے ہم عصر اور حضرت شاہ صاحبؒ کے قدر دان تھے۔ اس لئے اس موقعہ پر مولینا موصوف کا تذکرہ کرنا ضروری بن گیا۔

الغرض حضرت محدث کشمیریؒ نے جب یہ دیکھا کہ اُمتِ مُسلمہ ایک سخت امتحان میں مُبتلا ہے، جس میں اس کی تباہی کا بھی خطرہ ہے تو انھوں نے قادیانی فرقہ کے غلط عقائد کی تردید میں ایک منظم مہم چلانے کا فیصلہ فرمایا کیونکہ مُسیلمۂ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوّت کے فتنہ سے حضرت شاہ صاحبؒ بے چین رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ اُمتِ محمدیہ میں داخلی اور اندرونی فتنہ ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے تردید قادیانیت کے لئے کیا کچھ کیا وہ بجائے خود ایک اہم باب ہے اور اس پہ ایک ضخیم کتاب بھی مُرتّب ہو سکتی ہے۔

یوں تو زیرِ نظر کتاب کے کئی مقالات میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے "قادیانی" فتنہ کی بیخ کنی کے لئے کیا کیا اقدامات فرمائے۔ لیکن ان میں مولینا بدرُالحسن دربھنگوی اور مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی کے گرانقدر مقالات چونکہ خاص اسی موضوع پر ہیں اس لئے ان ہر دو مقالات سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی مساعی جمیلہ کے متعلق بڑی حد تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مولینا موصوف اس امتیازی خصوصیت کے مالک ہیں جنھوں نے مختلف نظریہ کے علماءِ دین سے استفادہ کیا ہے۔ پنجاب میں مولینا حافظ عبدالمنان صاحب، دیوبند میں مولینا محمود الحسن صاحب اور کانپور میں مولینا احمد حسن صاحب (رحمہم اللہ تعالیٰ) ان کے شیخ الحدیث رہے ہیں۔

یوں تو اس دلیر اور حق گو عالمِ دین اور مُوحّدِ حقیقی نے اپنی ساری عمر شرک و بدعت کے خاتمہ کے لئے صرف فرمادی لیکن پھر بھی تردید قادیانیت میں ان کی ناقابلِ فراموش خدمات کو اس سب پر فوقیت اور ترجیح دی جا سکتی ہے۔ علم و عمل کے اس بحرِ بیکراں نے قادیانیت کے خلاف اتنی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں کہ خود حضرتِ موصوف نے ایک بار تحریر فرمایا ہے کہ "مجھے خود ان کا شمار یاد

(باقی اگلے صفحہ پر)

آگہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا کہ حضرت ثناء صاحب نے قادیانی فرقہ کے غلط عقائد کی تردید میں ایک ہمہ گیر اور منظم مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ حضرتؒ نے اپنے تلامذہ سمیت غیر منقسم ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ شروع کیا۔ جگہ جگہ تبلیغی جلسوں کا انعقاد کیا اور مسلمانوں کو قادیانی فتنے سے بچنے کی تلقین فرمائی۔ حضرت نے پنجاب اور صوبۂ سرحد کا دورہ کیا، قادیانی مبلغین سے مناظرے اور مباحثے کئے۔ خاصکر فیروزپور پنجاب کے تاریخی مناظرہ میں اپنے رفیق کار علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سمیت قادیانی دجل و فریب کا پردہ پوری طرح چاک کر دیا۔ خاص قادیان میں جا کر قادیانیوں کو صراط مستقیم دکھائی تاکہ کسی طرح سے یہ اُمّت خداوند کریم اور رسولِ برحقؐ کی نافرمانی سے باز رہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قابلِ فخر تلامذہ کی اعانت سے تردیدِ قادیانیت میں مختلف رسالے عربی زبان میں شائع کر کے مصر و شام اور دوسرے اسلامی ممالک میں مفت تقسیم کرائے تاکہ یہ ممالک بھی قادیانی فرقہ کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مسئلہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السّلام پر پہلے ایک رسالہ "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃِ عیسیٰ علیہ السّلام" لکھا۔ اس کے بعد بطور اس کے حواشی یا ضمیمہ کے "تحیۃ الاسلام" نام سے دوسرا رسالہ تالیف فرمایا۔ مسئلہ کفر و اسلام کے حدود پر حضرت

(متعلق صفحۂ گذشتہ نہیں)۔ آپ کے مناظروں، تحریروں اور تقریروں سے مرزا قادیانی (علیہ ماعلیہ) کتنا تنگ آ گیا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو "مولوی ثناء اللہ کے ساتھ آخری فیصلہ" کے عنوان سے مرزا نے لکھا کر:۔

"مولوی ثناء اللہ نے مجھے بہت بدنام کیا، میرے قلعہ کو گرانا چاہا، وغیرہ) اس لئے میں یہ دُعا کرتا ہوں کہ ہم دونوں میں جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں مر جائے۔" پھر کیا ہوا؟ وہ تو آج بھی بفضلِ خدا زبان زدِ خاص و عام ہے۔ یعنی مرزا قادیانی کے مرنے کے کوئی ۴۰ سال بعد مولانا امرتسریؒ انتقال فرما گئے۔

علامہ امرتسریؒ نے بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں: قرآنِ پاک کی کئی تفسیریں لکھ کر ہم بہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

نے رسالہ "اکفار الملحدین فی شیٔ من ضروریات الدین" تالیف فرمایا۔ ختم نبوت پر "خاتم النبیین" کے نام سے فارسی زبان میں بھی ایک کتاب تصنیف فرمائی، اور یہ آپ نے خصوصیت سے اپنے وطن کشمیر کی ضرورت کو سامنے رکھ کر تحریر فرمائی کیونکہ ان دنوں کشمیر میں بھی قادیانی فتنہ سر اٹھا چکا تھا۔ اس کتاب کے متعلق یہاں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہو گا کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے مرض وفات میں رو رو کر فرمایا "ہم نے عمر ضائع کی اور کوئی کام آخرت کے لئے نہ کیا۔ ہاں یہ رسالہ "خاتم النبیین" اس لعین قادیانی کے رد میں لکھا ہے۔ توقع ہے کہ شاید یہی میری نجات کا ذریعہ ہو جائے۔[1]"

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ "خاتم النبیین" نامی یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور بقول مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی یہی انکی خاتمۃ التصانیف بھی قرار پائی ہے۔

اس سے پہلے اردو زبان میں بھی حضرت شاہ صاحبؒ نے دعوت حفظ ایمان کے نام سے کئی رسالے تصنیف فرمائے ہیں اور وہ بھی غالباً ان دنوں کشمیر کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ہی لکھے۔ ایک رفیق سے ہمیں دعوت حفظ ایمان کے دو جز ہاتھ آئے۔ مرزا قادیانی کے مبلغ علم کے بارے میں حضرت شاہ صاحب نے جو تذکرہ فرمایا ہے اُسے ضبط تحریر میں لانا خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

"یہ شخص معمولی درجہ کی فارسی اور اردو کا مالک ہے۔ نثر و نظم میں کوئی اعلیٰ پایہ نہیں رکھتا۔ عربی میں تک بندی یا سرقہ کر سکتا ہے اور صوفیہ کرام جیسے فن حقائق کہتے ہیں اس میں سے کسی حقیقت کو صحیح نہیں سمجھ سکا۔ قرآن مجید کی مناسبت سے اس قدر محروم ہے کہ اپنی مطبوعات میں نہایت کثرت سے آیات غلط اور محرف نقل کرتا جاتا ہے۔ تعلیم اس کی باب اور بہاء اللہ کی تعلیم سے مسروق ہے۔ بہاء اللہ کی کتابیں یہاں پیشتر موجود نہیں تھیں جس کی وجہ سے کچھ وقفہ رہا۔ ابکہ کتابیں

---

[1] حیات انور ص ۲۳۴، ۲۳۵ (صفحہ گذشتہ کا بقیہ آئندہ صفحہ پر دیکھئے)

اس کی سر آ گئیں ناظرین نے اس سرقۂ فاضحہ کو ثابت کر دکھایا۔ مع ہذا اس دجّال کی دیدہ دہنی اس درجہ تک ہے کہ کہتا ہے ؎

زندہ شد ہر نبی بآمدنم ⁂ ہر رسولے نہاں بہ پیرہنم

(یعنی) ہر نبی میرے آنے سے زندہ ہوا ہے نہیں تو مرے پڑے تھے اور ہر رسول میرے چولے میں چھپا پڑا ہے۔"

اسی طرح اکفار الملحدین فی ضروریات الدین میں بھی ایک جگہ مرزا کے علم کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"یدعی دعاوی بسیطۃً عاطلۃً مع غایۃ جہلہ وقلّۃ فہمہ حتّی انّہ لا یستطیع تلفیق عبارۃٍ صحیحۃٍ فی الفارسیۃ فکیف بالعربیۃ ویزعمها حقائق وہی فی الحقیقۃ بقایق ؎۲"

جس رسالہ دعوتِ حفظِ ایمان کے متعلق سطورِ بالا میں ہم نے عرض کیا اس کے آخر میں حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"حکومتِ کشمیر کو بحیثیتِ رعیت ہونے کے متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ کُل عالمِ اسلام مصر، شام، عرب، عراق، ہندوستان، کابل وغیرہ کادیانیوں کو مسلمان نہیں سمجھتے ہیں ان کی بھرتی اسکولوں اور محکموں میں مسلمانوں پر احسان نہیں اور ہمیشہ موجب تصادم وخللِ امن رہیگی۔

(متعلق صفحہ گذشتہ) بار احسان رکھا۔ ان میں تفسیر ثنائی اور تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن خاص طور پر مشہور ہیں۔

آخر علوم اسلامیہ کا یہ بے لوث عالم، دلیری اور حق گوئی کا یہ پہاڑ اور مسلکِ اہلِ حدیث کا یہ یگانہ خادم ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء (۱۳۶۷ھ) کی صبح کو دوشنبہ کے دن اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملا اور اس طرح یہ علم وفضل کا یہ آفتابِ تاباں سرگودھا (پاکستان) کی زمین میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

سالِ وفات کا مادہ "ھو المغفور" ہے۔ زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔ (کوندو)

۱؎ ملاحظہ ہو دعوتِ حفظِ ایمان ج ۲ ص ۵

۲؎ اکفار الملحدین ص ۱۰۵

اہلِ کشمیر پر واضح رہے کہ جو کادیانی اخبار کشمیر سے جاری ہوا ہے وہ کادیانی عقائد یعنی کُفر کی تخم ریزی ہے۔ عنقریب شاخ و برگ دِکھلائے گا۔ مسلمان اپنی جیبیں خالی کر کے کُفر نہ خریدیں۔ والسّلام۔

العارض: محمّد انور شاہ کشمیری عفی اللہ عنہ

از دیوبند، ۲۲ ذیقعدہ ۱۳۵۱ ہجری"

الغرض شاہ صاحب نے اپنی علالت، بُڑھاپا اور علمی مشاغل کی کثرت کے باوجود دِن رات اس فتنہ کی روک تھام میں صَرف کر دیئے۔ انہوں نے ہندوستان کے دوسرے عُلماء و فُضلاء کو بھی اِصلاحِ قوم کی طرف متوجّہ کیا۔

چنانچہ شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد اُن کے شاگردوں نے اپنے اُستاد کے شروع کئے ہوئے کام کو جاری رکھا، اور اب بھی وہ اس ضمن میں اپنے فرائض سے بدستور عہدہ برآء ہو رہے ہیں۔ فجزاھُمُ اللّٰہُ خیرًا۔

مُقدمۂ بہاولپور

تردیدِ قادیانیت میں شاہ صاحبؒ کا سب سے بڑا کارنامہ بہاولپور کے معرکۃ الآراء تاریخی مقدمہ میں شہادت دینا ہے۔ یہ مُقدمہ ایک مُسلمان عورت نے جو احمد پور شرقیہ ریاست بہاولپور کی رہنے والی تھی، اپنے خاوند کے خلاف دائر کیا تھا۔ اس عورت کا یہ کہنا تھا کہ اس کا شوہر مرزائی ہونے کی وجہ سے خارج از اسلام ہو چکا ہے اور خارج از اسلام مرد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح حرام ہے اس لئے اس کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔

یہ مقدمہ کافی عرصہ تک زیرِ سماعت رہا۔ تقریباً سات سال تک بہاولپور کی ادنیٰ و اعلیٰ عدالتوں میں زیرِ سماعت رہتے ہوئے آخر میں دربارِ معلّٰی بہاولپور پہنچا۔ ۱۹۳۲ء میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس مسئلہ پر فریقین یعنی قادیانی اور غیر قادیانی علماء سے روشنی ڈالنے کو کہا جائے تاکہ اُن کے بیانات کی روشنی میں مُقدمہ کا صحیح طور پر فیصلہ کیا جا سکے۔

قادیانیوں نے اس مُقدمہ کو جیتنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔

قادیان کا بیت المال اور رجال کار مقدمہ کی پیروی کے لئے وقف ہوئے۔

اِدھر مُدّعیہ بے چاری ایک غریب گھرانے کی لڑکی نہایت کس مپرسی میں وقت گذار رہی تھی۔ مُلک کے ممتاز مسلمان علماء کو شہادت میں لانا اس کے بس سے باہر تھا اس لئے بہاولپور کے مُسلمانوں کی انجمن "انجمن مویدُ الاسلام" نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا اور مُقدمہ کی پیروی کا انتظام کیا۔ مُلک بھر کے مُمتاز علماء کو خطوط لکھ کر مقدمہ کی پیروی اور شہادت کے لئے طلب کیا۔ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ ان دِنوں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں صدر مُدرّسی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اور کچھ وقت سے علیل ہونے کی وجہ سے دیوبند تشریف لائے ہوئے تھے۔ بے حد کمزور ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود سامانِ سفر باندھے ڈابھیل جانے کو تیار تھے تو اسی دوران بہاولپور سے مولٰنا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کی طرف سے وہ خط مِلا جس میں حضرت کو بہاولپور کے اُس مقدمہ میں شہادت دینے کی دعوت دی گئی تھی۔ چناں چہ انہوں نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور علماء کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ بہاولپور تشریف لائے، آپ کے ہمراہ حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ بھی تھے۔ کئی روز تک بیانات ہوتے رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے نہایت مُدلّل بحث کی اور فرقۂ قادیانیہ کی تردید میں ایک بصیرت افروز تقریر ارشاد فرمائی۔ یہ حضرت شاہ صاحبؒ اور اُن کے ساتھیوں کی مساعیٔ جمیلہ کا ظہور تھا کہ یہ مُقدمہ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو بحقِ مُدعیہ فیصل ہُوا جو اُسی زمانے میں کتابی صورت میں شایع ہُوا لیکن آج کل نایاب ہے۔

بہرحال بہاولپور کے اس معرکۃ الآراء مقدمہ میں حضرت شاہ صاحبؒ نے بیان دے کر مرزائیت کی بنیادوں کو مُنہدم اور قادیانی دجل و فریب کے تمام پردوں کو پارہ پارہ کر کے فرقۂ مرزائیہ ضالّہ کا اِرتداد دُنیا پر واضح کیا۔

انجمن موید الاسلام بہاولپور کے شایع کردہ "البیان الازہر" کے مطابق شیخ الاسلام والمسلمین اُسوۃ السلف و قدوۃ الخلف حضرت مولٰنا محمد انور شاہ صاحبؒ نے

۱۹۔ اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور کی سرزمین کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا۔ حضرتؒ کی رفاقت میں پنجاب کے بعض علماء مولینا عبدالحنان صاحب خطیب آسٹریلیا مسجد لاہور و ناظم جمعیۃ علماء پنجاب، مولینا محمد صاحب لائل پوری (تلمیذ حضرت شاہ صاحبؒ) فاضل دیوبند اور مولینا محمد زکریا صاحب لدھیانوی وغیرہم بھی تشریف لائے۔ ریاست بہاولپور اور ملحقہ علاقہ کے علماء اور ملاقاتی اس قدر جمع ہوئے کہ حضرتؒ کی قیام گاہ پر بعض اوقات بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی تھی، اور زائرین مصافحہ سے بھی محروم رہتے تھے۔ ۲۵ اگست ۱۹۳۲ء کو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا بیان شروع ہوا، عدالت کا کمرہ اُمراء و رؤساء ریاست اور علماء سے پُر تھا، عدالت کے بیرون میدان میں دُور تک مشاہدین کا اجتماع تھا۔ باوجودیکہ حضرت شاہ صاحبؒ عرصہ سے بیمار تھے اور جسم مبارک بہت ناتوان ہو چکا تھا مگر متواتر پانچ روز تک تقریباً پانچ پانچ گھنٹے یومیہ عدالت میں تشریف لا کر علم و عرفان کا دریا بہاتے رہے، مرزائیت کے کفر و ارتداد اور دجل و فریب کے تمام پہلو بے نقاب کئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے بیان ساطع البرہان میں مسئلہ ختم نبوّت اور مرزا کے ادعاءِ نبوّت، وحی اور مدعی نبوّت کے کفر و ارتداد کے متعلق جس قدر مواد جمع ہے اور ان مسائل و حقائق کی توضیح و تفصیل کے لئے جو ضمنی مباحث موجود ہیں شاید مرزائی نبوّت کے ردّ میں اتنا علمی ذخیرہ کسی ضخیم سے ضخیم کتاب میں بھی یکجا نہیں ملیگا۔

انجمن مؤید الاسلام بہاولپور کے منتظمین نے اس مقدمہ کی کارروائی" بیانات اور فیصلہ وغیرہ تین حصّوں میں شائع کیا ہے۔ "بیانات علماء ربّانی" کے نام سے جو کتاب شائع ہوئی ہے اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان بھی ہے۔ لیکن اس میں تفصیلات درج نہیں ہیں۔ جو عبارات اثناءِ بیان میں تشریحات اور تفسیرات کے ساتھ پیش فرمائی جاتی تھیں وہ بھی پوری درج نہیں کی گئیں۔ صرف

اتنا بیان شایع ہوا ہے جو حضرت شاہ صاحبؒ جج صاحب کو املا کرواتے تھے۔ اس میں حوالجات کی عبارات کا صرف اوّل اور آخری لفظ لے لیا گیا ہے، حالانکہ حضرت شاہ صاحبؒ پوری عبارت مع تشریح و تفسیر سُناتے تھے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذۂ کرام میں سے ایک اہم شاگرد مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری مدظلہ العالی حضرت شاہ صاحب کے ملفوظاتِ گرامی پر مشتمل کتاب "نطقِ انور" حصۂ اوّل میں اس مقدمہ کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:۔

"۱۲، اور ۱۳، ستمبر کو متعدد مجالس میں حضرت نے اسی مقدمۂ بہاولپور کے حالات اور اپنی شہادت و بیان کے کچھ حصّے سُناتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

میں نے عدالت میں پانچ وجوہ سے تکفیرِ مرزائیت کا ثبوت پیش کیا تھا:۔ (۱) دعوائے نبوّت (۲) دعوائے شریعت (۳) توہینِ انبیاء علیہم السّلام (۴) انکارِ متواترات و ضروریاتِ دین۔ (۵) سبِّ انبیاء علیہم السّلام، فرمایا کہ میں نے عدالت کے سامنے "سبّ" کی تشریح کی اور اس سے پہلے یہ ثابت کیا کہ سورۂ بقرہ میں جو اصول ارشاد فرمائے گئے ہیں ان ہی میں سے یہ بھی ہے کہ خدا کی اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس کے برگزیدہ بندوں کی بھی اطاعت کی جائے جس کو قصّۂ حضرتِ آدم علیہ السّلام اور شیطان سے واضح کیا گیا ہے۔ "سبّ" کے معنی بُرا بھلا کہنا، ناسزا کہنا ہے۔ گالی دینا نہیں۔ اس کے لئے "قذف" کا لفظ آتا ہے اور "سبّ" کی بہت اقسام ہیں مگر جو وہاں کے متعلق اور حسبِ حال تھیں وہ تین اقسام بیان کیں:۔

(۱) سبِّ لزومی: جو بلاقصد آجائے، جبکہ مقصد کوئی دوسری چیز بیان کرنا ہو۔

(۲) سبِّ تعریفی: دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چھوڑنا۔ جیسے مرزا نے انجیل وغیرہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے حالات بیان کئے ہیں اور مقصد اپنا دل ٹھنڈا کرنا ہے۔ چنانچہ دو چار ورق کے بعد کہیں جاکر حوالہ دیتے ہیں ورنہ بڑی تفصیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے خلافِ شان حالات لکھتے چلے جاتے ہیں تاکہ دوسروں کے قلوب سے ان کی عزت و وقعت کم کریں۔ حالانکہ خود تعزیراتِ ہند میں بھی ہے کہ اگر کوئی ہندوستانی

کسی انگریز مورخ کے لکھے ہوئے کسی واقعہ کو بلا کم و کاست نقل کر دے اور اس سے نفرت پھیلتی ہو تو اس پر مقدمہ قائم ہو جاتا ہے کیونکہ اس کو جرم سمجھا گیا ہے۔

(۱۳) سب صریحی :- یہ ظاہر ہے اور ہیں نے اس کو بھی ثابت کیا اور اس سلسلہ میں مرزا کا یہ شعر پڑھ کر سنایا ؎

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو ﴾ اس سے بہتر غلام احمد ہے۔

اس پر وکیل مرزائیین نے اعتراض کیا کہ مولینا محمود حسن صاحب (شیخ الہندؒ) کے ایک شعر میں بھی ایسا ہی مضمون ہے اس کا کیا جواب ہے؟ وہ شعر یہ ہے ؎

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذرا ابنِ مریمؑ

اس پر عدالت میں جو ہزاروں کا مجمع تھا اور ان میں ہندو بھی تھے، ذرا گھبرایا کہ شاید اس کا جواب مجھ سے نہ ہو سکے تو میں نے کھڑے ہو کر تقریر شروع کی اور کہا کہ شعر میں ایک تو شاعری ہوتی ہے دوسرے جھوٹ (احسنہٗ اکذبہٗ کہ شعر میں جتنا زیادہ جھوٹ ہو اتنا ہی زیادہ اچھا سمجھا جاتا ہے۔) اور تیسرے مبالغہ، شاعری میں تخیل اور خیال آفرینی ہوتی ہے یعنی حقیقتِ شئی کے آس پاس آنا اور خود اس کو ظاہر نہ کرنا جس کا مقصد اچنبھے میں ڈالنا ہوتا ہے۔

اور یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ کسی چیز کی حقیقت کو بتلانا یہ خاصہ خدا کا ہے کہ وُہی اشیاء کی حقائق کو کماہی بلا کم و کاست بیان کر سکتا ہے دوسرا نہیں۔

پس شاعر اپنے شاعرانہ جذبات میں یہ ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتا کہ میں کوئی حقیقت بیان کر رہا ہوں نہ وہ اُس کا مدعی ہوتا ہے۔ البتہ اپنے کسی اچھوتے تخیل یا خیال آفرینی کی صرف داد چاہتا ہے۔

چنانچہ حضرت الاستاذ مولینا شیخ الہندؒ کی مراد یہ ہے کہ ہمارے مشائخ طریقت و شریعت نے مُردہ دلوں کو زندہ کیا اور زندہ دلوں کو مرنے نہ دیا۔ اس مصرعہ میں صرف دل کا لفظ محذوف ہے جس سے شاعر نے اچنبھے میں ڈالا ہے اور خیال آفرینی کی داد

چاہی ہے۔

پھر چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرنے کے بارے میں بڑے مشہور و نامور پیغمبر ہیں اس لئے ان کو اس میں سب سے بڑا فرض کیا ہے۔ اور دوسرے مصرعہ سے منشا یہ ہے کہ وہ دیکھیں تو اس کی داد دے سکتے ہیں۔ جیسے بڑے چھوٹوں کی کارگذاری پر داد دیا کرتے ہیں۔

لہٰذا حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ کے شعر میں خالص ایمان ہے اور مرزا کے شعر میں خالص کفر ہے۔ کیونکہ حضرت مولینا رحمۃ اللہ علیہ نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس منقبت احیاءِ موتیٰ میں سب سے زیادہ معظّم و مکرّم قرار دیکر اپنے اکابر کو بھی ان کے چھوٹوں کے مرتبہ میں قرار دیکر اپنی طرف سے حضرت مسیح علیہ السلام کی بڑی سے بڑی عظمت کا اقرار فرمایا ہے اور اس کے برعکس مرزا صاحب نے اپنے شعر کے پہلے مصرعہ میں تو حضرت مسیح علیہ السلام کے ذکرِ مبارک سے اعراض کی تلقین کی جیسے کسی کمتر کے ذکر کو ناقابلِ التفات سمجھ کر ایسا کہا جاتا ہے اور دوسرے مصرعہ میں مزید اہانت یہ کی کہ صاف طور سے یہ کہہ دیا کہ اس سے یعنی حضرت مسیح علیہ السلام سے بہتر غلام احمد ہے۔ نعوذ باللہ من ھٰذا الکفریات۔ اس سے زیادہ کفر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ شعر میں جھوٹ ہوا کرتا ہے اور اس کا قائل اس کے جھوٹ ہونے کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔

تیسرے مبالغہ ہوا کرتا ہے کہ شاعر چھوٹی چیز کو بڑا دکھلاتا ہے اور خود قائل بھی سمجھتا ہے کہ یہ غلط ہے اور اگر کسی مجمع میں اس سے دریافت کیا جائے تو وہ اس کے زائد از حقیقت ہونے کا اقرار کرلے گا۔

اس مُسکِت و مُدلّل جواب سے اُن کا اعتراض ختم ہو گیا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ ختمِ نبوت کا عقیدہ اسلام کے اہم اور بنیادی مسائل میں سے ہے اور خاتم النبیین کے جو معنی قادیانی بیان کرتے ہیں آیاتِ قرآنی و احادیثِ صحیحہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ قرآنِ مجید کی بہت سی آیات سے

احادیث متواتر المعنیٰ سے اور قطعی اجماعِ اُمت سے روزِ روشن کی طرح ثابت ہے اس کا منکر قطعاً کافر ہے، کوئی تاویل و تخصیص اس میں قبول نہیں کی گئی۔ اس میں تاویل و تخصیص کرنے سے وہ شخص ضروریاتِ دین میں تاویل کرنے کی وجہ سے منکرِ ضروریاتِ دین سمجھا جائے گا۔ ختمِ نبوت کے بارے میں ہمارے پاس تقریباً دو سو احادیث ہیں۔

قادیانی وکلاء کی طرف سے اس ضمن میں یہ کہا گیا کہ حدیث میں ہے کہ قرآن شریف کی ہر آیت کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی اور تاویل کرنے والے کو کافر نہیں سمجھا گیا۔

اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ نے فرمایا کہ "یہ حدیث قوی نہیں ہے اور باوجود قوی نہ ہونے کے اس کی مراد ہمارے نزدیک صحیح ہے۔ اس حدیث میں لفظِ بطن سے تو جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دل میں تھا وہ سب منکشف نہیں ہے مجملاً ہم سمجھتے ہیں کہ ظہرِ قرآن کی مراد وہ ہے جو قواعدِ لغت اور عربیت سے اور اَدلّۂ شریعت سے علماء شریعت سمجھ لیں اور اس کے تحت میں قسمیں ہیں اور باطنی سے یہ مراد ہے کہ حق تعالیٰ اپنے ممتاز بندوں کو ان حقائق سے سرفراز کر دے اور بہتوں سے وہ مخفی رہ جائیں۔ لیکن ایسا کوئی باطن جو مخالف ظاہر کے ہو اور قواعدِ شریعت اس کو رد کرتے ہوں مقبول نہ ہو گا، اور رد کیا جائے گا اور بعض اوقات باطنیت الحاد تک پہنچا دے گا۔ حاصل یہ ہے کہ ہم مکلف فرمانبردار بندے اپنے مقدور کے موافق ظاہر کی خدمت کریں اور باطن کو خدا کے سپرد کر دیں۔

رہا تاویل کا مسئلہ تو اخبارِ آحاد کی تاویل اگر کوئی شخص قواعد کے مطابق کرے تو اس کے قائل کو بدعتی نہیں کہیں گے البتہ اگر قواعد کی رُو سے صحیح نہیں تو وہ خاطی ہے۔

فرمایا: مرزا صاحب نے آیاتِ قرآنی کو اپنے اوپر چسپاں کیا ہے جیسا کہ آیتِ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ الآیۃ کے متعلق کہا کہ اس میں میرا ذکر ہے۔ اور

دوسری جگہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ الآیہ میں کہا کہ اس میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی اسی طرح اور کئی تصریحات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کو اپنے اوپر چسپاں کرتے تھے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین اور حضرت مریمؑ کی شان میں بھی گستاخی کی ہے۔ ان سب سے قرآنِ مجید کی صریح آیات کی تکذیب ہوتی ہے۔

وکیلِ قادیانی نے مرزا صاحب کی طرف سے صفائی میں بعض عبارتیں ایسی پیش کیں جن سے انبیاء علیہم السّلام کی مدح نکلتی ہے۔ تو اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ

"جب ایک جگہ کلماتِ توہین ثابت ہو گئے تو دوسری ہزار جگہ بھی کلماتِ مدحیہ لکھے ہوں اور ثناخوانی کی ہو تو وہ کفر سے نجات نہیں دلا سکتے، جب کہ تمام دُنیا اور دین کے قواعد مسلّمہ اس پر شاہد ہیں کہ اگر ایک شخص تمام عمر کسی کی اتباع اور اطاعت گذاری کرے اور مدح و ثنا کرتا رہے لیکن کبھی کبھی اس کی سخت ترین توہین کر دیا کرے، تو کوئی انسان اس کو واقعی مطیع و معتقد نہیں کہہ سکتا۔

فرمایا:-

"مدحیہ اشعار تحقیقی نہیں ہوتے، بلکہ سب کے کلام اٹکل کے ہوتے ہیں اور شاعرانہ محاورہ نئی نوع کلام کی تسلیم کی گئی ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو خدا کا کلام ہوگا تو وہ عقیدہ ہوگا اور وہ کسی طرح اٹکل نہ ہوگی بلکہ حقیقتِ حال ہوگی، نہ کم نہ بیش اور بشر انتہائی حقیقت کو نہیں پہنچتا، تخمینی الفاظ کہتا ہے اور خود شاعر کی نیت بھی اس کو عالم سے منوانا نہیں ہوتی۔ پھر جھوٹے اور شاعر میں یہ فرق ہے کہ جھوٹا کوشش کرتا ہے کہ میرے کلام کو لوگ سچ مانیں اور شاعر کی یہ کوشش بالکل نہیں ہوتی بلکہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ لوگ میرے اس کلام کو حقیقت پر نہیں سمجھیں گے چنانچہ مرزا صاحب نے خود اپنی کتاب دافع البلاء کے صـ۲۰ پر لکھا ہے کہ یہ باتیں شاعرانہ نہیں بلکہ واقعی ہیں۔

انبیاء علیہم السّلام میں باہمی فضیلت کا باب فرقِ مراتب کا ہے اور جو پیغمبر افضل ہے تو کسی قرینہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کسی دوسرے سے افضل ہے اور نبی کریمؐ سے یہ فرقِ مراتب اس احتیاط سے اُمت کو پہنچا ہے کہ اس سے فوق مُتصوّر نہیں لیکن ایسی فضیلت دینا کسی پیغمبر کو اگرچہ واقعی ہو جس سے دوسرے کی توہین لازم آتی ہو کفر صریح ہے۔

مرزا صاحب کے عقائد کے متعلق فرمایا :-

مرزا صاحب کی پیدائش چونکہ مسلمان گھرانہ میں ہوئی تھی اور نسلی کافر نہیں تھے اس لئے ابتداءً ان کی نشوونما تمام اسلامی عقائد پر ہوئی اور وہ ان کے پابند رہے۔ پھر تدریجاً ان سے الگ ہونا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آخری اقوال میں بہت سے ضروریاتِ دین کے قطعاً مُخالف ہو گئے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے باطل اور جھوٹے دعوؤں کو رواج دینے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ اسلامی عقائد کے الفاظ وہی قائم رکھے جو قرآنِ مجید و احادیث میں مذکور ہیں، اور عام و خاص مُسلمانوں کی زبان پر جاری ہیں لیکن ان کے حقائق کو ایسا بدل دیا کہ جس سے ان عقاید کا بالکلیہ انکار ہو گیا۔ (مثلاً جس طریق سے نفخِ صور یا قیامت کی خبر قرآنِ مجید و حدیث میں آئی ہے اس سے بالکل انکار ہے۔ صرف ظاہری الفاظ رکھے مگر معنیٰ اُلٹ دئے)

اس لئے ان کی کتابوں سے ایسے اقوال پیش کرنا جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض عقائد میں اہلسنّت والجماعۃ کے ساتھ شریک ہیں۔ ان کے اقوال و افعال کُفریہ کا کفارہ نہیں بن سکتے۔ جب تک اسکی تصریح نہ ہو کہ جو عقاید کُفریہ انہوں نے اختیار کئے تھے ان سے توبہ کر چکے ہیں۔ اور جب تک توبہ کی تصریح نہ ہو، چند عقائد اسلام کے الفاظ کتابوں میں لکھ کر کُفر سے نہیں بچ سکتے۔ کیونکہ زندیق اسی کو کہا جاتا ہے جو عقائدِ اسلام ظاہر کرے اور قرآن و حدیث کے اتباع کا دعویٰ کرے لیکن ان کی ایسی تاویل و تحریف کرے جس سے ان کے حقائق بدل جائیں۔ لہٰذا جب تک اس کی تصریح نہ دکھلائی جائے کہ

مرزا صاحب ختمِ نبوّت اور انقطاعِ وحی کے اس معنٰی کے لحاظ سے قائل ہیں جس معنٰی سے کہ صحابہ و تابعین اور تمام اُمّتِ محمدیّہ قائل ہے۔ اس وقت تک ان کی کسی ایسی عبارت کا مقابلہ میں پیش کرنا مُفید نہیں ہوسکتا جس میں خاتمُ النّبیّین کے الفاظ کا اقرار کیا ہو۔

اسی طرح نزولِ مسیح وغیرہ عقائد کے الفاظ کا کسی جگہ اقرار کرلینا یا لکھ دینا بغیر تصریح مذکور کے ہرگز مُفید نہیں ہے، خواہ وہ عبارت تصنیف میں مُقدّم ہو یا مؤخّر۔

یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مرزا صاحب اپنی آخر عمر تک دعوائے نبوّت پر قائم رہے اور اپنے کفریہ عقائد سے کوئی توبہ نہیں کی، علاوہ ازیں اگر یہ ثابت بھی نہ ہو تو کلماتِ کفریہ اور عقائدِ کفریہ کہنے اور لکھنے کے بعد اس وقت تک ان کو مسلمان نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی طرف سے ان عقائد سے توبہ کرنے کا اعلان نہ پایا جائے اور یہ اعلان ان کی کسی کتاب یا تحریر سے ثابت نہیں کیا گیا۔

مرزا صاحب کے ایک قول سے جو تریاق القلوب حاشیہ ص۲۷۰ سے نقل کیا گیا ہے اور جس کے الفاظ حسبِ ذیل ہیں:۔

"غرض جیسا کہ صوفیوں کے نزدیک مانا گیا ہے کہ مراتبِ وجود دوری ہیں۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی خو، طبیعت اور دلی مشابہت کے لحاظ سے قریباً ڈھائی ہزار برس اپنی وفات کے بعد پھر عبداللہ پسرِ عبدالمطلب کے گھر میں جنم لیا اور محمدؐ کے نام سے پکارا گیا۔"

حضرت شاہ صاحبؒ نے حسبِ ذیل نتائج اخذ فرمائے:۔

(۱) اس قول سے لازم آیا کہ سرورِ عالم محمدؐ کوئی چیز نہیں تھے اور آپ کا تشریف لانا بعینہٖ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تشریف لانا ہے، گویا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بروز ہیں اور اصل ابراہیم علیہ السلام رہے اور آئینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے اور چونکہ ظل اور صاحبِ ظل میں مرزا صاحب کے نزدیک عینیت ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے کو "عینِ محمد" کہتے ہیں۔ تو جب محمدؐ بروزِ ابراہیمؑ ہوئے تو

مرزا صاحب عینِ ابراہیمؑ بھی ہوئے۔ اس سے صاف لازم آتا ہے کہ معاذ اللہ رسول اللہؐ کا کوئی وجود بالاستقلال نہیں اور نہ اُن کی نبوّت کوئی مستقل شئے ہے۔

(۲) رسولُ اللہؐ ابراہیمؑ کے بروز ہوئے اور خاتم النبیّین آپ ہوئے کہ خاتم بروز اور ظِل ہوتا ہے۔ صاحبِ ظِل اور اصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح مرزا صاحب آنحضرتؐ کے بروز ہوئے تو خاتمُ النبیّین مرزا صاحب ہوئے نہ کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم۔

(۳) جب رسول اللہؐ حضرت ابراہیمؑ کے بروز ہوئے تو جملہ کمالاتِ نبوّت اگر مجتمع ہونگے تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام میں ہونگے نہ کہ آں حضرتؐ میں اور یہ باطل و بے معنیٰ ہے۔

فرمایا:۔

مرزا صاحب کی کتابیں دیکھنے سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ان کی ساری تصانیف میں صرف چند ہی مسائل کا تکرار اور دَور ہے، ایک ہی مسئلہ اور ایک ہی مضمون کو بیسیوں کتابوں میں مختلف عنوانوں سے ذکر کیا ہے اور پھر سب اقوال میں اس قدر تہافت و تعارض پایا جاتا ہے اور خود مرزا صاحب کی ایسی پریشان خیالی ہے اور بالقصد ایسی روش اختیار کی ہے جس سے نتیجہ گڑبڑ رہے اور ان کو بوقتِ ضرورت مخلص و مفرّ باقی رہے۔

چناں چہ کہیں تو وہ ختم نبوّت کے عقیدہ کو اپنے مشہور اور اجماعی معنیٰ کے ساتھ قطعی اور اجماعی عقیدہ کہتے ہیں اور کہیں ایسے عقیدہ بتلانے والے مذہب کو لعنتی اور شیطانی مذہب قرار دیتے ہیں۔ کہیں حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام کے نزول کو تمام اُمّتِ محمّدیہ کے عقیدہ کے موافق متواتراتِ دین میں داخل کرتے ہیں اور اس پر اجماع ہونا نقل کرتے ہیں اور کہیں اس عقیدہ کو مُشرکانہ عقیدہ بتلاتے ہیں۔

حضرتِ عیسیٰ علیہ السّلام کی توہین کے متعلق مرزا صاحب کے جو اقوال ان کی کتب دافعُ البلاء اور ضمیمہ انجامِ آتھم وغیرہ میں ہیں۔ ان کتابوں سے پیش کر کے

یہ دکھلایا گیا تھا کہ ان میں بہت ہی سب وشتم درج ہے۔ ان کے بارے میں وکیل قادیانی نے جواب دیا کہ ان میں عیسائی مخاطب ہیں اور ان اقوال میں ان لوگوں کے اعتقادات کے مطابق جو ان کی کتابوں میں درج ہیں انہیں الزامی جواب دئے گئے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے ان دشنام آمیز الفاظ کو اپنی شہادت میں بسلسلۂ توہین عیسیٰ علیہ السلام بیان نہیں کیا اور کہا کہ میں موجب ارتداد مرزا صاحب کے سلسلہ میں اس قسم کی کوئی خط پیش نہیں کرتا جس میں کہ مجھے نیت سے بحث کرنی پڑے بلکہ میں اس چیز کو لیتا ہوں جسے انہوں نے قرآن کی تفسیر بتایا ہے اور اسے حق کہا ہے۔

غرض میں نے مرزا صاحب کی نیت پر گرفت نہیں کی، زبان پر کی ہے اور نہ ہی وجہ ارتداد میں تعریض کو لیا ہے بلکہ جس ہجو کو اس نے قرآن مجید سے مستند کیا اور اسے قرآن مجید کی تفسیر گردانا اور جس ہجو کو اپنی جانب سے حق کہا اس کو وجہ ارتداد قرار دیا اور اس ضمن میں مرزا صاحب کے حسب ذیل اقوال داخل کئے۔

(۱) "مگر میرے نزدیک آپ کی یہ حرکات جائے افسوس نہیں کیونکہ آپ تو گالیاں دیتے تھے اور یہودی ہاتھ سے کسر نکال لیا کرتے تھے۔"

(۲) "عیسائیوں نے آپ کے بہت سے معجزات لکھے ہیں، مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی معجزہ نہیں ہوا۔"

اس سے صریح حضرت عیسیٰ ع کی توہین نکلتی ہے کیونکہ "میرے نزدیک" اور "حق بات" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مرزا صاحب کے اپنے فیصلہ کے الفاظ ہیں۔

وکیل قادیانی نے صوفیاء کرام کے بعض ایسے قابل اعتراض اقوال پیش کئے جو مرزا صاحب کے اقوال کے مشابہ ہیں، اور باوجود ان اقوال کے ان کو

مسلمان کہا جاتا ہے۔ تو حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب میں فرمایا :-

"ہم نے اولیاء اللہ کو ان کی طہارت، تقدّس و تقویٰ کی بے شمار خبریں سُن کر اور ان کے شواہد افعال و اعمال اور اخلاق سے تائید پا کر ان کو ولی مقبول تسلیم کر لیا ہے۔ تو ان کے بعد اگر کوئی کلمہ مغائر یا موہم ہمارے سامنے ان کا آتا ہے تو ہم اس کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کی توجیہہ کریں اور حل نکالیں لیکن کسی شخص کی راست بازی ثابت ہونے سے پیشتر ہی اس کے شطحیات (مغالطہ میں ڈالنے والے کلمات) پیش کر کے اس کو مُسلّم الثبوت مقبولوں پر قیاس کرنا عاقل کا کام نہیں نہ ان کی تاویل کی ضرورت۔

حاصل یہ کہ کسی کی راست بازی اگر جُداگانہ کسی طریقہ اور دلیل سے معلوم ہو چکی ہو تو ہم مخارجِ تاویل و توجیہہ ہونگے۔ اور اگر زیرِ بحث صرف یہی کلماتِ موہم اور مغالطہ آمیز ہیں اور اس سے پیشتر کچھ سامان خیر کا ہے ہی نہیں تو ہم یہ کھوٹی پونجی اس کے مُنہ پر مار دیں گے۔

قادیانی وکیل نے کہا کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں اور جو کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے اس کو بھی کافر کہنا دُرست نہیں۔ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا :-

"یہ بات کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر جائز نہیں ہے بے علمی اور ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ حسبِ تصریح و اتفاقِ عُلماء اہلِ قبلہ کے یہ معنیٰ نہیں کہ جو قبلہ کی طرف مُنہ کرے وہ مسلمان ہی ہے۔ چاہے سارے عقائدِ اسلام کا انکار ہی کرے

قرآنِ مجید میں منافقین کو عام کُفار سے زیادہ کافر ٹھہرایا گیا حالانکہ وہ فقط قبلہ کی طرف مُنہ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ تمام ظاہری احکام اسلامیہ بھی ادا کرتے تھے۔

اہلِ قبلہ سے مُراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہ اتفاق کیا ضروریاتِ دین پر اور اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کی مُراد یہ ہے کہ کافر نہ ہوگا جب تک کہ نشانی کُفر کی اور

علامتِ کفر کی اور کوئی چیز موجباتِ کفر میں سے نہ پائی گئی ہو۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ قادیانی نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ عام ارکانِ اسلام کے پابند ہیں اور تبلیغِ اسلام میں کوشش کرتے ہیں پھر ان کو کافر کیسے کہا جائے گا! اس کے جواب میں فرمایا:۔

"صحیح حدیث میں یہ تصریح ہے کہ ایک قوم ایسی آئے گی جس کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خود فرماتے ہیں کہ دینِ اسلام سے نکل جائیگی اور ان کو قتل کرنے میں بڑا ثواب ہے۔ یہ لوگ نماز روزے کے پابند ہونگے بلکہ ظاہری خشوع وخضوع کی کیفیات بھی ایسی ہونگی کہ ان کے نماز، روزے کے مقابلہ میں مسلمان اپنے روزے کو بھی ہیچ سمجھیں گے لیکن اس کے باوجود جب کہ بعض ضروریاتِ دین کا انکار ان سے ثابت ہو تو ان کی نماز روزہ وغیرہ انکو حکمِ کفر سے بچا نہ سکی۔

ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ فقہاء نے ایسے شخص کو مسلمان ہی کہا ہے جس کے کلام میں ۹۹ وجوہات کفر کی موجود ہوں اور صرف ایک وجہ اسلام کی۔ اس کے جواب میں فرمایا:۔

" اس کا منشاء بھی یہی ہے کہ فقہاء کا منشاء نہیں سمجھا گیا اور نہ ان کے وہ اقوال دیکھے جن میں صراحتًہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ حکم اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ اس وقت ہے جب کہ قائل کا صرف ایک کلام مفتی کے سامنے آئے اور قائل کا کوئی دوسرا حال معلوم نہ ہو اور نہ اس کے کلام میں کوئی تصریح ہو جس سے معنی کفر متعین ہو جائے تو ایسی حالت میں مفتی کا فرض ہے کہ معاملۂ تکفیر میں احتیاط برتے۔ اور اگر کوئی خفیف سے خفیف احتمال ایسا نکل سکے جس کی بناء پر یہ کلام کفر سے بچ سکے تو اسی احتمال کو اختیار کرے اور اس شخص کو کافر نہ کہے۔ لیکن اگر ایک شخص کا یہی کلمۂ کفر اس کی سینکڑوں تحریرات میں بعنوانات والفاظِ مختلفہ موجود ہو جس کو دیکھ کر یہ یقین ہو جائے کہ یہی معنیٰ

(معنیٰ کفری) مراد لیتا ہے یا خود اپنے کلام میں معنی کفری کی تصریح کر دے تو باجماع فقہاء ایسے شخص پر قطعی طور پر کفر کا حکم لگایا جائے اور اس کو مسلمان ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

ایک شبہ یہ پیش کیا گیا کہ اگر کوئی کلمۂ کفر کسی تاویل کے ساتھ کہا جائے تو اس پر کفر کا حکم نہیں لگے گا اس کے جواب میں فرمایا:-

"اس میں تصریحاتِ فقہاء سے ناواقفیت کارفرما ہے، کیونکہ حضراتِ فقہاء و متکلمین کی تصریحات موجود ہیں کہ تاویل اس کلام اور اس چیز میں مانع تکفیر ہوتی ہے جو ضروریاتِ دین میں سے نہ ہو، لیکن ضروریاتِ دین میں اگر کوئی تاویل کرے اور اجماعی عقیدہ کے خلاف کوئی نئے معنیٰ تراشے تو بلاشبہ اس کو کافر کہا جائے گا، اس کو قرآنِ مجید نے الحاد اور حدیث نے زندقہ قرار دیا ہے۔

زندیق وہ ہے جو مذہبی لٹریچر بدل دے، یعنی الفاظ کی حقیقت بدل دے۔ مرزا صاحب نے بہت سے اسلامی عقائد کے حقائق بدل دئے ہیں۔ گو ان کے الفاظ وہی رہنے دئے ہیں اس لئے ان کو حسبِ تصریحاتِ مذکورۂ بالا کافر ہی قرار دینا پڑے گا اور ان عقائد کے تحت ان کا اتباع کرنے والا بھی اس طرح کافر سمجھا جائے گا۔

وکیلِ قادیانی کی طرف سے شیخ محی الدین ابن عربی اور دیگر بزرگوں کے اقوال نقل کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ ان کے نزدیک بھی نبوّت مرتفع ہونے سے یہ مراد ہے کہ شریعت والی نبوّت مرتفع ہو گئی نہ کہ مقامِ نبوّت اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ کے بعد کوئی ایسا نبی نہیں ہوگا جو آپ کی شریعت کے خلاف ہو بلکہ جب بھی ہوگا آپ کی شریعت کے ماتحت ہوگا۔ اس کے جواب میں ہماری طرف سے ان حضرات کے اقوال کی توجیہیں بیان کی گئیں۔ اور میں نے کہا کہ دین کے معاملہ میں انکے

اقوال دوسروں پر کوئی حجت نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ دینی معاملات میں سوا نبی کی وحی کے اور کوئی بات قطعی نہیں ہے۔

وکیل قادیانی کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت شیخ اکبر اور حضرت مجددؒ و صاحب اور مولینا روم کی کتابوں میں ہے کہ تمام اقسام وحی کی جو قرآن میں مذکور ہیں خدا کے نیک بندوں (اولیاءاللہ) میں پائی جاتی ہیں اور وہ وحی جو نبی میں ہے وہ خاص ہے اور وہ شریعت والی وحی ہے جو انبیاء علیہم السّلام کو ہوتی ہے، وہ اس اُمت کے بعض کامل افراد کو بھی ہوئی ہے اور جیسا کہ مولینا رومی نے کہا ہے، ہوتی تو وہ وحی حق ہی ہے لیکن صوفیاء عام لوگوں سے پردہ کرنے کی خاطر اسے "وحی دل" بھی کہہ دیتے ہیں اور جن طریقوں سے انبیاء علیہم السّلام کو وحی یا الہام ہوتا ہے ان ہی طرق سے اولیاءاللہ کو ہوتا ہے، اگرچہ اصطلاحاً ان کا نام رکھنے میں فرقِ مراتب کے لئے فرق کیا ہے کہ انبیاء کی وحی کو وحی اور اولیاء کی وحی کو الہام کہتے ہیں اور ولی پر بھی وحی بواسطۂ ملک ہوتی ہے"۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس پر بحث کے دوران فرمایا کہ :-

"صوفیاء کے یہاں ایک باب ہے جس کو شطحیات کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ان پر حالات گذرتے ہیں اور ان حالات میں کچھ کلمات ان کے مُنہ سے نکل جاتے ہیں جو ظاہری قواعد پر چسپاں نہیں ہوتے اور بسا اوقات غلط راستہ لینے کا سبب بن جاتے ہیں۔ صوفیاء کی تصریح ہے کہ ان پر کوئی عمل پیرا نہ ہو اور تصریح کرتے ہیں کہ جن پر یہ احوال نہ گذرے ہوں یا جو ان کی اصطلاحات سے واقف نہ ہوں وہ ہماری کتابوں کا مطالعہ نہ کریں۔

مُجملاً ہم بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی شخص جو کسی حال کا مالک ہوتا ہے دوسرا خالی آدمی ضرور اس سے اُلجھ جائے گا۔ لیکن دین میں کسی زیادتی، کمی کے صوفیاء میں سے کوئی قائل نہیں اور اُس کے مُدعی کو کافر بالاتفاق کہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ صوفیاء نے نبوّت بمعنیٰ لغوی لیکر مُقسم بتایا ہے اور اس کی تفسیر خدا سے اطلاع پانا، دوسرے کو اطلاع دینا کی ہے اور اس کے نیچے انبیاء علیہم السّلام اور اولیاءِ کرام دونوں کو داخل کیا اور نبوّت کی دو قسمیں کر دیں، نبوّتِ شرعی اور نبوّتِ غیر شرعی۔

نبوّتِ شرعی کے نیچے وحی اور رسل دونوں درج کر دیئے تو اب ان کے لئے نبوّتِ غیر شرعی اولیاء کے کشف و الہام کے لئے نکھر گئی اور مخصوص ہو گئی۔

پھر صوفیاء کی تصریح ہے کہ کشف کے ذریعہ مستحب کا درجہ بھی ثابت نہیں ہو سکتا صرف اسرار و معارف اور مکاشف اس کا دائرہ ہیں، اور تصریح فرماتے ہیں کہ ہمارا کشف دوسرے پر حُجّت نہیں۔ ہمارا کشف ہمارے لئے ہے۔

کشف اسے کہتے ہیں کہ کوئی پیرایہ آنکھوں سے دِکھلایا جس کی مُراد کشف والا خود نکالے۔ الہام اسے کہتے ہیں کہ دل میں کوئی مضمون ڈالدیا اور سمجھا دیا جائے۔ وحی یہ ہے کہ خُدا اپنا ضابطہ کا پیغام کسی نبی یا رسولؑ پر بھیجے۔ پھر وحی قطعی ہے اور کشف و الہام ظنی ہیں۔ بنی آدم میں وحی پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہے، غیروں کے لئے کشف یا الہام ہے یا معنوی وحی ہو سکتی ہے، شرعی نہیں[۱]۔"

حضرت شاہ صاحبؒ کو بہاولپور کے اس تاریخی مُقدمہ میں اپنے ایک شاگردِ رشید مولانا محمد صاحب انوری لائلپوری[۲] بھی ہمراہ تھے۔ موصوف کو حضرت شاہ صاحبؒ نے مختارِ مُقدمہ بنوا دیا تھا۔

مولانا ممدوح اس تاریخی سفر میں شب و روز اُنیس ۱۹ یوم تک حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ رہے۔ نیز حضرت کے عدالتی بیان میں جس قدر حوالجات کُتب کی ضرورت پیش

۱۔ مُلاحظہ ہو نُطقِ انور" جلد اوّل ص ۲۵-۵۰۔

۲۔ مولانا لائلپوری ۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء کو لائل پور میں انتقال کر گئے۔ ایک محتاط اندازہ کے مُطابق ایک لاکھ سے زائد افراد نے آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

آتی تھی وہ بھی مولٰینا موصوف ہی نکالکر پیش کرتے تھے جن کو حضرت شاہ صاحب خود پڑھ کر جج صاحب کو سُناتے تھے۔ "حضرت الاُستاذ مُحدّثِ کشمیریؒ" کے عنوان سے حضرتِ شاہ صاحبؒ پر ان کا ایک فاضلانہ مقالہ "حیاتِ انور" میں ہے۔ طوالت کے خوف سے اسے شاملِ کتاب نہ کیا گیا البتہ کتاب مذکورہ کے اِن صفحات کو من وعن جزوِ کتاب بنایا گیا جن میں موصوف نے وضاحت سے تحریر فرمایا ہے کہ کِس طرح دلائل و براہین سے حضرت شاہ صاحبؒ نے فاضل جج کو قائل کیا کہ "قادیانی اُمت" خارج از دائرۂ اسلام ہے۔

چنانچہ مولٰینا لائلپوری یوں رقمطراز ہیں :-

"حضرت کا حافظہ اس وقت قابلِ دید وشنید تھا جب حوالہ دیتے، کتاب کھولتے ہی فوراً اُنگشتِ مُبارک عبارت پر ہوتی۔ جج صاحب لکھئے! عبارت یہ ہے۔ بعض دفعہ احقر کو حکم فرماتے کہ عبارت نکالکر دِکھاؤں، بعض دفعہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے، بیان بیٹھ کر فرماتے لیکن حوالجات پیش فرمانے وقت کھڑے ہو جاتے۔ توراۃ شریف کی بعض آیات عبرانی الفاظ میں سُنائیں اور اپنے دستِ مبارک سے لکھ کر جج صاحب کو دیں۔ چنانچہ ایک آیت احقر کو یاد ہے۔ فَاْنِی مقر. بَخ مِیحَخ کاموخ یاقیم لَخَ اَلوُھَخ اِلاوتِشماعون ٥ نبیؔ مِن قرُبِکَ مِنْ اَخِیکَ کاَخِیکَ یُقِیْمُ لکَ اِلھکَ اِلیَہِ تَسَمَعُوْنَ۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت موسٰی علٰی نبیّنا وعلیہ السّلام نے اپنے دستِ مُبارک سے لِکھ کر اس آیت کا بنی اسرائیل میں اعلان فرمایا۔

(شاہ صاحبؒ نے) فرمایا:-

جج صاحب لکھئے، ہمارا دین متواتر ہے اور دُنیا میں کوئی دین مُتواتر نہیں" تواتُر کی تعریف بیان فرماکر اس کے اقسام تواترِ اسناد[1]، تواترِ طبقہ[2]، تواترِ قدرِ مشترک[3] اور تواتر

---

[1] تواترِ اسنادی یہ ہے کہ صحابہ سے بسندِ صحیح متصل مذکور ہو۔

[2] تواترِ طبقہ یہ ہے کہ جب یہ معلوم نہ ہو کہ کِس نے کس سے لیا اور صرف یہی معلوم ہوا کہ پچھلی نسل نے اگلی نسل سے سیکھا جیسا کہ قرآنِ مجید کا تواتر ہے۔

[3] تواترِ قدرِ مشترک یہ ہے کہ کئی حدیثیں بطورِ خبرِ واحد آئی ہوں اور ان میں قدرِ مشترک متفق علیہ حصہ

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

توارث[۱] بیان فرمائے، فرمایا تواتر کی ایک قسم معنوی بھی ہے، اور تواتر کی کسی ایک قسم کا منکر کافر ہے۔ مرزا غلام احمد نے تواتر کے جمیع اقسام کا انکار کیا ہے، جرح کے روز جلال دین شمس مرزائی مختار مدعا علیہ نے سوال کیا کہ آپ نے تواتر کے منکر کو کافر کہا ہے حالانکہ یہ تو ایک اصطلاح ہے جو علماء نے گھڑ رکھی ہے۔ اس کا منکر کیسے کافر ہو سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ تم لوگ مانتے ہو یا نہیں کہ یہ قرآن مجید وہی قرآن ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور ہم تک محفوظ چلا آیا؟ جلال الدین نے کہا کہ ہم مانتے ہیں، فرمایا کہ اس حالت میں حفاظت کا نام تمہارے ہاں کیا ہے؟ جلال دین نے کہا "تواتر"۔ فرمایا اس کا منکر کافر ہوگا یا نہیں۔؟ مرزائی مختار نے اقرار کیا، فرمایا کہ میں یہی تو کہہ رہا تھا۔ قادیانی مختار نے سوال کیا کہ امام رازی نے تواتر معنوی کا انکار کیا ہے۔ چنانچہ فواتح الرحموت شرح مسلّم الثبوت میں بحر العلوم نے تصریح کی ہے۔ فرمایا، آج ہمارے پاس فواتح الرحموت کتاب موجود نہیں ہے۔ تئیس[۲۳] سال ہوئے میں نے یہ کتاب دیکھی تھی۔ ان صاحب نے حوالہ دینے میں دھوکا دیا ہے، بحر العلوم امام رازی کے متعلق یہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ یہ جو حدیث ہے لَا تجتمع اُمّتی علی الضّلالۃ یہ تواتر معنوی کے درجہ کو نہیں پہنچتی، یہ نہیں کہ تواتر معنوی کے حجّت ہونے کا انکار کرتے ہیں بلکہ اس حدیث کے متواتر ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ چنانچہ

(متعلق صفحۂ گذشتہ) وہ حاصل ہو جو تواتر کو پہنچ جائے مثلاً نبی کریم کے معجزات، جو کچھ متواتر ہیں اور کچھ اخبار آحاد ہیں، ان اخبارِ آحاد میں اگر کوئی مضمون مشترک ملتا ہے تو وہ قطعی ہو جاتا ہے۔ اس سے بعض ایسی احادیث جو باعتبارِ لفظ و سند متواتر نہیں ہیں وہ باعتبارِ معنی کے متواتر ہو جاتی ہیں اگر ان معانی کو بہت سی سندوں سے اتنے راویوں نے بیان کیا ہو جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو۔

[۱] تواترِ توارث یہ ہے کہ نسل نے نسل سے لیا ہو، مثلاً بیٹے نے باپ سے لیا ہو اور باپ نے اپنے باپ سے۔ ان جملہ اقسام کے تواتر کا انکار کفر ہے۔ اگر متواترات کے انکار کو کفر نہ کہا جائے تو اسلام کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ ان متواترات میں تاویل کرنا یا مطلب بگاڑنا کفر صریح ہے۔ کفر کبھی قولی ہوتا ہے کبھی فعلی۔ کوئی شخص ساری عمر نماز پڑھتا رہے اور ۳۰ سال کے بعد (باقی اگلے صفحہ پر)

جج صاحب نے قادیانی مختار کو حکم دیا کہ اصل عبارت پڑھ کر سنائیے، اس نے ذرا تامّل کیا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی کہ لاؤ میں عبارت سناتا ہوں، اس نے کہا کہ میں سنا دیتا ہوں۔ جب سنایا، تو وہی عبارت تھی جو حضرتؒ نے ارشاد فرمائی تھی۔ فرمایا "جج صاحب! یہ صاحب ہمیں مفحم کرنا چاہتے ہیں لیکن میں چونکہ طالب علم ہوں دو چار کتابیں دیکھ رکھی ہیں، میں ان سے ان شاء اللہ مفحم نہیں ہوں گا۔

قادیانی مختار نے سوال کیا آپ نے فرمایا مدعی وحیِ نبوت واجب القتل ہے تو رسول اللہ صلعم نے ابن صیاد کو کیوں قتل نہ فرمایا، بلکہ فاروقِ اعظم رضؓ کو بھی روک دیا۔ فرمایا "جج صاحب! لکھئے" ابن صیاد نابالغ تھا اور نابالغ کو شریعت میں قتل نہیں کیا جاتا۔ سوال آپ نے فرمایا تھا کہ رسول اللہؐ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آئے، حضورؐ نے ان سے دریافت فرمایا، کہ کیا تم بھی مسیلمہ کا عقیدہ مانتے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا، تو فرمایا کہ اگر یہ بات نہ ہوتی، کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا تو میں تم دونوں کو قتل کرتا، اب سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے رواج کا اتباع کیا؟ فرمایا کہ نبی کریمؐ کا یہ فرمانا کہ قاصدوں کو قتل نہیں کیا جاتا یہ بجائے خود تشریعی حکم ہے، نبی رواج کا متبع نہیں ہوتا بلکہ حکم خداوندی کا متبع ہوتا ہے"۔

حضرت کی قیام گاہ پر زائرین کا ہجوم رہتا تھا۔ ہر وقت کسی نہ کسی موضوع پر تقریر فرماتے رہتے تھے۔ بہت سے لوگ حضرت سے بیعت بھی ہوئے۔ رات دن یہی شغل تھا۔ رات کے ایک بجے تک بیٹھتے رہتے۔ قرآن وحدیث وفقہ، تصوف

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) ایک بت کے آگے سجدہ کردے تو یہ کفر فعلی ہے۔ کفر قولی یہ ہے کہ کوئی شخص کہدے کہ خدا کے ساتھ صفتوں میں یا فعل میں کوئی شریک ہے۔ اسی طرح یہ بھی کفر قولی ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی اور نیا پیغمبر آئیگا، کیونکہ تواتر توارث کے ذیل میں ساری امت اس علم میں شریک ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد کوئی اور نبی نہ آئے گا۔

وغیرہ علوم و فنون کے دقیق مسائل علماءِ کرام و صوفیاءِ عظام دریافت کرتے رہتے۔ ہر ایک کے جواب میں ایسی محقق اور مبسوط تقریر فرماتے گویا ساری عمر اُسی میں لگائی ہے۔ ایک عالمِ دین نے مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدتِ شہود کے متعلق سوال کیا، بس پھر کیا تھا تین دِن عصر سے مغرب تک اور مغرب سے عشاء تک اِسی پر بیان فرماتے رہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی عبارات زبانی سُنا رہے ہیں۔ معارفِ لدُنیہ میں یہ فرماتے ہیں، مکتوباتِ شریفہ میں یہ فرماتے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ تحقیق ہے، عبقات میں شاہ اسماعیل شہیدؒ نے یوں فرمایا، حضرت شیخ اکبر محی الدین ابن العربیؒ نے فتوحات میں یہ فرمایا ہے، فصوص الحکم میں یہ ارشاد ہوتا ہے، حضرت مولینا حاجی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی نظموں پہ نظمیں وحدۃ الوجود پر طویل طویل پڑھ کر سُنا رہے ہیں، حضرت مولینا دین پوری نوّر اللہ مرقدہم بھی معہ اپنے خدّام کے تشریف فرما رہتے تھے، مولینا غلام محمد صاحب گھوٹوی، حضرات مولینا عبد اللطیف ناظم مدرسۂ مظاہر العلوم، مولینا مرتضیٰ حسن صاحب، حکیم عبد الرّشید افسر الاطباء بھاولپور، غرض ہر طبقہ محظوظ ہوتا تھا۔ حضرت ناظم صاحب سہارنپوری بڑی عقیدت کے ساتھ دو زانو سامنے بیٹھے رہتے تھے اور استفادہ فرماتے رہتے تھے، مولینا شمس الدین بھاولپوری مرحوم کے کُتب خانہ سے معجم کبیر طبرانیؒ کا قلمی نسخہ منگایا، حضرت ناظم لیکر آئے، احقر کو حکم فرمایا کہ روزانہ مجھے اس میں احادیث نقل کرکے دیا کرِ چنانچہ نشان دہی فرمائی جاتی اور احقر کو یہ سعادت نصیب ہوئی، فرمایا کہ قلمی کتاب کا پڑھنا مشکل ہوتا ہے میں آپ کو طریقہ سکھاتا ہوں۔ چنانچہ تھوڑی سی رہنمائی سے احقر نے خوب سمجھ لیا۔ معجم کے اس نسخہ میں کہیں اعراب و نقاط کا نام و نشان تک بھی نہیں۔ مولینا مفتی محمد شفیع صاحب اور مولینا محمد مرتضیٰ حسن مرحوم کے بیانات پہلے خود ملاحظہ فرماتے، جگہ جگہ رہنمائی فرماتے۔ جب خود تسلّی فرما لیتے، تو کچہری میں جانے دیتے، لیکن خود حضرت کوئی تیاری نہ فرماتے، اِکا ... نجِ نسبت تک تو جیسے اُوپر گذرا وعظ و تلقین وارشاد و ہدایت مسائل

ہوتا رہتا، صرف ایک گھنٹہ آرام فرماتے۔ ڈھائی بجے تہجد کے لئے اُٹھتے، فجر کی نماز تک مُراقب رہتے، پاس انفاس میں مشغول رہتے، اوّل وقت نماز فجر کی امامت خود کرتے پھر سورج نکلنے تک کچھ پڑھتے رہتے، چائے پی کر موٹر سے کچہری تشریف لے جاتے، سات بجے سے ایک بجے تک بیان ہوتا رہتا۔ ضعف و نقاہت بغایت تھا لیکن تکان مُطلقاً محسوس نہ فرماتے۔ تمام رُفقاءِ سفر و دیگر علماء کا خوب اہتمام سے تفقّد فرماتے رہتے، مجلسِ مشاورت میں خاص خاص عُلماء کو شامل فرماتے۔ احقر پر اتنی نوازشات وعنایات کی بارش ہوتی رہتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ احقر نے قادیانیوں کی کتب سے بعض نئی باتیں نکالکر پیش کیں، بہت خوش ہوئے اور بار بار عُلماء کو بلا کر دِکھلاتے۔ جب تک احقر مجلسِ مشاورت میں حاضر نہ ہوتا بات شروع نہ فرماتے، تخلیہ میں بھی مشورہ فرماتے اور باصرار فرماتے کہ تیری اس میں کیا رائے ہے؟ بھاولپور شہر میں جامع مسجد و دیگر مقامات پر قادیانیت کے خلاف تقریر کرنے کے لئے علماء کو بھیجتے رہتے تھے، دو دفعہ احقر کو بھی بھیجا، ان ایّام میں اس قدر حضرت کے چہرۂ مبارکہ پر انوارات کی بارش ہوتی رہتی تھی، ہر شخص اس کو محسوس کرتا تھا۔ احقر نے بارہا دیکھا کہ اندھیرے کمرے میں مراقبہ فرما رہے ہیں لیکن روشنی ایسی جیسے بجلی کے قمقمے روشن ہوں، حالانکہ اُس وقت بجلی گُل ہوتی تھی، بھاولپور جامع مسجد میں جُمعہ کی نماز حضرت اقدس ہی پڑھایا کرتے تھے بعد نماز کچھ بیان بھی ہوتا تھا، ہزاراں ہزار کا مجمع رہتا تھا۔ پہلے جمعہ میں فرمایا کہ "حضرات! میں نے ڈابھیل جانے کے لئے سامانِ سفر باندھ لیا تھا کہ یکایک مولٰنا غلام محمد صاحب شیخ الجامعہ کا خط دیوبند موصول ہوا کہ شہادت دینے کے لئے بھاولپور آجائیے۔ چنانچہ اس عاجز نے ڈابھیل کا سفر ملتوی کیا اور بھاولپور کا سفر کیا۔ یہ خیال کیا کہ ہمارا نامۂ اعمال تو سیاہ ہے ہی، شاید یہی بات میری نجات کا باعث بن جائے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جانبدار ہو کر بھاولپور میں آیا تھا۔" بس اس فرمانے پر تمام مجمع

دھاڑیں مار مار کر اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ خود حضرت پر ایک عجیب کیفیتِ وجد طاری تھی۔ ایک مولوی صاحب نے اختتامِ وعظ پر فرمایا، کہ حضرت شاہ صاحب کی شان ایسی ہے، اور آپ ایسے بزرگ ہیں وغیرہ، حضرت فوراً کھڑے ہوگئے۔ فرمایا، حضرات ان صاحب نے غلط کہا ہے ہم ایسے نہیں ہیں بلکہ ہمیں تو یہ بات یقین کے درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ "ہم سے گلی کا کُتا بھی اچھا ہے، ہم اس سے گئے گزرے ہیں" سُبحان اللہ، انکسار اور تواضع کی حد ہوگئی۔

لاہور اسی سفر کے سلسلہ میں دو روز قیام فرمایا تھا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعدِ نمازِ فجر وعظ فرمایا۔ علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور اُن کے ساتھی اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ بیان ہوتا تھا۔

"اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، مالک تعالیٰ سے علاقہ پیدا کرو" غرض حضرتؒ نے خطبہ شروع فرمایا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ الخ وعظ کرسی پر بیٹھ کر فرما رہے تھے، احقر کے دل میں وسوسہ سا گزرا کہ مسجد میں تو شاید کرسی بچھانا سوءِ ادب ہو۔ حضرت نے فوراً خطبہ بند کر دیا، فرمایا کہ "مسجد میں کرسی بچھانا نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مُسلم شریف میں روایت ہے کہ ایک سائل کے جواب دینے کے لئے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لئے مدینہ کے بازار سے کرسی لائی گئی۔ راوی کہتا ہے کہ اُس کرسی کے پائے سیاہ تھے غالباً لوہے کے تھے، مُصلّٰی کے قریب رکھی گئی۔ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اسی پر بیٹھ کر جوابات دئے" یہ فرمایا اور پھر خطبہ شروع فرما کر حضرتؒ نے وعظ کیا۔ احقر ندامت سے پسینہ پسینہ ہوگیا۔

دہر کیف قادیانی مختار نے کہا کہ تحذیر النّاس" میں مولینا محمد قاسم نانوتویؒ نے بھی بعد خاتم النّبیّین نبی کا آنا تجویز کیا ہے۔ فرمایا، جج صاحب لکھئے۔ حضرت مولینا محمد قاسم نے اپنے الہامی مضمون میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النّبیین ہونے کے مُتعلق

دلائل و براہینِ ساطعہ بیان فرمائے ہیں، اور اکثر عبد اللہ بن عباس رضؓ کی علمی توجیہات فرمائی ہیں ان لوگوں پر حیرت ہے جو تحذیر الناس کو بغور و بالاستیعاب دیکھتے نہیں۔ اسی رسالہ میں جا بجا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین زمانی ہونا اور اس کا اجماعی عقیدہ ہونا اور اس پر اپنا ایمان ہونا ثابت فرمایا ہے۔ رسالہ کے صفحہ ۱۰ کی عبارت میں آپ کو لکھوانا چاہتا ہوں، حضرت مولینا فرماتے ہیں :-

"سو اگر اطلاق اور عموم ہے، تب تو ثبوت خاتمیت زمانی ظاہر ہے۔ ورنہ تسلیم لزوم خاتمیت زمانی بدلالۃ التزامی ضرور ثابت ہے، ادھر تصریحات نبوی مثل أَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ او کَمَا قَالَ جو بظاہر بطرز مذکور اسی لفظ خاتم النّبیّین سے ماخوذ ہے، اس بات میں کافی ہے کیونکہ یہ مضمون درجۂ تواتر کو پہنچ گیا ہے اور اس پر اجماع بھی منعقد ہو گیا ہے گو الفاظ مذکور بسندِ تواتر منقول نہ ہوں۔ سو یہ عدم تواتر الفاظ باوجود تواتر معنوی یہاں ایسا ہی ہوگا جیسا تواتر اعدادِ رکعات فرائض و وتر وغیرہ باوجودیکہ الفاظ احادیث مشعر تعدادِ رکعات متواتر نہیں جیسا اُس کا منکر کافر ہے ایسا ہی اُس کا منکر بھی کافر ہوگا۔"

اسی رسالہ کے دوسرے صفحات میں بھی جا بجا حضورؐ کی خاتمیتِ زمانی کا اقرار فرمایا ہے۔ نیز "مناظرۂ عجیبہ" جو صرف اسی موضوع پر ہے اور "بحیاتِ قاسم العلوم"، انتصار الاسلام وغیرہ کُتب مُصنّفہ حضرت نانوتوی رحؒ دیکھنا چاہیئے۔

حضرت مولینا مرحوم حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے لئے تین طرح کی خاتمیت ثابت فرماتے ہیں۔ ایک بالذات یعنی مرتبہ حضورؐ کا خاتمیت ذاتی کا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم وصفِ نبوت کے ساتھ موصوف بالذات ہیں اور انبیاءِ کرام علیہم السلام موصوف بالعرض اور آپ کے واسطے سے۔ جیسا کہ عالمِ اسباب میں موصوف بالنور بالذات آفتاب ہے۔ اس کے ذریعے سے تمام کواکب قمر وغیرہ اور دیگر اشیاء ارضیہ متصف بالنور۔ یہی حال وصفِ نبوت کا ہے

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے متصف بالذات ہیں اور اسی وجہ سے آں حضور کو سب سے پہلے نبوت ملی۔ حدیث میں ہے کنتُ نبیًّا و اٰدمُ منجدلٌ بین الماءِ والطّین اور دوسرے حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام حضور کے واسطہ سے متصف بالنبوۃ ہوئے، حدیث میں ارشاد ہے لو کان موسٰی حیًّا لما وسعہٗ اِلّا اتّباعی اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔" پارہ ۳ کے آخری رکوع میں ارشاد ہوتا ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما اٰتیتکم من کتابٍ و حکمۃٍ ثمّ جاءکم رسولٌ مصدّقٌ لما معکم لتؤمننّ بہٖ ولتنصرنّہٗ الآیہ۔ اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی کریم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسا کہ اس اُمت کے رسول ہیں نبی الانبیاء بھی ہیں، تمام انبیاء علیہم السلام کی جماعت کو ایک طرف رکھا گیا اور نبی کریم کو ایک طرف، اور سب سے حضور پر ایمان لانے اور مدد کرنے کا عہد و پیمان لیا گیا، آیت میں ثمّ جاءکم فرما کر تصریح فرما دی گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ ظہور سب سے آخر میں ہوگا۔

آیتِ میثاق در وے ثم ہست
ایں ہمہ از مقتضائے ختم ہست

ثمّ عربی زبان میں تراخی کے لئے آتا ہے، اسی واسطے علیٰ فترۃٍ من الرّسل الآیہ فرمایا۔ حدیث میں ہے "انا دعوۃ ابی ابراھیم" میں اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہم السلام کی دُعا ہوں۔ تمام انبیاء علیہم السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارات دیتے آئے۔ چناں چہ توریت شریف، انجیل شریف و دیگر صحف میں باوجود تحریف لفظی و معنوی ہو جانے کے اب بھی متعدد آیات موجود ہیں جو حضور کی خاتمیت اور افضلیت کا پتہ دیتی ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ تشریف لاکر اتباعِ شریعتِ محمدیہ کرنا اسی فضیلت اور خاتمیت کا عملی مظاہرہ ہوگا۔ لیلۃ المعراج میں انبیاء

علیہم السلام کا صف بندی کر کے امام کا منتظر رہنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا امامت کرنا بھی اسی امر کی صراحت کرتا ہے۔ واسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا الآیہ بھی اسی کی طرف مشیر ہے کہ لیلۃ المعراج میں انبیاء علیہم السلام کا اجتماع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے ساتھ ہوا۔ اور ابن حبیب عبداللہ بن عباس رض سے راوی ہیں کہ یہ آیۃ لیلۃ المعراج میں نازل ہوئی (اتقان) اور انا خطیبھم اذا انصتوا، اور احادیثِ شفاعت بھی اسی فضیلتِ محمدیہ کا اعلان کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر نبوّت کا اختتام ہوا اور پہلے انبیاء علیہم السلام میں سے کسی نہ کسی کا زندہ رہنا ضروری تھا، تاکہ بطورِ نمائندہ سب کی جانب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے دین کی نصرت کریں۔ چنانچہ عیسٰی علیہ السلام کا انتخاب ہوا، اس لئے کہ آپ انبیاء بنی اسرائیل کے خاتم ہیں اور سلسلۂ اسحاقی اور اسماعیلی کو جوڑ دینا منظور ہے۔ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام نے تین امور کا اعلان فرمایا:-

۱۔ یابنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم "اے بنی اسرائیل! میں فقط تمہاری طرف مبعوث ہو کر آیا ہوں۔"

دوسری جگہ آلِ عمران میں "ورسولاً الی بنی اسرائیل" فرمایا گیا ہے "صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر"۔

۲۔ مصدقا لما بین یدی من التوراۃ۔ "میرے پاس جو کتاب (توریت) ہے اُس کی تصدیق کرنے والا ہوں"۔

۳۔ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد "میں ایک عظیم الشان رسولِ برحق کی خوشخبری سنانے آیا ہوں جو میرے بعد مبعوث ہوں گے اُن کا نام احمد ہے"۔ قرآنِ عزیز اعلان کرتا ہے کہ وہ رسولِ برحق جن کے متعلق عالم ارواح میں انبیاء علیہم السلام سے عہد و پیمان ہوا، اور بشارات دی گئی تھیں آچکا۔ "جاء بالحق وصدق المرسلین"۔ حدیث شریف میں ہے انی اولی

الناس بعیسی بن مریم الخ مجھے عیسیٰ علیہ السلام سے زیادہ قرب ہے بنسبت تمام لوگوں کے اور بلا شبہ وہ نزول فرمائیں گے" انبیاءِ بنی اسرائیل کے آخری نبی اولوالعزم کا خاتم النبیین علی الاطلاق کے دین کی نصرت کے لئے تشریف لانا اور شریعتِ محمدیہؐ پر عمل فرمانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہونے کا عملی مظاہرہ ہے۔ فضیلتِ محمدیہؐ کو دنیا پر واشگاف کر دینا منظور رہے، آپ کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تشریف لانا ایسا ہی ہے جیسے ایک نبی دوسرے نبی کے علاقہ میں چلا جائے۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ حضرت یوسف علیہ السلام کے علاقہ میں تشریف لے گئے تھے۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہی ہوں گے لیکن بہ حیثیتِ حکماً عدلاً تشریف آوری ہوگی بطور ججمنٹ فرمانے کے تشریف آوری ہوگی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قربِ قیامت میں عیسائی اقوام کی مسلمانوں سے مڈبھیڑ رہے گی، لہٰذا اہلِ کتاب کی اطلاع کے لئے تشریف لائیں گے، ثالث وہی ہوتا ہے جو ہر دو فریق کے نزدیک مسلّم ہو۔ ہماری کتابیں عقیدۃ الاسلام تحیۃ الاسلام، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح، اس باب میں دیکھنا چاہئے۔

دوم خاتمیتِ زمانی یعنے آپ کا زمانۂ نبوّت اس عالم مشاہدہ میں تمام انبیاء علیہم السلام کے آخر میں ہے۔ آپ کے بعد کسی کو نبوّت کی تفویض نہ ہوگی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آں حضورؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے ہیں۔ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا عقیدہ اسلام کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔

مرزا غلام احمد نے اجماع کو حجۃ مانا ہے اور اس کے منکر پر لعنت کا اعلان کیا ہے۔ (انجام آتھم ص۱۴۴) مرزا صاحب نے کفار کے تواتر کو بھی حجت مانا ہے چہ جائیکہ تمام امتِ محمدیہ کے تواتر سے ثابت شدہ عقیدہ (تریاق القلوب) حضرت نانوتویؒ نے تیسری خاتمیت مکانیہ ثابت فرمائی ہے یعنی وہ زمین جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوئے۔ وہ تمام زمینوں میں بالاتر اور آخری

ہے اور اُس کے اوپر کوئی زمین نہیں اس کو بدلائل ثابت فرمایا ہے۔

قادیانی مختارِ مقدمہ نے سوال کیا کہ امام مالکؒ سے منقول ہے کہ وہ عیسٰی علیہ السلام کی موت کے قائل ہیں۔ احقر سے فرمایا کہ اُبی کی شرح مسلم شریف نکالو۔ چناں چہ صـ۲۲۶ ج ۱ مطبوعہ مصر سے ذیل کی عبارت پڑھ کر سنائی:-

وفی العتبیۃ قال مالک بینا الناس قیام یستمعون لاقامۃ الصلوٰۃ فتغشاھم غمامۃ فاذا عیسٰی قد نزل الخ۔ عتبیہ میں ہے کہ امام مالکؒ نے فرمایا در آنحالیکہ لوگ کھڑے نماز کی اقامت سن رہے ہونگے اچانک ان کو ایک بادل ڈھانپ لیگا یکایک حضرت عیسٰی علیہ السلام نازل ہو نگے۔"

امام مالکؒ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ساری اُمتِ محمدیہؐ کا اجماعی اور متواتر عقیدہ ہے۔ ہم نے تتبع کیا ہے کوئی تیس اکتیس صحابہؓ احادیثِ نزولِ عیسٰی بن مریم علیہ وعلیہما السلام کے راوی ہیں، تابعین کا تو احصار بھی مشکل ہے۔ امام ترمذیؒ نے پندرہ صحابہ گنوائے ہیں، ہم نے مزید پندرہ کا اضافہ کیا۔ چناں چہ مسند احمد وکنز العمال و دیگر کتبِ حدیث کا مطالعہ کرنے والوں سے مخفی نہیں۔ ہمارے رسالہ "التصریح بما تواتر فی نزولِ المسیح" کا مطالعہ کیا جائے۔

قادیانی نے سوال کیا کہ علماءِ بریلوی، علماءِ دیوبند پر کفر کا فتوٰی دے رہے ہیں اور علماءِ دیوبند علماءِ بریلوی پر۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا کہ "جج صاحب! احقر بطورِ وکیل تمام جماعتِ دیوبند کی جانب سے گزارش کرتا ہے کہ حضرات دیوبند ان کی تکفیر نہیں کرتے، اہلسنت والجماعۃ اور مرزائی مذہب والوں میں قانون کا اختلاف ہے۔ علماءِ دیوبند اور علماءِ بریلی میں واقعات کا اختلاف ہے قانون کا اختلاف نہیں۔ چنانچہ فقہاءِ حنفیہؒ نے تصریحات فرمائی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کلمۂ کفر کسی شبہ کی بناء پر کہتا ہے تو اس کی تکفیر نہ کی جائے گی" دیکھو ردالمحتار اور بحر الرائق۔

حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات

کوندو

دارُالعلوم دیوبند نے ابتداء سے ہی اپنا تعارف ایک مذہبی ادارہ کی حیثیت سے کرایا تھا اور اس نے اپنا نصبُ العین یہی مقرر کیا تھا کہ مُسلمانوں میں اسلامی علوم کی اشاعت کی جائے اور دینی روح کی تربیت کی جائے۔ اس کے بانی اور معاونین بہی خواہوں کا یہ خیال تھا کہ اس دینی ادارے کو ہنگامی سیاست کی سرگرمیوں اور پارٹیوں کی دھڑے بندیوں سے بچا کر خالص دینی خدمت انجام دینے کے لئے وقف کر دیا جائے تاکہ مسلمان اپنے دین اور اس کے احکامات کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زندگی کو اپنے اسلاف کی زندگیوں کا نمونہ بنا سکیں، اور ایک بار پھر اپنے کھوئے ہوئے وِقار کو پا سکیں۔ لیکن سیاسیات سے یہ اجتناب زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور رفتارِ وقت کے تقاضوں کے باعث سیاست کے قدم دارالعلوم میں داخل ہو گئے۔

" مولینا رشید احمد (گنگوہی) اور مولینا محمدؐ قاسم (نانوتوی) یہ وہ حضرات تھے جو حاجی امدادُ اللہ مہاجر مکیؒ کی سرپرستی میں کارہائے عظیم انجام دے چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں عَلَمِ آزادی بلند کر کے شاملی، تھانہ بھون وغیرہ میں انگریزی اقتدار کا مقابلہ کیا تھا۔ ان کے سینوں میں ہمیشہ آزادی اور جہاد کی آگ سلگتی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ میں انگریزی اقتدار کے فنا کر دینے کا جذبہ مستقل طور پر جاگزین ہو گیا تھا۔ [۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو نقشِ حیات، ج ۲، ص ۱۳۵

کیونکہ حضرت شیخ الہند کا اعتقاد تھا کہ انگریز ہندوستان کا سب سے بڑا دشمن ہے اور ہندوستان جو مذہبی اور روحانی ملک ہے انگریز اسے بالکل ناستک اور بے دین بنا کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اور ظلم کرنا انگریز کا شیوہ بن گیا ہے۔

حضرت موصوف چونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے واقعات صغر سنی کی وجہ سے پوری طرح نہیں دیکھ سکے تھے۔ لیکن ایام بلوغت میں اپنے والدین اور اساتذہ خصوصاً مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے وہ انسانیت سوز مظالم اور بربریت کے معاملات سُنے جو انگریزوں نے اہلِ ہند کے ساتھ کئے تھے۔ اس لئے آپ کے دل میں انگریزی حکومت کی نفرت تھی۔

۱۸۵۷ء سے پانچ سال بعد ۱۸۶۲ء میں خاندان ولی اللہؒ کے جانشین اور سید احمد شہیدؒ کے خلفاء نے آزاد سرحد پر باقاعدہ جنگ شروع کی جس کے مقابلہ کے لئے وائسرائے ہند کو بڑی جد وجہد کرنا پڑی۔ ۱۸۶۴ء میں انبالہ کے مقدمہ کے بعد ہی تحریک دار العلوم دیوبند شروع ہو گئی، جو مسلمانانِ ہند کی ایک مہتم بالشان مذہبی علمی اور سیاسی تحریک تھی[1]۔"

آخر ۱۹۱۴ء میں جب سیاسی اشخاص کی گرفتاری اور نظر بندی کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولانا آزاد جیسے اکابر بھی گرفتاری سے نہ بچ سکے۔ ان حالات میں مولانا محمود الحسن کا حکم مولانا عبید اللہ سندھی کے پاس پہنچا کہ: "میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہنچو۔"

چنانچہ ۱۹۱۵ء میں حضرت شیخ الہندؒ تحریکِ آزادیٔ ہند ہی کے سلسلے میں حجازِ مقدس کو روانہ ہوئے تو انگریزوں نے آپ کو گرفتار

---

[1] علماءِ حق ج ۲، ص ۱۷۲

کر کے کئی سال نظر بند رکھا۔ تحریکِ خلافت کے اس دور میں ہجرت کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے قید و بند کی جو مصیبتیں مالٹا میں جھیلیں اس نے دیوبند کے اساتذہ اور طلباء میں خاص طور سیاسی احساسات کو بیدار کر دیا۔

۱۹۱۹ء میں امن و جدو جہد کا آغاز ہوا، تحریکِ حریت کے سلسلے میں خفیہ میٹنگوں کے بجائے کھلے عام جلسے ہونے لگے۔ خلافت کمیٹی وجود میں آئی۔ تحفظِ ملت اور مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے جمعیۃ العلماء ہند قائم کی گئی جس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں لکھنؤ کے مولینا عبدالباری فرنگی محلی کی صدارت میں ہوا۔

۱۳ جون ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے رہائی کے بعد حضرت شیخ الہندؒ دیوبند واپس تشریف لائے جہاں انگریزوں کے ساتھ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت نے آپ کو خاص طور پر سرگرم عمل کر دیا۔

یہاں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ جب مالٹا سے رہا ہو کر حضرتؒ واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترکِ موالات کا مسئلہ زیرِ غور تھا۔ قرار پایا کہ یہ مسئلہ حضرت شاہ صاحبؒ سے تحریر کرایا جائے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہندؒ کی خدمتِ اقدس میں سنایا۔ مولینا لائلپوریؒ فرماتے ہیں کہ "صرف دس بارہ سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہند نہایت محظوظ ہوئے[1]"

مولینا لائلپوری اپنے ایک مضمون "کمالاتِ انوری" مطبوعہ رسالہ "دار العلوم" جولائی ۱۹۶۴ء میں رقمطراز ہیں کہ:-

جب حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ مالٹا سے تشریف لائے تو حضرتؒ کو فکر تھی کہ یہاں کے علماء اختلاف نہ کریں اس لئے سب سے پہلے

---

[1] حیاتِ انور ص ۳۰۸

حضرت شاہ صاحب نے انگریز کی موالات ترک کرنے اور اُن کی ملازمت چھوڑنے پر فتویٰ حاصل کر لیا"۔

بہرحال حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا سے رہائی کے بعد آپ کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور ۳۰ ر نومبر ۱۹۲۰ء کو آپ داعیٔ اجل کو لبیک فرما گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی خدمات کا تذکرہ فرماتے ہوئے شاہ صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "وہ جانبازی جو حضرت شیخ الہندؒ نے دِکھائی ہے وہ تو کوئی کیا دِکھلائے گا، ہاں! حق ضرور واضح کر دینا چاہیئے[۱]"

حضرت شیخ الہندؒ کے خاص فیض یافتوں میں سے مولانا مدنیؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ تو سیاسیین کی صف اوّل میں داخل ہو گئے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ چونکہ اشاعتِ علم دین اور تبلیغ اسلام کو زندگی کا نصب العین بنا چکے تھے اور خالص علمی آدمی تھے اس لئے سیاست کے میدان میں بہت کم نظر آئے لیکن اس کے باوجود ملکی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ مختصر الفاظ میں یوں عرض کیا جا سکتا ہے کہ ملکی سیاست میں آپ بھی اپنے اُستادِ محترم حضرت شیخ الہندؒ کے مسلک کے پیرو اور برطانوی امپریلزم کے سخت ترین مخالف تھے۔ انگریزی حکومت سے آپ کو قلبی تنفر تھا۔ ایک بار لاہور میں علماء سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم لوگوں کو پیٹ کے لئے روٹی بھی دین کے نام پر ہی ملتی ہے۔ آخر تم بھی کچھ کیا کرو۔ میں آج کل اتنا علیل ہوں کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں لیکن پھر بھی اس حالت میں جیل جانے کے لئے تیار ہوں۔

آپ شروع سے آخر تک جمعیۃ علماءِ ہند کی مجلسِ عاملہ کے رکنِ اعلیٰ رہے اور ہمیشہ اپنے گراں قدر اور مخلصانہ مشوروں سے جمعیۃ کی رہنمائی فرماتے تھے۔

۱ھ "دار العلوم" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶ کالم ۱

مولینا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب اکثر آپ سے مشورہ لینے کے لئے خود دیوبند تشریف لاتے تھے۔ جمعیۃ علماء کے علاوہ مجلسِ احرارِ ہند کے حال پر بھی حضرت مرحوم کا گوشۂ چشمِ التفات مبذول رہا اور اس کے قائدین کی بھی حضرت مرحوم نے اپنے علم و فضل اور روحانی قوت سے قیادت و رہنمائی فرمائی اور انہیں انگریزی راج کی مخالفت کے ساتھ ساتھ ردِ قادیانیت کی مہم پر لگا دیا۔ احرار نے اس فتنہ کے استیصال کے لئے قابلِ قدر سرگرمی کے ساتھ جو ناقابلِ فراموش جہاد کیا اس میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ہاتھ نمایاں تھا۔

تحریکِ حریتِ کشمیر میں بھی مجلسِ احرار کو حضرت شاہ صاحبؒ کی تمام تر ہمدردیاں شاملِ حال تھیں۔

جمعیۃ العلماء کی صدارت

۲، ۳ اور ۴ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پشاور میں جمعیۃ علماءِ ہند کا آٹھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمائی اور ایک نہایت بصیرت افروز، معرکۃ الآراء اور تاریخی خطبۂ صدارت ارشاد کیا جس میں بہت سے اہم دینی، شرعی و سیاسی موضوعات پر اپنے مجتہدانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔

یہ وہ زمانہ ہے جب شدھی سنگھٹن اور ہندو مسلم بلووں کے طویل سلسلہ نے پورے ہندوستان کی فضا کو مکدر کر رکھا تھا اور مشہور نہرو رپورٹ نے مسلم لیگ، مجلسِ خلافت اور جمعیۃ العلماءِ ہند اور کانگریس کے درمیان کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ اختلافات کے اس پُر آشوب دور میں حضرت شاہ صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو رہنمایانہ خیالات ظاہر کئے ان کا اندازہ کرنے کے لئے آپ کے اس خطبہ سے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

حُبِّ وطن کی شرعی حیثیت

حضرتِ شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔

"ہندوستان جس طرح ہندوؤں کا وطن ہے اسی طرح مسلمانوں کا بھی وطن ہے۔ ان کے بزرگوں کو ہندوستان آئے

ہوئے اور رہتے ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ انھوں نے اس ملک پر صدیوں حکومت کی۔ آج بھی ہندوستان کے چپہ چپہ پر مسلمانوں کی شوکت و رفعت کے آثار موجود ہیں۔ موجودہ نسل کا خمیر ہندوستان کے آب و گل سے ہے۔ ہندوستان میں ان کی عظیم الشان مذہبی اور تمدّنی یادگاریں ہیں۔ کروڑوں روپے کی جائیدادیں ہیں۔ عالی شان تعمیروں اور وسیع قطعات زمین کے مالک ہیں۔ ان کو ہندوستان سے ایسی ہی محبّت ہے جیسے ایک سچّے محبِّ وطن کو ہونی چاہیئے۔ اور کیوں نہ ہو جب ان کے سامنے اپنے سید و مولا، اپنے محبوب آقا صلّی اللہ علیہ وسلّم کا حُبّ وطن میں اُسوۂ حسنہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ حضورؐ نے کُفّار کے جور و ستم سے مجبور ہو کر حُکمِ خداوندی کے تحت اپنے پیارے وطن مکّہ معظمہ سے ہجرت کے وقت وطنِ عزیز کو خطاب کر کے فرمایا:-

"خدا کی قسم خدا کی تمام زمین میں تو مجھے سب سے زیادہ پیارا شہر ہے اور اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تجھے کبھی نہ چھوڑتا۔"

اس کے بعد جب حکمِ الٰہی سے آپ نے مدینۂ طیّبہ میں سکونت فرمائی اور ہجرت کے بعد دارُالہجرت سے منتقل ہونا محبوب و مستحسن نہ تھا۔ اس لئے گویا مدینۂ طیّبہ آپ کا وطن ہو گیا اور اس میں بحیثیتِ وطن رہنا تھا تو اس کے لئے یوں دُعا فرمائی:-

اللّٰھُمَّ حَبِّبْ اِلَیْنَا المدینۃَ کَحُبِّنَا مکّۃَ اَوْ اَشَدَّ۔ اللّٰھُمَّ بَارِکْ لنا فی صَاعِنا وفی مُدِنا وفی ثَمَرِنا ضِعْفَیْ مَا جَعَلْتَ بمکّۃَ مِنَ البرکۃِ۔ اللّٰھُمَّ اِنَّ ابراھیمَ عبدُكَ وخلیلُكَ دعاكَ لِاَجْلِ مکّۃَ للبرکۃ وَاَنَا مُحَمَّدٌ عبدُكَ وَرَسُوْلُكَ اَدْعُوكَ لِاَھْلِ المدینۃ	بار خدایا! مدینہ کو ہمارے دلوں میں ایسا محبوب بنا دے جیسا ہم مکّہ سے محبّت کرتے ہیں یا اس سے بھی زیادہ محبّت دیدے۔ اے اللہ! ہمارے صاع، ہمارے مُدّ اور ہماری کھجوروں میں مکہ کی برکت سے دوچند برکت عطا فرما۔ خداوندا! آپ کے بندے آپ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آپ سے

اَنْ تبارِكَ لهُمْ فِي مُدِّهِمْ وَصَاعِهِمْ مِثْلَيْ مَا بَارَكْتَ لِاَهْلِ مَكَّةَ مَعَ الْبَرَكَةِ بَرَكَتَيْنِ

مکہ والوں کے لئے برکت کی دُعا کی تھی۔ میں تیرا بندہ اور تیرا رسول محمدؐ ہوں۔ اہلِ مدینہ کے لئے تیری بارگاہ میں دُعا کرتا ہوں کہ ان کے مد اور صاع میں اس برکت سے جو برکت اہلِ مکہ کو عطا فرمائی دوچند برکتیں عطا فرما۔ ایک برکت کے ساتھ دو برکتیں نازل فرما۔"

خطبہ جاری رکھتے ہوئے حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد کیا کہ :-

"سید الکونین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جذباتِ حُبِّ وطن یہ ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے کیا ممکن ہے کہ مسلمان سچا مسلمان ہو کر اس جذبۂ حُبِّ وطن سے خالی ہو۔ اور چونکہ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں ان کو طبعی طور پر اپنے وطن ہندوستان سے محبت ہونی چاہیئے۔ اس لئے تمام ہندوستانیوں کے قلوب میں ہندوستان کی آزادی کی خواہش ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی درجہ پر ہونی لازم ہے۔"

افغانی خطرہ کا حل

حضرت شاہ صاحبؒ نے وضاحت فرمائی کہ :-

"یہ خطرہ کہ آزادی کے وقت اگر کسی مسلمان حکومت نے ہندوستان پر حملہ کیا تو مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ نہایت پست خیال ہے اور اس کا نہایت سیدھا اور صاف جواب یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے ہمسایوں کی طرف سے کسی معاہدہ کی وجہ سے مطمئن ہو گئے اور ہمسایہ کی تعدی کا شکار نہ ہوں گے تو ان کا رویہ اس وقت وہی ہوگا جو کسی شخص کا اس کے گھر پر حملہ ہونے کی حالت میں ہوتا ہے اگرچہ حملہ آور اس کا ہم قوم اور ہم مذہب ہو۔ اس سے زیادہ ایک اور بات

ؔ صاع اور مد پیمانوں کے نام ہیں۔ صاع میں ۴ سیر ۶ چھٹانگ گیہوں آتے ہیں اور مد صاع کا چوتھائی حصہ ہوتا ہے۔

بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جب مسلمانانِ ہندوستان اپنے معاہدہ کی وجہ سے پابند ہوں اور غیر مسلم اقوام سے ان کا معاہدانہ برتاؤ واجب ہو تو ایسی حالت میں کسی مسلمان بادشاہ کو مذہبًا اس کی اجازت نہیں کہ مسلمانانِ ہند کے معاہدے کو توڑے اور ہندوستان پر حملہ آور ہو بلکہ اس پر واجب ہوگا کہ وہ مسلمانانِ ہند کے اس معاہدے کا پورا پورا احترام کرے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

ذمّۃُ المسلمین واحدۃ یسعیٰ بھا ادناھم — مسلمانوں کا عہد اور ذمہ داری ایک ہے۔ ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی کوئی عہد کرے تو دوسروں پر اس کا احترام لازم ہے۔

اسی طرح حضورؐ کا دوسرا ارشاد ہے :-

کُلُّ صُلحٍ جائزٌ اِلّا صُلحًا احلّ حرامًا او حرّم حلالًا — یعنے سوائے اس صلح کے جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کردے ہر قسم کی صلح جائز اور دُرست ہے۔

مخلصانہ یقین دہانی

"میں نہایت بلند آہنگی کے ساتھ برادرانِ وطن کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ مُنصفانہ معاہدہ کرلیں اور اس معاہدہ کو دیانتداری اور خلوص کے ساتھ پورا کریں۔ سیاسی چالوں اور نمائشی پالیسی سے کام نہ لیں تو مسلمانوں کو پورا وفادار مخلص ہمسایہ پائیں گے۔ کیونکہ مُسلمان حکمِ قرآنی کے بموجب معاہدہ پورا کرنے کے ذمّہ دار ہیں۔

ارشادِ خداوندی ہے :-

اِلّا الّذین عاھدتم من المشرکین ثمّ لم ینقصوکم شیئًا ولم یظاھروا علیکم احدًا — جن غیر مسلموں سے تم نے معاہدہ کیا اور انہوں نے ایفائے عہد میں تمہارے ساتھ کمی نہیں کی اور تمہارے خلاف کسی کو مدد نہیں دی تو تم بھی معاہدہ

فاتموا الیہم عہدھم الیٰ مدتہم ان اللہ یحب المتقین۔

کی مدت تک معاہدہ پورا کرو بے شک اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں سے محبت کرتا ہے

وقال ایضاً: اسی طرح فرمایا:

فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین

جب تک غیر مسلم تمہارے ساتھ سیدھے رہیں تم بھی سیدھے رہو۔ بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے"۔

دارالاسلام، دارالحرب یا دارالامان

اس خطبہ میں آپ نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کی عالمانہ وضاحت فرمائی:۔

"اس موقع پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے جس کے پیش نظر نہ رکھنے سے بسا اوقات شدید غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ وہ بات یہ ہے کہ مسائلِ شرعیہ تین قسم کے ہیں۔ اوّل جو اسلامی حکومت اور اسکی شوکت کے ساتھ متعلق ہیں۔ دوسرے جو دارالامان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ تیسرے وہ جو "دارالحرب" میں جاری ہوتے ہیں۔ ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ دارالامان کا حکم دیا جا سکتا ہے۔ دارالاسلام کے احکام جاری ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ہمارے شیخ المشائخ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس سرہ العزیز نے تصریح فرمائی ہے کہ ہندوستان دارالاسلام نہیں ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا فتویٰ اس وقت کا ہے جب موجودہ زمانہ کے لحاظ سے ہندوستان میں اسلامیت کا رنگ بہت گہرا تھا۔

ایسی صورت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم دارالامان کے احکام کتبِ مذہب میں تلاش کریں"۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے خطبۂ صدارت میں حاضرین کی توجہ حضور ؐ کے اس معاہدہ کی بعض دفعات کی طرف مبذول کی جو آں حضور ؐ نے ابتداءِ زمانۂ ہجرت میں باہم مسلمانوں (مہاجرین و انصار) اور یہود مدینہ کے ساتھ کیا تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے معاہدے کے متعدد دفعات کا ترجمہ پیش کرنے کے بعد دار الحرب اور دار الامان کے بہت سے احکام و مسائل اخذ کیے اور ان احکام و مسائل پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد فرمایا کہ "میرا مقصود اس بحث کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ دار الاسلام اور دار الحرب کے احکام کا فرق واضح ہو جائے اور مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں اور ہمسایہ قوموں سے کس طرح اور کتنی مذہبی رواداری اور تمدنی و معاشرتی شرائط پر صلح و معاہدہ کر سکتے ہیں۔"

یہ بیش بہا علمی خطبۂ صدارت ۸۲ صفحات پر شائع ہوا ہے جس میں اس زمانہ کے سیاسیات پر بصیرت افروز مباحث کے بعد صوبۂ سرحد کے بعض مراسم قبیحہ کی اصلاح کے متعلق بھی مفید مباحث ہیں۔ آخر میں عربی قصیدہ ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کے آخری دو[۲] شعر نقل کیے جاتے ہیں:-

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلَّذِیْ
ھَدَانَا لِھٰذَا مُرْشِدًا اَیَّ مُرْشِدٖ
صَلٰوۃٌ وَّتَسْلِیْمٌ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ
خِتَامِ جَمِیْعِ الْاَنْبِیَاءِ مُحَمَّدٖ ؐ

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) [۱] اہلِ علم تفصیل کے لئے درمنتقی کے اس باب کو ملاحظہ فرمائیں جس میں اختلافِ دار کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

[۲] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو خطبۂ صدارت مذکور۔

حضرت شاہ صاحبؒ — آئینۂ کمالاتِ صالحینِ کشمیر

از جناب سید میر قاسم صاحب سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

"حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عقیدت کا یہ گلدستہ ہماری استدعاء پر احترام مآب جناب سید میر قاسم صاحب (سابق وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر) نے عنایت فرمایا ہے۔ جناب سید میر قاسم صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ گذشتہ تیس ۳۰ سال سے آپ سیاسیینِ کشمیر کی صفِ اول میں چلے آرہے ہیں۔ ریاستِ جموں و کشمیر میں آپ قریباً اٹھارہ ۱۸ سال وزیر اور تین ۳ سال ڈھائی ماہ تک (۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء تا ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء) وزیر اعلیٰ کی گدی پر کامیابی اور نیک نامی سے فائز رہے۔ اس کے بعد آپ مارچ ۱۹۷۷ء تک ہند کی مرکزی کابینہ میں سول سپلائز اور امدادِ باہمی کے وزیر رہے۔

خطۂ جنت نظیر کے بہت سے پیچیدہ سیاسی مسائل کی عقدہ کشائی آپ کے ناخنِ تدبیر اور ایثار کی مرہونِ منت ہے۔" (کوندو)

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

کشمیر — رشی بھومی

سرزمینِ کشمیر کو اپنی جن خصوصیات پر فخر ہے اُن میں قدرت اور فطرت کے عطیات بھی ہیں اور اس وادی کے فرزندوں کے ذہنی، علمی اور روحانی کمالات بھی۔ قدیم الایام سے کشمیر کو خدادوست رشیوں اور منیوں کی جائے پناہ کی حیثیت حاصل

رہی ہے۔ ہندوستان کے اِتہاس کے مُطابق زمانۂ قدیم خاصکر ویدک پیریڈ میں بھارت کے جو لوگ خدائی احکام اور معیاری دھرم کی روشنی میں زندگی بسر کرنا چاہتے تھے، وہ اپنی عُمر کے پچیس[25] سال حصولِ علم میں اور دوسرے پچیس[25] سال (یعنی پچاس سال کی عمر تک) گھر بار بسانے میں صَرف کرتے تھے اور اس کے بعد گھر بار، بیوی بچوں اور مال و جائیداد سے قطع تعلق کر کے بقیہ زندگی کو ہمالیہ کے غیر آباد پہاڑوں اور جنگلوں میں تنہا رہ کر یادِ خدا کے لئے مخصوص کر دیتے تھے۔ کشمیر کی سرزمین اُس زمانہ میں غیر آباد اور جنگلوں سے ڈھانپی ہوئی تھی، اس لئے یہ تارکُ الدُنیا سنت سادھو پیر پنجال کو عبور کر کے یہاں پہنچ جاتے تھے اور یکسوئی کے ساتھ عبادت و ریاضت اور تپسیا کے لئے کشمیر کو ہمالیہ کے دوسرے پُر بہار کوہستانوں پر ترجیح دیتے تھے اور کشمیر میں مر جانے کو سیدھا سورگ میں پہنچ جانے کے برابر سمجھتے تھے۔ کشمیر کے شیش ناگ اور امرناتھ جیسے گلیشیروں پر ان کے تیرتھ تھے اور جگہ جگہ سے غاروں میں یا چشموں اور ندی نالوں کے کناروں پر ان رشیوں اور مُنیوں کے عبادت خانے اور مٹھ تھے اور سنسکرت زبان میں وید، اُپنشد اور دوسرے علوم کے پاٹھ شالے تھے، جن کے آثار کہیں کہیں اب تک باقی ہیں۔ بعد میں ان خدادوست لوگوں کے بتائے ہوئے راستوں سے گزر کر کچھ گڈریے، کسان اور دوسرے لوگ بھی آ گئے، جنہوں نے کشمیر کے میدانی علاقوں کو آباد کر کے بستیاں بسائیں اور پھر ایک نئی دُنیا، نئی زبان اور نئے لوگ پیدا ہو گئے جو "کشمیری" کہلائے۔ ویدک دھرم اور اس کے بعد جین دھرم اور بُدھ دھرم کے سادھوؤں، سنتوں، بھکشوؤں

اور مُنیوں نے کشمیر آنے کا برابر تانتا بندھا رہا۔ آبادی کے بعد وادی کا مشہور نام تو "کشمیر" ہی رہا لیکن خدا دوست لوگوں کی محبوب و مرغوب جائے عبادت ہونے کی وجہ سے علمی دنیا میں اس کو "رشی بھومی" یعنے عبادت گذاروں کی سرزمین" کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ "رشی بھومی" وِدوانوں اور عالموں کا ایک ایسا مرکز بن گئی کہ ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں برہمن لوگ جب اپنے چار، پانچ سال کے بچے کو جنیئو (زنار) پہنانے کی رسم ادا کرتے تھے، تو بچّے کی زبان سے کہلواتے کہ "میں علم حاصل کرنے کے لئے کشمیر جاؤنگا"۔ اور چند ایک قدم اس کو شمال کی طرف چلا کر اس قول کو عمل کی صورت دینے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

کشمیر۔ پیرِ واری

تیرہویں صدی عیسوی تک کشمیر کی فضائیں مذہب اسلام کے نام سے ناآشنا تھیں، حالانکہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں تب تک یہ دین دُور دُور تک پھیل چکا تھا اور اس کے پیرو، بادشاہت سے لیکر درویشی اور فقیری تک ہندوستان کی عوامی زندگی کے ہر شعبے میں حصّہ دار بن چکے تھے۔ آخر کار ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں پہلا مسلمان فقیر حضرت سیّد عبدالرحمٰن شرف الدین بُلبل شاہ رحمتہ اللہ علیہ سرینگر میں دریائے جہلم کے کنارے اُترا، اور ایک سہانی صُبح کو اس کی اذانِ سحری نے بادشاہ وقت (مہاراجہ کشمیر گیالپو رِنچن) کے بے چین دل میں تلاشِ حق کی دبی ہوئی آگ کو ہوا دے دی۔ مہاراج نے دریچہ کھولکر دیکھا تو درویش کو نمازِ صُبح میں مصروف اور سر بسجود پایا اور وہ عابد

کی اس ادا پر دِل دے بیٹھا۔ وہ بہادر انسان جو اب تک بڑے بڑے معرکے سر کرچکا تھا اور جس کی خارا شگاف شمشیر کشمیر کے اندرونی و بیرونی سورماؤں سے اپنا لوہا منوا چکی تھی اور جو کشمیر کے سیاہ و سفید کا مختارِ مُطلقُ العنان تھا اُس کو ایک تنہا، نہتے اور غریبُ الوطن فقیر کی نمازِ سراپا گداز نے ہمیشہ کے لئے فتح کیا۔ اور وہ اس مردِ روشن ضمیر کے ہاتھ پر اِسلام قبول کرکے "رِنچن مہاراج" سے "ملک صدرُالدّین شاہ کشمیر" بن بیٹھا۔

مشیّتِ ایزدی کے اس ظہور کے بعد باغِ کشمیر کا دروازہ دُنیا بھر سے آنے والی روحانی ہستیوں، عُلماء و فُضلاء اور اولیاء و اصفیاء کے لئے کھل گیا اور اس کے بعد اس مُلک میں نہ صرف ہندوستان سے بلکہ عرب و عجم ایران و افغانستان، ترکستان و خراسان، کوفہ و بغداد اور بلخ و بخارا وغیرہ ممالک سے فقراء و درویش، عُلماء، وعُرفاء اور خدا دوست لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں وارد ہونے شروع ہوئے۔ حقیقت پوچھو تو یہ وہی سنت، سادھو، یوگی، ریشی اور مُنی تھے جو کئی ہزار سال قبل زبان، لباس اور ناموں کی تفاوت کے ساتھ کشمیر کو "رشی بھُومی" کا لقب دِلوا چکے تھے۔ اب اُن کا قافلہ نئی شکل وصُورت اور نئے ناموں کے ساتھ دوبارہ آرہا تھا، اُن کا کام تو وُہی تھا جو پہلے بھی سرانجام دے گئے تھے یعنی خُدا کا نام بُلند کرنا، سچائی کی حمایت کرنا، نیکیاں پھیلانا، بُرائیوں سے روکنا یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرنا، لیکن نام نئے تھے اور کام کی اصطلاحات جدید تھیں۔ اب کشمیر کے یہ نو وارد حضرات کی جماعت عالم، عابد، عارف، سالک، اہلُ اللہ اور ولیُ اللہ کے

ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ اس لئے اب وادی کشمیر کو بھی "رشی بھومی" کے بدلے "پیر واری" یا "باغِ اہلِ ارشاد و ہدایت" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ چونکہ "انسانی نجات کے بنیادی اصول کی اَقدار"[1] ہمیشہ سے وُہی تھیں جن کی تجدید و اشاعت اسلام کر رہا ہے لہٰذا معنی وُہی پُرانا تھا، اور معنی کی روح بھی پُرانی تھی۔ البتہ مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اِصطلاحات اور الفاظ ضرور نئے تھے اور الفاظ کے انداز بھی نئے تھے۔ کشمیر کے ان نئے فرزندوں نے بھی "رشی بھومی" کو "پیرواری" بنا لینے کے بعد اپنے کمالات کی وجہ سے کشمیر کا نام چاردانگِ عالم میں روشن کیا۔ ان میں سے ایسے بڑے عُلماء فُضلاء، عُقلاء، رشی اور ولی پیدا ہوئے جن کا وجود اولادِ آدم کو اندھیریوں اور ظُلمتوں سے نجات دِلانے کا روشن مینار تھا۔ ابتداء میں قدرتاً یہ لوگ باہر سے تشریف لائے۔ مثلاً حضرت سید عبدالرحمٰن بُلبُل شاہ (م ۷۲۷ھ) جو حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدّین سُہروردی کے خُلفائ میں سے تھے، حضرت میر سیّد علی ہمدانی (م ۷۸۶ھ) جو سلسلۂ کبروی کے تاجداروں میں سے تھے اور آپ کے خاندان کے درجنوں اولیائ و اتقیاء خاصکر حضرت میر محمّد ہمدانی (م ۸۵۴ھ) جنہوں نے حضرت شاہ ہمدان رحمۃ اللہ علیہ کے مشن کی تکمیل کی۔ یہ تو مشہور اولیاء کرام ہیں۔ ان کے دوش بدوش ایسے عالم و فاضل لوگ بھی آئے جن کے اوّلین نمونے میر علی بخاری (م بزمانۂ بڈشاہ) اور محدّث میر رضیُ الدّین (م ۹۵۶ھ) جیسے صدہا علماءِ ربّانی تھے جو اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر کشمیر میں روشنی پھیلانے آئے۔ اس کے بعد خود خاکِ کشمیر سے پیدا ہونے والے بے شمار اولیائ اللہ رشی، مشائخ عارفین، عُلماءِ راسخین اور فُضلاءِ متکلّمین بھی تھے۔ مثلاً حضرت نورالدین ریشی رح (م ۸۴۲ھ)، حضرت شیخ بہاؤالدّین رح (م ۸۴۳ھ)، حضرت بابا سردی ریشی رح

---

1. VALUES OF THE FUNDAMENTAL PRINCIPLES FOR HUMAN-SALVATION.

(م ۹۷۳ھ)، حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۸۴ھ)، حضرت شیخ بابا مسعود نروری (م قریباً ۱۰۱۱ھ) ابو الفقراء حضرت بابا نصیب الدین غازی (م ۱۰۴۷ھ) اور حضرت خواجہ احمد تارہ بلی (م ۱۲۷۸ھ) وغیرہ حضرات سالکین میں سے اور علماء میں سے مُلّا احمد خوش خوان (م قریباً ۸۲۵ھ) اُستاذ العلماء حافظ مُلّا بصیر (م ۹۴۶ھ)، شہیدانِ اعلائے کلمۃ الحق مولانا فیروز گنائی اور مولانا الماس گنائی (م ۹۰۳ھ)، علامہ بابا داؤد خاکی (م ۹۹۴ھ) جامع الکمالات مولانا شیخ یعقوب صرفی مُفسّر و مُحدّث (م ۱۰۰۳ھ) اُستاذ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی، مُلّا جوہر ناتھ مُحدّث (م ۱۰۲۶ھ) مولانا حُسین خبّاز مُحدّث (م ۱۰۵۲ھ) مُلّا شنگرف گنائی مُحدّث (شاگرد حضرت علامہ ابن حجر مکی) مُحدّث حضرت خواجہ حیدر چرخی بن فیروز (م ۱۰۵۷ھ)، مُلّا محمد اشرف چرخی (م ۱۱۲۳ھ)، مُلّا عنایت اللہ شال مُحدّث (م ۱۱۲۵ھ)، مولانا مفتی امان اللہ شہید (م ۱۱۲۵ھ)، مُلّا محسن فانی مُصنّف "دبستانِ مذاہب" (م ۱۰۸۲ھ)، مُلّا ابو الوفا مُفتی (م ۱۱۷۹ھ)، مولانا میر سیّد سعید اندرابی مُحدّث (م ۱۲۸۲ھ)، مُحدّث محمد امین ولی اللہی (م ۱۱۸۷ھ)، شیخ الاسلام مُفتی قوام الدین (م ۱۲۱۹ھ) فخر الواعظین مولانا لسہ بابا صاحب (م ۱۲۶۱ھ)، شیخ طیب بن احمد بن مصطفےٰ رفیقی (م ۱۲۶۶ھ)، قاضی ناصر الدین مُفتی (م ۱۲۹۳ھ) اور میر واعظ مولانا محمد یحییٰ (م ۱۳۰۸ھ) وغیرہ

ان سبھی حضرات کے کمالاتِ علم و عمل کے تذکروں سے کشمیر کی تاریخی کتابیں لبریز ہیں۔

مُحدّثِ جلیل مولانا انور شاہ کشمیری

ماضی قریب میں کشمیر نے ایسی عظیم الشان ہستی کو جنم دیا جس

کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ وہ تھے محدّث جلیل علامہ محمّد انور شاہ کشمیری ؒ۔ حضرت موصوف ایک ایسا آئینہ تھے جس میں زمانۂ سلف کے علماء ربانی اور عرفائے حقّانی کا عکس جمیل یکجا جلوہ گر تھا۔ اہل علم متفق ہیں کہ آپ کے انتقال کے بعد ایسا ہمہ صفت موصوف عالم دین ابھی تک دیکھنے میں نہیں آیا ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

آپ نے ایک طرف علم تفسیر و حدیث اور فقہ میں، دوسری طرف فلسفہ و منطق اور ادبیات عربی میں غرضیکہ قدیم و جدید علوم میں وہ کمالات حاصل کئے تھے جن کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی۔ ذہانت یوں تو کشمیر کے اوسط درجہ کے انسان کے لئے ایک خداداد نعمت ہے۔ مگر شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کی ذہانت آپ کے دل و دماغ کی ایک ایسی روشنی تھی اور ایک قسم کا ایسا قلبی نور تھا جس کو ذہانت کے بدلے فطری اور پیدائشی کرامت کہنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ قدرت کا دوسرا بڑا عطیہ آپ کی محیّر العقول قوت حافظہ تھی کہ جو بات ایک بار کان میں پڑی یا نظر سے گذری اس کا بھول جانا گویا ناممکن ہو گیا۔ ان کمالات کو چمکانے والی صفت آپ کا شوق مطالعہ اور اخذ و حصول علم کا عشق تھا۔ اور سونے پر سہاگہ آپ کا تقویٰ اور وہ للّٰہیت تھی جو آپ کو اپنے اساتذۂ کرام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ (م ۱۳۲۳ھ) اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی ؒ (م ۱۳۳۹ھ) سے وراثۃً ملی تھی۔ یہی وہ اوصاف حمیدہ تھے جن کی بدولت آپ "لولاب" کے ایک گم نام گاؤں "ورنو" سے چلکر دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث کی مسند پر جلوہ افروز ہو گئے اور شرق و غرب سے گوہر علم کے متلاشی حضرت پیغمبر رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کو سمجھنے کے لئے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے لگے اور آپ

کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو وحی آسمانی کی صحیح ترین تعبیر یقین کر کے کاغذوں پر ہی نہیں بلکہ اپنے دل و دماغ کے صفحات پر لکھ کر کے جانے لگے۔

"ولی را ولی می شناسد" کے اصول کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تبحرِ علمی کا اندازہ کرانے کے لئے برِصغیر کے جیّد عالم اور مُفسّرِ قرآن حضرت مولٰنا اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ) نے ایک بار فرمایا تھا کہ اسلام کی حقانیت کی دیگر دلائل میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ مولٰنا انور شاہ مسلمان ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ (م ۱۹۳۸ء) نے فرمایا کہ اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔

شیخ الاسلام مولٰنا سید حسین احمد مدنی (م ۱۳۷۷ھ) نے حضرت شاہ صاحب کی رحلت کے موقعہ پر ایک تعزیتی جلسے میں برملا فرمایا کہ میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالم کہ کتب خانہ کا کتب خانہ جس کے سینے میں محفوظ ہو سوائے حضرت مولٰنا انور شاہؒ کے کوئی نہیں دیکھا۔

الغرض حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بارے میں زمانۂ حاضر کے جید علماء و محدثین کے ان افکار و آراء کا مطالعہ کر کے انسانی ذہن پر ایک ایسا عظیم علمی اور دینی پیکر اُبھرتا ہے جس کی مثال موجودہ نسلِ انسانی کو نہ مل سکے گی۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے علمی مقام کا تعین اور ان کی ہمہ دانی کی نشاندہی کے لئے علوم دینی کے جس ادراک اور فہم رسا کی ضرورت ہے، وہ عصرِ جدید کے بہت ہی کم ارباب علم کے حصے میں آ سکتی ہے!

حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات سرزمین ہندوستان کے لئے اور پورے عالم اسلام

کے لئے موجب افتخار تھی۔ لیکن اہل کشمیر کو حق پہنچتا ہے کہ وہ آپ کے وجود پر زیادہ سے زیادہ جذبۂ فخر و مباہات کا احساس کریں اور کشمیر کی آیندہ نسل کا تو یہ فرض ہے کہ وہ آپکی ذات کو اپنی علمی جد و جہد میں نمونہ بنا کر ترقی کی منازل طے کریں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی اور جہاں بھی کشمیر کے گہوارۂ روحانیت کا تذکرہ کیا جائے گا وہاں اسلام کے اولیاء کرام اور اصفیاءِ عظام کی صف میں وادی کشمیر کے جن علماءِ عاملین کا ذکر خیر آئے گا ان میں حضرت شاہ صاحبؒ کی یادِ جمیل سرِعنوان رہے گی۔ کشمیر کے علماء و شرفاء کا جو تذکرہ شاہ صاحبؒ کے حالات سے خالی ہو گا وہ تذکرہ یقیناً نامکمل سمجھا جائے گا۔

علم و فضل کے اس بحرِ بیکران کے بارے میں خود میری اپنی معلومات محدود ہیں جس کا مجھے افسوس ہے، چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کا زمانہ ہمارے زمانہ سے مسبوق تھا اور ہم براہِ راست اُن کے فیوض سے بہرہ یاب نہ ہوئے۔ لیکن آپ کی ذات کے ساتھ یہ تعلق میرے لئے موجب مسرت رہا ہے کہ میرے والد مرحوم الحاج سید احمد اللہ صاحب براہِ راست آپ کے شاگرد تھے اور اس چشمۂ فیض سے بقدرِ قسمت سیراب ہوئے تھے۔ ہم لوگ اپنے بچپن میں جب کبھی اپنے والدِ ماجد کی زبان سے حضرت شاہ صاحبؒ کے اوصاف جمیلہ سنتے تھے تو اپنے دل میں موصوف کی ذات کے ساتھ ایک نادیدہ تعلق و محبت کا جذبہ اُبھرتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور اب جب ہم آپ کی ذات ستودہ صفات کو مفصل تاریخی حقائق کے پسِ منظر میں دیکھتے ہیں تو وہ جذبہ اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

اہلِ بصیرت کے لئے اُن سخت مشکلات کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں جو صبر آزما تحقیق و تجسّس (RESEARCH) کی رہ نوردی میں ایک سوانح نگار کو حضرت علّامہ کشمیری مرحوم کی کتاب زندگی مِن وعَن پیش کرنے میں پیش آسکتی ہیں۔ خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ آپکے انتقال

پر قریبًا نصف صدی کا زمانہ گذر گیا ہو۔ اور کشمیر میں جن لوگوں نے حضرت موصوف کو دیکھا تھا وہ اس دُنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ باین ہمہ مُشکلات ہمارے ایک فاضل دوست مکرم عبدالرحمان صاحب کوندو نے ہمتِ مردانہ سے کام لیکر آپ کی حیات اور کارناموں پر ایک تحقیقی کتاب لکھنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ کوندو صاحب کی یہ مبارک کوشش اہلِ علم کے ہاں تحسین و تشکّر کی مستحق ہے۔

مؤلفِ موصوف نے اپنی اس کتاب میں ایک حصّہ مُتفرق اہلِ قلم سے حاصل کردہ مضامین و مقالات کے لئے مخصوص کیا ہے۔ آپ نے مجھ سے بھی حیاتِ انوریہ پر لکھنے والوں کے زُمرے میں شرفِ شمولیت حاصل کرنے کی خواہش کی تھی۔ یُوں تو اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کے کثرتِ مشاغل نے میرے لئے ایسے نازک اور صبر طلب موضوع پر قلم اُٹھانا ناممکن بنا دیا ہے اور شاہ صاحب جیسی ہمہ پہلو ہستی پر کوئی مُفصّل مقالہ لکھنے کے لئے جس یکسوئی اور جن شواہد کی ضرورت ہے وہ بھی مفقود ہیں۔ اس کے باوجود عزیز القدر کوندو صاحب کی نیک خواہش کے احترام میں یہ چند سطور سپردِ قرطاس کی گئی ہیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

تحریر سرینگر ۱۲ ار جولائی ۱۹۷۶ء

(دستخط) میر قاسم

حضرت شاہ صاحبؒ کی ظرافتِ طبع

مُرتبۂ کوندو

باوجودیکہ حضرت شاہ صاحبؒ متانت اور سنجیدگی کا پہاڑ تھے لیکن آپ کی لطیف و نفیس طبیعت میں ظرافت اور مزاح کا عنصر بھی موجود تھا اور درس و تدریس کے دَوران کبھی کبھی علمی رموز و دقائق ظریفانہ انداز میں بھی بیان فرمایا کرتے تھے لیکن یہ ظریفانہ تخاطب شرعی حدود و قیود اور آدابِ مجلس تدریسی کی نازک سرحدات سے کبھی مُتجاوز ہونے نہ پاتا۔ آپ مزاح میں عامیانہ پن سے ہمیشہ گریز فرماتے۔ ابتذال اور لایعنی بات کرنے اور سُننے سے سخت احتراز کرتے۔
زیرِ نظر کتاب کے کئی مقالات میں حضرت شاہ صاحب کے تلامذۂ کرام نے اپنے اپنے الفاظ میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ کس طرح حضرت شاہ صاحب کی مجالسِ درس میں ظرافت سے زندگی پیدا ہو جاتی تھی اور کبھی کبھی اس انداز میں بھی آپ کس طرح علوم و معارف کے دقائق بیان فرمایا کرتے تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے ایک ذہین ترین شاگرد خلد آشیاں مولینا مناظر احسن گیلانی[۱] کا ایک بسیط مقالہ "حضرتِ شاہ صاحب کی درسی خصوصیات" کے عنوان سے حیاتِ انور میں شائع ہوا ہے جو تقریباً ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ قلّتِ گنجائش کی وجہ سے یہاں ہم اس بے بہا مضمون کے صِرف حسبِ ذیل اقتباس پر اکتفا کرتے ہیں :۔

---

[۱] حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں مولینا گیلانی صاحب مرحوم کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ موصوف کی علمی شہرت، تصنیفی مہارت، کمال تبحر و ورع اور علوم کی جامعیت سے ایک دُنیا واقف ہے۔ آپ درجنوں عالمانہ کتابوں کے مصنف اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں اسلامیات اور شعبۂ عربی کے سربراہ رہے ہیں :۔

"بظاہر عام مجلسوں اور صحبتوں میں ان پر سکینت و وقار کی خاموشی طاری رہتی لیکن حلقۂ درس میں طیبت و مزاح کا جبلی رجحان ان کا نمایاں ہو جاتا اس وقت ان کی زبان مبارک پر معصومانہ انداز میں بڑے پُر کیف فقرے جاری ہوتے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کرتے کہ جی ہاں ظرافت کی یہ مد وہاں بھی کافی وسیع ہے۔ بڑے صاحب کے یہاں بھی اس کا تماشا پیش ہوگا۔ پھر مثلاً ان حدیثوں کا ذکر فرماتے جن میں آیا ہے کہ قیامت کے دن بعض گنہگاروں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائیگا کہ ان ہی سے ان کے گناہوں کا اعتراف کرا کے حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا کہ ہر وہ گناہ جس کا اس نے اقرار کیا ہے اس کے مقابلہ میں اُسے نیکی کا اجر دیا جائے۔ اقرار کرنے والا گنہگار اس حکم کو سُن کر فرشتوں سے کہے گا کہ ٹھہرو! میرے گناہوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ جب ہر گناہ کے بدلہ میں مجھے نیکی کا اجر دیا جائے گا تو ان گناہوں کو بھی گن لو۔ او کما قال۔

صحیح مسلم ہی کی مشہور حدیث جس میں جنت کے داخل ہونے والے سب سے کمتر درجہ کے آدمی کا ذکر کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ جہنم سے نکلنے کے بعد اپنے سامنے ایک درخت کو پائے گا۔ عرض کریگا کہ اے اللہ! اس درخت کی چھاؤں کے نیچے پناہ لینے کی اجازت دی جائے۔ حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس سے اقرار لیں گے کہ اس سے زیادہ تو اپنے مطالبہ کو تو آگے نہ بڑھائے گا، قسم کھا کر اقرار کریگا کہ بس اس سے زیادہ میں کبھی اور کچھ نہ چاہوں گا۔ اجازت دے دی جائے گی۔ یوں ہی ایک درخت کے بعد اس سے زیادہ گھنا اور بہتر درخت اس کے سامنے آئے گا اور اپنے معاہدہ کو توڑ کر اس کے نیچے جانے کی اجازت چاہے گا۔ تا آنکہ بالآخر سر کتے ہوئے وہ جنت کے دروازے پر پہنچکر جنت میں داخل ہو جانے کی اجازت چاہے گا۔ اس وقت حق سبحانہٗ و تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ:-

مایصرینی منک۔ تجھ سے میرا پیچھا آخر کون چیز چھڑائے گی۔؟

ایک فرمائش کے بعد اس سے زیادہ بہتر فرمائشیں کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ارشاد ہوگا:-

"کیا تو اس پر راضی ہو جائے گا کہ تجھے ساری دنیا اور اس دنیا کے مانند دوسری دنیا دے دی جائے گی۔؟"

تب وہ غریب گنہگار عرض کریگا کہ:۔

یا رب اتستھزء منی وانت رب العلمین۔ اے پروردگار! کیا آپ مجھ سے مذاق کرتے ہیں حالانکہ آپ سارے جہانوں کے مالک ہیں۔؟

حدیث کے راوی صحابی ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اس روایت کو بیان کرتے تو ہنسنے لگتے اور کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی یوں ہی اس حدیث کو بیان کرتے ہوئے ہنسے تھے۔ جب آپ سے ہنسنے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا تھا کہ:۔

"اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے یہ سُن کر کہ سارے جہانوں کے مالک ہو کر مجھ غریب سے مذاق کرتے ہیں۔"

گنہگار کے اس فقرے پر خود اللہ تعالیٰ کو ہنسی آجائے گی۔ اور اس کے بعد اس غریب بندے سے ارحم الراحمین فرمائیں گے کہ "میرے بندے میں تجھ سے مذاق نہیں کرتا لیکن جو میرے جی میں آتا ہے وہ کرتا ہوں۔"

اس حدیث پر پہونچنے کے بعد شاہ صاحب کے جذبات چھپانے کے باوجود چھلک کر باہر آجاتے تھے اور اس قسم کی عام حدیثوں کو "مدِ ظرافت" میں شریک فرما کر آگے بڑھ جاتے۔

اسی سلسلہ میں کبھی کبھی ان پر خاص جذبہ طاری ہوتا طلبہ کی طرف مخاطب ہو کر فرماتے تم سمجھتے ہو کہ میں کوئی بڑا کام کر رہا ہوں۔ حالانکہ جانتے ہو، میری حیثیت بھی وہی ہے جو مدرسہ کے مُنیر خاں[۱] کی ہے۔ مُنیر خاں بھی چکی پیستے ہیں اور میں مُدقّق ہوں۔ دقیق (آٹا) پیستا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔[۲]

---

[۱] مدرسہ کے ایک بوڑھے اَن پڑھ ملازم مُنیر خان تھے اور مسجد کے احاطہ کی طرف دروازے کے پاس ایک جھونپڑے میں مقیم تھے۔ عموماً مدرسہ کے تعمیری کاموں کے لئے چکی میں چونا پیسا کرتے تھے۔ ۱۲ منہ

[۲] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۷۰ – ۷۲

"دورۂ اختتام کی حد پر جب پہونچتا تو اس وقت اپنے خاص انداز میں فرماتے کہ اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ میں مرغوں کا ڈربہ کھولدوں گا۔ یہ مرغے جو ہمارے ارد گرد جمع ہیں ڈربے سے نکلیں گے۔ دیکھتا ہوں کہ بلندیوں پر چڑھ چڑھ کر بازوؤں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے کون بانگ دیتا ہے۔ کس کی آواز کتنی اونچی ہوتی ہے۔ اس قسم کے لطیفوں میں وہ سب کچھ کہدیا کرتے تھے جو کہنا چاہتے تھے"[1]

آگے چل کر مولینا گیلانی صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"شاید ہی کوئی دن ایام درس کے اس طویل عہد میں ایسا گذرا ہو جس میں دلوں کے انبساط و انشراح کا یہ موقعہ اوّل یا آخر یا وسط میں نہ نکل آتا ہو"[2]

درس و تدریس کے دَوران علمی رنگ کا مزاح فرمانے کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولینا طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک عصر مغرب کے درمیان ایک دن بخاری شریف کا درس زور و شور سے ہو رہا تھا۔ احقر بھی اُس سال بخاری میں تھا اور شریک درس بھی تھا کہ اچانک کتاب بند کردی اور فرمانے لگے کہ جب بھائی شمس الدین ہی رخصت ہو گئے تو اب درس کا کیا لطف رہا۔ جاؤ تم بھی گھر کا رستہ لو۔

ہم سب حیران ہوئے کہ کون بھائی شمس الدین اور وہ آئے کب تھے۔؟ اور رخصت کب ہو گئے؟

ہماری حیرانی کو دیکھ کر سورج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو غروب ہو رہا تھا، فرمایا کہ "جاہلین! دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین جا رہے ہیں۔

اب کیا اندھیرے میں سبق پڑھو گے؟ کیا وہ لطف کا سبق ہوگا؟"

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۴۷
[2] ایضاً ص ۵۷

(۲) ایک بار پچھلی صف میں سے کسی طالبعلم نے سوال کیا مگر مہمل انداز سے۔ فرمایا کہ "جاہل ب تجھے معلوم نہیں کہ میں اسناد متصل کرنا بھی جانتا ہوں۔ جانتا ہے کس طرح اسناد متصل ہوگی؟ میں اپنے پاس والے کو تھپڑ ماروں گا وہ اپنے پاس والے کو مارے گا، وہ اپنے پاس والے کو رسید کریگا۔ یہاں تک کہ تھپڑ کا بر فعلی سلسلۂ سند تجھ تک پہونچ جائے گا۔"

یہ تہدید بھی تھی اور حکیمانہ رنگ سے فنی اصطلاحات میں ایک مزاح بھی تھا۔ جس سے طلبہ کی تنشیط (نشاط میں لانا) مقصود تھا۔ (حیاتِ انور ص ۲۲۱)

☆

یہ ذہن تھا یا مینارۂ حفظ و ضبط و استحضار؟

(مرتبہ: کوندو)

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحبؒ کو غیر معمولی قوتِ حافظہ اور محیر العقول استحضار سے سرفراز فرمایا تھا۔ جو ایک مرتبہ دیکھ لیا یا سُن لیا تھا وہ ضائع ہونے سے محفوظ و مامون ہو گیا۔ آپ کا علم اتنا وسیع اور قوتِ حافظہ ایسی تیز اور خارقِ عادت تھی کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اسی لیے ان کے اکابر معاصرین ان کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کو خداداد کرامت قرار دیتے تھے اور آج تک بھی ان کا حافظہ زبان زدِ خلائق ہے۔
ایک ایک کتاب کے اگر پانچ پانچ یا دس دس حواشی بھی ہوتے تو وہ حضرت کو یاد ہوتے تھے۔ حوالہ ہائے کتبِ صحیحہ بقیدِ جلد و صفحات آپ کو ایک ہی دفعہ کے مُطالعہ سے محفوظ ہو جاتے تھے اور جس وقت کسی اہم علمی مسئلہ پر تقریر فرماتے تو بے شمار کتابوں کے حوالے بلا تکلُّف دیتے چلے جاتے تھے۔ احادیث کا تمام ذخیرہ اور ان کی صحت اور عدم صحت کے متعلق لمبی و عریض بحثیں، رُواۃ کے مدارج و مراتب اس طرح محفوظ تھے کہ طلبۂ حدیث اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے وجود سے ایک مکمل لائبریری کا کام لیتے اور ایسے سوالات کا جواب منٹوں میں حاصل کر لیتے جن کی تحقیق و جستجو کے لئے ایک پوری عمر درکار ہے۔ پھر ہر جواب میں جامعیت اس قدر ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کسی کتاب کو خواہ وہ مطبوعہ ہو یا قلمی، دیکھنے کی ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ مشہور و معروف کتب خانوں کی اکثر مخطوطات (قلمی کتابیں) آپ کی نظر سے گذر چکی تھیں اور اس طرح محفوظ تھیں کہ گویا آج ہی ان کا مُطالعہ کیا ہے۔ آخر عمر میں بھی جبکہ دیگر قوائے جسمانی اضمحلال پذیر ہو رہے تھے) بفضلِ ایزدی حضرت شاہ صاحبؒ کا حافظہ بدستور قابلِ رشک تھا۔

مولانا سراج احمد رشیدی کا بیان

مولانا سراج احمد صاحب رشیدی مرحوم (استاذ سننِ ابی داؤد) کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ "ایک شخص نے کعبۃ اللہ کے پردوں کو پکڑ کر دعا کی کہ خداوند تعالیٰ! مجھے ابنِ حجرؒ کا سا علمِ حدیث عطا فرما۔ اس کی دعا قبول کی گئی۔" مولانا رشیدی کہتے تھے کہ میں سمجھا کہ شاہ صاحب کسی دوسرے کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اس وقت یہ خیال نہ گذرا کہ یہ ان کی اپنی ہی حکایت ہے۔ کچھ دیر بعد سمجھا کہ یہ واقعہ حضرت شاہ صاحبؒ ہی کا ہے۔[۲]

حضرت شاہ صاحب کے متعدد تلامذہ کا بیان ہے کہ درس وتدریس کے دوران جب کبھی حسبِ ضرورت کتاب کھولتے تو عموماً وہی صفحہ کھلتا جس پر وہ حدیث ہوتی جس کا آپ کو حوالہ دینا ہوتا تھا، اگر اصل صفحہ نہ بھی کھلتا تو یا تو وہ دو چار صفحے پہلے ہوتا یا دو چار صفحے بعد۔ اور انہیں تقریباً چالیس پچاس ہزار عربی کے اشعار زبانی یاد تھے۔ جب کبھی تشریح کے طور پر وہ کوئی شعر بطور حوالہ پڑھنا چاہتے تو صرف اُس ایک شعر کے پڑھنے پر اکتفا نہ کرتے جس کا حوالہ دینا چاہتے تھے بلکہ پوری کی پوری نظم پڑھ ڈالتے۔ سالم نظم میں بیس بیس پچیس پچیس اشعار ہوتے تھے اور آپ نہایت روانی کے ساتھ ان کو پڑھتے چلے جاتے تھے۔

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے حافظہ کے بارے میں کتبِ تاریخ و سِیَر میں کچھ حیرت انگیز واقعات پڑھنے میں تو آجاتے ہیں مثلاً حضرت قتادہؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت اصمعیؒ وغیرہ کی غیر معمولی قوتِ حافظہ کی اکثر جگہ تعریف کی گئی ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ اُس زمانے میں

---

[۱] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ علم حدیث اور حفظِ حدیث میں یگانۂ زمانہ تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ حافظ ابن حجر کے بے حد مداح تھے۔ حضرت کے اکابرین نے انہیں حفظِ حدیث میں حافظ ابن حجر عسقلانی ہی سے تشبیہ دی ہے چنانچہ علامہ عثمانیؒ نے تقریرِ تعزیت میں فرمایا کہ "آج حافظ ابن حجر کا انتقال ہوا ہے - الخ" کو ثر ...   [۲] حیاتِ انور ص ۱۵

کتابیں نایاب تھیں اس لئے لوگوں کو اپنے حافظہ پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کا قدرتی اور لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حافظہ میں غیر معمولی جلا پیدا ہو جاتی تھی، لیکن آجکل کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے، کروڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ علم سینہ اور دماغ کے بجائے کتابوں میں منتقل ہو کر رہ گیا ہے۔ ان حالات میں اس انفرادیت کے ساتھ اس قسم کا حافظہ واقعی اللہ تعالیٰ کی بے شمار عنایات اور نشانیوں میں سے ایک نشان تصوّر کیا جا سکتا ہے۔ سچ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی قوّتِ حافظہ اُن منکرینِ حدیث کا جواب بھی جو محدّثین کے حافظہ کو اپنے کمزور حافظے پر قیاس کر کے اُن پر اعتماد نہ کر کے ذخیرۂ حدیث کو مُشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔

بہرحال حافظہ اور استحضار کے لحاظ سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی ذات ستودہ صفات ایتٌ مِن ایاتِ اللہ تھی۔ اگر اُنہیں اپنے وقت کا امام زہریؒ کہا جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ اتنا عمدہ تھا کہ جو بات ایک دفعہ اُن کے کان میں پڑ گئی وہ کسی طرح نہ بھولتے تھے، اس لئے وہ جب مدینہ منوّرہ کے بازاروں سے گذرتے تو کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے کہ مبادا بازار کی خرافات اُن کے دماغ پر نقش نہ ہو جائے۔

مولانا محمد ادریس صاحب سکھروڑوی کا فرمانا بجا ہے کہ دراصل حضرت شاہ صاحب کا حفظ و ذکاء حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص موہبت تھی۔ صدیوں ہی میں کوئی ہستی ایسی پیدا ہوتی ہے۔ ہزاروں صفحات کی کتاب ایک مرتبہ دیکھ لینے کے بعد پھر ہاتھ میں نہیں اُٹھاتے تھے اور سالہا سال کے بعد جب بھی اُس کتاب میں کسی مسئلہ کا حوالہ دینا چاہتے تو چند منٹ میں اُس مسئلہ پر اُنگلی رکھ کر فرما دیتے کہ "یہ ہے"۔ نہ اُس کی کوئی یادداشت کہیں لکھی ہوتی اور نہ کہیں نوٹ ہوتا اُس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ ابھی کچھ مدّت پہلے یہ کتاب نظر سے گذری ہے اور مُستحضر ہے اور کتاب کے دائیں بائیں صفحات خیالِ مُبارک میں موجود ہیں۔
مناظرہ و مباحثہ کی کسی مہم میں حضرت شاہ صاحب کی معیت ایک ضخیم کُتب خانہ کی

معیت کا کام کرتی تھی۔ ہر فن میں جامعیت اور پورا اقتدار شاہ صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور حفظ و ذکاء کا حصہ وافر عطا کیا تھا[1]

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

زیر نظر کتاب کے کئی مقالات میں حضرت شاہ صاحبؒ کے غیر معمولی حافظہ کے متعلق متعدد واقعات کا ذکر موجود ہے۔ ان میں سے چند واقعات یہاں موضوع کی مناسبت کی وجہ سے اختصار کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لائے گئے اور ان کے علاوہ مزید کچھ واقعات بھی ذیل میں درج کئے گئے جن کا ذکر پیش نظر کتاب میں نہیں ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کا بیان

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

حضرت شاہ صاحب درس میں جب مسائلِ خلافیہ پر کلام فرماتے تو جابجا شیخ ابن ہمام کی تحقیقات کو مع نقض اور ابرام کے ذکر فرماتے۔ ایک مرتبہ بطورِ تحدیث بالنعمۃ فرمایا کہ "میں نے تمام فتح القدیر (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے) کا تقریباً چھبیس ۲۶ روز میں مطالعہ کیا اور اب چھبیس ۲۶ سال گذر گئے اور مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو مضمون بیان کروں گا، اگر تم اس کی مراجعت (اصل سے مقابلہ) کرو گے تو ان شاءاللہ بہت کم تفاوت پاؤ گے۔"

مولانا ادریس صاحبؒ نے مزید لکھا ہے کہ:۔

"حالانکہ فتح القدیر نہایت دقیق اور غامض کتاب ہے جو فقہ اور اصولِ فقہ کے دقائق اور غوامض پر خصوصاً اور اصولِ حدیث کے مشکلات پر عموماً مشتمل ہے۔ ایسی دقیق کتاب کا چھبیس ۲۶ روز میں مطالعہ غیر معمولی فہم اور خداداد نورِ فراست کی دلیل ہے اور پھر مدۃ العمر اس کا بلا مراجعت استحضار، قوتِ حافظہ کی کمال کی دلیل ہے۔[2]

[1] حیاتِ انور ص ۳۴۳-۳۴۴ [2] حیاتِ انور ص ۱۱۸

جزئیاتِ فقہ نہ صرف فقہ حنفی کی بلکہ ائمہ اربعہ اور دوسرے ائمہ کی بھی بہت زیادہ آپ کو محفوظ تھیں۔ کمالِ حافظہ کی وجہ سے صحاحِ ستہ کے علاوہ دیگر کتب مبسوطہ احدیث مطبوعہ و قلمی آپ کو ازبر تھیں۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ نے فرمایا ہے کہ "مجھ سے حضرت شاہ صاحب فرماتے تھے کہ جب میں کسی کتاب کا سرسری نظر سے مطالعہ کرتا ہوں اور اس کے مباحث کو محفوظ رکھنے کا ارادہ بھی نہیں ہوتا۔ پھر بھی پندرہ ۱۵ سال تک اس کے مضامین مجھے محفوظ رہ جاتے ہیں"۔ [۱]

سرعتِ مطالعہ کا یہ عالم تھا کہ مسند احمد (مطبوعہ مصر) کے روزانہ دو سو صفحات کا مطالعہ فرمایا۔ اس طرح کہ پوری دقتِ نظر اور کامل غور و فکر کے ساتھ اس کی اسانید اور مشکلات کو حل کرتے جاتے تھے۔ [۲]

حافظہ کے بارے میں کشمیر کا واقعہ

حضرت شاہ صاحبؒ کے وسعتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ پر مندرجہ ذیل واقعہ سے بھی روشنی پڑتی ہے:۔

کشمیر میں ایک دفعہ علماء کے درمیان اختلاف ہوا اور ہر ایک کا جواب دوسرے کے مخالف رہا۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحبؒ بھی کشمیر تشریف لائے۔ فریقین شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوئے اور دونوں نے مختلف فیہ مسئلہ کو آپ کے سامنے پیش کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا محمد یوسف بنوری کو حکم دیا کہ اس کا جواب لکھو۔ اس فتویٰ پر ایک فریق نے "فتاویٰ عماریہ" کے ایک قلمی نسخہ سے اپنے استدلال میں ایک عبارت پیش کی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مولانا محمد یوسف صاحب سے فرمایا کہ میں نے فتاوای عماریہ کے مخطوطہ کا دار العلوم کے کتب خانہ میں مطالعہ کیا ہے۔ اس میں یہ عبارت ہرگز موجود نہیں یہ لوگ تصحیف کر رہے ہیں یا تدلیس۔ اس پر

[۱و۲] حیاتِ انور ص ۱۲

حاضرین متحیر ہوئے اور مستدلین مبہوت ہو کر رہ گئے۔ [1]

مولانا منظور نعمانی کے واقعات

حضرت مولانا منظور صاحب نعمانی اپنے مقالہ میں حضرت شاہ صاحب رح کے حافظہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"ایک دفعہ میں حضرت شاہ صاحب رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور ترمذی شریف کی ایک عبارت کا میں نے حوالہ دیا اور عرض کیا کہ اس عبارت میں یہ اشکال ہے بہت غور کیا لیکن حل نہ ہو سکا۔

فرمایا ــــــ "مولوی صاحب! آپ کو یاد نہیں رہا، مجھے خوب یاد ہے جس سال آپ دورہ [2] میں تھے اس موقع پر میں نے بتایا تھا کہ یہاں ترمذی کے اکثر نسخوں میں ایک غلطی واقع ہو گئی ہے لیکن لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں اور انہیں پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ جو اشکال آپ کو پیش آیا سب کو پیش آنا چاہئیے۔

پھر فرمایا ــــ صحیح عبارت اس طرح ہے :-

بس سارا اشکال جس نے چکر میں ڈال رکھا تھا ایک منٹ میں رفع ہو گیا۔

اللہ اکبر! یہ بات بھی یاد رہتی تھی کہ فلاں سال اس موقع پر سبق میں یہ بات بتلائی تھی۔

ایک واقعہ اور سنیئے! سورۂ نساء کے سولہویں اور سترہویں رکوع کی آیتیں چوری اور دھوکہ بازی کے ایک خاص واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ اس واقعہ کو امام ترمذی نے بھی روایت کیا ہے۔ مجھے طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک خاص مسئلہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑی کہ کس سنہ میں یہ واقعہ پیش آیا اور یہ آیتیں نازل ہوئیں؛ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں جو تفسیریں مجھے ایسی ملیں جن میں آیات سے

---

[1] حیاتِ انور ص ۱۳

[2] دورۂ حدیث دار العلوم دیوبند میں علم حدیث کا درجۂ اعلیٰ۔

متعلق روایات کو جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ میں نے اُن سب کو دیکھ ڈالا مگر واقعہ کا زمانہ اور سنہ مجھے کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ عاجز آ کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے فلاں واقعہ کے سنۂ وقوع کی تلاش ہے۔ کتابوں میں دیکھا مگر مجھے نہیں ملا۔

فرمایا "کون کون کتابیں آپ نے دیکھیں؟" میں نے تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر و معالم وغیرہ چند تفسیروں کے نام لئے۔ فرمایا دُرِ منثور میں نہیں دیکھا۔؟" میں نے عرض کیا کہ دُرِ منثور کا نسخہ اس وقت کتب خانہ میں موجود نہیں تھا۔ کہیں عاریت میں گیا ہوا ہے۔ اس لئے اس کو تو نہیں دیکھ سکا۔

فرمایا، "جاؤ اُس میں دیکھ لو، اُس میں مذکور ہے۔"

چناں چہ تلاش کر کے دُرِ منثور کو دیکھا تو ابن سعد کی ایک روایت میں یہ صریح الفاظ موجود تھے:۔

"وکان ذلک فی شھر ربیع سنۃ اربع"

"کہ یہ واقعہ ماہ ربیع ۴ھ میں پیش آیا۔"

گویا جو چیز بھی کسی کتاب میں کبھی حضرت نے دیکھی تھی وہ حافظہ کے خزانہ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھی۔[1]

مولینا لائلپوری کا بیان

مولینا محمد صاحب انوری لائلپوری مقدمۂ بہاولپور کی پیروی کے سلسلہ میں شب و روز ۱۹ یوم تک حضرت کے ساتھ رہے اور حضرت شاہ صاحبؒ نے ان کو مختارِ مُقدمہ بنوا دیا تھا۔ نیز حضرت کے عدالتی بیان میں جس قدر حوالجاتِ کتُب کی ضرورت پیش آتی تھی وہ بھی مولینا موصوف ہی نکالکر پلیش کرتے تھے، جن کو حضرت خود پڑھ کر جج صاحب کو سُناتے تھے۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو پیش نظر کتاب میں مولینا نعمانی صاحب کا مقالہ

[2] ملاحظہ ہو نُطقِ انور حصۂ اول ص ۲۴۔

اس سلسلے میں مرحوم مولینا لائل پوری حضرت شاہ صاحبؒ کے حافظہ کے مُتعلق یوں رقمطراز ہیں :-

"حضرت کا حافظہ اس وقت قابلِ دید و شنید تھا، جب حوالہ دیتے، کتاب کھولتے ہی فوراً اُنگلی مُبارک عبارت پر ہوتی، زج صاحب! لکھئے۔

"عبارت یہ ہے"۔ بعض دفعہ احقر کو فرماتے کہ عبارت نکال کر دے، تاکہ دِکھاؤں، بعض دفعہ صفحہ بھی ارشاد فرماتے الخ" [1]

فقہ حنفی کی کتاب نور الایضاح کا واقعہ

امامُ العصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کی حیرت انگیز قوّتِ حافظہ سے متعلّق مشہور واقعہ ہے کہ ممدوح نے مِصر کے کسی کُتب خانہ میں فقہ حنفی کی کتاب "نور الایضاح" کا مطالعہ کیا اور اسی مُطالعہ کی بُنیاد پر ہندوستان آکر اسے طبع کرایا۔[2]

لنگڑے اور لولے کا واقعہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے خود ایک بار فرمایا ہے کہ :-

"میں نے اپنے وطن کشمیر میں سُنا تھا۔ اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے، انہوں نے اس کی ایک مثال بھی دی، ایک نے کہا کہ جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لولے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لئے گئے، اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کے توڑنے سے معذور۔ آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا، اندھا اس کو لے کر درختوں کی طرف چلا۔ لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا۔[3]

[2] یہ واقعہ مشہور تو ہے لیکن غالباً اسکی شہرت غلط ہے۔ کسی قابلِ اعتماد ذریعہ سے نہیں سُنا گیا۔ قابلِ قبول بھی نہیں ہے۔ (حضرت مولینا محمد منظور نعمانی مدظلہ)

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۳۲۲ [3] اتنے میں اگر باغبان آگیا تو وہ دونوں ہی کو گرفتار کریگا اور دونوں کو سزا کا مستحق قرار دیگا۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے، بدن بغیر روح کے جمادِ محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے۔ لہٰذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہونگے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے۔ پینتیس ۳۵ برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علّامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبداللہ بن عبّاس رضؓ سے مروی ہے، دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا۔ [1]

علّامہ عثمانی کا واقعہ

مولینا محمد ادریس صاحب سکھروڑوی کا بیان ہے کہ:۔

حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی رحؒ جس زمانے میں قرآن پاک کے فوائد تحریر فرما رہے تھے یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دار العلوم دیوبند کو چھوڑ کر مقام ڈابھیل (سورت) میں حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولینا شبیر احمد صاحبؒ وغیرہ تشریف لے گئے تھے اور اسی مقام ڈابھیل میں فوائدِ قرآن پاک کی تکمیل ہوئی۔

حضرت مولینا شبیر احمد صاحبؒ کی عادت تھی کبھی کبھی فوائد کے متعلق مزید تسکینِ خاطر و توثیق کے پیشِ نظر فوائد کے مُتعلّق لِکھا ہُوا حضرت شاہ صاحبؒ کو سُنا دیا کرتے تھے اور اگر کوئی اِشکال ہوتا تو دریافت بھی فرما لیا کرتے تھے۔

جِس دِن حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات کا تار ڈابھیل پہنچا تو حضرت شبیر احمد صاحبؒ پر بے صبری اور غم کے آثار زیادہ نُمایاں تھے، بے ساختہ چیخیں اور دہاڑے مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے آہ! ہمارے لئے موجبِ تسکین و طمانیت کون ہے، کِس کے پاس جا کر اب تسکینِ خاطر

---

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری مطبوعہ دار المامون قاہرہ ۱۳۵۷ھ جلد ۴ ص ۱۱۵

کریں گے، کس سے اپنے علمی اشکالات حل کرائیں گے؛ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو غم و رنج کا پہاڑ مولینا شبیر احمد صاحبؒ پر گرا ہے وہ غم و رنج کسی دوسرے کو نہیں۔

بہرحال بعدِ وفات ہی یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب میں فوائد (فوائد التنزیل) لکھتے لکھتے اِن آیات پر پہنچا جو حضرت داؤد علیہ السلام کے قصّہ میں ہیں۔

"وَھَلْ اَتَاكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ الخ" (صٓ آیت ۲۱-۲۵)

حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کی تقسیم یوں کر رکھی تھی۔ ایک دن لوگوں کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا۔ ایک دن اپنے اہل وعیال کے لئے، ایک دن اللہ کی عبادت کرنا۔ جس دِن اللہ کی عبادت کرتے مکان بند کر دیا جاتا اور دربان پہرہ دیتے تھے تاکہ عبادتِ الٰہی میں کسی قسم کی کھنڈت نہ ہو۔ عبادت کے دن ہی یہ واقعہ پیش آیا کہ جب ان انتظامات کے ساتھ عبادت میں مشغول تھے کہ ناگاہ کئی شخص دیوار پھاند کر اُن کے پاس آکھڑے ہوئے، داؤد علیہ السلام باوجود اپنی قوّت و شوکت کے یہ ماجرا دیکھ کر گھبرا اُٹھے کہ یہ آدمی ہیں یا اور کوئی مخلوق؟ آدمی ہیں تو ناوقت آنے کی ان حالات میں جرأت کیسے ہوئی؟ دربانوں نے کیوں نہیں روکا۔ اگر دروازے سے نہیں آئے تو اتنی اونچی دیوار پھاند کر آنے کی کیا سبیل کی ہوگی؟ خدا جانے ایسے غیر معمولی طور پر کس نیت اور کس غرض سے آئے ہیں؟ غرض اچانک یہ عجیب و مہیب واقعہ دیکھ کر خیال دوسری طرف ہٹ گیا اور عبادت میں جیسی یکسوئی کے ساتھ مشغول تھے، قائم نہ رہ سکی۔ ان آیات کی تفسیر میں عام مفسّرین متاخرین نے اسرائیلیات سے کچھ ایسے واقعات لکھے ہیں جو ایک نبی کی شایانِ شان نہیں بلکہ ایک اچھے آدمی کے متعلق بھی مناسب نہیں خیال کئے جاتے۔ چہ جائیکہ داؤد علیہ السلام جیسے نبی کے متعلق ان

باتوں کا تصوّر کیا جا سکے۔ مفسّرینِ متأخرین یہ لکھتے ہیں کہ داؤد علیہ السّلام کی ننانوے بیبیاں تھیں، اس کے باوجود داؤد علیہ السّلام نے ایک پڑوسی کی بیوی کو اپنے نکاح میں لیا، اس پر متنبّہ کرنا مقصود ہے اور اس کے حاصل کرنے کے جو طریقے و واقعات لکھے ہیں وہ ایک صحیح طریق پر چلنے والے انسان کے لئے نامناسب اور صحیح سمجھ والے کے لئے ناقابلِ تسلیم۔ ان آیات میں داؤد علیہ السّلام کو اُن کے اس فعل پر متنبّہ کرنا ہے۔ متقدمین مفسّرین اور ائمہ حدیث ان متاخرین کے درجِ ذیل آیات واقعات کو یہ کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ اسرائیلیات میں بیان کردہ ہیں جن کی کوئی سند نہیں اور نہ ہی یہ قصّے تسلیم کے قابل ہیں۔ اور کوئی بات متقدمین کے یہاں ایسی نہیں ملتی جس سے یہ اِشکال حل ہو سکے کہ آخر ان انتظامات کے باوجود کہ دربان مقرر ہیں، مکان بند ہے، کوئی راہ اندر آنے کی نہیں، اچانک دیوار پھاند کر چند آدمی کیوں آئے اور اس قصّے میں غرض کیا ہے؟ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں پندرہ دِن اِن آیات کے متعلّق تفتیش و تحقیق میں سرگردان اور پریشان رہا۔ جہاں تک امکان میں تھا، قدیم و جدید تفسیریں اور شروح حدیث کو چھان مارا اور کوئی بات ایسی قابلِ تسکین نہ ملی جس سے یہ خلش دور ہوتی کہ بالآخر یہ ایسا کیوں ہوا کہ جس سے داؤد علیہ السّلام کی عبادت میں رخنہ اندازی ہوئی اور عبادت میں یک سوئی نہ رہ سکی۔ حضرت شاہ صاحب اُس وقت بیمار تھے، بیماری کا خیال کر کے حضرت شاہ صاحب کے پاس جاتے ہوئے ہچکچاتا تھا، جب دیکھا کہ کوئی صورت تسلی و اطمینان کی نہیں اور ان آیات کے تحت لکھوں تو کیا لکھوں؟ کام لٹکا ہوا ہے، ناچار حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا کہ مجھے پندرہ دِن تفسیروں کے اوراق گردانتے ہوئے ہو گئے مگر ان آیات کا کوئی حل نہیں ملتا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا، بے شک ان آیات میں اِشکال ہے، البتہ میری نظر سے ایک حدیث گذری ہے جو مستدرک حاکم میں ہے۔ ضعف ہی کی حالت میں مستدرک اُٹھائی اور دو چار ہی منٹ میں کچھ ورق اُلٹ پلٹ کر اُنگلی رکھ کر ایک حدیث بتلائی اور فرمایا کہ اس حدیث

ہیں اُن آیات کے متعلق حل نکلتا ہے۔ میں نے حدیث پڑھی، پیچھے سے کچھ ورق دیکھے کہ دیکھوں داؤد علیہ السلام کے متعلق کوئی باب ہو، کچھ نہ ملا اور نہ حدیث کو دیکھ کر کوئی بات سمجھ میں آئی۔ حضرت شاہ صاحبؒ تو صرف اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو گئے کہ "یہ حدیث ہے اور اُس میں اُن آیات کے متعلق جو اشکال ہے اُس کا حل ہے"۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس کتاب کو لے جاؤں۔ فرمایا "لے جائیے اور دیکھ لیجئے"۔ میں کتاب لیکر اپنی جگہ آیا اور غور کیا تو مطلب کو پا لیا۔ حدیث کا مضمون یہ ہے، جس کو مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ نے فوائد میں نقل کیا ہے:۔

"ہمارے نزدیک اس قصہ میں اصل بات وہ ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے یعنی داؤد علیہ السلام کو یہ ابتلاء ایک طرح کے اعجاب کی بناء پر پیش آیا، صورت یہ ہوئی کہ داؤد علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا کہ "اے پروردگارا! رات دن میں کوئی ساعت ایسی نہیں جس میں داؤدؑ کے گھرانے کا کوئی نہ کوئی فرد تیری عبادت (یعنی نماز یا تسبیح وتکبیر) میں مشغول نہ رہتا ہو۔ یہ اس لئے کہا کہ انہوں نے روز و شب کے ۲۴ گھنٹے اپنے گھر والوں پر نوبت بہ نوبت تقسیم کر رکھے تھے، تا کہ اُن کا عبادت خانہ کسی وقت عبادت سے خالی نہ رہنے پائے اور بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں عرض کیں (شاید اپنے حسنِ انتظام وغیرہ کے متعلق ہونگی) اللہ تعالیٰ کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ ارشاد ہوا کہ " داؤد! یہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے۔ اگر میری مدد نہ ہو تو اس چیز پر قدرت نہیں پا سکتا، (ہزار کوشش کر کے نہیں نبھا سکتا) قسم ہے اپنے جلال کی میں تجھ کو ایک روز تیرے نفس کے سپرد کر دوں گا! (یعنی اپنی مدد ہٹا لوں گا، دیکھیں اُس وقت تو کہاں تک اپنی عبادت میں مشغول رہ سکتا اور اپنا انتظام قائم رکھ سکتا ہے") داؤد علیہ السلام نے عرض کیا، اے پروردگار مجھے اس دن کی خبر کر دیجئے۔ پس اسی دن فتنہ میں مبتلا ہو گئے۔

(اخرج هذا الاثر الحاكم فى المستدرك وقال صحيح الاسناد واقره الذهبى فى التلخيص)

یہ روایت بتلاتی ہے کہ فتنہ کی نوعیت صرف اسی قدر ہونی چاہیئے کہ جس وقت داؤد علیہ السلام عبادت میں ملوں باوجود پوری کوشش کے مشتغل نہ رہ سکیں اور اپنا انتظام قائم نہ رکھ سکیں۔ چنانچہ آپ پڑھ چکے کہ کس بے قاعدہ اور غیر معمولی طریقے سے چند اشخاص نے اچانک عبادت خانہ میں داخل ہو کر حضرت داؤد علیہ السلام کو گھبرا دیا، اور ان کے شغلِ خاص سے ہٹا کر اپنے جھگڑے کیطرف متوجہ کر لیا، بڑے بڑے پہرے اور انتظامات اُن کو داؤد علیہ السلام کے پاس پہنچنے سے نہ روک سکے۔ تب داؤد علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اللہ نے میرے اس دعوے کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا کیا۔"

اس سے آگے مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے لفظِ فتنہ کی تفسیر میں مزید کچھ لکھا ہے جو ان آیات کے فوائد دیکھنے سے متعلق ہے۔ مولانا موصوف نے جب حضرت شاہ صاحبؒ کی بتلائی ہوئی حدیث سے یہ فوائد لکھ لئے تو حضرت شاہ صاحبؒ کو سنائے جس کی حضرت شاہ صاحبؒ نے تصویب کی اور فرمایا حدیث کا یہی مضمون ہے اور اُن آیات کے درج ذیل یہی مناسب ہے۔

مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے حضرت شاہ صاحب کے حفظ و ذکاء کی دو چیزوں کی داد دی اور فرمایا کہ اس حفظ کا کیا ٹھکانا کہ اتنی بڑی ضخیم کتاب سے ایک دو منٹ میں چند ورق اِدھر اُدھر کر کے حدیث پر انگلی رکھ کر بتلا دی، گویا ابھی حال ہی میں دیکھی ہے، خدا ہی جانتا ہے کب دیکھی ہوگی، حضرت شاہ صاحب کی عادت تھی، کتاب ہاتھ میں اٹھائی اوّل سے آخر تک دیکھتے رہے جب تک ختم نہ کر لیتے چھوڑتے نہیں تھے۔

مستدرک غالباً تین چار سال پہلے زمانۂ قیام دار العلوم میں دیکھی تھی اور فرمایا کہ ذکاوت اور سرعتِ انتقالِ ذہنی پر غور کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کتاب دیکھتے دیکھتے جب حدیث سامنے آتی ہے تو فکر کس سرعت سے اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق آیات

میں مفید طلب ہوگی۔ (جن کی تفسیر میں حضرت مولینا شبیر احمد صاحبؒ جیسے عالم کو پندرہ دن سرگرداں و پریشان رہنا پڑا۔ ؎

مولینا طیب صاحب کا بیان

مولینا طیب صاحب کا بیان ہے کہ "حضرت شاہ صاحب کی غیر معمولی قوتِ حافظہ سے محفوظِ سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ انہیں غیر متداول بلکہ غیر معروف کتُب کی عبارتیں بھی اس درجہ مستحضر رہتی تھیں کہ وقت پڑنے پر بے تکلف پیش کر دیا کرتے تھے اور علماء حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے تھے۔"

اس سلسلے میں اپنے مقالہ "نور الانور" میں مولینا موصوف نے دو واقعات کا خصوصی طور ذکر کیا ہے۔

پہلا واقعہ طویل ہونے کی وجہ سے، ہم اپنے الفاظ میں مختصر کر کے اس طرح عرض کرتے ہیں کہ مولینا طیب صاحب کو اپنی ایک تصنیف میں ابن الحسن کذاب کے سوانح حیات کی ضرورت تھی۔ انہیں جب اس بارے میں کہیں معلومات نہیں ملے تو عاجز آ کر حضرت شاہ صاحبؒ سے ماخذ دریافت کئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے متعدد کتابوں کے حوالے دے دئے کہ ان میں ابو الحسن کذاب کے حالات مل جائیں گے، مولینا طیب صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! میں کہاں کہاں تلاش کرتا پھروں گا۔ آپ خود ہی کچھ فرما دیں۔ میں آپ ہی کا حوالہ دیکر اسے جزوِ کتاب بناؤں گا۔ اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے برجستہ ابو الحسن کذاب کے سنِ ولادت سے لیکر سنِ وفات تک کے اس سلسلے کے اجمالی حالات ترتیب وار بیان فرمائے اور اس کے کذب و زور کے متعدد واقعات سنائے۔

؎ ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص، ۳۴ تا ۳۵۲ مقالہ مولینا محمد ادریس صاحب سکروڈوی۔

مولانا طیب صاحب کا بیان ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ شاید حضرت شاہ صاحب نے ابھی حال ہی میں یہ حالات مطالعہ کئے ہیں۔ چناں چہ جب میں نے حضرت سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا! نہیں مولوی صاحب! قریباً تیس سال کا عرصہ ہوا، جب مصر جانا ہوا تھا وہاں کے ایک کتب خانہ میں اتفاق سے اسی ابوالحسن کے حالات پر ایک کتاب ہاتھ میں آگئی۔ روا روی میں اس کا بھی مطالعہ کیا اور اب آپ کے دریافت کرنے پر من وعن مستحضر ہو گئے۔[1]

جہاں تک دوسرے واقعہ کا تعلق ہے اسے ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں من وعن درج کرتے ہیں۔ چناں چہ مولانا طیب صاحب مدظلہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"تحریکِ خلافت کے دور میں جب امارتِ شرعیہ کا مسئلہ چھڑا تو مولوی سبحان اللہ خان صاحب گورکھپوری نے اس مسئلہ میں اپنے بعض نقاطِ نظر کی تائید میں بعض سلف کی عبارت پیش کی جو اُن کے نقطۂ نظر کی تو مؤید تھی مگر مسلکِ جمہور کے خلاف تھی۔ یہ عبارت وہ لے کر خود دیوبند تشریف لائے اور مجمع علماء میں اُسے پیش کیا۔ تمام اکابرِ دار العلوم حضرت شاہ صاحب کے کمرہ میں جمع تھے۔ حیرانی یہ تھی کہ نہ اس عبارت کو رد ہی کر سکتے تھے کہ وہ سلف میں سے ایک بڑی شخصیت کی عبارت تھی اور نہ اُسے قبول ہی کر سکتے تھے کہ مسلکِ جمہور کے صراحتاً خلاف تھی۔ یہ عبارت اتنی واضح اور صاف تھی کہ اسے کسی تاویل و توجیہہ سے بھی مسلکِ جمہور کے مطابق نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب استنجا کے لئے تشریف لے گئے ہوئے تھے۔

---

[1] ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب میں مولانا طیب صاحب کا مقالہ۔ و مکاتیب طیب جلد اوّل ص ۳۵

وضوء کر کے واپس ہوئے تو اکابر نے عبارت اور مسلک کے تعارض کا تذکرہ کیا اور یہ کہ ان دونوں باتوں میں تطبیق و توفیق بھی نہیں پڑتی۔ حضرتِ ممدوح حسبِ عادت "حسبنا اللہ" کہتے ہوئے بیٹھ گئے اور عبارت کو ذرا غور سے دیکھ کر فرمایا کہ اس عبارت میں جعل اور تصرف کیا گیا ہے اور دو سطروں کو ملا کر ایک کر دیا گیا ہے۔ درمیان کی ایک سطر چھوڑ دی گئی ہے، اسی وقت کتب خانہ سے کتاب منگائی گئی، دیکھا گیا تو واقعی اصل عبارت میں سے پوری ایک سطر درمیان سے حذف ہوئی تھی، جوں ہی اس ساقط کردہ سطر کو عبارت میں شامل کیا گیا عبارت کا مطلب مسلکِ جمہور کے موافق ہو گیا اور سب کا تحیّر رفع ہو گیا۔

(ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص۲۲۹۔ ص۲۳۰)

حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ

مرتبۂ کوندو

علامۂ جلیل حضرتِ شاہ صاحبؒ کے شاگردوں کا حلقہ اتنا وسیع ہے کہ آج تک کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہ کر سکا کہ اس منبع علم و فضل سے کتنے طالبانِ علمِ دین مستفیض ہوئے۔ دار العلوم دیوبند میں حضرتؒ نے لگ بھگ اٹھارہ سال تک درس و تدریس کا کام جاری رکھا اور ایک محتاط اندازہ کے مطابق دو ہزار کے قریب تشنگانِ علم ان سے بلاواسطہ مستفید ہوئے۔ بعد ازاں کئی سال تک جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درس و تدریس کے کام کو جاری رکھا اور یہاں بھی ایک کثیر تعداد نے ان سے استفادہ کیا۔ اسی طرح بارہ مولہ کشمیر کے مدرسۂ فیضِ عام اور دہلی کے مدرسۂ امینیہ میں بھی بے شمار طالبانِ علم کو سرفراز فرمایا۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی ذاتِ گرامی جو بلا مبالغہ "آیتٌ مِن آیاتِ اللہ" تھی، کو یہ خصوصیت و امتیاز بھی حاصل تھا کہ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں جن سعادت مندانِ ازلی کو شامل رہنے کا موقع ملا وہ اپنے وقت کے بہترین رجالِ علم و عمل سمجھے گئے اور انھوں نے دین و شریعت سے لیکر ادب و سیاست تک کے میدان میں عوام و خواص کی نمایاں اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔ حضرتؒ کے ارشد تلامذہ کی ایک بڑی تعداد انکی زندگی ہی میں دین و سیاست، علم و ادب اور ملی رہنمائی کی مسندوں پر جلوہ فرما تھی اور حضرتؒ کے انتقال کے بعد برصغیر ہند و پاک اور دوسرے ممالکِ

اسلامیہ میں اشاعت و تبلیغِ علومِ اسلامیہ کی خدمت کا بڑا حصّہ ان ہی کے شاگردوں سے انجام پایا۔ آج بھی خدائے رحیم و کریم کے فضل سے حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں کی کمی نہیں ہے۔ اور انہیں علم و فضل اور دینی زندگی کے ایک معیار کی حیثیت حاصل ہے۔ قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح، احیاءِ اسلام اور اماتتِ کفر کی جو خدمت جس بھی صاحب سے پوری ہو رہی ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگردوں میں سے ہے۔ متعدد حضرات ایسے بھی ہیں جو گمنامی کے گوشوں میں چھپکر خاموش طریقے سے دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس علم و فن کے بحرِ ذخار سے فیض یافتہ چند ممتاز شاگرد ایسے بھی ہیں جو پورے عالمِ اسلام میں نہ صرف معروف و مقبول ہیں بلکہ ان کی بقاء سے دنیاءِ اسلام کا دل و دماغ معطر اور پُر کیف بنا ہوا ہے۔

ذیل میں ہم حضرت مرحوم کے شاگردوں کی ایک مختصر اور نا تمام فہرست پیش کرتے ہیں۔ اس فہرست میں خوفِ طوالت سے صرف ان حضراتِ علماء کے اسماءِ گرامی درج کئے گئے جن کی خدمات نے نمایاں شہرت حاصل کی ہے۔

۱۔ حضرت مولانا فخرالدین احمد شیخ الحدیث، مرکزِ علومِ اسلامیہ دارالعلوم دیوبند (دورۂ حدیث شریف آپ نے اگرچہ حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ سے پڑھا ہے لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے بھی اتنا علمی استفادہ کیا ہے کہ آپ کے تلامذہ کی صف میں سب سے اوّل نمبر پر آپ کا شمار کیا جا سکتا ہے۔)

۲۔ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ، مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

۳۔ مجاہدِ ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق جنرل سکرٹری جمعیۃ العلماء ہند، دہلی۔

۴۔ شیخ الادب حضرت مولینا محمد اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ
سابق نائب ناظم تعلیمات دار العلوم دیو بند۔
۵۔ شیخ الحدیث حضرت مولینا حبیب الرحمٰن صاحب مئو ناتھ بھنجن
ضلع اعظم گڈھ یو۔پی۔
۶۔ حضرت مولینا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ناظم اعلیٰ ندوۃ المصنفین دہلی۔
۷۔ حضرت مولینا بدر عالم صاحب مرحوم مہاجر مدنی مؤلف "فیض الباری"
نزیل مدینۂ منورہ۔
۸۔ حضرت مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی رح۔ سابق صدر شعبۂ دینیات
حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی و مؤلف سوانح قاسمی۔
۹۔ حضرت مولینا محمد بن موسیٰ میاں سملکی قدس سرہٗ العزیز، افریقہ۔
بانی مجلس علمی ڈابھیل
۱۰۔ حضرت مولینا محمد ادریس صاحب کاندہلوی رح
سابق شیخ الحدیث و صدر جامعہ اشرفیہ لاہور (پاکستان)
۱۱۔ حضرت مولینا مفتی محمد شفیع صاحب دیو بندی رحمہ اللہ سابق مفتی دار العلوم
دیوبند۔ و مفتی اعظم پاکستان و شیخ الحدیث دار العلوم کراچی۔
۱۲۔ حضرت مولینا محمد صدیق صاحب مرحوم نجیب آباد، مؤلف انوار المحمود۔
۱۳۔ حضرت مولینا قاضی سجاد حسین صاحب صدر المدرسین، مدرسہ عالیہ
فتح پوری دہلی۔
۱۴۔ حضرت مولینا پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی دامت برکاتہم
سابق صدر شعبۂ دینیات (سنی) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
ایڈیٹر ماہنامہ "برہان" دہلی۔
۱۵۔ حضرت مولینا سید محمد یوسف صاحب بنوری سابق شیخ الحدیث دار العلوم الاسلامیہ

نیو ٹاؤن کراچی پاکستان۔ مؤلف و مصنف "نفحۃ العنبر" (م ۱۹۷۷ء)

۱۶۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سکھروڈوی، سابق مدرس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل سورت۔

۱۷۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی سابق ناظم جمعیۃ علماء ہند دہلی۔ (م ۱۹۷۵ء)

۱۸۔ حضرت مولانا محمد چراغ صاحب گوجرانوالہ۔

۱۹۔ حضرت مولانا احسان اللہ خان صاحب تاجور، لاہور۔

۲۰۔ حضرت مولانا سید امین الحق صاحب مردانی

۲۱۔ حضرت مولانا غلام مرشد صاحب مفسر و محدث حال خطیب شاہی مسجد لاہور۔

۲۲۔ حضرت مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی۔

۲۳۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی۔ مجلس احرار کے قائد اعظم۔

۲۴۔ حضرت مولانا حمید الدین صاحب فیض آبادی شیخ الحدیث مدرسۂ عالیہ کلکتہ۔

۲۵۔ حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحب نانوتوی۔ مفتی مدھیہ بھارت (مہوکینٹ) رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند۔

۲۶۔ حضرت مولانا حامد الانصاری صاحب غازی سابق مدیر "مدینہ" بجنور یوپی رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند۔

۲۷۔ حضرت مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ۔ سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۲۸۔ حضرت مولانا سلطان محمود صاحب سرحدی سابق صدر مدرس مدرسۂ فتحپوری دہلی۔

۲۹۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی۔ سنبھل (مراد آباد)

۳۰۔ حضرت مولانا نور الدین صاحب بہاری مشہور کانگریسی رہنما۔

۳۱۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی۔

۳۲۔ حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔

۳۳۔ حضرت مولانا محمد صاحب انوری لائلپوری مرحوم

سابق مہتمم مدرسۂ تعلیم الاسلام سنت پورہ، لائل پور پاکستان

۳۴۔ حضرت مولانا غلام غوث صاحب سرحدی، ناظم جمعیۃ علماء (پاکستان)

۳۵۔ حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحب کامل پوری محدث، حضرو ضلع کیمبلپور (پاکستان)

۳۶۔ حضرت مولانا شائق احمد صاحب مدیر "عصر جدید" (کراچی)

۳۷۔ حضرت مولانا قاری اصغر علی صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

۳۸۔ حضرت مولانا عبد الحق صاحب نافع سابق استاد دار العلوم دیوبند۔

۳۹۔ حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

۴۰۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر مدرس مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

۴۱۔ حضرت مولانا فیض اللہ صاحب مفتی مدرسہ معین الاسلام ہاٹ ہزاری چاٹگام۔

۴۲۔ حضرت مولانا محمد طاہر صاحب قاسمی مرحوم سابق ناظم دار الصنائع دار العلوم دیوبند

۴۳۔ حضرت مولانا عبد اللہ خان صاحب بجنوری۔

۴۴۔ حضرت مولانا سید اختر حسین صاحب مدرس دار العلوم دیوبند۔

۴۵۔ حضرت مولانا یعقوب الرحمٰن صاحب عثمانی۔

سابق ناظم جمعیۃ الطلبہ دار العلوم دیوبند۔

۴۶۔ حضرت مولانا احمد نور صاحب سابق استاذ دار العلوم دیوبند و مدرسۂ شاہی مراد آباد وغیرہ۔

۴۷۔ حضرت مولانا فیوض الرحمٰن صاحب دیوبندی پروفیسر اورنیٹل کالج لاہور۔

۴۸۔ حضرت مولانا عبد الحنان صاحب ہزاروی جامع مسجد صدر راولپنڈی۔

۴۹۔ حضرت مولانا اسماعیل یوسف گارڈی جوہانسبرگ (ٹرانسوال) جنوبی افریقہ۔

۵۰۔ شیخ الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتحپوری۔

۵۱۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سرگودھا۔

۵۲۔ حضرت مولانا جمیل الدین صاحب میرٹھی جامعہ اسلامیہ بہاولپور۔

۵۳۔ حضرت مولانا محمد الیوب صاحب اعظمی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت

۵۴۔ حضرت مولانا احمد اشرف صاحب جامعہ اشرفیہ راندیر ضلع سورت

۵۵۔ حضرت مولانا محمد عرفان صاحب ہزاروی، خلافت کمیٹی صوبۂ سرحد کے روحِ رواں اور علی برادران کے دستِ راست۔

۵۶۔ حضرت مولانا عبد العزیز صاحب بہاری سابق صدر جمعیۃ علماء بمبئی۔

۵۷۔ حضرت مولانا سید نثار احمد صاحب انوری لہریا سرائے ضلع دربھنگہ۔

۵۸۔ حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمی استاذ دار العلوم دیوبند۔

۵۹۔ حضرت مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحب مرحوم دیوبند۔ (حضرت شاہ صاحبؒ کے برادرِ نسبتی)

۶۰۔ حضرت مولانا حکیم محبوب الرحمٰن صاحب بجنور۔

۶۱۔ حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب مؤلف "انوار الباری"۔ مکتبۂ ناشر العلوم، بجنور یو، پی۔

۶۲۔ حضرت مولانا محمد امین صاحب استاذ حدیث دار العلوم مئو اعظم گڈھ۔

۶۳۔ حضرت مولانا ریاست علی صاحب جبل پور۔

۶۴۔ حضرت مولانا آلِ حسن صاحب رضوی دیوبندی مقیم میرٹھ۔

۶۵۔ حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مدرسۂ مظہر العلوم کرتپور، ضلع بجنور۔

۶۶۔ حضرت مولانا ابو احمد عبد اللہ صاحب لدھیانوی، دار العلوم نعمانیہ گوجرانوالہ۔

۶۷۔ حضرت مولانا ظہور احمد صاحب دیوبندیؒ سابق استاذ دار العلوم دیوبند۔

۶۸۔ حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانوی، استاذ دار العلوم دیوبند۔

۶۹۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب راولپنڈی پاکستان۔

۷۰۔ حضرت مولانا انوار الحسن صاحب شیرکوٹی مرحوم۔

۷۱۔ حضرت مولانا حشمت علی صاحب سہارنپوری۔

۷۲۔ حضرت مولانا عبد الوحید صاحب پرتاپ گڈھ (یو۔پی)

۷۳۔ حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب مرحوم (بی، ایس، سی، ایم، بی، بی، ایس) سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۷۴۔ حضرت مولانا حکیم سعد اللہ صاحب ناظم دار العلوم مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ
۷۵۔ حضرت مولانا محمد صادق صاحب صدر مدرس بڑودہ گجرات۔
۷۶۔ حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب انوری ضلع بیر بھوم۔
۷۷۔ حضرت مولانا مفتی اسماعیل محمود بسم اللہ صاحب مرحوم۔
سابق مفتی و مہتمم جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت۔
۷۸۔ حضرت مولانا محمود احمد صاحب ضلع دربھنگہ (بہار)
۷۹۔ حضرت مولانا حکیم عبد الاول صاحب اجراڑہ ضلع میرٹھ۔
۸۰۔ حضرت مولانا افتخار علی صاحب خیر نگر بازار میرٹھ۔
۸۱۔ حضرت مولانا اسماعیل کاچھوی صاحب مرحوم جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ)
۸۲۔ حضرت مولانا صالح ابن محمد منیجرا جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ)
۸۳۔ حضرت مولانا ایم۔ آئی نانا صاحب جوہانسبرگ (جنوبی افریقہ)
۸۴۔ حضرت مولانا ابو الوفاء صاحب شاہ جہاں پوری۔ مشہور و معروف خطیب و مناظر۔
۸۵۔ حضرت مولانا ڈاکٹر مصطفےٰ حسن صاحب علوی، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی و ممبر
مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند۔
۸۶۔ حضرت مولانا موسیٰ بھام جی صاحب (افریقہ)
۸۷۔ حضرت مولانا مفتی ابراہیم صاحب سنجالوی (افریقہ)
۸۸۔ حضرت مولانا ڈی۔ ای، بیرا صاحب (افریقہ)
۸۹۔ حضرت مولانا حکیم عبد الجلیل صاحب دہلوی۔ پروفیسر جامعہ طبیہ قرولباغ دہلی۔
۹۰۔ حضرت مولانا عبد القیوم صاحب آروی، سید پور ضلع رنگپور (بنگلہ دیش)
۹۱۔ حضرت مولانا لطف اللہ صاحب پشاوری۔
۹۲۔ حضرت مولانا عبد الحی حقانی مدیر "نصرت" حقانی چوک رام باغ کراچی۔
۹۳۔ حضرت مولانا عبد القیوم صاحب خطیب جامع مسجد ہری پور ہزارہ۔
۹۴۔ حضرت مولانا مظفر الدین صاحب مراد آبادی۔

۹۵- حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب سلطان پوری
اُستاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ

۹۶- حضرت مولانا عبدالصمد صاحب منگلور۔

۹۷- حضرت مولانا فصیح الدین صاحب بہاری۔

۹۸- حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب (برما)

۹۹- حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مدظلہٗ ۔خطیب جامع مسجد چاٹگام۔

۱۰۰- حضرت مولانا احمد علی صاحب گجراتی (ایم۔ اے) گوجرانوالہ

۱۰۱- حضرت مولانا محمد یوسف شاہ صاحب مرحوم سابق میر واعظ کشمیر
مترجم قرآن شریف (بزبانِ کشمیری) و مصنفِ "تنویرُ المصابیح"۔

۱۰۲- حضرت مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابی مرحوم۔
سابق پروفیسر اورینٹل کالج لاہور و سابق استاذ دارالعلوم دیوبند وغیرہ۔

۱۰۳- حضرت مولانا عبدالکبیر صاحب مرحوم سابق پرنسپل مدینۃ العلوم حضرت بل سرینگر کشمیر

۱۰۴- حضرت مولانا سید محمد یوسف شاہ صاحب وترہ ہیلی مرحوم
سابق پرنسپل نورِ اسلام اورینٹل کالج "سری نگر کشمیر۔

۱۰۵- حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مرحوم ساکن کریری۔
تحریکِ حُریّتِ کشمیر کے اوّلین مجاہد اور مسلم کانفرنس کے سرکردہ رُکن۔

۱۰۶- حضرت مولانا محمد عبدالقدوس صاحب ساکن وُن گام بڈگام۔ حال مفتی اعظم مظفر آباد۔

۱۰۷- حضرت مولانا سیف اللہ شاہ صاحب مرحوم (برادرِ اصغر حضرت شاہ صاحبؒ) لولاب کشمیر۔

۱۰۸- حضرت مولانا غلام مصطفےٰ صاحب مسعودی کشمیری۔ (سابق ایم، ایل، اے)

۱۰۹- حضرت مولانا مفتی محمد اسرائیل صاحب مرحوم سابق مفتی اعظم ضلع مظفر آباد

۱۱۰- حضرت مولانا سید احمد اللہ صاحب مرحوم۔ مشہور مفتی دین و مبلغ اسلام علاقۂ
ڈورو شاہ آباد (اسلام آباد) کشمیر

خوف طوالت اور قلت گنجائش کی وجہ سے ہم نے صرف ایک سو دس

تلامذۂ کرام کے اسماءِ گرامی پر مشتمل فہرست درج کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ ورنہ میسّر شدہ معلومات کی روشنی میں یہ فہرست کافی طویل ہو جاتی اور اگر ہر اسمِ گرامی کے ساتھ حالاتِ زندگی، دینی خدمات اور تصانیف و تراجم کا تذکرہ بھی کیا جاتا تو یہ فہرست بجائے خود ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لیتی۔

جن حضراتِ علماء کے اسماءِ گرامی ہم نے یہاں درج کیے ان میں چند ایسے صاحب منبعِ علم و عمل بھی ہیں جن کو حضرت مولینا سید سلیمان ندوی مرحوم نے "دائرۂ علم" (Encyclopaedia) سے تعبیر کیا ہے۔[1]

حضرت شاہ صاحبؒ کے سعادتمند شاگردوں میں اگرچہ بشتر داعئ اجل کو لبیک فرما چکے تاہم کارہائے نمایاں کی انجام دہی کی وجہ سے وہ بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔

اَلنَّاسُ مَوْتٰی وَاَھْلُ الْعِلْمِ اَحْیَاءٌ[2]

جو حضرات اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں، ان کے حق میں ہم بجز "رَحِمَهُمُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً" اور جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم سے بقیدِ حیات ہیں اُن کے حق میں ماسوائے "مَدَّ ظِلُّهُمُ الْعَالِي"، "دَامَتْ فُیُوضُهُمْ"، "زِیْدَ مَجْدُهُمْ" اور "بَارَكَ اللّٰهُ فِي عِلْمِهِمْ وَعَمَلِهِمْ" وغیرہ کے کیا دُعاء کر سکتے ہیں۔

ꙮ

---

[1] ملاحظہ ہو: "یادِ رفتگاں" طبع کراچی ۱۹۵۵ء ص ۵۲ھ

[2] ترجمہ: لوگ مرتے ہیں اور اہلِ علم زندہ ہیں۔ فرمودۂ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ۔

حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

مُرتبۂ کوندو

(۱) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہ العزیز قرآن وحدیث اور فقہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے سب سے بڑے اُستاذ تھے لیکن وہ اس کے باوجود مسائل مُشکلہ شاہ صاحب سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ "تمہاری اس مسئلہ میں کیا رائے ہے؟" اور کبھی کبھی شفقت ومحبّت کے جوش میں آپ شاہ صاحب کو "علاّمہ" کے وقیع خطاب سے بھی سرفراز فرماتے تھے کہ کہو علاّمہ! اس مسئلہ میں سلف کا کوئی قول یاد ہے؛ چناں چہ اپنے استاذ مکرّم کے اِستفتاء پر حضرت شاہ صاحب نہایت مؤدبانہ اور مناسب جواب دیتے تھے اور اس پر حضرت شیخ الہند اطمینان اور مسرّت کا اِظہار فرماتے تھے۔

(۲) حضرت شیخ الہندؒ کو اپنے اس شاگردِ رشید کے علم وفضل اور اصابتِ رائے پر کتنا اعتماد تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا ظہیر احسن شوق نیموی نے جب "آثار السُّنَن" کے کچھ حصّے تالیف فرما کر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ملاحظہ کے لئے ارسال کئے تو حضرت موصوف نے اس کی تصحیح کے لئے حضرت شاہ صاحب کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ:

"جس زمانہ میں مولانا ظہیر احسن صاحب نیموی رحمۃ اللہ علیہ آثار السُّنَن تالیف فرمارہے تھے۔ انھوں نے اس کے کچھ اجزاء حضرت استاذؒ (یعنی

حضرت شیخ الہندؒ) کی خدمت میں اس غرض سے بھیجے کہ وہ ملاحظہ فرما کر مشورے دیں اور جو اضافے فرمائے جاسکیں وہ اضافے فرمادیں۔

حضرت استاذؒ نے ملاحظہ فرما کر وہ اجزاء واپس فرمائیے اور انکو میرا پتہ لکھ دیا کہ آپ اس مقصد کے لئے اس پتہ پر خط و کتابت فرمائیں، میں اس زمانے میں اپنے وطن (کشمیر) میں رہتا تھا۔ الخ" [1]

(۳) جُنید زمن حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ حضرت شاہ صاحبؒ کے شفیق استاد تھے اور اس کے باوجود آپ کا بہت زیادہ احترام فرماتے تھے۔ چناں چہ حضرت شاہ صاحب کے ایک قابلِ فخر شاگرد اور دار العلوم کے مہتمم اعلیٰ حضرت مولینا طیب صاحب کا بیان ہے کہ "حضرت شیخ الہند استاد ہونے کے باوجود توقیر کے کلمات ان کے بارہ میں استعمال فرماتے تھے"۔ [2]

(۴) چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کو مجرد رہنا ہی پسند تھا اور آپ شادی کے لئے بالکل آمادہ نہیں تھے لیکن اکابرینِ دیوبند خصوصًا ان کے استاذِ مکرم حضرت شیخ الہند دیوبند میں ان کے مستقل قیام کی تجاویز سوچا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ہی حضرت شاہ صاحب کو اتباعًا للسنۃ النبویہ نکاح کرنے کی تاکید فرمائی۔ چناں چہ اپنے شفیق و محترم استاد کے اِصرار پر حضرت شاہ صاحب نے شادی کے لئے رضامندی ظاہر فرمائی اور اس طرح سے حضرت شیخ الہند کی تاکید اور مولینا حبیب الرحمن صاحب عثمانی کے حُسنِ انتخاب سے ۱۳۲۷ھ میں گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک اعلیٰ اور معزز خاندان میں آپ کی شادی ہو گئی۔

(۵) حضرت شیخ الہندؒ کے دل میں شاہ صاحبؒ کی طالب علمی کے زمانہ

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۱۳۵ (مضمون مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)

[2] ملاحظہ ہو حیات انور ص ۲۳۹ ؛

سے ہی آپ کا کس قدر حسنِ ظن تھا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت شاہ صاحب کی سندِ فراغت پر ایک نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے پر فضلاءِ دیوبند کو جو سند دی جاتی اس میں اساتذہ اپنے شاگرد کی نسبت اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت شاہ صاحب کو جو سندِ فضیلت اور سندِ اجازت عنایت فرمائی تھی اس میں اپنے تاثرات کو یوں تحریر فرمایا تھا کہ "خداوند تعالیٰ نے مولینا انور شاہ میں علم، عمل، سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہنِ ثاقب کو جمع کر دیا ہے"۔ لہ

اللہ اللہ! ایک سطر میں حضرت شیخ الہندؒ جیسی ہستی کے قلم سے ایسے آٹھ اوصاف کا اعتراف ہے جن کا ایک ذات میں اجتماع صاحبِ اوصاف کی شخصیت کو اپنے وقت کی بے نظیر شخصیت بنا ڈالنے کی ضمانت ہے۔

(۶) اور یہی وجہ تھی کہ ۱۳۳۳ھ میں جب حضرت شیخ الہند حج بیت اللہ کے لئے دیوبند سے روانہ ہوئے تو دیگر سینئر اساتذہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی موصوف نے اپنی جانشینی کے فخر و امتیاز سے حضرت شاہ صاحب کو ہی مشرف فرمایا اور اس طرح سے حضرت شاہ صاحبؒ ۱۳۳۳ھ سے ۱۳۴۵ھ تک دارالعلوم میں بحیثیت صدرِ مدرس و جانشین حضرت شیخ الہند درسِ حدیث دیتے رہے اور بقولِ مولینا طیب صاحب شیخ الہند کی ہجرت کے بعد "علمی پیاسوں" کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحرِ ذخار سے محروم ہو گئے ہیں۔ بلکہ انہیں معلوم ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدالم الغلط نہیں

لہ حیاتِ انور ص ۱۵، ۱۶۔

بلکہ بدل صحیح ہے۔ جس سے بلا تأمل علوم کے پیاسے سیراب ہونے لگے اور آبِ حیات سے قدیم و جدید سیرابی میں انھیں کوئی زیادہ فرق محسوس نہ ہوا"۔ [1]

اس واقعہ کو مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ (دار العلوم کی جانشینی ایک) "ایسا قبا تھا جو بلا کسی قطع و برید کے حضرت شاہ صاحب کے قامت موزون پر راست آ کر رہا تھا [2]

(۷) ۱۳۳۹ھ میں جب حضرت شیخ الہند انتقال کر گئے تو ہر طرف قیامت بپا تھی، لوگ چیخیں اور دھاڑیں مار مار کر اظہار غم کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ انکی آنکھیں اشک بار تھیں۔

مولانا لائلپوری اس واقعہ کے متعلق ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جوں ہی ریل گاڑی بعد مغرب اسٹیشن دیوبند پہنچی سب کی بے ساختہ چیخیں نکل گئیں، نہایت ادب کے ساتھ تابوتِ شریف باہر لایا گیا۔ اسٹیشن سے مدرسہ تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ لوگ تابوت اُٹھائے ہوئے تھے اور روتے ہوئے حضرت شیخ الہند کے درِ دولت کی طرف آرہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ساتھ ہی ساتھ روتے ہوئے تشریف لا رہے تھے۔ خود فرماتے ہیں وَلَقَدْ اَرَیٰ مِثْلَ الْیَوْمِ کَمْ کَانَ بَاکِیًا یعنے اس دن کتنے لوگ رو رہے تھے ایسا نظارہ میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔

پھر ایک دن تعزیتی جلسہ ہوا۔ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رح کی

---

[1] حیاتِ انور، ص ۲۰۹

[2] حیاتِ انور، ص ۲۷۶

صدارت تھی سبھی اکابر نے مرثیے پڑھے۔

حضرت شاہ صاحب بھی کھڑے ہوئے، آنسو جاری تھے۔ دو قصیدے ایک عربی جو فصل الخطاب کے آخر میں لگا ہوا ہے پہلے وہ پڑھا ؎

قِفا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَىٰ مَزَارٍ فَنَدْمَعَا
مصيفا ومشتا ثُمَّ مَرائىً ومسمعًا
قد احتفه الالطافُ عطفًا وعطفةً
وَبُورِكَ فِيهِ مَرْبَعًا ثُمَّ مَرْبَعًا [۱]

پھر فارسی کا طویل قصیدہ پڑھا۔ حاضرین وقف گریہ و بکا تھے۔

(مرثیہ کے چند شعر بذیل ہیں) ؎

بگذر از یادِ گل و گلبن کہ ہیچم یاد نیست
در زمین و آسمان جز نامِ حق آباد نیست
بر روانِ رہ روان ہم رحمتے بفرستہ باش
حسن بے بنیاد باشد عشق بے بنیاد نیست
شرحِ حالِ خود نمودن شکوہٗ تقدیر نیست
نالہ بر سُنت نمودن نوحہ و فریاد نیست

پھر فرمایا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے بھی سُنّت کے مطابق حزن و ملال کا اظہار کیا ہے۔ حضرتِ صدیقِ اکبر رضؓ نے بھی مرثیہ پڑھا ہے۔ اس لئے آنسو بہانا یا غم کا اظہار کرنا بدعت نہیں ہے۔ یہ صحابۂ کرام رضؓ سے ثابت ہے۔[۲] (ماہنامہ دارالعلوم دیوبند مئی ۱۹۶۵ء ص ۱۶)

---

[۱] ملاحظہ ہو فصل الخطاب فی مسئلۃ اُمّ الکتاب، ص ۱۰۳، ۱۰۴، یونیورسل پریس دہلی۔

[۲] نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے بھی ثابت ہے۔ حضرت ابراہیم صاحبزادہ حضرت آں حضرت ﷺ کے وصال پر آپؐ نے فرمایا کہ اِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا ابراهيمُ لَمَحزونون" اور آنسو جاری تھے۔ (کوثر)

(۸) مولینا لائلپوری کا بیان ہے کہ درس میں اکثر حضرت شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وہ جانبازی (یعنی جہادِ حُریت میں) جو حضرت شیخ الہند نے دکھائی ہے وہ تو کوئی کیا دکھلائے گا۔

(۹) حضرت مولینا محمد انوری صاحب لائلپوری اپنے ایک فاضلانہ مقالہ میں حضرت شیخ الہند اور حضرت شاہ صاحب کے باہمی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں یوں رقمطراز ہیں:

"شوال ۱۳۳۰ھ میں جب احقر دورۂ حدیث میں شامل ہونے کی غرض سے دارالعلوم دیوبند میں حاضر ہوا تو سامان دارالعلوم کے حُجرہ میں رکھتے ہی حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لئے حضرت کے آستانہ پر حاضر ہوا۔ دیکھا کہ علماء وصلحاء کا عظیم اجتماع ہے، گرمی کا وقت ہے، ایک بزرگ چھت کے پنکھے کا رسّہ کھینچ رہے ہیں اور نرم نرم مترنّم آواز میں فرما رہے ہیں، بھائی بیٹھ جاؤ، حضرت کے اردگرد بھیڑ نہ کرو۔ وہ بزرگ حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ تھے۔ بعدِ عصر حضرت شیخ الہندؒ کی سہ دری کے سامنے چارپائی بچھائی جاتی، چاروں طرف کرسیاں رکھی جاتیں، چارپائیاں بچھ جاتیں، علماء وصلحاء وطلبۂ دارالعلوم بقصدِ زیارت جمع ہو جاتے۔ حضرت شاہ صاحب بھی دبے پاؤں آکر دور بیٹھ جاتے، حضرت کو جب نظر پڑتی تو اپنے پاس والی کرسی پر بٹھاتے۔ حضرت شیخ الہندؒ جب مسائل بیان فرمانے لگتے، سبحان اللہ! علوم و معارف کا بحرِ ذخّار موجیں مارنے لگتا۔ کبھی کسی مسئلہ پر فرماتے، بھئی اس کے متعلق مولوی انور شاہ صاحب سے پوچھنا چاہیئے، کیوں شاہ صاحب! یہ مسئلہ یوں ہی ہے؟ عرض کرتے ہاں حضرت فلاں محقق نے یوں ہی لکھا ہے۔

(۱۰) مولینا لائلپوری نے مزید لکھا ہے کہ:

مالٹا سے جب حضرت شیخ الہندؒ واپس تشریف لائے تو نصاریٰ سے ترکِ موالات کا

مسئلہ زیر غور تھا۔ قرار پایا کہ حضرت شاہ صاحب سے یہ مسئلہ تحریر کرایا جائے حضرت نے فتویٰ لکھا اور حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت مبارکہ میں حاضر ہو کر نہایت ادب سے بیٹھ کر سنایا۔ احقر نے دیکھا کہ صرف دس سطور تھیں لیکن ایسا جامع مانع کہ حضرت شیخ الہندؒ نہایت محظوظ ہوئے۔ احقر کے والدِ ماجد مرحوم چونکہ اس روز زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے تھے اس لئے احقر بھی وہاں حاضر تھا۔ مولانا احمد اللہ پانی پتی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ بس یہ حضرات حاضر تھے۔

مولانا لائل پوری کی زبان سے یہ بھی سن لیجئے:۔

(۱۱) "جس روز احقر دیوبند حاضر ہوا تو حضرت شیخ الہندؒ کی دعوت مع خدام و زائرین حضرت شاہ صاحب کے ہاں تھی، بعد نماز مغرب تین صد سے زائد مہمان حضرت کی معیت میں نودرہ کی چھت پر تشریف فرما ہوئے۔ عجیب انوار و برکات کا نزول ہو رہا تھا۔ حضرت شاہ صاحب وجد کے عالم میں تھے، کھانے سے فراغت کے بعد حضرت دیر تک تشریف فرما رہے۔

ایک دفعہ احقر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضر تھا، دن کے دس بجے ہوں گے، بارش ہو رہی تھی، فرمانے لگے، بھائی مولوی محمد حسن صاحب! شاہ صاحب کے ہاں چلنا ہے آج انہوں نے ہمیں مہمانوں سمیت مدعو کیا ہے۔ حکیم صاحب فرمانے لگے، حضرت بارش تو ہو رہی ہے، کھانا یہیں منگا لیا جائے گا۔ فرمایا، نہیں بھائی میرے ایک مخلص نے دعوت دی ہے، وہیں جاؤں گا۔ چنانچہ بارش ہی میں چل دئے۔ راستے میں سامنے سے شاہ صاحب تشریف لا رہے تھے، عرض بھی کیا کہ کھانا، درِ دولت پر پہنچا دیا جائے گا، فرمایا کچھ تکلیف نہیں، آپ کے گھر پر کھانا کھائیں گے۔

(۱۲) مولانا لائلپوری مرحوم ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"احقر ایک دفعہ ہوشیار پور میں (فارسی زبان کے مشہور شاعر اور نظام حیدرآباد کے استاد) مولینا گرامی رح سے ملنے گیا۔ (۱۹۲۵ء میں احقر ۶ ماہ ہوشیار پور میں ایک عربی مدرسہ میں مدرس بھی تھا) گرامی رح کہنے لگے کہ آپ نے حدیث مولینا محمود الحسن صاحب سے پڑھی یا مولینا انور شاہ صاحب سے؟ میں نے عرض کیا حدیث تو شاہ صاحب مدظلہ ہی سے پڑھی ہے، ہاں بیعت حضرت شیخ الہند رح کے دستِ مبارک پر کی ہوئی ہے۔ خوش ہوئے، دیر تک باتیں کرتے رہے پھر فرمانے لگے کہ میں نے شاہ صاحب کی شان میں بہت سے اشعار کہے ہیں، ایک شعر یہ ہے ؎

چہ فصاحت چہ بلاغت چہ معانی چہ بیان
جلوہ فرما است در آغوشِ زبانِ انور

اسی شعر کو گرامی صاحب جھوم جھوم کر بار بار پڑھتے گئے اور حضرت شیخ الہند رح کا مرثیہ بھی سنایا جس میں یہ دو شعر بھی تھے ؎

ماتمِ عاشقِ دل زندہ تماشا دارد
خضر از خویش شد و مرگ تمنا می کرد
از کجا تا بکجا ماتمِ شیخ الہند رح است
نالہ برخورد بگوشم کہ مسیحا می کرد

(حیاتِ انور ص ۲۰۸، ۲۱۰)

حضرت تھانوی اور حضرت شاہ صاحب

(مُرتبہ کوندو)

زعیم احرار حضرت مولینا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ حکیم الاُمّت حضرت مولینا محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے ایک بار فرمایا کہ:

"ایک عیسائی فلسفی نے اسلام کی حقانیت کی یہ دلیل دی ہے کہ غزالی جیسا محقق اور مفکر مذہب اسلام کو سچا مذہب مانتا ہے؛ اس زمانہ میں میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی بہت سی دلیلوں میں سے ایک دلیل حضرت مولینا محمد انور شاہ کا مسلمان ہونا ہے۔ اگر اسلام میں کوئی کجی ہوتی تو مولینا انور شاہ یقیناً اسلام ترک کر دیتے" لے

مولینا محمد صاحب انوری لائلپوری رقمطراز ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے تھے کہ "حضرت شاہ صاحبؒ سے میں نے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ میرے قلب میں اُن کا احترام اسی طرح ہے جیسا کہ اپنے اساتذہ کا، گو میں نے ان کی باقاعدہ شاگردی نہیں کی" لے

مولینا طیب صاحب اپنے مقالہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ جب مولوی انور شاہ میرے پاس آکر بیٹھتے ہیں تو میرا قلب اُن کی علمی عظمت کا دباؤ محسوس کرتا ہے۔" سے

لے ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۲۰ ۔ لے ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۳۰۸

سے ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۲۳۹۔

حضرت عارف تھانوی رحؒ خود ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"مولٰینا انور شاہ صاحب رحؒ نے ایک صاحب[1] سے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں اس لئے میں کسی اردو تصنیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا، لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہوگیا اور جو بے وقعتی اردو کی کتابوں کی، میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی[2]۔

مولٰینا لائلپوری فرماتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی یہ رائے سُن کر حضرت[3] تھانوی رحؒ کو بہت مسرت ہوئی اور فرمایا کہ ایک عالی قدر اہلِ علم نے تصدیق فرمادی۔

حضرت تھانوی رحؒ جب دیوبند تشریف لاتے تو حضرت شاہ صاحب کے درس میں اہتمام سے بیٹھتے تھے اور بذریعہ خطوط بھی آپ سے استفادہ فرماتے رہتے۔ بعض جوابات کافی طویل بھی ہوجاتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت تھانوی رحؒ تھانہ بھون سے دیوبند تشریف لائے۔ اس وقت کے مہتمم مولٰینا حافظ محمد احمد صاحب رحؒ نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ مدرسہ کے سرپرست ہیں۔ ذرا اپنے مدرسہ کے شیخ الحدیث کا درس بھی سُنیں۔ چنانچہ حضرت تھانوی درس میں جاکر بیٹھے اور پھر مجلس میں آکر فرمایا کہ "شاہ صاحب کے ایک ایک جملہ پر ایک ایک رسالہ تصنیف ہوسکتا ہے"۔

(ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۲۷۹)

حضرت مولٰینا تھانوی رحؒ حضرت شاہ صاحب رحؒ کی ذات کے بارے میں کیا احساسات

---

[1] یہ حضرت شاہ صاحب رحؒ کے شاگرد مولٰینا طیب صاحب تھے۔ (کوندو)

[2] ملاحظہ ہو "الاضافات الیومیہ من الافاضات القومیہ" طبع کراچی ج ۷، ص ۱۱۱

[3] ملاحظہ ہو "حیاتِ انور" ص ۳۱۸ ۔

رکھتے تھے اس کی وضاحت کے لئے ذیل میں ہم حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ایک مکتوبِ گرامی کا پہلا اور آخری حصّہ درج کرتے ہیں۔

مکتوب کی عبارت یہ ہے:۔

"از ناکارہ آوارہ اشرف علی عفی عنہ بخدمت بابرکت جامع الفضائل العلمیہ والعملیہ حضرت مولٰنا انور شاہ صاحب دامت انوارہم۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ تحقیقِ سابق کے متعلق بضرورت مکرّر تکلیف دینا پڑی۔ امید ہے کہ معاف فرمائیں گے۔ ایک حادثہ خود مجھ کو پیش آیا اور اُس کے متعلق جُداگانہ تکلیف دیتا ہوں۔ الخ

(وقال خاتمۃ) اس میں روایت و درایت سے کچھ حکم فرمائیں[1]۔"

مجددِ ملّت حضرت تھانوی قدس اللہ سرہُ العزیز کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرت موصوف علیہ الرحمۃ چھوٹی بڑی ۶۶۶ کتابوں کے مؤلّف و مُصنّف ہیں جن میں تفسیر "بیان القرآن" سرِفہرست ہے۔ اس مردِ مومن نے شرک و بدعت کے استیصال کے لئے اور حقیقی اسلام اور احسان و تصوّف کا روشن چہرہ دِکھانے کے لئے اپنی عمر صرف فرمادی۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے فارغ شدہ افاضل حکیمُ الامت مولٰنا اشرف علی تھانوی رح کے مریدوں میں شامل ہوتے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے تعلق رکھنے والے بزرگوں میں سے حضرت مولٰنا سید سلیمان صاحب ندوی رح (مصنّفِ سیرۃُ النّبیؐ) حضرت مولٰینا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص رہے ہیں۔ حضرت سیّد سلیمان صاحب ندوی مرحوم کا تعلق حضرت تھانوی کے ساتھ آخر میں "فنافی الشیخ"

---

[1] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور ص ۱۹۰ و حیاتِ انور ص ۹

کے درجہ کو پہنچ گیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے دل میں عارف باللہ حضرت تھانویؒ کی کتنی قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ مولینا منظور نعمانی صاحب کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔

مولینا منظور نعمانی کا بیان ہے کہ درس ہی میں ایک دفعہ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ:

"ہم یہاں آئے (یعنی کشمیر سے ہندوستان) تو دین حضرت گنگوہیؒ[1] کے یہاں دیکھا۔ اس کے بعد حضرت استاذ (یعنی حضرت شیخ الہندؒ) اور حضرت رائے پوری (یعنی حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوریؒ) کے یہاں دیکھا، اور اب جو کوئی دیکھنا چاہے وہ حضرت مولینا اشرف علی صاحب کے یہاں جاکر دیکھے"[2]

---

[1] یعنی قطب الارشاد حضرت رشید احمد صاحب گنگوہیؒ۔

[2] ملاحظہ ہو زیر نظر کتاب میں مولینا نعمانی صاحب کا مقالہ۔

شاہ صاحبؒ اور علامہ سید سلیمان ندویؒ

مرتبہ کو ندو

رئیس المتکلمین، سیرت خاتم النبیین کے فقید المثال ترجمان اور وکیلِ اسلام حضرت مولانا علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحؒ کی ذات ستودہ صفات اور محدث کشمیری حضرت شاہ صاحبؒ جیسے جبالِ علم کی بلند و بالا شخصیت سے اہلِ کمال ہی کما حقہ، واقف ہیں۔

"رحماءُ بینھم" کے بہ عملی مصداق ایک دوسرے کی علمی و عملی صلاحیتوں اور کمالات کے مرتبہ شناس اور ایک دوسرے سے بہت متاثر تھے۔ سچ ہے:

"قدرِ زر زرگر بداند قدرِ جوہر جوہری"

مولانا علی میاں نے ایک بار فرمایا ہے کہ "میں نے اپنی عمر میں دو فنا فی العلم دیکھے۔ ایک علامہ کشمیری۔ دوسرے علامہ سید سلیمان ندوی"۔

مرحوم رشید احمد صدیقی نے مولانا سید سلیمان ندوی کی دو خصوصیتوں کا ذکر کیا ہے۔ "خلوصِ علم و احترامِ علم" اور یہی دو عناصر ہیں جن سے حضرت شاہ صاحب کی شخصیت بھی عبارت ہے۔ انہوں نے علم کو پیشہ نہیں بننے دیا بلکہ اس کا وقار بڑھایا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے چند جلیل القدر تلامذہ کو علامہ ندوی مرحوم "دائرۂ علم" سے تعبیر فرماتے تھے۔ قارئینِ کرام اسی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضرت مولانا مرحوم کی رائے جن کے شاگردوں کے متعلق یہ تھی

ان کے استاد (یعنی حضرت شاہ صاحب) کا مقام آپ کے دل میں کیا ہو سکتا تھا؟

حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مرحوم نے ایک گرانقدر اور بسیط مضمون سپرد قلم کر کے اپنے موقر جریدہ "معارف" میں شائع کیا جس میں حضرت موصوف نے نہایت شاندار الفاظ میں حضرت شاہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں حضرت ممدوح نے شاہ صاحب کی علمی عظمت کا اعتراف، ان کی دینی خدمات کی تعریف و توصیف اور اپنے دردِ دل کا اظہار جن الفاظ میں کیا ہے وہ قابلِ مطالعہ ہیں۔

خوفِ طوالت اور قلتِ گنجائش کی وجہ سے اس مضمون کے کچھ منتخب حصے کو ذیل میں نذرِ قارئین کرنے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

"دین و دانش کا مہر انور ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ یعنی مولانا محمد انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند و صدر المدرسین دار العلوم دیوبند۔

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی ہے جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گرانقدر خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعتِ نظر، قوتِ حافظہ اور کثرتِ حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے، کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند کیا۔ ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے۔ شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔" (ملتقطاً و مختصراً)

"معارف" اعظم گڈھ جون ۱۹۳۳ء مطابق ربیع الاول ۱۳۵۲ھ

علامہ سیّد رشید رضا مصریؒ اور حضرت شاہ صاحبؒ

انساکوندو

علامہ سیّد رشید رضا

علامہ سیّد رشید رضا اس صدی کے رُبع اوّل میں مصر کے مشہور و معروف فاضل اور اپنے وقت کے ممتاز عالمِ دین تھے۔ آپ ملّتِ اسلامیہ کے با اخلاص رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے اور الازہر قاہرہ کے مُصلح مفتی محمّد عبدہٗ کے نہ صرف شاگرد بلکہ جانشین بھی تھے۔ آپ کا سیاسی مسلک وہی تھا جو حضرت سیّد جمال الدین افغانیؒ کی تحریکِ آزادی اور دعوتِ وحدتِ اسلامی (پان اسلام ازم) کے ان دوسرے حامیوں کا تھا جو ہندوستان، ایران اور شرقِ اوسط میں پھیلے ہوئے تھے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور عالمِ اسلام کے کئی دیگر اکابر کی طرح علامہ رشید رضاؒ بھی انگریزی سامراج کے اقتدار سے مصر اور ہندوستان کی آزادی کو پورے مشرق اور ایشیاء کی نجات کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

علامہؒ موصوف اپنے وقت کے مُفسّر، مُحدّث اور ادیب و مُحرّر تھے۔ علومِ حاضرہ کی روشنی میں اور ضروریاتِ وقت کے لحاظ سے آپ نے قرآنِ شریف کی جو تفسیر لکھی ہے وہ آپ کا دینی و سیاسی کارنامہ ہے۔ اس تفسیر اور بین الاقوامی اسلامی سیاست پر اپنے خیالات اور آراء کی اشاعت کے لئے "المنار" کے نام سے آپ نے ایک ماہوار رسالہ جاری کر رکھا تھا۔ "المنار" ہندوستان، ایران، ترکی، افغانستان اور مصر وغیرہ ممالک میں اونچے درجے کے

قارئین کا ایک خاص دائرۂ اثر رکھتا تھا۔

ہندوستان کے ساتھ تعلق

۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء میں آپ ہندوستان آئے۔ اس سے کچھ مدت قبل کے ایک واقعہ کی وجہ سے آپ کا ہندوستان کے ساتھ تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ عربی زبان کے ایک مشہور ادیب مسٹر جرجی زیدان (جو شام کے باشندے اور مذہباً عیسائی تھے اور قاہرہ سے "الہلال" نام کا ماہوار جریدہ شائع کرتے تھے، قلم کے دھنی تھے، لیکن اسلام کے خلاف بغض اور تعصب کی وجہ سے اکثر تہذیب و تمدنِ اسلام پر بے جا تنقید کے عادی تھے) نے پانچ جلدوں میں "تمدنِ اسلامی" نامی کی ایک کتاب لکھی جس میں اس نے اسلام کی تصویر کو مسخ کرکے پیش کیا۔ اس کتاب کے خلاف مسلمانوں نے ہر جگہ احتجاج کیا اور مسٹر جرجی زیدان کی تحریرات کی تردید میں مضامین لکھے۔ ہندوستانی علماء میں سے مولانا شبلی نعمانی رح نے محققانہ تردیدیں لکھ کر مصر کے جرائد میں شائع کرائیں۔ ان تحریرات کی وجہ سے مولانا شبلیؒ اور علامہ رشید رضا موصوف میں موانست اور خط و کتابت شروع ہوئی جو دونوں میں دوستی کی بنیاد بنی۔

جلسۂ ندوۃ العلماء کی صدارت

اپریل ۱۹۱۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے لکھنو میں جلسۂ دستاربندی منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ (اس سے دو سال قبل ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند بھی جلسۂ دستاربندی کی ایک تاریخ ساز تقریب منعقد کر چکا تھا) مولانا شبلی نے علامہ رشید رضا کو ندوۃ العلماء کے اس خاص جلسے کی صدارت کرنے کی دعوت دی جس کو قبول کرکے آپ ۲۲ر مارچ ۱۹۱۲ء کو ہندوستان آگئے اور لکھنو جانے سے پہلے بمبئی، لاہور، دہلی اور علی گڑھ میں گھوم پھر کر انھوں نے ہندوستان کے مسلم اکابر کے ساتھ ملت

اسلامیہ کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کیا اور ۶ر اپریل کو لکھنؤ پہنچکر ندوۃ العلماء کے جلسے کی صدارت فرمائی۔

(یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ کے جلسہ میں آپ کی صدارتی تقریر کا اُردو ترجمہ مولٰنا ابو الکلام آزاد نے کیا تھا۔ جس طرح شاہ صاحب حضرت شیخ الہند کے خازن العلوم تھے اسی طرح اُس زمانہ میں مولٰنا آزاد مولٰنا شبلیؒ کے ذہن رسا کے ترجمان متصور ہوتے تھے۔)

حکیم محمد اجمل خان کا توجہ دِلانا

ابتداء میں علامہ رشید رضا نے ہند کے جن شہروں اور اداروں میں جانے کا جو پروگرام بنایا تھا، کسی مصلحت سے دار العلوم دیوبند کو دیکھنا اس میں شامل نہ رکھا گیا تھا۔ لیکن جب آپ دہلی میں تھے تو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان مرحوم نے ان کو بتایا کہ اگر آپ دیوبند کو دیکھے بغیر واپس تشریف لے گئے تو آپ کا دورۂ ہندوستان نامکمل اور ناقص رہے گا۔

حکیم صاحب کی زبان سے دارالعلوم کے اساتذہ خاص کر مولٰنا محمود الحسنؒ کے اوصاف سُن کر علامہ رضا نے دارُالعلوم دیوبند کو دیکھنے کا تہیہ کرلیا۔ اور ۹ر اپریل ۱۹۱۲ء کی تاریخ مقرر کرکے اطلاع بھی دے دی۔ لیکن نہ جانے کیا بات مانع ہوئی کہ آپ ۹ر اپریل کو دیوبند نہ آسکے۔ بعد ازاں ۱۵ر اپریل کا دِن مقرر کیا گیا۔ چنانچہ ۱۴ر اپریل کو علیگڈھ سے آپ کے ایک میزبان نواب وقارُالملک نے بزرگانِ دیوبند کو تار دے کر مُطلع کیا کہ علامہ رشید رضا ۱۵ر اپریل کی صبح کو دیوبند پہنچ رہے ہیں۔ اور جب آپ کی گاڑی دیوبند کے ریلوے سٹیشن پر وارد ہوئی تو اساتذہ و طلباءِ دارُالعلوم نے آپ کی شان کے شایان استقبال کیا۔

دارالعلوم میں جلسہ

دارالعلوم کی طرف سے مہمان عزیز کے اعزاز میں اساتذہ اور طلبہ نے نودرہ ہال میں خیر مقدم کا ایک عظیم الشّان جلسہ منعقد کیا۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی بحیثیت صدر المدرّسین رونقِ جلسہ تھے۔ لیکن آپ نے بذاتِ خود کچھ فرمانے کے بدلے یہ طے کیا کہ علامہ رشید رضا کو اھلاً وسھلاً مرحبا کہنے کا فرض آپ کی طرف سے اور دیگر اساتذہ اور طلباء کی طرف سے اور ادارۂ اہتمام کی طرف سے حضرت شاہ صاحبؒ انجام دیں۔

دیوبند کی حنفیت علامہ کی نظر میں

دیوبند میں حدیث اور ائمۂ اربعہ کی فقہ کے درمیان تطابق اور ترجیح اور روایت و درایت کی متوازی تعلیم کا جو ولیُ اللّٰہی طریقہ برتا جاتا ہے۔ اس کا الانشا ھو میں رواج نہیں ہے۔ وہاں حدیث کے متن اور سلسلۂ سند سے زیادہ کسی چیز کے ساتھ بہت کم اعتناء کیا جاتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر علامہ رشید رضا نے ہندوستان پہنچکر جب یہ سُنا کہ دارُالعلوم دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے فیض یافتہ اساتذۂ علمِ حدیث صحیح البخاری اور ہدایہ کو پہلو بہ پہلو رکھ کر تطابق کے ساتھ درس دیتے ہیں تو آپ کسی قدر متعجب سے ہو گئے۔ چنانچہ جب آپ دارالعلوم پہنچے تو ابتدائی بات چیت کے دَوران آپ نے دارُالعلوم کے کسی استاد سے دریافت کیا کہ یہاں درسِ حدیث کا طرز کیا ہے؟ انہیں بتلایا گیا کہ پہلے قاری متنِ حدیث پڑھتا ہے اور استاد اس حدیث کے متعلق تمام مباحثِ علمیہ اور حقائق و نکات بیان کرتا ہے۔ پھر اگر حدیث احکام سے

متعلق ہوتی ہے تو استاد ائمہ متبوعین کے مذاہب و دلائل بیان کرتا ہے اور اگر امام اعظمؒ کا مذہب بظاہر اس حدیث کے مخالف دکھائی دیتا ہے تو استاد توفیق، تطبیق یا ترجیح راجح کے اصول پر تقریر کرتا ہے اور حنفی مسلک کو مؤید و مدلل کرتا ہے۔ یہ بات علامہ کو بہت عجیب معلوم ہوئی اور پوچھنے لگے کہ کیا ہر حدیث میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ مخاطب نے کہا "ہاں" جو حدیثیں احکام سے تعلق رکھتی ہیں ان میں ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ اس پر علامہ نے کہا:۔ "کیا حدیث حنفی ہوگئی ہے؛ اور کیا سارا ذخیرۂ روایاتِ حدیث صرف فقۂ حنفی ہی کی حمایت کے لئے ہے؟"

شاہ صاحبؒ کی تقریر

علامہ کے اِستفسار و جواب کا معاملہ تو یہاں ہی ختم ہوگیا اور دارُالعلوم کے اکابر کی قرار داد و صوابدید کے مطابق حضرت شاہ صاحبؒ کا ارادہ یہی تھا کہ جب مدرسہ کی طرف سے مہمان کی خدمت میں رسمی سپاسنامہ پڑھا جاچکے گا تو آپ ترحیبِ ضیف کے بعد دارُالعلوم کے قیام کا پسِ منظر اور اس کے مقاصد اور ضرورت پر مختصر سی روشنی ڈالدیں گے تاکہ مہمان کو اپنے خیالات کے اظہار میں سہولت ہو جائے (گویا آپ کا ارادہ پندرہ یا بیس منٹ سے زیادہ بولنے کا نہ تھا) مگر جب آپ جلسہ گاہ کی طرف آرہے تھے تو کسی نے علامہ رشید رضا کے مُصرّحۂ صدر الفاظ آپ کو سُنادیئے اور سُنتے ہی آپ نے پہلا ارادہ منسوخ کرکے دارُالعلوم دیوبند کے طریقۂ تعلیم اور اسکی خصوصیات پر مکمل تبصرہ کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اور قلیل سے وقفہ میں جلسہ گاہ میں بیٹھے بیٹھے دارُالعلوم کے اسی مذکورہ بالا طرزِ درسِ حدیث پر اپنے ذہن میں مضمون مرتب فرمالیا اور پھر وہ مشہور و معروف محققانہ و محدثانہ تقریر نہایت فصیح و بلیغ

عربی میں ارشاد فرمائی جس کو سُن کر علامہ اور تمام شرکاءِ اجلاس (علماء وطلبہ) حیران رہ گئے۔ اس تقریر میں آپ نے دار العلوم دیوبند کے طریقۂ تعلیم حدیث نبوی کی وضاحت کی اور فقہاء و محدثین کے اصولِ استنباط، تحقیقِ مناط، تنقیحِ مناط اور تخریجِ مناط کی وضاحت وتشریح احادیث و احکام سے فرمائی اور حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے لے کر اپنے اساتذۂ دار العلوم تک کے فضائل و مناقب اور طرز و طریقِ خدمتِ علم و دین پر روشنی ڈالی۔ علامہ آپ کی تقریر کے مضمون، قوتِ دلائل اور تقریر کی فصاحت و بلاغت سے نہایت متاثر ہوئے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ علامہ رشید رضا جھوم رہے تھے اپنی جگہ سے اُٹھ کر بار بار داد دیتے اور بے ساختہ فرماتے تھے: "مَا رَأَيْتُ مِثْلَ هٰذَا الْأُسْتَاذِ الْجَلِيْلِ" (میں نے اس جیسا جلیل القدر عالم نہیں دیکھا) علامہ موصوف خود بذاتِ شافعی المذہب ہونے کی وجہ سے دورانِ تقریر موقع بموقع سوالات بھی کرتے رہے۔ جن کے جواباتِ ناطق حضرت شاہ صاحبؒ نہایت انبساط و شرحِ صدر کے ساتھ دیتے گئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی اس تقریر نے علامہ کی غلط فہمیاں دُور کر دیں اور آپ کو اندازہ ہو گیا کہ دار العلوم دیوبند اور اس کے اساتذہ کا علمی، تعلیمی اور تدریسی رُتبہ بہت بُلند ہے۔

علامہ مصریؒ کی جوابی تقریر

چنانچہ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر کے بعد علامہ مصری نے جو بصیرت افروز اور فاضلانہ جوابی تقریر فرمائی اس میں آپ نے بزرگانِ دیوبند کے کمالات کا اعتراف کیا اور مسرت کا اظہار فرمایا۔ نیز فرمایا:۔

"حضراتِ علماءِ کرام! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں اس مدرسہ کو نہ دیکھتا تو میں ہندوستان سے نہایت غمگین جاتا۔ ہندوستان میں آکر

اس مدرسہ کی نسبت جو کچھ میں نے اب تک سُنا تھا اس سے بہت زیادہ پایا۔ استاذ مولینا انور شاہ صاحب نے جو اصول میرے سامنے بیان کئے اور جو مسلک اپنے مشائخ کا مجھے بتلا دیا ہے، میں اسکو پسند کرتا ہوں اور اُس سے مُستفیض ہوں۔ فقہ حنفی بلاشبہ کافی ووافی ہے۔" (روئداد دارالعلوم ص۳۰ ۱۳۳۰ھ)

المنار میں بھی تذکرہ علامہ موصوف نے مصر پہنچ کر یہ سب حالات اپنے رسالہ "المنار" میں شائع کئے اور اسمیں یہ بھی اضافہ کیا کہ میں نے ازہر الہند دیوبند میں وہ نہضت دینیہ علمیہ جدیدہ دیکھی ہے جس سے نفع عظیم کی توقع ہے۔ مدرسۂ دیوبند دیکھ کر جس قدر میرے دِل کو مسرتِ بے پایاں حاصِل ہوئی وہ کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔ مجھ سے بہت سے لوگوں نے دارالعلوم کے فضائل و مآثر بیان کئے تھے اور کچھ لوگوں نے علماءِ دیوبند کی طرف جمود و تعصّب کو بھی منسوب کیا تھا مگر میں نے ان حضرات کو ایسی تنقید سے بہت بلند پایا اور میں نے حضرت شاہ صاحب جیسا جلیل القدر عالِم تو کوئی دیکھا ہی نہیں۔

شاہ صاحبؒ کی تقریر کا متن حضرت شاہ صاحبؒ کی اصل عربی تقریر کا متن دارالعلوم دیوبند کی روداد ۱۳۳۰ھ ۱۹۱۲ء سے اخذ کر کے ذیل میں درج کیا جاتا ہے اور اس تقریر کے بیشتر حصّے کا اردو ترجمہ صفحہ نمبر ۳۸۸ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

المحاضرة المرتجلة

للشیخ محمّد انور شاه الکشمیری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔ یقدّم الخویدم فی الحضرة السامیة تحیة الاسلام حیاکم اللہ تعالیٰ انا انستا منکم مخائل الکرم والاعتناء بحالنا و

احسنا بنهضة اسلامية عطفت عليكم وعلينا وانا احوج اليكم منكم الينا هؤلاء اساتذتي و اكابري وذخائري عند الله في يومي وغدي امروني بان امثل لكم شكراً على اسداء الخير ونشر فكيم ايانا بالقدوم المبارك احسن الله اليكم والينا ورفع درجاتكم في الدين والدنيا والآخرة آمين وبه نستعين.

مولينا ان حديثنا حديث ذو شجون والشيئ بالشيئ يذكر ان بلادنا هذه على شقة بعيدة ومسافة شاسعة من بلاد الاسلام كالعراق والشام ومصر فكانت شعائر الاسلام فيها على وهي ومنار العلم على خفاء الا ما شاء الله ومن شاء وقليل ما هم وان عصابتنا هذه عصابة على طريقة قديمة ليست بحديثة اسنادنا في الدين متصل بالصدر الكبير والبدر المنير والامام الشهير الشيخ الاجل ولي الله بن عبد الرحيم الفاروقي الدهلوي وحال الشيخ اظهر من ان يذكر فقد شرقت تصانيفه وغربت لكن بعض احوال الشيخ يحتاج الى اخبار شفاهية وواقعات تلقيتها من مشائخنا كان من امر الشيخ رحمه الله انه اتقن العلوم الدينية ومباديها اولاً على والده العلام الشيخ الهمام عبد الرحيم ثم رحل الى الحرمين زادهما الله شرفاً وتكريماً واستفاد من علمائهما وفقهائهما ولازم الشيخ اباطاهر الكردي في الحديث واجتهد فيه حتى صار الطرد والعكس في الباب و كان الشيخ ابوطاهر يقول فتلقن الالفاظ منا وتلقنا المعنى منه يريد بذلك تبيين ملاحظ الحديث وتعيين مراد الشارع ثم رجع الشيخ ولي الله الى بلاده واشتغل باصلاح ما افسد الناس من سنة النبي الكريم صلى الله عليه وسلم وكان الله اودع في صدره نوراً ينظر به عواقب الامور فتفرس انه ستقوم الحروب بين الحق والباطل فاستعد رحمه الله للدفاع عن الدين والذب عنه فما اعد لذلك ان ترجم القرآن العزيز باللسان الفارسية سماه فتح الرحمن جرده عن الاسرائيليات باسرها اراد بذلك تمهيد التوحيد ثم شرح الموطأ وسماه المسوى على طريقة فقهاء الحديث مع تحقيق المناط وتنقيحه وتخريجه اراد بذلك ما اصطلح عليه علماء الاصول فتحقيق المناط ان يصدر حكم من الشارع في صورة جزئية ثم يثبت ويحقق ذلك في سائر الجزئيات من نوع تلك الصورة مثاله تقويم جزاء الصيد فتعرف القيمة في جزئي هو تحقيق المناط وليس ذلك بقياس فلذا يشترك فيه الخاص والعام ولا يحتاج الى الاجتهاد و تنقيح المناط ان يصدر حكم من الشارع في صور قد اجتمعت هناك امور واتفقت

بعض تلك الامور مناط ذلك الحكم وبعضها لا دخل لها فيه فتعرف الامر الذی هو
العلة تنقيح المناط مثاله ما فی الحديث عن ابی هريرة قال اتی رجل النبی صلی الله عليه و
سلم فقال هلكت قال ما شانك قال وقعت علی امرأتی فی رمضان قال فهل تجد ما تعتق
رقبة قال لا قال فهل تستطيع ان تصوم شهرين متتابعين قال لا قال فهل تستطيع ان
تطعم ستين مسكينا قال لا الحديث. فنقح ابو حنيفة والشافعی مناط وجوب الكفارة كون ذلك
الفعل مفطرا كان جماعا كما فی هذه الصورة او اكلا او شربا بعد ان يكون عمدا فكونه جماعا
فی هذه الواقعة امر اتفاقی كسائر الاتفاقيات وذهب احمد الی ان المناط هو كونه جماعا
فلا يتعدی الحكم الی الاكل والشرب. واحتج بحديث آخر عن ابی هريرة ايضا قال قال
رسول الله صلی الله عليه وسلم من افطر يوما من رمضان فی غير رخصة رخصها
الله لم يقض عنه صيام الدهر حمله علی الاكل والشرب عامدا وقال لا يقضی عنه صيام
الدهر وتخريج المناط ان يحصل حكم من الشارع فی صورة تجتمع هناك امور يصلح كل منها
للعلية فيرجح المجتهد امرا من بين تلك الامور للعلية و يجعله مناطا مثاله حديث
النهی عن الربو فی الاشياء الستة اجتمع هناك امور القدر والجنسية والطعم والثمنية
والاقتيات والادخار فذهب ابو حنيفة الی ان مناط الحكم هو الوصف الاول والشافعی
الی انه الثانی ومالك الی انه الثالث علی ما ادی اليه اجتهادهم. فالفرق بين تنقيح المناط
وتخريجه ان فی الاول اجتمعت امور لا دخل لها مع المناط فنقح المجتهد المناط وفی الثانی
اجتمعت امور كل منها صالح لان يكون مناطا فرجح المجتهد احدها لان يكون مناطا
وتنقيح المناط وتخريجه وظيفة المجتهد يزاحم فيه بعضهم بعضا ومن الامثلة فيه ايضا
حديث مفتاح الصلوة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم فذهب اكثر الائمة الی
ركنية صيغة التكبير والتسليم وخرج ابو حنيفة المناط فيه كون الاول ذكرا مشعرا
بالتعظيم وكون الثانی خروجا بصنع المصلی وقال بفرضية هذين لكن ثبتت مواظبة النبی
صلی الله عليه وسلم علی صيغة التكبير والمشهور انه سنة وقد تحقق فيهما الذكر المشعر بالتعظيم والخروج
بصنع المصلی كتحقق الكلی فی الجزئی فليكونا فرضين وعلی هذا القياس امثلة كثيرة فهذا امر عاه
الشيخ ولی الله فی شرح الموطأ واختار فيه ايضا فقهما جامعا وقد حقق الشيخ ايضا فی كتاب الانصاف
فی بيان سبب الاختلاف وعقد الجيد فی مسائل الاجتهاد والتقليد ان الحق فی موضع الاجتهاد متعدد
وحكاه عن الائمة الاربعة وارتضاه واريد بموضع الاجتهاد ان لا يكون هناك كتاب ولا سنة متواترة

عه وصيغة التسليم فليكونا واجبين. وقد التزم الشيخ ابن الهمام وجوب صيغة التكبير

فالحق هناك متعدد واذا كان هناك قاطع فليس بموضع اجتهاد والحق هنا واحد وهو الموافق لذلك
القاطع فمن وافقه وافق الحق ومن خالفه خالف الحق وصنف الشيخ فى حكم التشريع والعقائد الحقه تصانيف
صارت لكل آت نبراسا ومقياسا منها حجة الله البالغة والتفهيمات الالهية والخير الكثير وغير ذلك ثم
تبعه على ذلك اولاده واحفاده فمن اولاده الشيخ الاجل والصد الاكمل الشيخ عبد العزيز ثم
الشيخ رفيع الدين ثم الشيخ عبد القادر ثم خلف الشيخ عبد العزيز حفيده مفيد العصر ومسنده
المشتهر فى الآفاق الشيخ محمد اسحاق وابن اخيه محى السنة العلامة الجليل الشيخ محمد اسمعيل وكان
الشيخ عبد العزيز يتلو الحمد لله الذى وهب لى على الكبر اسمعيل واسحاق نفع الله بهما هذه البلاد درس
الشيخ محمد اسحق حديث النبى صلى الله عليه وسلم فصار رحلة الاقطار وصنف الشيخ محمد اسمعيل كتبا فى
الفرق بين السنة والبدعة الظلماء فاحى السنة حين كانت اميتت ومات شهيدا وقد تلمذ على الشيخ
محمد اسحق شيخ مشائخنا الشيخ عبد الغنى صار مدار الرواية فى عصره وارتحل اخرا الى المدينة الطيبة
وصار سند تلك البلاد وكثر الاخذ عنه هناك وتلمذ على الشيخ عبد الغنى شمس الاسلام والمسلمين
العارف الحافظ المحقق الشيخ محمد قاسم موسس هذه المدرسة العالية وبانيها والفقيه الحافظ المجتهد الولى
الشيخ رشيد احمد صنف الشيخ محمد قاسم كتبا المعارف والحقائق وكتبا فى الرد على المخالفين من الماديين
والدهريين فنفع الله به كثيرا وقد كنت انشأت هذه الاشعار فى منقبته ـ قفا يا صاحبى على الديار
فمن دأب الشجى هوى الديار الخ ⁂ وكثرت الفتيا وازدحمت المسائل على الشيخ رشيد احمد حين التبس
الحق بالباطل فاجاب فيها بالصواب وكان فقيها مجتهدا فاخذنا ذلك اماما فى الاصول وهذا اماما فى الفروع
وتنقح لنا منها علم منقح مبيض ثم لما استولت الاجانب على هذه البلاد وقامت الحرب بين الحق والباطل اسس
الشيخ محمد قاسم هذه المدرسة العالية فنفع الله بها كثيرا جزاه الله خير الجزاء وغاية المدرسة درس
الحديث وفقه الحديث وكان يرى المبادئ ضرورية والضرورى يقدر بقدر الضرورة حتى ان الشيخ
رشيد احمد حظر الفلسفة وحجر عنها فى بعض السنين فى هذه المدرسة فهذا اسنادنا وطريقة مشائخنا
فى الحديث وفقه الحديث طريقة معتدلة مثلى يتوسطون بين الاطراف اريد بذلك ان للائمة الاربعة
اصولا اربعة اكثرية وذلك ان الامام مالكا يعتنى بعمل اهل المدينة بل قد يرجحه على الحديث المرفوع
والشافعى يأخذ باصح ما فى الباب واحمد يأخذ بالاصح والصحيح والحسن والضعيف اذا كان ضعفه
يسيرا او يجوز هذا وذلك وعلى هذا وضع مسنده وابوحنيفة يأخذ بهذه الاقسام وينزل الاحاديث
على محمل فلذا كثرت التأويلات عند الحنفية وكثرت الجروح على الرواة عند الشافعية . و
الشافعى اول من ابطل الاحتجاج بالمرسل الا اذا اعتضد وامام الصنعة ذلك الامام الهمام

البخاری قد اخذ اصول مالک و الشافعی و رکب بینهما فیاتی باصح ما فی الباب و یراعی مسألة عمل السلف فلذ الروایات بحدیث یعارض حدیثا فی کتابه ولم یخرج فی الکسوف الاحادیث الرکوعین مشیا منه علی اصله و اعتمد مسلم علی ثقة الرواة فاخرج حدیث ثلاث رکوعات و حدیث اربع رکوعات بل حدیث خمس رکوعات ایضا موقوفا علی امیر المؤمنین علی رضی الله عنه فالبخاری قد انتقی و اتبع مسلم القاعدة فمشائخنا یتوسطون فی مثل هذا لا یاخذون بالتشدد ولا بالتساهل و یوجهون الاحادیث المتعارضة بتوجیهات یکاد یقبلها من یسمعها مثاله حدیث القلتین او ثلاثا بالتنویع فهو تقریب فی احالة علی خلوص اثر النجاسة من جانب الی جانب. و ذلک اصل مذهب ابی حنیفة و صاحبیه صرح به الشیخ ابن الهمام و الشیخ ابن نجیم و قد سلمت الاحادیث المعارضة لحدیث القلتین کحدیث النهی عن البول فی الماء الراکد و حدیث النهی عن ادخال الید فی الاناء اذا استیقظ و حدیث ولوغ الکلب فی الاناء و مثاله ایضا احادیث القرأة خلف الامام فانهم لما استدلوا علی ترک القرأة خلف الامام فی الصلوة بقوله تعالی و اذا قرئ القرآن فاستمعوا و انصتوا لعلکم ترحمون. و بقوله صلی الله علیه و سلم و اذا قرأ فانصتوا و بحدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة. اوّلوا احادیث لا تفعلوا الا بام القرآن فانه لا صلوة لمن لم یقرأ بها و ذلک انه لم یصح فی شان نزول الآیة شیئ من الروایات فالعبرة لعموم اللفظ و ایضا فقد روی البیهقی فی کتاب القرأة عن الامام احمد انه اجمع العلماء علی ان هذه الآیة فی القرأة فی الصلوة و حدیث و اذا قرئ فانصتوا حدیث صحیح صححه احمد بن حنبل ثم صاحبه ابو بکر الاثرم ثم مسلم فی باب التشهد من حدیث ابی موسی الاشعری و احال به علی حدیث ابی هریرة ثم صححه ابن خزیمة و الحافظ ابو جعفر بن جریر الطبری و الحافظ ابو عمر بن عبد البر و الحافظ ابن حزم الاندلسی الظاهری ثم الحافظ زکی الدین عبد العظیم المنذری ثم خاتم الحفاظ الحافظ ابن حجر العسقلانی فی الفتح و هذا من حیث الاسناد و اما من عمل السلف و الائمة فقد عمل به جماعات من الصحابة و مالک و احمد و ابو حنیفة و الحدیث اذا کان رواته ثقات ثم ساعده العمل عمل السلف فهو صحیح و بلا ریب لا یقدح فیه قدح ولا یؤثر فیه جرح و حدیث من کان له امام فقراءة الامام له قراءة حکاه الشیخ ابن الهمام عن مسند احمد بن منیع و صححه، فان سنده علی شرط الشیخین و لم نقف الی الآن علی علة فیه و اسناده اخبرنا اسحٰق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان و شریک عن موسی بن ابی عائشة عن عبد الله بن شداد عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله صلی الله علیه و سلم الحدیث و قد ساعده الموقوف عند الترمذی و المرسل عند

قوله فقد رواه یزید بن زریع و کان من حفاظ ... و ابراهیم ... و هذا ... بن خالد و وکیع و یحیی بن ... بلفظ اذا بلغ الماء القلتین او ثلاثا ... العمل بالحدیث ... فیه ان هذا لیس تحدید ... ترمذی

آخرين فاذن هو صحيح نوجه شيخ مشائخنا الشيخ رشيد احمد حديث عبادة من طريق محمد بن اسحاق وسياقه لعلكم تقرأون خلف امامكم قالوا نعم يا رسول الله نهذه هذا قال فلا تفعلوا الحديث فقال هذا دليل الاباحة لا دليل الوجوب فانهم كانوا يقرأون بغير امر منه صلى الله عليه وسلم ولذا سأل بقوله لعلكم تقرأون خلف امامكم فلما قالوا نعم قال فلا تفعلوا الا بأم القرآن فانها سورة متعينة من بين سائر القرآن لا غيرها من السور فعلل النبي صلى الله عليه وسلم اباحتها خلف الامام بكونها متعينة من بين السور للصلوٰة بدونها وظهر عدم كون الصلوٰة بدونها في حق الامام والمنفرد واثر ذلك هي الاباحة في حق المقتدي ومسئلة الاباحة والكراهة مختلف فيها عند الحنفية وان اتفقوا على عدم الوجوب وقالوا في مسئلة رفع اليدين وجهر آمين انه قد صح الرفع والجهر عن النبي صلى الله عليه وسلم وعن الصحابة وقد صح ترك الرفع باسناد صحيح عند ابي داود والاخفاء وقد صح ترك الرفع عن امير المؤمنين عمر و امير المؤمنين علي وكذا صح الاخفاء بآمين عن جماعة من الصحابة والسلف الصالح فليكن كلا الامرين سنة وانما يبقى الشان في الترجيح هذا والله الموفق للسداد في المبدأ والمعاد ثم تلمذ على الشيخ محمد قاسم شيخنا العدل الحجة مسند وقته الشيخ محمود حسن متع الله المسلمين بطول بقائه وهو شيخ المدرسة الآن وعليه المدار في الاسناد في هذه البلاد وهو على طريقة مشائخه ساعد التوفيق الالهي في التوفيق بين المتعارضات وحل المشكلات مثاله ما قال لي مرة ان تعدد الركوع في الكسوف قد ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم امر اختص به ولكن ارشد الامة الى وحدة الركوع فقال صلوا كاحدث صلوٰة صليتموها من المكتوبة فراجعته وقلت ان السادة الشافعية يحملون التشبيه على عدد الركعتين لا على وحدة الركوع فقال ان هذا هو جعل البديهي نظريا فانه اذا كان النبي صلى الله عليه وسلم قد صلى الكسوف بتعدد الركوع بنفسه على اعين الناس ورؤس الاشهاد وكان يشرع تعدد الركوع للامة فلم ترك الاحالة على ما شاهدوه وعدل الى التشبيه بالصبح ما ذلك الا ان التعدد كان لعارض وارشد الامة الى المعروف في الصلوٰة والله الموفق والمعين وآخر دعوينا ان الحمد لله رب العٰلمين ◦

حضرت شاہ صاحبؒ اور علّامۂ اقبالؒ

(مرتبہ کوندو)

ترجمانُ الحقائق علّامہ اقبال مرحوم نہ صرف حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی بصیرت، دِقّتِ نظر، وُسعتِ معلومات اور علوم و فنون میں جامعیت کے معترف و قدردان تھے بلکہ آپ حضرت شاہ صاحب کی نگاہِ التفات کے خواستگاروں میں سے تھے اور اس بحرِ ذخّار سے برابر فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ اس علمی تعلّق کا اعتراف علّامہ مرحوم نے خود کیا ہے اور حضرت شاہ صاحب نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ آپ کے تلمیذ ارشد مولٰینا محمد انوری لائلپوری مرحوم کا بیان ہے کہ حضرت شاہ صاحب خود فرماتے تھے کہ "جتنا استفادہ مجھ سے ڈاکٹر اقبال نے کیا ہے کسی مولوی نے نہیں کیا۔" [1]

خود علّامہ مرحوم کو علومِ قرآن و حدیث پر کافی دسترس حاصل تھی، انہوں نے عربی اور فارسی مولٰینا میر حسن سیالکوٹی مرحوم سے باقاعدہ پڑھی تھی۔ اس لئے انہیں شاہ صاحب سے استفادہ کرنے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی۔

علّامہ اقبال اور حضرت شاہ صاحبؒ کے تعلقات کا باضابطہ آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء سے ہوتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی راوی

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، اپریل ۱۹۶۵ء۔

ہیں کہ :-

"ہندوستان میں سیاسی طور سے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔ چناں چہ جمعیۃ العلماء ہند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے اس کے روحِ رواں (پنجاب کے ہر دل عزیز لیڈر) مولانا عبدالقادر قصوری وکیل (لاہور) تھے۔ اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں لاہور کے بریڈلا ہال میں منعقد ہوا۔ راقم نے اتنے علماءِ دین کا مجمع پھر نہیں دیکھا اور نہ آج تک پھر ایسا جلسہ ہی ہوا۔ اس جلسے کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا طاہر دیوبندی نے کی تھی اور صدرِ جلسہ مولانا آزادؒ کی تجویز کی تائید میں کئی علماء نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا فاخر کانپوری نے کی تھی وہ ایک شاہکار تھی۔ خطبۂ صدارت کو مولانا ابوالکلام آزاد نے خود اور کچھ حصّہ کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور کچھ حصّہ کو مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا۔ اسی جلسہ میں اول مرتبہ میں نے خود علامہ اقبال اور علامہ انور شاہ کشمیری کا تعارف کرایا تھا۔"[1]

اس کے بعد اقبال اور مولانا انور شاہ کی متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ اقبال کی شدید خواہش تھی کہ لاہور میں کسی مستند عالم کو مستقل قیام کی دعوت دی جائے تاکہ علامہ خود اور اہل لاہور اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ اقبالؒ کے نزدیک لاہور میں ایک متنفس بھی ضروریاتِ اسلامی سے آگاہ نہیں تھا اور پنجاب عملی طور پر بانجھ تھا۔ چنانچہ اکبر الٰہ آبادی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :-

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند، مارچ ۱۹۷۵ء ص ۱۸ :

"یہاں لاہور میں ضروریاتِ اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں، پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہوگیا ہے، صوفیاء کی دو کانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی"

ایسے میں علامہ اقبال کی نظرِ انتخاب برصغیر ہندو پاک کی دو (عظیم المرتبت) شخصیات پر پڑی جنہیں لاہور میں مستقل قیام کی دعوت دی جاسکے، ایک استادِ کل اور علومِ اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد مولینا سید سلیمان ندوی رح اور دوسرے دنیائے اسلام کے جید ترین محدثِ وقت مولینا محمد انور شاہ کاشمیری رح لیکن بدقسمتی سے دونوں بزرگ لاہور نہ آسکے۔ یہ ۲۱ جنوری ۱۹۲۲ء کی بات ہے جب اقبال رح نے مولینا انور شاہ کے قیام کے انتظامات کر لئے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مزید لکھتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ علامہ انور شاہ صاحب لاہور میں اتفاق سے تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرون موچی دروازہ رنگ محل لاہور) میں پیر عبدالغفار شاہ صاحب[۱] (المتوفی ۱۳۴۰ھ) کے ہاں مہمان تھے، اس وقت ادھر آپ کی موجودگی میں لاہور میں، علامہ اقبال نے ہر دو انجمنوں سے معاملہ فہمی بھی کرلی تھی کہ اگر آپ یہاں تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہی مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علومِ دینِ اسلام کے سربراہ ہوں گے"[۲]

---

[۱] خاندانِ مسعودی میں پیر عبدالغفار شاہ صاحب ایک خدا دوست بزرگ گزرے ہیں، آپ کا سلسلۂ نسب نویں پشت پر حضرت شاہ صاحب کے سلسلۂ نسب کے ساتھ جا ملتا ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو ماہنامہ "دارالعلوم" مارچ ۱۹۷۵ء مضمون جناب قاضی افضل حق قریشی۔

مارچ ۱۹۲۵ء میں جب مولینا انور شاہ انجمنِ خُدام الدین لاہور کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو اقبالؒ نے انہیں یہ خط لکھا:۔

"۱۳، مارچ ۱۹۲۵ء

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولینا!

السّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

مجھے ماسٹر عبداللہ سے ابھی معلوم ہوا ہے کہ آپ انجمنِ خُدام الدین کے جلسہ میں تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرماویں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصوّر کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مُخلص کے ہاں کھانا کھائیں، جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمان کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے، مجھے امید ہے کہ جناب اس عریضے کو شرفِ قبولیت بخشیں گے۔ آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لئے سواری یہاں سے بھیجدی جائے گی۔"

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی اس ملاقات کی تفصیل اس طرح لکھتے ہیں:۔

"مارچ ۱۹۲۵ء میں لاہور میں انجمن خدام الدین کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ ہوا۔ اس انجمن کے روحِ رواں مولوی احمد علیؒ تھے جس میں خصوصیت سے علماءِ دیوبند محمد انور شاہ صاحب، مولینا حبیب الرحمان صاحب عثمانیؒ، مولینا شبیر احمد عثمانی اور مفتی عزیزُ الرحمان وغیرہم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں ان تمام علماءِ کرام نے شرکت کی تھی۔ ان میں مرحوم مولینا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی حبیبُ الرحمان لدھیانوی بھی مدعو تھے۔ اور علامہ اقبال کے سامنے اس وقت محض یہ مدِ نظر تھا کہ کسی طرح علامہ انور شاہ صاحب کو ان

سے استفادہ کرنے کے لئے مستقل طور پر یہاں بلایا جائے۔[1]

۱۹۲۶ء میں جب حضرت شاہ صاحب بطور احتجاج دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہوئے تو علامہ اقبال مرحوم کو اس سے خوشی ہوئی۔ خوشی اس لئے ہوئی کیونکہ آپ کو خیال تھا کہ شاید اب مولینا قیام لاہور پر راضی ہو سکیں گے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اپنے رفقاء خصوصاً مولینا محمد بن موسیٰ سملکی کے اصرار پر جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا۔ بہرحال اس سلسلے میں مولینا سعید احمد صاحب اکبرآبادی رقمطراز ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں اختلافات کے باعث جب حضرۃ الاستاذ نے اپنے عہدۂ صدرُ الاساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد (میں) ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمانے لگے کہ آپ کا اور دوسرے مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو، میں بہرحال استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں، میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا: کیا آپکو دارالعلوم دیوبند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا، کیوں نہیں! مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی لیکن اسلام کے لئے جو کام میں شاہ صاحب سے لینا چاہتا ہوں اس کو سوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا، اس کے بعد انہوں نے اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے۔ جس میں زندگی کے سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی،

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند مارچ ۱۹۷۵ء

سیاسی، معاشی اور سماجی احوال و ظروف نے پیدا کر دیا ہے، مجھ کو پورا
یقین ہے کہ اس کام کے لئے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی
کچھ کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور شخص اس وقت عالمِ
اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم ذمہ داری کا حامل ہو سکے،
پھر فرمایا، یہ مسائل کیا ہیں؟ اور ان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ میں
ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں، یہ سب
مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کروں گا اور ان کا صحیح
اسلامی حل کیا ہے؟ یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے
اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی[1]۔"

بہرحال جب حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے علیحدگی
اختیار کی تو اقبال مرحوم نے انہیں ایک تفصیلی تار دیا اور انہیں لاہور
آنے کے لئے اصرار کیا۔ اس سلسلے میں مولینا عبدالرشید صاحب
ارشد، مولینا عبدالحنان ہزاروی کی زبانی یوں رقمطراز ہیں:-

"جب حضرت شاہ صاحب نے دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دیدیا"
میں ان دنوں لاہور آسٹریلیا جامع مسجد میں خطیب تھا۔ ڈاکٹر صاحب
نے دیوبند ایک تفصیلی تار دیا جس میں شاہ صاحب سے درخواست کی
گئی تھی کہ اب آپ لاہور تشریف لے آئیں اور یہیں قیام فرمائیں۔
جوابی تار تھا جس کا کوئی جواب نہیں آیا، جس پر ڈاکٹر صاحب نے مجھ
کو دیوبند بھیجا کہ تم جاکر زبانی عرض کرو، میں گیا تو معلوم ہوا کہ شاہ
صاحب کو وہ تار اس وقت دیا گیا جب ڈابھیل والوں نے اصرار کر کے
وہاں تشریف لے جانے پر رضامند کرایا تھا۔ میں ملا تو فرمایا افسوس

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۱۶۵، ۱۶۶ یا زیرِ نظر کتاب میں مولینا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا مقالہ۔

کہ آپ کا پیغام بعد میں ملا اور میں ڈابھیل والوں سے وعدہ کر چکا ہوں"۔[1]

بہر حال حضرت شاہ صاحب۔ اگرچہ لاہور نہ جا سکے لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال مرحوم ان سے برابر استفادہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مولینا قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"علامہ اقبال مرحوم کے خیالات کی بہت حد تک اصلاح حضرت ممدوح کے ارشادات سے ہوئی۔ اُن کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پُر آتے تھے اور حضرت اُن کے شافی جوابات لکھتے جس سے اُن کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی"[2]

لیکن بدقسمتی سے علم وعمل کے ان دو سرمایہ داروں کی خط وکتابت نامعلوم وجوہات کی بناء پر محفوظ نہ رہ سکی۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت شاہ صاحب کا ایک منظوم رسالہ "ضربُ الخاتم علیٰ حدوثِ العالم" حدوثِ عالم کی بحث پر ہے چارسو اشعار پر مشتمل یہ رسالہ حجم میں تو بہت مختصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں علم کا ایک سمندر موجود ہے۔

اور جب یہ رسالہ شائع ہوا تو حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ایک نسخہ اقبالؔ مرحوم کو بھی بھیجا۔ اس بارے میں مولینا سعید احمد اکبر آبادی کا بیان ہے کہ "ڈاکٹر صاحب جس ذوق اور جس استعداد کے بزرگ تھے اس کے اعتبار سے اُن کے لئے کوئی تحفہ اس چند ورقی رسالہ سے زیادہ قیمتی ہو نہیں سکتا تھا۔ بڑے خوش ہوئے اور پورا رسالہ بڑی توجہ اور غور وفکر کے ساتھ پڑھا۔ میں اس زمانہ میں بسلسلۂ طالب علمی لاہور میں

---

[1] ملاحظہ ہو ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، مارچ ۱۹۷۵ء ص ۲۰

[2] حیاتِ انور ص ۲۲۵۔

مقیم تھا اور گاہے گاہے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی علمی و ادبی مجلس سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک صحبت میں ایک مرتبہ فرمایا کہ میں تو مولٰینا انور شاہ صاحب کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دِن قال اللہ اور قال الرسول سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی اُن کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسائل پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوثِ عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھ دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وہ رسالہ میرے حوالہ کیا اور فرمایا کہ اس میں چار شعر ایسے ہیں جن کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے اُن پر نشان لگا دیا ہے۔ آپ اب دیوبند جائیں تو یہ نسخہ ساتھ لیتے جائیں اور شاہ صاحب سے ان اشعار کا مطلب دریافت کرتے آئیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل کی۔ دیوبند آکر وہ رسالہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کا پیغام پہونچایا۔ لیکن حضرت الاستاذ نے مجھ کو اُن اشعار کا مطلب سمجھانے کے بجائے یہی مناسب خیال فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب کو فارسی میں ایک طویل خط لکھیں اور اسی میں ان اشعار کا مطلب بھی تحریر فرمادیں۔ یہ خط میں ہی دستی لیکر لاہور آیا اور ڈاکٹر صاحب کو پہونچادیا۔" [۱]

اسی طرح مسئلۂ زمان و مکان ایک عرصہ تک علامہ اقبالؒ کے مطالعہ کا محوَر رہا ہے کیونکہ فلسفے میں علامۂ اقبالؒ کو اس سے کافی دلچسپی تھی۔ اس سلسلہ میں مزید معلومات اور ذاتی آراء حاصل کرنے کے لئے جہاں دیگر محققین کے ساتھ ان کی خط و کتابت جاری تھی وہاں حضرت شاہ صاحب کی

---

[۱] ملاحظہ ہو حیاتِ انور، ص ۱۶۴، ۱۶۵؎

خدمت میں نہ صرف خطوط ارسال کئے بلکہ کئی بار حضرت شاہ صاحب سے بالمشافہ بھی ملے اور فلسفہ کے رموز و دقائق پر حضرت شاہ صاحب کے ارشادات سن کر مستفید ہوئے۔

ایک بار اسی مسئلۂ زمان و مکان پر حضرت شاہ صاحب اور ڈاکٹر اقبالؒ کے درمیان گفتگو شروع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ اثباتِ باری پر نیوٹن کی اور نیوٹن پر لکھی ہوئی عمدہ کتابیں ہیں۔ اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا "میں نے اس کی پندرہ تصانیف دیکھی ہیں لیکن میں نے اپنی کتابوں "ضربُ الخاتم" اور "مرقاۃُ الطارم" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے اسکو نیوٹن نہیں پہنچ سکا۔ اسی طرح ایک بار حضرت شاہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو علامہ عراقی کا ایک قلمی فارسی رسالہ دیا جس کا نام "غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان" ہے۔ پھر شاہ صاحب نے کہا: نیوٹن نے جو کچھ لکھا ہے علامہ عراقی سے لیا ہے۔ اس کی اپنی تحقیق نہیں ہے، ڈاکٹر صاحب یہ سن کر حیران رہ گئے۔ یورپ کے اخباروں تک میں بیان دئے۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر اقبالؒ نے کی تھی، اس جلسہ میں ڈاکٹر صاحب نے یہ قصہ سنایا۔ جلسہ میں کلکتہ سے آئے ہوئے پروفیسروں کے علاوہ حیدر آباد سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خان شیروانیؒ بھی تشریف لائے تھے ڈاکٹر اقبالؒ نے جلسہ میں یہ قصہ سنایا تو حاضرین کی حیرت کی انتہا نہ رہی" [1]

۱۹۲۸ء میں اقبال مرحوم اورینٹل کانفرنس لاہور کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدارتی خطبے حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعے کی دعوت میں لکھتے ہیں:-

"لیکن جدید ریاضیات کے اہم ترین تصورات میں سے ایک تصور کا

---

[1] "دار العلوم" اگست ۱۹۷۴ء

یہ مختصر حوالہ بالا میرے ذہن کو عراقی کی تصنیف "غایۃ الامکان فی درایۃ المکان" کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ مشہور حدیث لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ إِنَّ الدَّهْرَ هُوَ اللّٰه میں دھر (بمعنی TIME) کا جو لفظ آیا ہے اس کے متعلق مولینا انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اس مراسلت کے دوران میں مولینا موصوف نے مجھے اس مخطوطے کی طرف رجوع کرایا اور بعد ازاں میری درخواست پر از راہِ عنایت مجھے اس کی ایک نقل ارسال کی" [1]

اقبال مرحوم نے اپنے معرکۃ الآراء چھ انگریزی خطبات

"The Reconstruction of Religious thought in Islam"

کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب سے ختم نبوت، قتلِ مرتد اور مسئلۂ زمان و مکان کے بارے میں خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

اسی طرح قادیانیت کے خلاف ڈاکٹر صاحب کا جو فاضلانہ مقالہ ہے وہ دراصل نتیجہ ہے حضرت شاہ صاحبؒ کی فیضِ صحبت کا۔ جب علامہ مرحوم نے یہ مقالہ تحریر فرمایا تو اسے انگریزی اخبارات نے بھی شائع کیا جس سے پورے پنجاب میں ایک تلاطم کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔

بہاولپور کے معرکۃ الآراء مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب ۱۹ر اگست ۱۹۳۲ء کو بہاولپور پہنچے، ۲۵ اگست کو ان کا بیان شروع ہوا جو متواتر پانچ روز تک جاری رہا۔ مولینا محمد انوری لائلپوری کا بیان ہے کہ اس سفر کے دوران حضرت شاہ صاحب نے لاہور میں بھی دو روز قیام فرمایا۔ آسٹریلین بلڈنگ کی مسجد میں بعدِ نمازِ فجر وعظ فرمایا علماء و فضلاء عوام و خواص بالخصوص ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور ان کے ساتھی

---

[1] دار العلوم مارچ ۱۹۷۵ء

اہتمام سے حاضر ہوتے تھے۔ الخ [1]

چونکہ اس سفر سے واپسی کے بعد حضرت شاہ صاحب کی تکلیف نے شدت اختیار کی اور آپ صاحب فراش ہوئے یہاں تک کہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء کو جان جان آفریں کے سپرد فرمائی۔

اس لئے اغلب ہے کہ متذکرہ صدر ملاقات (یعنی اگست ۱۹۳۲ء) ہی علامہ اقبالؒ اور علامہ انور شاہؒ کی آخری ملاقات رہی ہو۔

حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر اقبال مرحوم کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا؟ اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال اگر اپنے وقت میں کسی عالم الدین سے متاثر ہوئے تھے، وہ حضرت شاہ صاحب کی ہی ذات گرامی تھی۔

بہرحال علامہ اقبالؒ نے مولانا مرحوم کو جن الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں:-
"اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے"۔ (چٹان لاہور پاکستان بحوالۂ دار العلوم مارچ ۱۹۷۵ء ومقدمہ انوار الباری جلد ۲ ص ۲۲۵)

دل کو روؤں کہ یا جگر کو میرؔ
میری دونوں سے آشنائی ہے

علامہ اقبالؒ روحِ اسلام کی جہاں گیریت اور اپنے فلسفہ کی آفاقیت کے باوجود کشمیر اور کشمیریت کے لئے ایک خاص جذبہ اپنے قلب کی نہاں خانہ میں محفوظ پاتے تھے جن کا اظہار وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور، ص ۳۲۷

حضرت شاہ صاحب کی ذات سے آپ کے بے نظیر علم و عمل اور عبقریت کے علاوہ کشمیریت کی وجہ سے بھی علامہ کو محبت تھی۔ حضرت شاہ صاحب کے انتقال کے بعد علامہ کی خود اپنی بقیہ زندگی کے جو چار پانچ سال ہیں، وہ بیماریوں اور جسمانی عوارضات کی نذر ہوئے ہیں اور اس دور میں موصوف نے اپنے احساسات کو اکثر چارپائی پر لیٹے لیٹے لکھا ہے یا لکھوا دیا ہے۔ اسی زمانہ کے کوئی ۱۹ قطعات ہیں جو "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" کے عنوان کے تحت ارمغانِ حجاز میں شامل کیے گئے ہیں۔ پہلا قطعہ صاف صاف حضرت شاہ صاحب کی جدائی میں رنج و غم اور حسرت کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ شاعر حضرت شاہ صاحب کے مقامِ پیدائش لولاب کو بھی اپنی سوگواری میں شریک بنا کر "اے وادیٔ لولاب، اے وادیٔ لولاب" کی تکرار کر رہا ہے۔ اس نظم سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں حضرت شاہ صاحب منبر و محراب کے حقیقی وارث، نوابلہائے جگر سوز کے نے نواز، فغانِ سحری سے دلوں کو بیدار کر دینے والے درویش اور ایک عظیم الشان کشمیری تھے۔ اس لئے علامہ نے اپنے ان خیالات کو جو کشمیر کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ان انیس قطعات میں ظاہر کئے گئے ہیں، حضرت شاہ صاحب کا فیضان قرار دیکر کہتا ہے "ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض"

ان قطعات میں بعض دیگر شخصیات مثلاً میر واعظ مولینا محمد یوسف شاہؒ، مولینا میرک شاہ اندرابیؒ اور شیخ و برہمن وغیرہ کی طرف بھی تلمیحات ہیں۔ (قطعہ ۹ و ۱۱ جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۸ء (علامہ کی وفات تک) کشمیر کی سیاست کے پس منظر میں موجود تھے۔ ان میں سے ہر ایک پر علامہ کی نظر تھی لیکن جو بلند امیدیں موصوف نے

حضرت شاہ صاحب کی ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں۔ وہ رسمی سیاست سے وراء الوراء تھیں۔ اس پس منظر میں "اے وادیٔ لولاب" کا قطعہ پڑھ لیجئے تاکہ اقبال اور انور شاہ کے باہمی تعلقات کا کچھ اندازہ ہو جائے۔

اے وادیٔ لولاب!

۱. پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیٔ لولاب!
۲. گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیٔ لولاب!
۳. ہیں ساز پہ موقوف نواہائے جگرسوز ڈھیلے ہوں اگر تار تو بیکار ہے مضراب
اے وادیٔ لولاب!
۴. مُلّا کی نظر نورِ فراست سے ہے خالی بے سوز ہے میخانۂ صوفی کی مئے ناب
اے وادیٔ لولاب!
۵. بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے اس قوم میں مدّت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب!

شاہ صاحبؒ اور مولانا مفتی محمد کفایت اللہؒ

(مرتبہ کوندو)

محدّث کشمیری حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت علامہ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کے باہمی تعلقات کو سمجھنے کے لئے پہلے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ہر دو حضرات حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ دونوں ازہر ہند دار العلوم دیوبند سے امتیازی شان کے ساتھ فارغ التحصیل ہوئے تھے اور دونوں ہی فقہ اسلامی کی حنفی شاخ کے ان ماہرین میں سے تھے جو امام اعظمؒ کے اجتہادات کے لئے قرآن و حدیث اور تعامل صحابۂ کرامؓ سے سندات پیش کرنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ نیز دونوں جمعیۃ العلماء ہند کے ممتاز و مقتدر رہنما تھے اور وطنی سیاست میں بقدرِ وسعت حصہ لیتے تھے۔ اسی لئے دونوں ایک دوسرے کی علمی صلاحیتوں کے قدر دان اور معترف تھے۔

حضرت شاہ صاحب کے فرزند اکبر مولینا محمد ازہر شاہ صاحب قیصر ان دونوں حضرات کے باہمی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

(۱) حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اگر "عالم الدین والدنیا" کہہ کر مفتی صاحبؒ کو خراجِ تحسین ادا کیا اور مختلف مواقع پر ان کے متعلق مدح و

تعریف کے وہ کلمات کہے جو اپنے معاصرین میں سے کسی شخص کے متعلق ان کی زبان پر نہیں آئے تو حضرت مفتی صاحب نے بھی حضرت شاہ صاحب کی رفاقت و دوستی کا حق ادا کیا، ہمیشہ ان کے احترام میں اپنی آنکھیں بچھائیں، ہمیشہ ذاتی معاملات میں انہیں خیر خواہانہ مشوروں سے مستفید فرمایا۔"[1]

(۲) دیوبند میں ملتان سے کھلا ہوا حضرت مفتی صاحب کا ایک کارڈ آیا کہ میں کل شام جیل سے رہا کر دیا گیا ہوں۔ آج دہلی روانہ ہو رہا ہوں۔ پرسوں صبح دہلی پہنچوں گا۔ یہ دو سطریں حضرت شاہ صاحب کے لئے ایک پیغام مسرت ثابت ہوئیں۔ وسیع علمی مشاغل اور بے حد سنجیدگی و وقار کے باوجود مسکراہٹ ان کے چہرہ پر کھیل گئی۔ فرط مسرت سے غنچۂ نورس کی طرح کھل کھل گئے۔ تیسرے دن دہلی تشریف لے گئے اور امینیہ کے دروازہ پر علم و فضل کے یہ دو سرمایہ دار پُرتپاک طریقہ پر ایک دوسرے سے ملے۔" الخ

("مفتی اعظم کی یاد"۔ از مولانا حفیظ الرحمٰن واصف ص۱۵۷)

حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی صاحب کے تعلقات آخر عمر تک نہایت استوار تھے اور اکثر و بیشتر حضرت مفتی صاحب علمی تحقیقات حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں پیش فرماتے رہتے تھے۔

جب حضرت شیخ الہندؒ کے اصرار اور دوسرے اکابرین دیوبند کی تجویز پر حضرت شاہ صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس پر مامور ہوئے تو بھی ان دونوں کے تعلقات پہلے کی طرح قائم رہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" ص ۵۲۔

اور جب زندگی کے آخری حصہ میں یعنی وفات سے ۸ سال پہلے حضرت شاہ صاحبؒ نے دار العلوم دیوبند سے انتظامی معاملات پر اختلاف کر کے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا تو اس دوران بھی علم وفضل اور ورع وتقویٰ کے ان دو سرمایہ داروں کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ زندگی کے ان آخری سالوں میں حضرت شاہ صاحب کا معمول تھا کہ ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے مدرسۂ امینیہ میں حضرت مفتی صاحب کے پاس ایک دو دِن قیام فرماتے تھے اور علمی دقائق کو حل کرنے میں باہم تبادلۂ خیالات بھی فرماتے تھے۔

مولانا کفایتُ اللہ مرحوم رسالہ "روضُ الریاحین" (جو مدرسۂ امینیہ دہلی کی مختصر تاریخ ہے) کے آخر پر حضرت شاہ صاحب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

نبیہٌ فائقُ الاقرانِ یُدعیٰ — بانورشاہ موموق الحسودِ

بزرگ مرتبہ ہمسروں پر فائق جن کو انور شاہ کہہ کر پکارا جاتا ہے، حاسدوں کے محبوب ہیں۔

فہٰذا الحبرُ غارسُ ذا النخیلِ — واوّلُ موقظ القومِ الرقودِ

کیونکہ یہ علّامہ اس درخت کے لگانے والے ہیں اور سوئی قوم کو اوّل اوّل جگانے والے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی شہرۂ آفاق تصنیف "اِکفارُ الملحدین فی ضروریات الدّین" کے اختتام پر اکابر علماء کی جو تقریظات ہیں ان میں مولانا مفتی محمّد کفایتُ اللہ کی بھی فاضلانہ تقریظ شامل ہے۔ کتاب مذکور پر تبصرہ فرماتے ہوئے حضرت مفتی صاحب نے اپنے رفیقِ محترم کو "عمدۃ زمانہ"، "صدرُ الافاضل" اور "فخرُ الاماثل" جیسے القاب سے نوازا ہے۔ پوری تقریظ عربی فصاحت و بلاغت کا قابلِ قدر آئینہ ہے۔ اس لئے

قارئین کرام کی تفریح طبع کے لئے من وعن پیش خدمت ہے:۔

الحمد لله الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعلمین نذیرا بعثه بالحق داعیا الی الله باذنه وسراجا منیرا وختم به النبوة و الرسالة فجاء خاتم النبیین والمرسلین بشیرا و نذیرا صلی الله علیه وعلی اٰله واصحابه وسلم صلوٰة متوالیة وسلاما کثیرا۔ **امابعد** فانه قد کان یختلج فی صدور بعض الناس تسجیل العلماء بکفر الطائفة القادیانیة القائلة بنبوة محدثها (مرزا غلام احمد القادیانی) وبکفر الفرقة الاحمدیة القائلة بان مرزا غلام احمد المذکور کان مسیحا موعودا و مهدیا منتظرا ومجددا جلیلا وولیا نبیلا وانه لم یدعی النبوة والرسالة وان سمی نفسه نبیا ورسولا وادعی الوحی والالهام وسوی بین وحیه ووحی الانبیاء ظنا منهم انهم متاولون وتوقف فی تکفیر امثالهم السلف الصالحون فقام العلامة عمدة زمانه ورحلة اوانه صدر الافاضل وفخر الاماثل المولی المقدام والحبر الهمام مولانا محمد انور شاه صدر الاساتذه بدار العلوم الدیوبندیة مشمرا عن ساق التحقیق ورافعا لواء التدقیق فکشف عن المرام ومحا الظلام نحی الستر وجلی الامر فی عجالة سماها "اکفار الملحدین" نفس فیها درا وجود غررا فلم یترک مساغا للشک والاختلاج تزیل سطورها کانها للایقان فجاج جزاه الله عنا وعن سائر المسلمین وقطع بما ابدی دابر الملحدین ونقی به لون الدین المبین وازاح کید الخائنین الظالمین۔ محمد کفایت الله عفی عنه ربه وکفاه

۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۳ھ۔

حضرت مفتی صاحب مرحوم کے دل میں حضرت شاہ صاحب کی کتنی قدر و منزلت تھی، اس کا اظہار تو حضرت موصوف نے عمر بھر بار بار کیا ہے۔ خصوصاً حضرت شاہ صاحب کی وفات حسرت آیات پر سہ روزہ الجمعیۃ (جون ۱۹۳۳ء) میں حضرت مفتی صاحبؒ نے خود اپنے قلم سے تعزیتی اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں اپنے دردِ دل کا اظہار کرنے کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کی علمی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔ افادیتِ عام کے لئے اس اداریہ کے اقتباس کو ذیل میں درج کرنا غیر مناسب نہ ہوگا۔

"آہ! قدرت کے زبردست ہاتھ نے حضرت مولٰنا العلّامۃ الفاضل الکامل، اکمل العلماء، افضل الفضلاء النحریر المقدام، البحر الطمطام، رحلۃ العصر، قدوۃ الدہر، استاذ الاساتذہ، رئیسُ الجہابذہ محدّثِ وحید، مفسّرِ فرید، فقیہہ بیگانہ، ماہر علوم النقلیۃ و العقلیۃ مولٰینا انور شاہ قدس سرہ کو آغوشِ رحمت میں کھینچ لیا اور ہم سے ظاہری طور پر ہمیشہ کے لئے جُدا کر دیا۔ حضرت شاہ صاحب کی وفات بلاشبہ وقتِ حاضر کے کامل ترین عالمِ ربّانی کی وفات ہے جن کی نظیر مستقبل میں متوقع نہیں، طبقۂ علماء میں حضرت شاہ صاحب کا تبحّر، کمالِ فضل، ورع و تقویٰ اور جامعیت و استغنا مُسلّم تھا۔ موافق و مخالف ان کے سامنے تسلیم و انقیاد سے گردن جُھکا دیتا تھا"۔ ؎[1]

حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ رشید مرحوم مولٰینا لائلپوری حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی صاحب موصوف کے باہمی تعلقات کو بیان فرماتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:۔

---

[1] ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۱۲۱۔

"حضرت مفتی صاحب سے ہمارے شاہ صاحب قدس سرہٗ کو بہت تعلق اور شغف تھا، بہاولپور کے مقدمہ پر جب حضرت تشریف لے گئے، احقر بھی ہمراہ تھا، لاہور پہنچکر فرمایا، مولٰینا کفایت اللہ صاحب ملتان جیل میں ہیں اُن سے ملکر آگے جانے کا خیال ہے۔ چناں چہ ملتان کا ٹکٹ لیا گیا اسٹیشن پر خدّام کا مجمع استقبال کے لئے موجود تھا۔ شہر میں تشریف لے جاتے ہی تقاضا فرمایا کہ ہمیں سنٹرل جیل مولٰینا سے ملاقات کرنا ہے۔ مجلسِ احرار کے کارکنوں نے اجازت حاصل کرنے کا انتظام کیا، احقر کو بھی ساتھ لیا، جیل تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی صاحب کو جب معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ملاقات کے لئے تشریف لائے، معانقہ مصافحہ ہوا، دیر تک آنسو بہاتے رہے۔ بار بار حضرت سے خیریت دریافت کرتے تھے۔ بڑی ہی مسرّت کا اظہار فرمایا، احقر سے بار بار پیار فرماتے۔ پھر مولٰینا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، مولٰینا قاری عبد الرحمٰن مرحوم، مولٰینا احمد سعید صاحب دہلوی، مولٰینا عبد الحلیم صاحب صدیقی، مولٰینا داؤد غزنوی، مظہر علی اظہر، چودہری افضل حق صاحبان یہ سب حضرات بھی چونکہ اس جیل میں نظر بند تھے اس لئے حضرت شاہ صاحب کی زیارت کے لئے جمع ہو گئے۔ عجیب مجلس تھی، مولٰینا داؤد صاحب غزنوی نے حضرت مفتی صاحب مرحوم کی وساطت سے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ وہ مفردات القرآن علامہ راغب اصبہانی کا اردو ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، حضرت بہت خوش ہوئے اور مولٰینا کے دریافت کرنے پر بہت سی کتب کے نام نوٹ کروائے جن سے امداد لی جا سکے۔ زمانۂ جیل میں علمی و دینی خدمات تحریری کے متعلق سب حضرات سے فرداً فرداً بھی گفتگو فرماتے رہے، ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی، آخر میں فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو حکومت نے جب جیل بھیجا تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ شاگردوں میں کون صاحب زیادہ

محبوب ہیں؟ آپ نے حافظ ابن قیمؒ کا نام لیا، ان کو بھی ساتھ ہی نظر بند کر دیا گیا پوچھا گیا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہئے۔ آپ نے کاغذ، قلم اور دوات طلب کی، یہ سامان دے دیا گیا، آپ نے لکھ لکھ کر سب کاغذات پُر کر دئے۔ اس کے بعد جیل کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا، یہ حضرت مولٰنا کفایت اللہ مرحوم اور حضرت مولٰنا احمد سعید صاحب دہلوی کی طرف اشارہ تھا کہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ ان کے محبوب شاگرد کو بھی نظر بند کر دیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب جمعیۃ علماءِ ہند کی مجلسِ منتظمہ کا کوئی اجلاس کامیاب نہیں سمجھتے تھے جس میں حضرت شاہ صاحب کی شمولیت نہ ہو، اکثر مشاورت کے لیے خود دیوبند تشریف لاتے یا حضرت کو تار دیکر دہلی بُلاتے۔ رسالۂ "فصلُ الخطاب فی مسئلۃ اُمّ الکتاب" جب مطبع قاسمی والوں نے جلد طبع کر کے نہ دیا تو کاپیاں احقر اور مولٰنا محمد ادریس صاحب سکروڑوی کے ہاتھ حضرت مفتی صاحب کے پاس دہلی بھیجیں تاکہ اپنی نگرانی میں طبع کرادیں[۱]"۔

حضرت شاہ صاحب اور حضرت مفتی صاحب رحمہما اللہ کے انتقال سے وہ نقصان ہوا جس کی تلافی مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ان کی وفات سے تدریس حدیث و تفسیر، تفہیم فقہ اور ارشاد و تلقین ہی یتیم نہیں ہوئے بلکہ سیاست و فتویٰ اور معاشرت و اصلاح کے دو عظیم الشّان حکیم بھی ہم سے رخصت ہوئے۔

"خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را"

✽

---

[۱] ملاحظہ ہو حیاتِ انور، ص ۳۰۶، ۳۰۷۔

حضرت شاہ صاحبؒ اور علامہ عثمانیؒ

(مرتبہ: کوندو)

مفسرِ قرآن، شارح صحیح مسلم اور مملکتِ پاکستان کے اوّلین شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ حضرتِ شاہ صاحبؒ کے رفیق خاص تھے۔ باوجودیکہ وہ خود جید عالم و فاضل تھے لیکن بایں ہمہ حضرت شاہ صاحب سے انہوں نے کافی استفادہ کیا ہے جس کے وہ خود معترف ہیں۔ چناں چہ حضرت موصوف نے حضرت شاہ صاحب کی امالی فیض الباری علیٰ صحیح البخاری پر جو تقریظ تحریر فرمائی ہے اس میں آپ حضرت شاہ صاحب کی عظمت، علم حدیث اور علم فقہ میں ان کے علوِّ مرتبہ کا ذکرِ جمیل فرمانے کے بعد یوں رقمطراز ہیں:۔

"میں نہ ان کے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ میرا ان کے ہم سبقوں میں شمار ہے، بس مجھے ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں ان کے ساتھ مشکلاتِ فن اور دقیق مسائل میں مذاکرہ سے ایک زمانۂ دراز تک استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کوئی میری کتاب "فتح الملہم بشرح صحیح مسلم" کا مطالعہ کریگا اس پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی"۔ (مقدمہ فیض الباری ص۳۸)

بطورِ نمونہ اس سلسلے میں ہم ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر حضرت محدث کشمیری کا ذکرِ خیر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"سألتُ الشيخَ العلّامةَ النقيَّ التقيَّ الذي لم ترَ العيونُ مثلَه،	"میں نے خدا ترس، پاک طینت شیخ العلامہ (انور شاہ) جن کا مثل ہماری

وَلَمْ یَرَ ھُوَ مِثْلَ نَفْسِہٖ وَلَوْ
کَانَ فِی سَالِفِ الزَّمَانِ لَکَانَ
لَہٗ شَأْنٌ فِی طَبَقَۃِ اَھْلِ الْعِلْمِ
عظیم وھو سیدنا ومولینا
الانور الکشمیری ثم الدیوبندی
اطال اللہ بقاءہ عن تفسیر
اوائل سورۃ النجم وتحقیق
رؤیۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ربہ فقرر الشیخ تقریرا حسنا
بلیغا جامعا لاشتات الروایات
واطراف الکلام منبہا علی اغوار
القرآن فالتمست منہ ان یقیدہ
بالکتابۃ لتعم الفائدۃ فاستجاب
الملتمس وعلی اللہ اجرہ مع وجود
الشواغل الکثیرۃ" لہ

آنکھوں نے نہیں دیکھا ہے، اگر وہ گذشتہ
زمانے میں ہوتے تو اہلِ علم کے طبقہ میں
ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے سردار
مولانا انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی ہیں۔
اللہ تعالیٰ انہیں تادیر قائم رکھے۔ میں نے
ان سے سورۂ النجم کی ابتدائی آیتوں کی تفسیر
اور رسالت مآبؐ کے دیدارِ الٰہی کی تحقیق
کے متعلق درخواست کی تھی، جس کو
انہوں نے شرفِ قبولیت بخشا اور
نہایت نفیس اور فصیح و بلیغ تقریر کی۔
جس میں متفرق روایات اور بحث کے تمام
گوشوں کو سمیٹ لیا ہے اور قرآنِ مجید کی
گہرائیوں پر تنبیہ فرمائی ہے۔ میں نے
ان سے درخواست کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں
تاکہ اس سے فائدہ عام ہو جائے، انہوں نے
گوناگوں مشغلوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان
لی، اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے"۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ہجرت و اسارت اور آپ کے انتقال کے بعد صحیح بخاری اور جامع ترمذی کی تدریس حضرت شاہ صاحب کے لئے اور صحیح مسلم کی مولانا عثمانی کے لئے مخصوص تھی۔ تمام اہلِ علم کا عقیدہ رہا ہے کہ اگر

لہ ملاحظہ ہو فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۳۵۔

مولانا انور شاہ اپنے زمانہ کے بخاری تھے تو مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانہ کے مُسلم تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کے تلمیذِ خاص مرحوم مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کا بیان ہے کہ:

"حضرت شاہ صاحبؒ علم کے بحرِ ذخار تھے مگر زبان میں کچھ لکنت تھی اور مولانا عثمانی نہایت فصیح اللسان تھے گویا کہ حضرت شاہ صاحب شانِ موسویؑ کا ایک پرتو تھے اور مولانا عثمانی شانِ ہارونیؑ کا ایک عکس تھے جیسا کہ حدیث میں ہے عُلماءُ اُمّتی کانبیاءِ بنی اسرائیل۔ حضرت ہارونؑ افصحُ اللِّسان تھے اور حضرت موسیٰ اعلمَ قلباً تھے اور بلاتشبیہہ کے جس طرح حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے وزیر اور مُشیر تھے اسی طرح حضرت مولانا عثمانیؒ علم میں حضرت شاہ صاحب کے وزیر اور قائم مقام تھے۔" ؎۱

حضرت شاہ صاحب کی کتاب "کشفُ السّتر عن صلوٰۃِ الوِتر" کے متعلق علامہ عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ صاحب کی کتاب "کشفُ الستر عن صلوٰۃِ الوِتر" کی قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت لگا جب میں نے مسئلۂ مذکور پر جتنی احادیث جمع کی جاسکیں، جمع کیں اور ان کا مطالعہ کیا، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف کو سمجھنے کے لئے کافی مطالعہ اور گہری نظر کی ضرورت ہے۔" ؎۲

جن دنوں حضرت شاہ صاحب جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں درسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس دوران مولانا عثمانیؒ نے حضرت شاہ صاحب سے

؎۱ ملاحظہ ہو حیاتِ انور ص ۱۱۵، مضمون مولانا کاندھلوی۔

؎۲ ملاحظہ ہو سیرتِ انور ص ۱۵۵، حیاتِ انور ص ۱۸۶۔

کافی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی اِمالی کے ایک بڑے امانتدار مؤلّفِ انوار الباری مولٰینا سیّد احمد رضا صاحب کا بیان ہے کہ

"راقم الحروف نے اپنے سولہ سالہ قیام مجلسِ علمی ڈابھیل کے عرصہ میں یہ اندازہ کیا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم و کمالات سے سب سے زیادہ استفادہ حضرت علامہ عثمانیؒ نے کیا تھا وہ حضرت سے تمام مشکلات میں رجوع فرماتے اور پھر کتابوں کا مطالعہ رات دن فرماتے تھے۔ آپ نے قرآنِ مجید کے (تفسیری) فوائد اور فتح الملہم میں حضرت شاہ صاحبؒ کے افادات بکثرت لئے ہیں۔[1]

حضرت شاہ صاحب سے اتنا استفادہ کرنے کے بعد ہی ایک بار مولٰینا مفتی محمود احمد صاحب سے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:

"تمہیں ایک خوش خبری سُناتا ہوں کہ مولٰینا شبیر احمد صاحب کو علمِ حدیث سے مناسبت ہو گئی ہے"[2]

اس مختصر جُملہ سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی علمی تحقیق کا مرتبہ کس قدر بُلند تھا کہ حضرت مولٰینا عثمانیؒ جیسی جامعِ معقول و منقول شخصیت کے لئے یہ الفاظ فرمانا جو دارالعلوم دیوبند میں حضرت شاہ صاحبؒ ہی کے زمانہ میں مُسلم شریف کا درس دیا کرتے تھے اور کتاب الایمان کی درسی تقاریر میں تو ان کی غیر معمولی شہرت تھی۔

مولٰینا محمد ادریس صاحب سکھروڑوی تحریر فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت شاہ صاحب کی وفات کا تار ڈابھیل پہنچا تو حضرت مولٰینا شبیر احمد صاحب

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ "انوار الباری" حصہ دوم ص ۲۳۹ و نُطقِ انور ص ۹

[2] ملاحظہ ہو "نطقِ انور" جلد ۱ ص ۹

پر بے صبری اور غم کے آثار زیادہ نمایاں تھے، بے ساختہ چیخیں اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے " آہ! ہمارے لئے موجبِ تسکین و طمانیت کون ہے، کس کے پاس جا کر اب تسکینِ خاطر کریں گے، کس سے اپنے علمی اشکالات حل کرائیں گے۔" اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو رنج و غم کا پہاڑ مولانا شبیر احمد صاحب پر گرا ہے وہ رنج و غم کسی دوسرے کو نہیں [لے] ع

حضرت شاہ صاحب کی رحلت پر تقریرِ تعزیت میں علامہ عثمانی نے اپنے شفیق محترم اور رفیق خاص کو جن الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا ہے، اُس سے نہ صرف قارئینِ کرام کو حضرت شاہ صاحبؒ کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانے میں سہولت ہوگی بلکہ حضرت شاہ صاحب اور مولانا عثمانی کے باہمی تعلقات کو بھی بیان کرنا ہمارے لئے آسان ہوگا۔

چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

" مجھ سے اگر مصر و شام کا کوئی آدمی پوچھتا کہ کیا تم نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، شیخ تقی الدین ابن دقیق العید اور سلطان العلماء حضرت شیخ عز الدین بن عبد السلام کو دیکھا ہے؟ تو میں استعارہ کر کے کہہ سکتا تھا کہ ہاں دیکھا ہے کیونکہ صرف زمانہ کا تقدم و تاخر ہے ورنہ اگر حضرت شاہ صاحب بھی چھٹی یا ساتویں صدی میں ہوتے تو اسی طرح آپ کے

لے ملاحظہ ہو حیاتِ انور، ص ۳۴۷، مضمون مولانا سکھروڑوی

ع نوٹ: مؤلف " نطقِ انور " نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ دورانِ تقریر طالبعلموں سے خطاب کرتے ہوئے مولانا عثمانیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ :- " حضرت شاہ صاحبؒ کی وفات سے تم لوگ یتیم نہیں ہوئے بلکہ ہم جیسے پڑھانے والے یتیم ہو گئے ہیں، کیونکہ تمہارے لئے خدا کے فضل سے ہم بھی کافی ہیں۔" (کوثر نما)

مناقب و محامد بھی اوراقِ تاریخ کا گرانقدر سرمایہ ہوتے، میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجرؒ، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا آج انتقال ہو رہا ہے"۔ ؎۱

حضرت شاہ صاحب کے بڑے صاحبزادے مولینا ازہر صاحب نے اپنی ایک تازہ تصنیف میں مولینا عثمانی کا ذکرِ خیر کرنے کے بعد ایک جگہ حضرت موصوف کی زبان سے نکلے ہوئے چند فلسفیانہ جملے بھی نقل کئے ہیں جو واقعی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

"سکون و راحتِ انسانی زندگی کے سب سے بڑے دشمن ہیں، ممکن ہے کہ سانپ انسان کا سب سے بڑا دشمن ہوتے ہوئے بھی کسی وقت انسان سے اچھا سلوک کرے اور اُسے کاٹ لینے سے رک جائے، ایسا ہو سکتا ہے کہ زہر انسان پر اثر نہ کرے اور انسان زہر کھا لینے کے بعد بھی زندہ رہے مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو قوم اور جو طبقہ تن آسانی اور راحت پسندی کا خوگر ہو جائے اور جہد و کشمکش سے جان چرانے لگے اسے قدرت عزت کی کوئی زندگی اور نہ زندگی کا کوئی ایک لمحہ بھی عنایت فرمادے، عیش طلبی اور انسانی زندگی کا باہم کوئی تعلق نہیں۔ زندگی میں عیش کا تصور و تلاش، انسان کے لئے ایک لاعلاج مرض ہے۔ اور عیش و راحت کی موجودگی انسانیت کے ناموس و عزت کے لئے موت کا پیغام ہے"۔ ؎۲

؎۱ ملاحظہ ہو حیاتِ انور، ص ۲۱، بسرتِ انور ص ۸۰، مقدمۂ انوار الباری وغیرہ۔

؎۲ ملاحظہ ہو "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" ص ۱۳

حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مولانا بخاریؒ

مولانا ازہر شاہ صاحب قیصر کے قلم سے

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ۱۹۱۹ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کشمیر سے راس کماری تک ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر بستی میں چیختا اور چلاتا روتا رُلاتا، ہنستا بولتا اور گرجتا برستا رہا۔ شاید ہی کوئی شہر ہو جس کی فضاؤں میں بخاریؒ کی تقریروں کی روانی، ایک پوشیدہ قوت بن کر جاگزین نہ ہو۔ ہندوستان کے مسلمان بخاری کو بھول جائیں مگر یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ایک مسلمان کسی پریشانی سے رو رہا ہے تو عطاء اللہ شاہ کے آنسوؤں نے اس کا ساتھ دیا ہے، جب بھی کسی مظلوم نے اسے آواز دی ہے تو وہ سینہ تان کر اس کی حمایت میں سامنے آگیا ہے، گجرات، ملتان، دہلی، علی پور (بنگال)، لاہور، امرتسر کی جیلیں اس کی یادگار ہیں۔ آج نہ سہی ایک وقت ضرور آئے گا جب آنے والی نسلیں ان جیلوں کو بخاری کی قیام گاہ کی حیثیت سے آثار قدیمہ میں شامل کردیں گی۔

آج تاج محل، مغل آرٹ کا ایک نشان اور ہندوستان کی عظمت کا ایک باوقار نمونہ ہے، وقت مجبور کریگا کہ امرتسر اور ملتان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے مکانات کو اپنی تاریخ حریت کی یادگار کے طور پر محفوظ کیا جائے۔

لاہور کے ایک جلسہ میں پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرنے والے

ایک مُصنّف کے خلاف احتجاج کیا جارہا تھا۔ لاکھوں کے مجمع میں بُخاری نے کہا وہ دیکھو سامنے! خدیجۃُ الکبُریٰ کھڑی شکایت کر رہی ہیں کہ میرے شوہرِ نامدارؐ کی توہین کی گئی اور لاکھوں مسلمانوں میں سے ایک بھی نہ بولا۔ لو، وہ سنو فاطمۃُ زہراؓ فرماتی ہیں کہ میرے ابّا جان کی بے عزّتی کی گئی اور اُن کی اُمّت نے کچھ نہ کیا" تو لاکھوں کے اس مجمع کی چیخیں نکل گئیں اور سینکڑوں مسلمان عورتوں نے اپنے شیر خوار بچوں کو شاہ کے سامنے پھینکدیا کہ ہم اپنے جگر گوشوں کو ناموسِ رسولؐ پر قربان کرتی ہیں، کوئی اور بھی اگر ایسا جادو بیان خطیب ہو تو مجھے بتاؤ۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے میرے والدِ مرحوم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "میں گوشہ نشین فقیر لیڈروں سے ملنے کا سلیقہ نہیں رکھتا۔"

نظامِ حیدر آباد نے انہیں گھیر گھار کر اپنے یہاں بُلایا، کہتے ہیں کہ نظام ترجمۂ قرآن کے سلسلہ میں ابّاجی سے کوئی علمی خدمت لینا چاہتے تھے، اور اس کام کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار تھے، مگر ابّاجی نے کہا کہ "میں پیسہ لیکر قرآن کی کوئی خدمت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آپ اس کام سے مجھے معذور سمجھیں"۔ آپ ان افکار و آراء سے اسی نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ ابّاجی جیسے غیر دنیادار آدمی کا کسی کی دنیاداری سے مرعوب ہونا واقعی مُشکل تھا مگر حضرت شاہ صاحب، مولینا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری کے سو جان سے دیوانے تھے۔ ہر وقت ان ہی کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ کتابت سے فراغت ہوئی، چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئے، سادہ چائے آئی، اس کا دَور چلا۔ سامنے میرے ماموں جناب حکیم سید محفوظ علی صاحب یا مولینا حفظ الرحمٰن صاحب، مولینا محمد ادریس صاحب، مولینا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی

ہوئے اور اباجی نے سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"کیوں مولوی صاحب! ہم عطاءُ اللہ شاہ کو اگر سب کاموں سے ہٹا کر صرف تردیدِ قادیانیت پر لگا دیں تو یہ کیسا رہے گا؟"۔ "مولوی صاحب! یہ صاحب واقعی مخلص ہیں، بہت محنتی اور بہت زیادہ بہادر۔ انہوں نے پنجاب میں چند تقریریں کر کے قادیانیت کے خلاف ایک عام جذبۂ ناراضگی پیدا کر دیا ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اسی طرح محنت سے کام کیا تو قادیانیت ان شاءَ اللہ ختم ہو جائے گی۔

جن دِنوں انجمن خُدّامُ الدین کے جلسہ میں اباجی نے شاہ جی کے ہاتھ پر بیعت کی اِن دنوں شاید اخبار "انقلاب" لاہور میں ایک نظم نکلی تھی جسے اس زمانہ کے مشہور اخبار "سیاست" (لاہور) نے بھی خوب مزے لے لے کر چھاپا تھا، اس کے پہلے چند اشعار میں تو نمک کے محصول کے سلسلہ میں اباجی کے ایک مشہور فتویٰ کا مذاق اُڑایا تھا، اور اس فتویٰ کا اس زمانہ میں اس وجہ سے بہت چرچا ہو گیا تھا کیونکہ گاندھی جی نے اس فتوے کو سامنے رکھ کر نمک سازی کی اپنی مشہور تحریک شروع کی تھی۔

اس نظم میں اباجی کی بیعت کا ذکر یوں کیا گیا تھا:۔

کی ہے اِک شاگرد کی استاد نے بیعت قبول
بڑھ گیا ہے مہر سے کس درجہ رُتبہ ماہ کا
انقلابِ آسماں دیکھو کہ اِک ادنیٰ مُرید
پیر انور شاہ جیسا ہے عطاءُ اللہ کا

اور بادیُ النظر میں یہ بات واقعی حیرت انگیز تھی کہ اباجی، شاہ جی کی بیعت کریں، مگر یہاں "میانِ عاشق و معشوق رمزیست" کا معاملہ تھا، کسی کو کچھ پتہ نہیں چلا کہ مُرشد نے مُرید میں کیا جوہر دیکھے اور کیوں اس کے ہاتھ

پر بیعت کی، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ شاہ جی کا نام آیا اور اباجی کے چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی، کسی نے شاہ جی کی تعریف کی تو خوش ہو گئے اور کسی نے شاہ جی کو بُرا کہا تو بگڑ گئے۔

اباجی کو اخبار پڑھنے کی کبھی عادت نہ تھی مگر صرف شاہ جی کی خبریں معلوم کرنے کے لئے اخبار پڑھنے والوں سے جب خیال آ جاتا تو پوچھتے کہ "بھائی! شاہ جی کی کوئی خبر ہے، کہیں تقریر کی ہے یا نہیں؟ کہاں ہیں؟ ادھر دیوبند کی طرف تو آنے کی خبر نہیں؟"

اللہ اللہ محبت و شفقت کا کیا عالم تھا، ایک دفعہ اسی طرح مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ "آج اخبار میں شاہ جی کی کوئی خبر تھی کہ نہیں؟" میں نے جھنجھلا کر کہا کوئی نہیں؛ فرمایا کہ "الجمعیۃ بھی دیکھا تھا یا نہیں؟" میں نے کہا دیکھا تھا، اس میں بھی کوئی خبر نہیں تھی، ارشاد ہوا اور "زمیندار؟" میں اس کھود کرید سے تنگ آ گیا تھا، لیک کر بولا کہ جی اس میں خبر تھی کہ شاہ جی گرفتار ہو گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے سالہا سال پہلے کا یہ نقشہ جوں کا توں موجود ہے، اس طرح کہ گویا یہ واقعہ آج ہی ہوا ہے۔ اباجی چارپائی پر اپنے کھُردرے بستر پر لیٹے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی اُٹھ بیٹھے، گھبرا کر پوچھا کہ گرفتار ہو گئے! کہاں گرفتار ہو گئے؟ بھائی! کیا معاملہ ہوا، ذرا تفصیل سے سناؤ"، اُن کے گھبرا کر اُٹھ بیٹھنے اور اس طرح سوالات کرنے سے مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ جھوٹ اباجی کے لئے بدرجۂ غایت تکلیف دِہ ہو گا۔ یہاں تو محض دفع الوقتی کے لئے جھوٹ بولا تھا مگر اب یہ جھوٹ جان لے کر رہیگا، پریشان ہوا کہ آخر کیا کروں، اور دل نے فوراً یہ فیصلہ کیا کہ اس شاندار جھوٹ کو واپس لے لینے ہی میں عافیت ہے۔ میں نے عرض کیا کہ میں تو ویسے ہی مذاق میں کہہ رہا تھا۔ شاہ جی کہیں گرفتار نہیں ہوئے۔ ۱۴ر مئی کو دہلی میں

جلسہ ہے شاہ جی اس جلسہ کی شرکت کے لئے دہلی آنے والے ہیں۔
بے ساختہ فرمانے لگے کہ نعوذُ باللہ جھوٹ کسی ضرورت اور حاجت سے بولا جاتا ہے، آپ کچھ عجیب طرح کے آدمی معلوم ہوتے ہیں، بظاہر یہ جھوٹ بولنے میں آپ کا کوئی نفع نہیں تھا مگر آپ نے بے ساختہ جھوٹ بولا۔ گویا آپ ضرورۃً نہیں بلکہ عادۃً جھوٹ بولتے ہیں۔ حق تعالیٰ آپ کو ہدایت فرمائے، آپ کو نیک عمل کی توفیق دے، آپ کا حال تو ہمارے نزدیک بہت افسوسناک ہوتا جارہا ہے۔"

قادیانیت کے سلسلہ میں شاہ جی نے جتنا کام کیا وہ سب اباجی کے اشارہ و ارشاد پر کیا۔ شاہ جی کی تقریریں پسند کی جائیں تو اباجی کا سیروں خون بڑھتا۔ وہ تردیدِ قادیانیت کے لئے لمبے لمبے دورے کرتے تو اباجی کی نگاہ ان کے ہر قدم پر رہتی۔ ڈابھیل کی مسجدِ مدرسہ میں اباجی کا معمول تھا کہ جمعہ کو تقریر فرمایا کرتے، ایسی تقریر جس میں صرف مغز ہی مغز ہوتا تھا۔ الفاظ بالکل نہیں نہ کوئی ابتداء ہوتی تھی اور نہ انتہا۔ تقریر ختم کر چکے، مجمع اُٹھ گیا، خود منبر سے اُتر آئے مگر کوئی بات پھر ذہن میں آگئی تو دوبارہ پھر منبر پر جا بیٹھے اور تقریر شروع فرمادی۔ ایک دفعہ خطبۂ مسنونہ کے بعد صرف یہی مضمون بیان ہوا کہ "پنجاب میں ایک صاحب ہمیں مل گئے ہیں، صاحبِ توفیق، صاحبِ صلاحیت، صاحبِ سواد، خوب کام کرتے ہیں، مولویوں کی طرح نہ خواہشِ زر میں مُبتلا ہیں اور نہ خواہشِ شہرت میں، بس بے چارہ محض اللہ کے لئے کام کئے جاتے ہیں۔ ہم نے قادیانیت کے متعلق انہیں توجہ دلائی کہ یہ فتنۂ عظیم صحیح اسلام کو جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کر بیٹھا ہے، آپ کیوں نہ اس فتنہ کے خلاف کچھ کام کر گذریں۔ آپ کا وہ کام دین میں آپ کے لئے نفع رساں ہوگا اور دُنیا میں اس سے اہلِ دین کو فایدہ

پہنچے گا"۔ یہ کہہ کر پھر شاہ جی کا نام لیا، فرمایا کہ "بڑوں بڑوں سے جو کام نہ ہوا، وہ اس غریب نے کر دکھایا"۔ (طلباء کی طرف اشارہ کر کے فرمایا) "آپ تو مدرسہ کی روٹیاں کھا کر ہر وقت بحث و مباحثہ میں لگے رہتے ہیں دین کی کوئی محبت آپ حضرات کے دل میں نہیں، عطاء اللہ شاہ اگر یہاں آ گئے تو آپ ان سے ملئے، وہ عجیب آدمی ہیں"۔

میرے خیال میں اباجی کے ان ہی الفاظ کو سامنے رکھ کر حفیظ جالندھری نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "دورِ اوّل کے مجاہدینِ اسلام کے گروہ سے ایک سپاہی راستہ بھول کر اس زمانہ میں آ نکلا ہے، وہی سادگی، مشقت پسندی، یکسر عمل، اخلاص اور للّٰہیت جو ان میں تھی وہ عطاء اللہ شاہ میں بھی ہے"۔

بہرحال جن بزرگوں کے یہ قصے ہیں وہ بزرگ اب مدت ہوئی نظروں سے ایک جلوۂ بے قرار کی طرح اوجھل ہو گئے۔ وہ بزرگ اپنے اپنے وقت پر علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے، مگر آج تو خاکِ مزار کے سوا ان کا کوئی نشان نہیں ملتا، پہلے کبھی اباجی کی مجلس میں حقائقِ دین کی گرہیں کھلتیں اور فکر و نظر کے نئے سانچے تیار ہوتے تھے، جن پر ان کی نظر پڑ جاتی تھی وہی کام کا آدمی بن جاتا تھا، جو قدموں میں آ کر بیٹھتا تھا وہی کچھ لے کر جاتا تھا، مگر آج ان کے مزار پر خاموشی اور سکون کے سوا اور کیا ہے؟

۷۳ سال کی عمر پوری کر کے عطاء اللہ شاہ صاحب نے ۲۱ اگست کی شام کو جان جانِ آفرین کے سپرد کی، اور ۲۲ کو بعدِ ظہر تقریر و خطابت کے اس بادشاہ کو منوں مٹی کے نیچے دبا دیا گیا، شاہ کی موت پر ایک تاریخ ختم ہو گئی، ایک عہد گذر گیا، ایک دور پورا ہو گیا، ایک چمن اُجڑ گیا، ایک بہار لٹ گئی، تقریر و

خطابت کی رونق ختم ہوگئی، جرأت و شجاعت کا شیرازہ بکھر گیا اور خلوص و دیانت پر افسردگی چھاگئی، اب نہ کبھی شاہ نظر آئیں گے، نہ ان کی تقریریں سُننے کا موقع ملے گا، لیکن جب بادل گرجے گا، بجلی چمکے گی، موسلادھار بارش ہوگی، طوفان اور سیلاب آئیں گے، جب کبھی صبح ہوگی اور جب کبھی شام آئے گی، جب کبھی پھول کھلیں گے اور کلیاں مسکرائیں گی، جب کبھی بادِ صبا پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی چمن سے گذرے گی، جب کبھی کوئی قرآن پڑھیگا، اور جب کوئی رات کی آخری اور خشک ساعتوں میں لاکھوں اور ہزاروں کے مجمع کے سامنے تقریر کریگا، جب کوئی جرمِ حق گوئی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتوں سے گذرے گا، جب کوئی مردِ حق اللہ اور اس کے رسولؐ کی عظمت کے لئے اپنے جسم و جان کا نذرانہ وقت کے کسی ظالم اور قاہر کے سامنے پیش کریگا مجھے اس وقت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری ضرور یاد آئیں گے، کہ ان سب چیزوں میں مجھے عطاء اللہ شاہ بخاری کی شباہت ملے گی۔ عطاء اللہ شاہ کی کچھ ادھوری سی نقل، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ۷۰ سالہ مجاہدانہ زندگی، اسکے خلوص و دیانت، اس کی تقریر و شعلہ بیانی، اس کی حسین جوانی، اس کے پُروقار بڑھاپے کو، اس کے لاکھوں عقیدت مندوں کی طرف سے ہزاروں سلام۔

رَحِمَهُ اللهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً وَغَفَرَ لَهُ اللهُ مَغْفِرَةً كَامِلَةً ۞

حضرت شاہ صاحبؒ اور علامہ علی حنبلی مصریؒ

(مرتبہ کوندو)

علامہ محدث علی حنبلی مصری جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے مشہور حافظ تھے، مصر سے سورت و راندیر آئے اور وہاں سے دہلی مولوی عبدالوہاب صاحب مشہور اہل حدیث عالم کے پاس پہنچے، اوقاتِ نماز کے متعلق ان سے مناظرہ ہو گیا اور مولوی عبدالوہاب صاحب نے طیش میں آکر ان کو اپنے یہاں سے نکلوا دیا۔ راندیر میں حضرت مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب نے محدث مصری کو مشورہ دیا تھا کہ آپ دیوبند کا دارالعلوم بھی ضرور دیکھیں۔ دہلی میں بھی کچھ لوگوں نے دیوبند کا مشورہ دیا مگر مایوس و پریشان تھے۔ کہنے لگے جب اہلِ حدیث نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا حالانکہ ان کا مذہب حنابلہ سے قریب تر ہے تو دیوبند تو احناف کا مرکز ہے، وہاں خدا جانے کیا سلوک ہوگا، مگر لوگوں نے اطمینان دلایا۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو لیکن دیوبند جانا ہی پڑے گا۔ قبلِ ظہر دیوبند پہنچے۔ ظہر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم مہمانوں کا بہت تفقد کیا کرتے تھے اور نمازوں میں بھی دیکھا کرتے تھے کہ کوئی نیا آدمی باہر کا مدرسہ کا مہمان ہو تو اسکے حسبِ حال قیام و طعام وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ چناں چہ آپ نے علامہ علامہ علی کو نو وارد دیکھ کر ان کا بھی خیر مقدم کیا، مہمان خانہ میں ٹھہرایا خاطر مدارات کی اور عرب طلبہ کو جو اس وقت دارالعلوم میں پڑھتے تھے

بُلوا کر علامہ سے ملوایا تا کہ زیادہ مانوس و منبسط ہو جائیں۔ علامہ پر ان چیزوں کا بڑا اثر ہوا، بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ علمائے دیوبند تو بڑے مہمان نواز اور کریمُ النفس ہیں، یہ لوگ صحابۂ کرام رضو کے قدم بقدم چلنے والے اور مُتبع اُسنّت معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی محمد یحیٰی یمنی (متعلم دار العلوم) نے کہا کہ یہ لوگ علوم و فنون میں بھی فائق الاقران ہیں۔ علامہ نے کہا یہ بات تو میں ماننے کو تیار نہیں کیونکہ "ھم اعجامٌ" یعنی یہ بے چارے تو عجمی ہیں۔ عصر کی نماز کے بعد چند عرب طلبہ علامہ موصوف کو مزاراتِ اکابر کی طرف لے گئے۔ ایک صاحب نے علامہ کو القاسم کا وہ نمبر دیا جس میں حضرت شاہ صاحب رح کا عربی قصیدہ (مرثیۂ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری قدس سرہٗ) شائع ہوا تھا۔ علامہ نے چالیس ابیات کا فصیح و بلیغ مرثیۂ مذکورہ پڑھ کر فوراً کہا کہ "اِنّی تبتُ مِنْ اعتقادی" یعنے میں نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا۔ اس قصیدہ سے زمانۂ قبل از اسلام کے شعراء کی فصاحت و بلاغت مہک رہی ہے، نہایت بلیغ کلام ہے اور جن صاحب کا یہ کلام ہے میں اس عالم کی زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ چناں چہ اس کے بعد حضرت شاہ صاحب سے سرسری ملاقات ہوئی اور اگلے دن صبح کے وقت محدّث مصری نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رح کا درس صحیح مسلم سُنا اور اثناء درس میں کچھ اعتراضات کئے۔ حضرت مولانا عثمانی نے مہمان کی رعایت سے پورا درس عربی میں دیا، اور علامہ مصری کے جوابات بھی عربی میں دیتے رہے۔ علامہ متاثر ہوئے اور مولوی محمد یحیٰی یمنی سے فرمایا کہ یہ شخص بہت بڑا عالمِ دین ہے۔ اگرچہ بعض مسائل میں میری تسلی نہ ہو گی۔ اس کے بعد بخاری شریف کے درس میں پہنچے۔ حضرت شاہ صاحب رح نے بھی پورا درس آپ کی رعایت سے عربی میں دیا۔ علامہ وہاں بھی اثناءِ درس میں سوالات کرتے رہے اور شاہ

صاحب جوابات دیتے رہے۔ درس کے بعد علامہ نے کہا کہ میں نے عرب ممالک کا سفر کیا اور علماءِ زمانہ سے ملا، خود بھی میں نے مصر میں کئی سال حدیث کا درس دیا ہے، ہر جگہ کے علماء سے حدیثی مباحث کئے ہیں مگر میں نے اب تک اس شان کا کوئی محدّث عالم نہیں دیکھا، میں نے ان کو ہر طرح بند کرنے کی سعی کی لیکن ان کے استحضارِ علوم، تیقظ، حفظ و اتقان، ذکاوت اور وسعتِ نظر سے حیران رہ گیا"۔ (مولٰینا حکیم اعظم علی صاحب بجنوری مرحوم نے یہ اضافہ بھی کیا کہ علامہ نے یہ بھی فرمایا ہے) "میں نے شاہ صاحبؒ کے علاوہ اس درجہ کا کوئی عالم نہیں دیکھا جو امام بخاری، حافظ ابن حجر، علامہ ابن تیمیہ، ابن حزم اور شوکانی وغیرہم کے نظریات پر تنقیدی نظر و محاکمہ کر سکتا ہو اور ان حضرات کی جلالتِ قدر کا پورا لحاظ رکھ کر بحث و تحقیق کا حق ادا کر سکے۔"

علامہ نے دارالعلوم میں تین ہفتے قیام کیا اور حضرت شاہ صاحب سے برابر استفادہ کرتے رہے اور سندِ حدیث بھی حضرت سے حاصل کی۔ علامہ علیؒ یہاں تک کہنے لگے، لَوْحَلَفْتُ اَنَّهٗ اَعْلَمُ مِنْ اَبِیْ حَنِیْفَةَ لَمَا حَنِثْتُ۔ "اگر میں قسم کھالیتا کہ شاہ صاحبؒ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ علم رکھتے ہیں تو میں حانث نہ ہوتا۔" حضرت شاہ صاحبؒ کو پتہ چلا تو سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا" ہمیں امام کے مدارکِ اجتہاد تک قطعاً رسائی نہیں ہے۔

دیوبند سے علامہ کے واپس مصر ہونے پر درسگاہ نودرہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے عربی میں تقریر فرمائی۔ علامہ نے بھی جوابی تقریر فرمائی، حضراتِ دیوبند کے مکارمِ اخلاق، مہمان نوازی، تقویٰ و طہارت، بالخصوص علومِ نبوی ﷺ کی اشاعت و خدمت پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا اور کہا کہ" اگر میں دارالعلوم دیوبند میں حاضر نہ ہوتا تو ان فیوض و

برکات سے محروم جاتا، جو مجھے یہاں حاضری پر نصیب ہوئے، فرمایا، میں چونکہ حنبلی مذہب سے تعلق رکھتا ہوں اور حدیث لَا تُشَدُّ والرِّحَالَ اِلَّا اِلیٰ ثَلٰثَۃِ مَسَاجِدَ (نماز کی فضیلت کے حصول کے لئے تین مساجد کے علاوہ سفر نہ کرو) کے پیش نظر مجھے خوف تھا کہ اگر قیامت میں سوال ہوا کہ تم نے یہ سفر کیوں کیا، تو میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا، لیکن اب بفضلہٖ تعالیٰ اُمید قوی ہے کہ یہ میرا سفر عبادت میں گنا جائے گا کہ میں نے ایسی مقدس درسگاہ کی زیارت کی اور مولانا محمد انور شاہ جیسے محدث اور بزرگانِ دین کے علوم سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل کیا۔ واپسی پر راندیر میں مولانا مفتی مہدی حسن صاحب سے پھر ملاقات ہوئی۔ دیوبند کے تمام واقعات وحالات سُنائے۔ فرمانے لگے کہ مجھے حیرت ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اتنے بڑے عالم اور امام وقت ہو کر بھی امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ مُفتی صاحب نے فرمایا کہ اس سے ہی آپ امام صاحبؒ کے علوم کا اندازہ کریں۔

مصر پہنچکر علامہ نے وہاں کے رسائل میں اپنا سفرنامہ شائع کیا اور علماءِ دیوبند کے کمالات علمی وعملی پر بھی ایک طویل مقالہ لکھا۔ [۱]

٭

[۱] اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہو مقدمۂ انوار الباری حصۂ دوم ص ۲۴۲، ۲۴۳ وحیات انور ص ۳۱۴-۳۱۷-

حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا آزادؒ

(مُرتبہ کوندو)

۱۹۱۸ء کے بعد جب کہ شیخ الہند حضرت مولینا محمود الحسنؒ ابھی مالٹہ میں نظر بند تھے اور مولینا آزاد و علی برادران اور دیگر مجاہدین حریت ہندوستان کے جیل خانوں میں اسارت کے دن گذار رہے تھے۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب میں امرتسر کے جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام اور لاہور کے مارشل لا وغیرہ کے واقعات نے ملک بھر میں زلزلہ ڈالکر ہر حساس دِل کو سربکف ہو جانے پر آمادہ کیا جس سے کانگریس میں نئی جان پڑی اور اس کی اعانت کے لئے مجلسِ خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند جیسی تنظیمیں معرضِ وجود میں آئیں، جنہوں نے مسلمانانِ ہند خاصکر مسلمانوں کے علماء کو جدوجہد آزادی کی صفِ اوّل میں لاکھڑا کیا۔ مجلسِ خلافت سے بھی زیادہ جس تنظیم نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے ذہین ترین عنصر کو ایک دوسرے سے متعارف و متعاون کرانے میں مؤثر حصہ ادا کیا وہ جمعیۃ العلماء ہند کا پلیٹ فارم تھا۔ اس تنظیم کے پہلے صدر مولینا عبدالباری فرنگی محلی تھے۔ اس کا دوسرا اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا اس کی صدارت مولینا ابوالکلام آزاد نے کی۔ اسی طرح جمعیت کا ایک اور اجلاس کلکتہ میں ہوا اور اس کی صدارت مولینا سید سلیمان ندویؒ نے کی اور تمام حریت نواز علماء کی طرح حضرت مولینا انور شاہ صاحب کاشمیری بھی جمعیۃ العلماء ہند کی صفِ اوّل کے

رہنما تھے۔ اور جمعیۃ العلماء جو اپنے طریق کار کو کتاب اللہ اور سنّت رسول ؐ کے منہاج کے مطابق رکھنے کی مدّعی تھی اس کو قدم قدم پر حضرت شاہ صاحب کے فیوض سے استفادہ کرنا پڑتا تھا۔ اور ۱۹۲۷ء میں تو جمعیۃ العلماء کے پشاور والے اجلاس میں جب آزادیٔ کامل اور انگریزی راج کے خاتمہ کو جمعیّت نے اپنا نصب العین قرار دیا تو اس وقت جمعیت کے سالانہ اجلاس کے صدر حضرت شاہ صاحب ہی تھے۔ اور اس اجلاس میں حضرت شاہ صاحب نے وہ تاریخی خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جو جمعیۃ العلماء کے خطبات میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور جس کی تازگی آج بھی مفکّرین و مدبّرین سے خراجِ تحسین وصول کرتی ہے۔

یہ تمہیدی کلمات عرض کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب اور مولانا آزاد جمعیۃ العلماء ہند جیسی عظیم الشان تنظیم کے ساتھ اس کے ابتدائی دَور سے وابستہ چلے آتے تھے اور جمعیت کی مجالس میں اکثر و بیشتر لازماً و فطرۃً باہم ملتے تھے۔ اور اس دَوران نہ معلوم آپ علمی رموز و دقائق کی کِن کِن گتھیوں کو بھی سلجھاتے ہونگے۔
حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق مولانا آزاد مرحوم کیا رائے رکھتے تھے اور آپ کی بے پناہ علمی صلاحیتوں کے کس قدر معترف اور قدردان تھے اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے کہ کلکتہ میں مولانا آزاد نے جو دینی مدرسہ قائم کیا تھا اس میں اونچے علوم کے شائقین کا جب ہجوم ہوگیا تو درسِ حدیث دینے کے لئے مولانا آزاد حضرت شاہ صاحب کو بُلانے پر مُصر ہوئے۔ چنانچہ آپ نے براہِ راست حضرت شیخ الہندؒ سے یہ مطالبہ کیا کہ کلکتہ کے مدرسہ کے لئے مولانا انور شاہؒ کی خدمات عطا کی جائیں، مگر مولانا آزاد اس

میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس کی وضاحت حضرت مولینا مدنی کی کتاب "نقشِ حیات"[1] کے حسبِ ذیل اقتباس سے ہو جاتی ہے :-

"حضرت (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ کے قیام دہلی کے زمانہ میں مولینا عبد اللہ مصری جو کہ در اصل الہ آباد کے باشندے ہیں، اور مصر میں عرصہ تک ایامِ طالب علمی میں اقامت کرنے کی وجہ سے مصری مشہور ہو گئے ہیں۔ جناب مولینا ابو الکلام صاحب کے بھیجے ہوئے کلکتہ سے تشریف لائے اور مولینا موصوف کا خط لائے جس میں یہ مطالبہ تھا کہ چونکہ مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے طلباء نے ترکِ موالات کی تحریک پر مدرسۂ عالیہ سے علیحدگی کر لی ہے اور چاہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک آزاد اور نیشنل مدرسۂ عالیہ قائم کر دیا جائے، خلافت کمیٹی کے اراکین اس کی سرپرستی کریں اس لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا مدرس جو کہ علم حدیث کی کتابیں پڑھا سکے، جلد بھیجدیا جائے تاکہ وہ اوپر کے طلبہ کو پڑھا سکے اور مشہور و معروف ہو، خلافت کمیٹی اس کی کفالت کرے گی، ضرورت ہے کہ مولینا انور شاہ صاحب کو یہاں بھیج دیجئے۔ حضرتؒ نے کہا کہ شاہ صاحب (مرحوم) تو دار العلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے مگر ہم دوسرا شخص دیں گے جو کہ تمام کتب حدیث کی تعلیم دے سکتا ہو اور اس کو تجربہ اور شہرت حاصل ہو۔" الخ

مردِ مجاہد مولینا مدنی مرحوم کے متذکرۂ صدر بیان سے بیک وقت دو اہم باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ ایک یہ کہ مولینا آزاد مدرسۂ عالیہ کلکتہ[2]

---

[1] ملاحظہ ہو نقشِ حیات جلد دوم ص ۱۶۱ - ۱۶۲

[2] یہ مدرسہ کلکتہ کی ناخدا مسجد میں قائم ہو گیا تھا۔ اور مولینا عبد الرزاق ملیح آبادی اس کے ناظم بنا دئے گئے تھے۔

کے لئے حضرت شاہ صاحب کو سب پر ترجیح دیتے تھے۔ لہٰذا اس سے صاف ظاہر ہے کہ مولینا آزاد حضرت شاہ صاحب کی علمی صلاحیتوں کے معترف اور جوہروں کے شناسا تھے۔

دوم اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۱۵ء میں سفر حجاز پر روانہ ہونے کے وقت جس طرح حضرت شاہ صاحب کو اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا تھا ۱۹۲۰ء میں اپنی وفات سے قبل بھی اسی طرح اپنی جانشینی کے قابل صرف آپ ہی کی ذات کو یقین کرتے تھے۔ اسی لئے تو حضرت ممدوح نے فرمایا کہ "شاہ صاحب تو دارالعلوم دیوبند چھوڑ نہیں سکتے۔" اللہ اللہ! ایک طرف امام الہند حضرت مولینا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کا مطالبہ اور دوسری طرف حضرت شیخ الہند مولینا محمود الحسن قدس اللہ سرہٗ کا انتخاب جانشینی۔ سچ ہے ؎

"اِنَّمَا یَعْرِفُ ذَا الْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوُوْہُ"

مولینا آزاد کو حضرت شاہ صاحب سے جو تعلق ابتداء میں علمی قدردانی کی شکل میں تھا وہ روز بروز بڑھتا گیا اور شاہ صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں اس تعلق نے ایک قسم کی عقیدت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ چنانچہ ایسے اکابر علماء، اور دونوں بزرگوں کے عقیدتمند اور مرتبہ دان دہلی میں کل تک زندہ تھے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک بار حضرت شاہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی میں مولینا مفتی کفایت اللہ صاحب کے مہمان کے طور سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مولینا آزاد شوق ملاقات میں وارد مدرسہ ہوتے ہیں اور بے تکلف آپ کے سامنے مودبانہ دوزانو ہوکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اس ہیئت کذائی کو کب گوارا کرتے، تاہم اس واقعہ سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مولینا آزاد کی حقیقت بین نگاہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کی علمی عبقریت ہی نہیں بلکہ آپ کی

روحانی فضیلت کا بھی پورا پورا اندازہ کر لیا تھا اور اپنے غیر معمولی طرزِ عمل سے اس کا اعتراف کر رہے تھے۔

مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری کے بیان کے مطابق آخری دور میں حضرت شاہ صاحب جب کبھی دیوبند سے ڈابھیل اور ڈابھیل سے دیوبند آتے جاتے تو آپ کا معمول تھا کہ دہلی میں اپنے اوّلین رفیق اور خواجہ تاش مولانا کفایت اللہ صاحب سے مدرسہ امینیہ دہلی (کشمیری گیٹ) میں ملاقات کرتے اور ان مواقع پر مولانا کفایت اللہ صاحبؒ مولانا آزاد کو بھی آگاہ کر دیتے تھے اور مولانا یک دم امینیہ چلے آتے اور حضرت شاہ صاحبؒ سے ملتے (اور اس صحبت پر ملأ اعلیٰ کے فرشتے بھی رشک کرتے)۔ حضرت شاہ صاحب کا مطالعہ چونکہ بہت وسیع تھا، لہٰذا مولانا آزاد ان سے نوادر کے حوالے بھی پوچھتے تھے[۵۱]۔ اور چونکہ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تحریرات میں متعدد بار یہ شعر نقل کرتے آئے ہیں کہ:۔

ہیچگہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت،
دانہ می چیدم دراں روزے کہ خرمن داشتم

جب حضرتِ موصوف کا یہ حال تھا کہ بے پناہ علم وفضل کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے سے کمتر درجے کے علماء سے بھی استفادہ کرنے کی جستجو میں رہتے تھے تو حضرتِ شاہ صاحب جیسے علم کے بحرِ بیکراں سے مولانا آزاد جیسے فنا فی العلم کا استفادہ کرنا کوئی ناممکن امر نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد رشید مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے دونوں بزرگوں کے تعلقات پر یہ کہہ کر

---

۵۱ مکتوبِ گرامی مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری (بنامِ راقم الحروف) مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۷۵ء۔ (گونڈو)

روشنی ڈالی ہے کہ مولینا ابوالکلام آزاد حضرت شاہ صاحبؒ کی
وسعتِ علم اور حذاقتِ فنِ حدیث کے پوری طرح معترف و مقر
تھے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ حال تھا کہ جب مولینا آزاد کی تفسیر
قرآن (ترجمان القرآن) شائع ہوئی تو حضرت شاہ صاحبؒ نے بحیثیتِ
مجموعی ان کے اس علمی کارنامہ کی تعریف کی۔

ٹ

حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا مدنیؒ

(مرتبۂ کوندو)

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، حضرت شاہ صاحبؒ کے ظاہری و باطنی کمالات، تبحرِ علمی، بے نظیر قوتِ حافظہ اور روحانی بلند مدارج کے ہمیشہ معترف رہے۔ مولانا مدنیؒ کی آثارِ باقیہ خود نوشت سوانح عمری یعنی "نقشِ حیات" اور آپ کے مکتوبات میں ان اعترافات کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ بطورِ "مشتے نمونہ از خروارے" ہم اس سلسلے میں ان دو کتابوں اور دیگر ماخذ سے موصوف کے ان جذبات کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جو شاہ صاحبؒ کے متعلق آپ کے قلب میں موجزن تھے۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت پر جلسۂ تعزیت میں تقریر کرتے ہوئے مولانا مدنیؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ :-

"میں نے ہندوستان، حجاز، عراق اور شام وغیرہ ممالکِ اسلامیہ کے علماء و فضلاء سے ملاقات کی اور مسائلِ علمیہ میں ان سے گفتگو کی لیکن تبحرِ علمی، وسعتِ معلومات اور علومِ نقلیہ (یعنی قرآنِ پاک اور حدیثِ رسولِ اکرمؐ) اور علومِ عقلیہ (یعنی فلسفہ، تاریخ اور ہیئت وغیرہ) کے احاطہ میں شاہ صاحب کا کوئی نظیر نہیں پایا۔[1]"

مولانا محمد انوری لائلپوری مرحوم کے بیان کے مطابق حضرت مولانا مدنیؒ نے یہ بھی فرمایا کہ :-

---

[1] "حیاتِ انور" ص۱۶۔

"میں ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو ایک لاکھ حدیثیں یاد ہیں۔ اور ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جن کو صحیحین حفظ یاد ہیں لیکن ایسا عالمِ دین کہ کتب خانہ کا کتب خانہ ہی جس کے سینے میں محفوظ ہو، سوائے حضرت مولانا انور شاہؒ کے میں نے کوئی بھی نہیں دیکھا۔[1]"

(۲) جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی (مرحوم) پر اپنے مکتوبات کی اشاعت کی مجبوریاں واضح کرتے ہوئے مولانا مدنیؒ رقمطراز ہیں کہ:-

"آپ کو معلوم ہے کہ مجھ میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حافظہ اور تبحر نہیں۔ نہ حضرت عبید اللہ صاحب مرحوم اور مولانا کفایت اللہ صاحب مرحوم کی ذکاوت ہے، نہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ کی حسنِ تحریر و تقریر اور علامیت ہے، نہ ان حضرات کا تبحرؒ اور وسعتِ علمی ہے، پھر ان حضرات کے مکتوبات کا شائع نہ ہونا اور میرے مکتوبات کی اشاعت کس قدر بے شرمی اور انانیت کی بات ہے۔[2]"

(۳) ایک اور موقعہ پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:
"امارت کے لئے بہت سے اہل اور لائق اشخاص موجود ہیں مولانا کفایت اللہ صاحب، مولانا انور شاہ صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب (عثمانی) وغیرہ ہیں ان حضرات کے دستِ مبارک پر بیعتِ امارت کرنے کے لئے تیار ہوں۔[3]"

حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا مدنی رحمہما اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عرض

---

[1] ماہنامہ "دار العلوم" دیوبند، جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶

[2] مکتوباتِ شیخ الاسلام (از مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی) جلد سوم ص ۲۲ مکتوب ۸۵

[3] ایضاً جلد اوّل ص ۱۲۹ -

کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ دونوں صاحب بیک وقت دار العلوم دیوبند میں زیرِ تعلیم تھے، لیکن شاہ صاحب جس طرح عمر میں مولینا مدنی سے دو تین سال بڑے تھے اسی طرح مدارجِ تعلیم میں بھی آگے تھے، دورۂ حدیث سے شاہ صاحبؒ نے ۱۳۱۴ھ میں اور مولینا مدنی نے ۱۳۱۵ھ میں فراغت حاصل کی۔

بہر کیف دونوں صاحبوں کو حضرت شیخ الہندؒ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور دونوں کی ذات سے حضرت موصوف علیہ الرحمۃ کو اونچی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ چناں چہ ۱۹۱۵ء میں سفر حجاز کے وقت آپ نے اگر شاہ صاحبؒ کو دار العلوم دیوبند کی صدارت کے مسند کا مشکل مقام سپرد کیا تو مولینا مدنیؒ کو ابتلاء و آزمائش کے اس سفر میں مالٹا تک اپنا شریکِ کار بنایا۔

ان دونوں عظیم الشان ہستیوں کے طرزِ تدریس کے متعلق جو تجزیہ حضرت مولینا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ نے رقم فرمایا ہے، اس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت شاہ صاحبؒ کا اندازِ درسِ حدیث حافظانہ، داعیانہ، محدثانہ اور متبحرانہ تھا جبکہ مولینا مدنیؒ کے درس کا انداز عالمانہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہدانہ اسپرٹ[۱] سے بھرپور اور جذبات عمل سے زیادہ سے زیادہ لبریز ہوتا تھا۔"

ان اکابر حضرات کے متعلق مولینا ازہر شاہ صاحب کے یہ

۱؎ مکتوبات شیخ الاسلام جلد اول ص۵ (مقدمہ از حکیم الاسلام مولینا طیب صاحب)

جملے بھی قابلِ ملاحظہ ہیں :-

"مولینا عبیدُ اللہ سندھی اپنے اُستاد (حضرت شیخ الہندؒ) کے سیاسی کاموں کے راز دار ٹھہرے، مولینا انور شاہ کاشمیری کو استاذ نے اپنے علمی منصب پر دارُ العلوم میں فائز کیا، مولینا شبیر احمد عُثمانی حضرت شیخُ الہندؒ کی زبان تھے، مولینا حسین احمد مدنی اُن کے دست و بازو اور مولینا آزاد کا قلم ان کا قلم تھا۔"[1]

ہر گُلے را رنگ و بوئے دیگر است

---

[1] "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ"۔ صـ۲۰

حضرت شاہ صاحبؒ اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ

از کوندو

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے زمانہ میں اس تمنا سے بے تاب ہو رہے تھے کہ انجام کار یہ ہنگامہ کوئی ایسی شکل اختیار کر جائے جس کے نتیجہ میں ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک انگریزی امپریل ازم سے نجات حاصل کر لیں اور ہندوستان کی چھینی ہوئی آزادی وخود مختاری ایک بار پھر واپس مل جائے۔ ۱۹۱۴ء سے ہی آپ نے ارادہ کیا کہ آپ عالمگیر جنگ کے نتائج سے آزادی ہند کا مقصد حاصل کرنے کی کوئی سبیل نکالیں۔ اس سلسلہ میں چونکہ انگریزوں کے خلاف شریک جنگ طاقتوں خاص کر ترکی اور جرمنی سے رابطہ پیدا کرنا ضروری تھا جس کے ذرائع مفقود تھے، اس لئے آپ کی نظر کابل کی طرف اُٹھنے لگی اور آپ کے ذہن میں یہ تجویز پرورش پانے لگی کہ اگر ایک طرف افغانستان کو انگریزوں کے خلاف لڑنے پر آمادہ کر لیا جائے اور دوسری طرف صوبۂ سرحد کے آزاد قبائلی علاقوں میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بچے ہوئے مجاہدین کے ذریعہ صوبۂ سرحد کے عوام اور نیم آزاد جنگجو قبائل کو آمادۂ جہاد کر لیا جائے تو شاید جس وقت انگریز پر اتحادیوں کا دباؤ بڑھ رہا ہو اس وقت ہندوستان کے شمال مغرب کی طرف سے ایک اچھا سا بھرپور حملہ ہندوستان کو برطانوی امپریل ازم کے پنجے سے چھڑا لینے میں کارگر ثابت ہو سکے گا۔

حصولِ آزادی کا یہی منصوبہ تھا جس کو بروئے کار لانے کے لئے حضرت شیخ الہندؒ نے مولینا عُبیداللہ سندھیؒ کو کابل، مولینا منصور انصاری کو قبائلی علاقوں میں بھیجا اور خود ترکی حکومت سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کے لئے حرمین و حجاز کا سفر کیا اور دارُ العلوم کی تعلیمات کی صدارت کا کام جو آپ کا اوّلین اور دوامی فریضہ تھا اس کے لئے اس موقعہ پر آپ کی نظرِ انتخاب اپنے تلمیذِ خاص اور محرم اسرار مولینا محمّد انور شاہ کشمیری پر پڑی، جن کو آپ اپنے علوم اور فیضان کا خازن بنا چکے تھے اور جو آپ کی تدریسی خصوصیّات کو فنافی الشیخ کی حد تک اپنے سینے میں سمیٹ چکے تھے۔

اس پسِ منظر کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ مولینا عبیداللہ سندھی اور حضرت شاہ صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے فیض یافتہ علماء میں سے نہایت ممتاز اور غیر معمولی دل و دماغ رکھنے والی دو شخصیّتیں تھیں اور دونوں کے فطری رجحانات کو دیکھتے ہوئے مُشفق اُستاد نے دونوں کو دُو مختلف کاموں کی انجام دہی کے لئے تربیت دے کر تیار کیا تھا۔ جہاں مولینا سندھی کے انقلابی ذوق و شوق کو دیکھ کر انہیں سیاسی انقلاب کے میدان کا شہسوار بنا دیا تھا وہاں شاہ صاحبؒ کے مخصوص رجحانات کو پیش نظر رکھ کر انہیں تدریسی و تعلیمی مُرشِد و مُربّی بننے کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ دہلی کے امینیہ اور بارہمولہ کے فیضِ عام کے تجربوں کے بعد دارالعلوم دیوبند میں اچھے درجہ کے مدرّسین میں شامل کر کے اِن کی بے نظیر قابلیتوں کو جانچ لیا تھا اور دار العلوم میں اب اپنی جانشینی کے قابل بنانے کے لئے ان میں علم و عمل کے شعلے اس حد تک فروزاں کر دئے تھے کہ جب اُستاد نے اس شاگرد کو نازک وقت میں اپنی مسند حوالہ کر دی تو کسی کو اس پر حیرت نہ ہوئی۔ اس طرح حضرت شاہ صاحبؒ اور مولینا سندھی اگرچہ ایک ہی درخت کی دُو شاخیں تھے۔ مگر اپنے مُربّی کی سکیم کے

مطابق اپنے پھول اور پھل کے لحاظ سے دو مختلف قسم کی ہستیاں بن کر تیار ہو گئے تھے۔ چونکہ دونوں بے حد ذہین تھے اس لئے طالب علمی کے زمانہ میں بھی اور فراغت کے بعد بھی دونوں کے درمیان ذہنی قرب تھا۔ اپنی ملکوتی فطرت کی وجہ سے دنیا سے بے نیازی اور بلند مقاصد کے لئے ہمہ تن فدائیت ومحویت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بحصۂ وافر نصیب ہوئی تھی۔ متأہل زندگی سے آزاد رہ کر مقاصدِ عالیہ کے لئے ہمہ تن وقف ہو جانا بھی ایک ایسا مشترک وصف تھا جو دونوں نے اپنا رکھا تھا (مولینا سندھی تو آخر عمر تک بے خانگی اور تجرّد پر کاربند رہے البتہ حضرت شاہ صاحبؒ آگے چل کر اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر تجرّد سے اس وقت دستبردار ہوئے جب آپ کی عمر قریبًا ۴۵ سال کو پہنچ چکی تھی)

یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ان دو فاضل ہستیوں کے درمیان اونچے درجہ کے مسائل کبھی کبھی زیر بحث آجائیں اور کہیں کہیں رائے کا اختلاف بھی ہو جائے اور ایسا ہو ہی جایا کرتا تھا۔ خاصکر مابعد الطبیعیات کی دنیا کے مسائل کی فلسفیانہ موشگافیوں میں کبھی دونوں کے درمیان بحث وتکرار کا سلسلہ ہوتا تھا۔ آخر ایسے دو بڑے عبقری عالموں سے یہ توقع کون رکھ سکتا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر ہر نکتے میں ایک دوسرے سے متفق رہیں گے۔ بتایا جاتا ہے کہ دونوں کے درمیان ہیچو قسم علمی مباحثات کے دوران کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ کشمکش ہو جاتی تھی جو بحث ومباحثہ میں ایک فطری بات ہے مگر مخلصین بحث کے بعد ہمیشہ اس قسم کی تیزی کے لئے ایک دوسرے سے معافی خواہ ہو جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب ۱۹۱۵ء میں مولینا سندھی ناگاہ کابل چلے گئے تو اغلبًا جاتے وقت آپ شاہ صاحبؒ سے مل بھی نہ پائے اور شاہ صاحبؒ کو یہ خیال ستانے لگا کہ اگر اس طویل جدائی کے وقت باہمی درشت کلامی کی ایک

دوسرے سے معافی مانگ لی ہوتی جو بحث و مباحثہ کے دوران سرزد ہوجایا کرتی تھی تو یہ امر متقین کے شیوۂ کریمانہ کے مطابق رہتا۔ برسوں تک یہ احساس حضرت شاہ صاحبؒ کے قلب نازک کے لئے بے چینی کا موجب رہا۔ اس مدت میں مولٰینا سندھی کابل سے واپس آجانے کے بدلے اور بھی آگے دور تک بڑھتے ہی چلے گئے۔ کبھی ماسکو اور لینن گراڈ میں، کبھی برلن میں اور کبھی قسطنطنیہ اور انگورہ میں۔ جہاں ان تک چٹھی پہنچنے کے امکانات بھی کالعدم ہوگئے تھے۔

اسی دوران مولٰینا سندھی کی زندگی میں ایک ایسا مرحلہ بھی آیا جب آپ آزادیٔ وطن کے عشق میں بے تابی اور اضطراب سے اس مرض کے نئے نئے علاج سوچتے ہوئے مارکس ازم کو بھی ہندوستان کی مشکلات کا حل اور غلامی کی بیڑیوں سے نجات کا ایک راستہ سمجھ کر اس پر غور کرنے لگے لیکن چونکہ آپ کے ذہن کی ساخت وہ تھی جس کی آبیاری حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن و سنت کے آبِ حیات سے کی تھی اور جس کا سانچہ حضرت مجددؒ الف ثانی، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے تیار کردہ خمیر سے بنایا گیا تھا اس لئے آپ لاملوک ولاکلیسا کی حد تک تو مارکسزم کو مفید سمجھنے پر آمادہ ہوسکتے تھے لیکن مارکس ازم کے تیسرے "لا" یعنی لَا اِلٰہَ کو کسی طرح بھی قبول نہیں کرسکتے تھے اور اِلَّا اللّٰہ سے دستبرداری آپ کے لئے ناممکناتِ حیات میں سے تھی، اس لئے آخر کار مارکس ازم کو ایک طرف رکھ کر آپ نے نہ صرف ہندوستانی عوام کی بلکہ دنیا بھر کے بنی نوع انسان کی تمام قسم کی غلامیوں کی نجات کو " لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ " میں تلاش کرنا شروع کیا اور اس مقصد کے لئے جب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے فلسفۂ انقلاب کو اٹھا کر سامنے رکھا تو آپ کی

آنکھیں کھل گئیں اور آپ کو محسوس ہوا کہ جس چیز کو میں زمانۂ جدید کی نعرہ بازیوں میں تلاش کر رہا تھا وہ اپنے ہی خزانے میں موجود ہے۔ چنانچہ آپ نے حضرت شاہ ولی اللہ رح کی تمام تصنیفات بالخصوص حجۃ اللہ البالغۃ، تفہیمات و فیوض الحرمین وغیرہ کا مطالعہ شروع کیا اور لینن کے روس اور کمال اتاترک کے ترکی کو پس پشت پھینک کر آپ واپس آکر مکہ معظمہ میں مقیم ہو گئے اور ولی اللّٰہی فلسفۂ انقلاب پر تحقیقات کرنا شروع کر دی۔ اس نئے مطالعہ کے بعد آپ نے سیاست کے کچھ جدید نظریات مرتب کئے جن کی تفصیلات میں جانا اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ جس زمانہ میں مولانا سندھی مکہ معظمہ میں بیٹھ کر ولی اللّٰہی نظریات پر مبنی انقلاب کے پروگرام کی نوک پلک درست کر رہے تھے اور ابھی ہندوستان میں آپ کی واپسی پر پابندیاں عاید تھیں۔ حضرت شاہ صاحب رح نے آنے جانے والے حاجیوں کے ذریعہ آپ کے ساتھ رابطہ پیدا کیا اور پہلی فرصت میں خط لکھ کر مولانا سندھی رح کے ساتھ سینہ صفائی کی اور ان سے معذرت طلب کی۔

واقعی یہ احتیاط اور یہ حوصلہ حضرت شاہ صاحب رح جیسے عالم ربانی اور محدثِ بے نظیر کو ہی نصیب ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں مولانا سید حسین احمد مدنی رح اپنی خود نوشتہ سوانح عمری "نقشِ حیات" جلدِ دوم صفحہ ۱۴۲ کے حاشیہ پر یوں رقمطراز ہیں:-

" حضرت مولانا انور شاہ صاحب مرحوم نے مولانا سندھی رح کے

نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں پیغام بھیجا تھا کہ قیامِ دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ سے کوئی رنج نہیں ہے، امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔"

ممکن ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اور مولینا سندھیؒ کی یہ مراسلت اور بھی آگے بڑھی ہو لیکن اس کی تفصیلات ہمیں معلوم نہیں ہیں۔

بہر حال مولینا سندھیؒ نے قریبًا بارہ سال مکہ مکرمہ میں گذارے اور وطن کی واپسی پر اگر وہ شاہ صاحب کو بقیدِ حیات پاتے تو نہ جانے دونوں کے تعاون سے ملت کی کتنی اُمنگیں پوری ہوتیں۔

۲۵ سال کی طویل جلاوطنی کے بعد مولینا سندھی ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس تشریف لائے، تو دیوبند کی مجالسِ علمیہ میں اور دوسرے مواقع پر ہمیشہ نہایت وقیع الفاظ میں حضرت شاہ صاحبؒ کا ذکر فرماتے تھے اور حضرتِ موصوف کے متعلقین کے ساتھ بھی اپنے گہرے اور مُشفقانہ تعلق کا اظہار بھی فرماتے تھے۔

چناں چہ حضرت شاہ صاحبؒ کے بڑے فرزند مولینا ازہر شاہ صاحب اپنی کتاب "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"۱۹۳۹ء میں جب مولینا (سندھی) کی واپسی کی تحریک اُٹھی تو دیوبند مولینا سے اپنے قدیم تعلقات کی بناء پر خاص طور پر اپنے

اس گم شدہ فرزند کی بازیابی کا خواہشمند تھا اور ہم سب کی خواہش تھی کہ جس مردِ مجاہد کے عزم و حوصلہ کی بہت سی داستانیں ہم نے اپنے ماحول میں سُنی ہیں، اسے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیں، آخرہ ایک دِن شام کو معلوم ہوا کہ مولینا دہلی سے بغیر کسی اطلاع کے دیوبند پہنچے اور لوگوں نے اُنہیں اس حالت میں پایا کہ وہ اسٹیشن سے مدرسہ میں پہنچکر مدرسہ کی مسجد میں شکرانہ کی دوؔ نفلیں پڑھ رہے تھے، دیوبند آنے کی اِطلاع آپ نے پہلے سے اس لئے نہیں دی تھی کیونکہ یہاں وہ اپنے استقبال اور شان و شوکت کو پسند نہیں فرماتے تھے، دوسرے دِن مولینا صبح کے وقت راقمُ الحروف کے گھر پر تشریف لائے، (میں نے) دیکھا کہ ایک بوڑھا انسان سب سے آگے ہے اور اس کے پیچھے پچاس ساٹھ آدمیوں کا ہجوم ہے، میں نے مولینا کو اِس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اس لئے پہچان نہیں سکا، مولینا نے میری حیرت کو ختم کرنے کے لئے پیشقدمی فرمائی اور ارشاد ہوا "عبیدُ اللہ سندھی!" اور پھر مجھے سینہ سے لگالیا، پیشانی پر بوسہ دیا، مجھ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپ میرے رفیقِ درس اور رفیقِ فکر مولینا انور شاہ کاشمیری کی نِشانی ہے۔"

میری والدۂ محترمہ مولینا سے اُس وقت سے نیاز رکھتی تھیں جب مولینا دیوبند تشریف فرما تھے، والدہ نے چائے کا انتظام کیا، چائے کے وقت مولینا شبیر احمد عثمانی اور کئی اور بزرگ بھی موجود تھے، مولینا بڑی بے تکلّفی اور سادگی سے چائے پیتے جاتے تھے، اسی مجلس میں انہوں نے بڑی شفقت سے مجھ سے فرمایا کہ :-

"مکہ مکرمہ میں اُردو کے ایک رسالہ میں تمہارا مضمون ہم نے پڑھا تم ہمارے ساتھ رہو، ہم تمہیں کام کرنے کا ڈھنگ بتا دیں گے۔ میں نے برجستہ جواب دیا کہ حضرت! یہ جھگڑا میرے بس کا نہیں، آپ خانہ بدوش آدمی ہیں ۲۵۰ سال کے بعد اب گھر واپس آئے ہیں، کابل، روس، ترکی اور حجاز کی زمین ناپتے رہے، فقر و فاقہ میں آپ کی بسر ہوتی ہے، اپنا عیش و آرام آپ نے تج دیا ہے، میں غریب ان مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے حوصلہ کہاں سے لاؤں گا، مولینا اس پر ہنس دیئے۔

اللہ اللہ! عجیب لوگ تھے، جو خود کو مٹا کر قوم کو بنا گئے! جنہوں نے اپنی ساری زندگی، زندگی کی ساری راحتیں، زندگی کے سارے ولولے۔ زندگی کا سارا عیش اپنے مقصد پر قربان کر دیا"۔

شاہ صاحبؒ اور ہندوستان کے عُلماءِ اہلحدیث

از کوندد

مولینا ثناءُ اللّٰہ صاحب امرتسریؒ

حضرت مولینا ابوالوفا ثناءُ اللّٰہ صاحب امرتسریؒ کے متعلق

گذشتہ صفحات میں ایک جگہ ہم نے مُفصّل طور پر حاشیہ میں عرض کیا کہ موصوف کے والد ماجد کشمیری تھے۔ اور بعد ازاں وہ امرتسر میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ ایک دُنیا جانتی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ اپنے زمانے میں فقہ حنفی کے اوّلین علمبردار تھے اور مولینا ثناء اللّٰہ صاحب کو "سردارِ اہلِ حدیث" کہہ کر پُکارا جاتا تھا۔ اس کے باوجود مولینا ثناء اللّٰہ صاحب حضرت شاہ صاحبؒ کے قدردان اور علمی عظمت کے معترف تھے۔ دونوں عمر بھر مختلف المشرب ہونے کے باوجود اسلام کی حفاظت اور دفاع کے محاذوں پر سرگرمی کے ساتھ ایک دوسرے کو تعاوُن دیتے رہے۔ ذاتی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ مولینا ثناءُ اللّٰہ صاحب جب دیوبند جاتے تھے تو حضرت شاہ صاحب کے ہاں قیام فرماتے اور جب کبھی حضرت شاہ صاحبؒ امرتسر آتے تو اکثر مولینا موصوف کے ہاں قیام فرماتے تھے۔ اور علماءِ اہل حدیث احناف کی نسبت زیادہ تعداد میں حضرت شاہ صاحبؒ کی مجالس میں شریک ہوا کرتے تھے اور اس کا خصوصی اہتمام رکھتے تھے۔ اور اس طرح سے علمی رموز و دقائق خاصکر تبلیغِ اسلام اور ردِّ قادیانیت پر باہم تبادلۂ خیالات فرماتے تھے۔

حضرت مولینا ثناء اللہ صاحبؒ امرتسری نے حضرت شاہ صاحبؒ کے وصال پر اپنے اخبار "اہلحدیث" میں ایک طویل مقالہ بھی سپردِ قلم کیا اور اس میں اپنے دردِ دل کا اظہار کیا اور حضرت کے ذاتی مناقب اور علمی فضائل بیان کئے اور محبت بھرے الفاظ میں متعدد ملاقاتوں کا ذکر کیا اور یہ کہ : "بے نظیر عالمِ دین رخصت ہو گیا"۔[1]

مولینا میر سیالکوٹیؒ و دیگر اکابر علماء اہلحدیث

مولینا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی مرحوم، مولینا محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ، مولینا عبد التواب مُلتانی، مولینا داؤد غزنوی لاہوری، مولینا غلام نبی صاحب مُبارکی کشمیری اور دیگر اکابر علماء اہل حدیث کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً مولینا میر سیالکوٹی صاحب موصوف نے قادیان کے پہلے بے نظیر اجتماع میں جب حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر سُنی تو فرمایا کہ "اگر مجسّم علم کسی کو دیکھنا ہو تو مولینا انور شاہ کو دیکھ لے۔" مولینا عبد التواب مُلتانی (تلمیذِ مولینا عبد الجبار غزنوی) نے علماءِ اہلِ حدیث کے مجمع میں حضرت شاہ صاحب کے علمی کمالات اور بزرگی کا برملا اعتراف کیا ہے۔ اور اسی طرح مولوی محمد اسماعیل صاحب گوجرانوالہ نے اسی مجمع میں کہا ہے کہ "مولینا انور شاہ تو حافظِ حدیث ہیں۔" وغیر ذالک ؀

---

[1] حیاتِ انور ص ۳۲۷ ؀

حضرت شاہ صاحبؒ اپنے وطن میں

جناب سید نبیہ احمد اندرابی شہید
از:- الحاج سید مبارک شاہ فطرت گیلانی

"تعلیم سے فراغت کے بعد حضرت مولٰینا انور شاہ صاحبؒ کی زندگی کا بڑا حصّہ اپنے وطنِ عزیز یعنی کشمیر سے باہر بسر ہوا، دہلی کے امینیہ، دیوبند کے دارالعلوم اور ڈابھیل گجرات کے مدرسۂ جامعہ اسلامیہ علم کے اِس بحرِ ناپیدا کنار سے سیراب ہوتے رہے، خود خطۂ کشمیر کی قسمت میں اس بارانِ رحمت کے محدود قطرات ہی لکھے گئے تھے۔ سوانح مُرتّب کرتے ہوئے ہم نے بہت چاہا کہ آپ کے کشمیری فیض یافتہ علماء و فُضلاء کے قلم و زبان سے آپ کی شخصیت کے بعض پہلو روشنی میں لائے جائیں لیکن اس راستے میں مشکلات کے ناقابلِ عبور پہاڑ حائل پائے۔ بارہ مولہ کا مدرسۂ فیضِ عام جو آپنے آج سے سَتّر یا اسّی سال قبل قائم کیا تھا اس کا ایک بھی تعلیم یافتہ آج اس دنیا میں موجود نہیں ملتا۔ جن لوگوں نے کشمیر سے دیوبند جاکر آپ کی شاگردی کا امتیازی شرف حاصل کیا تھا مثلاً مولٰینا سیّد میرک شاہ اندرابی، میر واعظ مولٰینا محمدؐ یوسف شاہؒ، مولٰینا غلام مصطفٰے شاہ مسعودی، مولٰینا سیّد عنایت اللہ شاہ بخاری، مولٰینا عبدالکبیر ریتہ اور مولٰینا سیّد محمدؐ یوسف شاہ وتر ہیلی وغیرہم، یہ سب لوگ اس دنیائے فانی سے ایک ایک کرکے رخصت ہوچکے ہیں۔ مشکل سے ہم کو دو بوڑھے عمر رسیدہ علم دوست بزرگ جناب سیّد نبیہ احمد صاحب اندرابی اور الحاج سیّد مبارک شاہ فطرت گیلانی صاحب اُن لوگوں میں سے بقیدِ حیات ملے ہیں جنہوں نے علم و شعور کی آنکھوں سے حضرت شاہ صاحب کو قیامِ کشمیر کے مواقع پر دیکھا ہے اور آپکی مجالسِ وعظ و تذکیر میں بھی شامل ہوئے ہیں۔ دونوں صاحبوں نے اپنی قوتِ حافظہ کے بھروسہ پر پچاس پچاس سال پُرانے واقعات بارے میں جو کچھ عطا کیا ہے، وہ ہدیۂ ناظرین ہے"۔ کوندو

لہ جناب فطرت کاشمیری کو علم و ادب اور شعر و سخن کا ذوق ورثے میں ملا ہے اور ترکستان اور ختن وغیرہ ممالک کی سیاحت نے ان کے اس شوق و ذوق کو اور بھی اُبھارا ہے۔ فارسی زبان میں اکثر (باقی برصفحہ آئندہ)

حضرت شاہ صاحبؒ کا قیامِ سرینگر

جناب سید نبیہہ احمد اندرابی شہید

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلیٰ آلہ الطیبین واصحابہ الطاہرین۔

میں کیا اور میری بساط کیا؟ کہ حضرت فخر المحدثین رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات کے کسی گوشہ پر کچھ روشنی ڈال سکوں۔ تاہم میں نے عزیز محترم عبدالرحمٰن صاحب کوندوؔ کی فرمائش پر مندرجہ بالا عنوان کے تحت چند واقعات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان سطور کی بنیاد صحیح واقعات پر ہے مگر پھر بھی میں ناظرین کرام کی خدمت میں اپنی فروگذاشتوں سے درگذر کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

(متعلق صفحۂ گذشتہ) ان کا کلام ہے لیکن کبھی کبھی اردو اور کشمیری میں بھی سخن سرا ہوئے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کر کے ریاست کے محکمۂ تعلیم میں تعینات ہوئے تھے اور اب وظیفۂ حسنِ خدمت پانے کے بعد ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ (کوندو)

ع ۵ محترم سید نبیہہ احمد اندرابی حضرت شاہ صاحبؒ کے ایک فاضلِ اجل شاگرد مرحوم مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابیؒ کے فرزند ہیں۔ مدرسۂ عالیہ امدادیہ مرادآباد سے درسِ نظامی کی تکمیل کر کے محکمۂ تعلیم میں تعینات ہوئے تھے اور اب وظیفۂ حسنِ خدمت حاصل کرنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔

مولانا میرک شاہ صاحب مرحوم کا تذکرہ چند سطروں میں یہاں کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔

مرحوم صفر ۱۳۰۶ھ میں کشمیر میں پیدا ہوئے، اپنے وطن میں علوم عربیہ وفارسیہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے ان کے دل میں علومِ دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے اسی ۲

مجھے تو حضرت شاہ صاحبؒ سے براہِ راست شرفِ تلمّذ بھی حاصل نہیں ہے۔ البتہ میرے والدِ ماجد حضرت الأستاذ مولینا سیّد میرک شاہ صاحب اندرابی علیہ الرحمہ حضرتِ شاہ صاحبؒ کے اَرشد تلامذہ میں سے تھے اور ان ہی کی بدولت ہمارے میر محلہ ملارٹہ کو یہ شرف نصیب ہُوا تھا کہ حضرت فخر المحدّثین رحمۃ اللہ علیہ اس میں تقریباً بیس پچیس روز تک قیام پذیر رہے تھے۔

میری عمر اس وقت چھوٹی تھی مگر اس کے باوجود شعوری طور پر حضرتؒ کی صحبت سراپا عظمت سے دُور رہنا اپنے لئے باعثِ نقصان و حرمان ہی سمجھ لیتا تھا یہی وجہ ہے کہ آپؒ کی معیّت کی سعادت اکثر و بیشتر اوقات میں نصیب ہوتی تھی۔

---

۲ دوران حضرت شاہ صاحبؒ کچھ مدت کے لئے دیوبند سے کشمیر تشریف لائے تو میرک صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب نے انھیں دیوبند آنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ دیوبند جانے پر حضرت شاہ صاحبؒ کی شفقت ان کے شاملِ حال رہی۔ دیوبند سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ وقت وہاں مدرّس بھی رہے اور دار الافتاء میں بھی خدمات انجام دیں۔ مولوی فاضل کے امتحان میں شامل ہوئے تو یونیورسٹی بھر میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ دار العلوم دیوبند کے علاوہ سرائے میر اعظم گڑھ، سندھ، کرنال اور لاہور وغیرہ متعدد شہروں میں تشنگانِ علوم کی پیاس بجھائی۔ تقسیم ملک سے پہلے اورینٹل کالج لاہور میں ایک ممتاز پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ آخر میں صوبۂ سندھ کے ایک مشہور مدرسہ میں درسِ حدیث کی خدمت انجام دیتے رہے تھے۔

آپ کی تصانیف میں موطا امام مالک کا حاشیہ، محیط الدائرہ کا حاشیہ، فلسفہ کی اعلیٰ ترین کتاب "اسفارِ اربعہ" کی ایک جلد کا اردو ترجمہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

آزادی کے سلسلے میں خاصکر ۱۹۳۱ء کی انقلابی تحریک میں انہوں نے سرگرم رہنمایانہ کارنامے انجام دئے ہیں لیکن بعد میں سیاست سے کنارہ کشی کر کے دوبارہ علمی زندگی میں قدم رکھا اور آخری عمر تک اسی ماحول سے وابستہ رہے۔

بالآخر ۲۶ جمیدٔ الثانی ۱۳۹۳ھ کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

(کوندو)

حضرتِ شیخ کی قیام گاہ

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرے والدِ ماجد علیہ الرحمۃ کے مہمان تھے۔ ہمارا ایک مکان سڑک کے کنارے واقع تھا اور وہی مہمان خانہ بھی تھا۔ حضرت رح اسی مکان میں رونق افروز رہتے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ حضرت مولٰینا سید احمد سعید صاحب اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا مکان سڑک سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اس مکان میں بھی کافی وقت گذارتے تھے اور خانقاہِ اندرابیہ میں پنجگانہ نماز ادا فرماتے تھے۔ درسِ حدیث، درسِ تصوّف اور مواعظِ حسنہ کی کچھ مبارک مجلسیں کبھی اس خانقاہ میں ہوتی تھیں اور کبھی دونوں قیام گاہوں میں۔

مُصاحبین اور مجالس کی برکات

میرہ محلہ میں اُن دنوں بڑی بڑی صاحبِ علم و فضل ہستیاں موجود تھیں جو حضرتِ شاہ صاحبؒ کے ساتھ بے پناہ محبّت و عقیدت رکھتی تھیں اور حضرت شاہ صاحبؒ بھی ان حضرات سے کافی انس و محبّت فرماتے تھے۔ ابتدائی ملاقاتوں میں ہی باہمی گہرے روابط قایم ہو گئے تھے۔ سچ ہے "اِنَّمَا یَعْرِفُ ذَاالْفَضْلِ مِنَ النَّاسِ ذَوُوْہُ" واقعی ایک فاضلِ اجلّ اور جامع کمالات ہستی کو ان صاحب فضل ہستیوں نے بہت اچھی طرح پہچانا تھا اور اُن ایّام میں یہاں کی یادگار مجلسیں بلا مبالغہ ایسی تھیں کہ رات دن علوم و معارف کے دریا بہتے تھے۔ لمحہ لمحہ رحمتِ خداوندی کا نزول ہوتا تھا۔ کوئی وقت ایسا نہیں گذرتا تھا جو علمی و دینی مذاکرات سے خالی ہوتا۔ آج جب وہ دن یاد آتے ہیں تو کلیجہ مُنہ کو آتا ہے اور جگر پھٹا جاتا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارگاہِ عالم پناہ خداوندی (جلّ جلالہٗ) درگاہِ فیض پناہ محمّدی (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہ وسلّم) اور درس گاہِ اکابرِ دینِ متین کے فیوض و برکات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر لہرا رہا ہے۔

آہ! وہ مبارک مجلسیں اب خواب میں بھی نصیب نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور اُنہیں کروٹ کروٹ جنتُ الفردوس نصیب کرے۔ یہ سب کچھ ان کی صحبت سراپا رحمت کا صدقہ تھا۔ تمام اہلِ مجلس بزبانِ حال کمال خلوص کے ساتھ پکارتے رہتے تھے ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ
لَعَلَّ اللّٰهَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

یعنی میں تو صالح بزرگوں سے محبت کرتا ہوں حالانکہ خود ان میں سے نہیں ہوں۔ ہاں مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صلحاء (رحمۃ اللہ علیہم) کے صدقے مجھے بھی صلاحیتِ پارسائی اور پرہیزگاری کی دولت سے مالامال فرمائے گا۔

میرہ محلہ اُن ایّام میں مرجعِ خاص و عام بنا ہوا تھا۔ طالبانِ علومِ دین، شائقانِ معارفِ راہِ یقین اور تشنگانِ فیضانِ اوّلین و آخرین اس یگانۂ روزگار لاثانی ہستیؒ سے منٹ منٹ میں ایسے سیراب ہوتے تھے کہ واقعی ان کی پیاس بُجھ جاتی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ سلفِ صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے اس مایۂ ناز سپوت کے ہوتے ہوئے نہ اب کسی کتاب کی حاجت ہے اور نہ کسی اُستاد کی ضرورت بلکہ کسی اور طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی احتیاج بھی نہیں۔ اُن کا تو یہ حال تھا کہ ع

"اے لقاءِ تو جوابِ ہر سوال"

حقیقت یہی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی خدمت میں جو بھی سائل آتا تھا وہ اپنی استعداد کے مُطابق اپنے سوال کا تسلی بخش جواب سُن کر مُطمئن ہو جاتا تھا۔ حضرت شاہ صاحب کی بے پناہ اور لاجواب علمی قابلیت پر ان کی عدیمُ المثال قوّتِ حافظہ واقعی چار چاند لگاتی تھی۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں تھا کہ شاہ صاحبؒ ایک چلتا پھرتا عظیمُ الشّان کتب خانہ تھے جس سے مختلف علوم و فنون کے

معرکۃ الآراء مسائل کے بارے میں بغیر کسی تکلّف کے وقتاً فوقتاً استفادہ کیا جا سکتا تھا۔

حضرت شاہ صاحب کے مواعظِ حسنہ

یہ اس تقریباً ایک ماہ کی مستقل قیام گاہ کی مختصر بلکہ مجمل جھلکیاں تھیں۔ اس دوران میں خانقاہِ اندرابیہ کے علاوہ مسجد جامع سری نگر، خانقاہِ معلّٰی سری نگر اور خانقاہِ نقشبندیہ سری نگر وغیرہ میں بھی حضرتؒ کی تقریریں ہوئی تھیں جن کا خلاصہ ان ہی مجلسوں میں قلم بند بھی کیا گیا تھا اور پھر چھپ کر شائع بھی ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ "التقریرات" کے لفظ سے بحسابِ ابجد سرینگر کے اس قیامِ خوش ہنگام کا سال بھی ظاہر ہوتا ہے مگر بعض دوستوں کے اظہار کے مطابق قیامِ سرینگر کے سالِ پُر اقبال میں کچھ فرق بھی ہے۔ واللہ اعلم وعلمہ اتم و احکم۔ چونکہ اس زمانے میں کچھ اشخاص اور قاصرین نے مذہبِ حنفیہ کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا تھا۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ نے خاص طور پر فاتحہ خلف الامام، رفع الیدین اور آمین بالجہر وغیرہ مسائل پر بقدرِ ضرورت روشنی ڈالی تھی اور حضرت امام الائمہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے ٹھوس دلائل و براہین دے کر ثابت فرمایا تھا کہ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مختارات بدلائلِ قویہ راجح ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مرزائیوں کے دجل وفریب کو براہینِ قاطعہ کی روشنی میں طشت ازبام فرمایا تھا۔

مسجدِ جامع میں تقریر

مسجدِ جامع میں حضرت شاہ صاحبؒ نے محراب کی دائیں جانب سنگِ سیاہ کے بنے ہوئے منبر پر نمازِ جمعہ کے بعد کھڑے ہو کر تقریر فرمائی۔ میرواعظ مولانا احمد اللہ صاحب علیہ الرحمہ اس سے تھوڑی دیر پہلے شمال کی طرف وعظ فرما رہے تھے۔ جوں ہی حضرت شاہ صاحب کی تقریر شروع ہوئی میرواعظ

صاحب موصوف سامعین کی جماعت کے ساتھ قبلے کی جانب تشریف لائے اور حضرت شاہ صاحب کی تقریر بکمالِ اشتیاق سے سُنی۔

خانقاہ معُلّٰی میں تقریر

خانقاہِ معُلّٰی میں حضرتؒ کی تقریر دوسری منزل "سلطان خانہ" پر ہوئی۔ غالباً اسی مجلس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے مرزائیوں کے دو فرقوں (لاہوری اور قادیانی پارٹیوں) کے متعلق سوال کیا گیا۔ حضرت موصوفؒ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں بس لَعِیْنٌ[1] اور لُعَیْنٌ[2] کا فرق ہے۔ دورانِ تقریر میں مشہور مرزائی (اور پھر بہائی) مولوی عبداللہ وکیل صاحب کھڑے ہوئے اور کچھ پوچھنا چاہا مگر ان پر ایسا رعب طاری ہوا تھا کہ وہ تمہیدی الفاظ کو بھی صحیح رنگ میں ادا نہیں کر سکے چنانچہ یوں گویا ہوئے کہ "جناب میں فرماتا ہوں"۔ چونکہ "میں فرماتا ہوں" کے الفاظ بدحواسی کے عالم میں زبان پر جاری ہوئے اور یہ الفاظ ایسے وقت میں ایک سائل کے لئے آدابِ مجلس اور تہذیب کلام کے لحاظ سے عوام کی نظروں میں بے محل اور ناموزون تھے اس لئے تمام سامعین اور حاضرین نے وکیل صاحب کا مذاق اُڑایا اور وہ کھسیانے ہو کر ایسے بیٹھ گئے کہ دوبارہ اُٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ حالانکہ شاہ صاحبؒ کی طرف کسی کو بھی سوال پیش کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔ ہم نے ان ہی ایام میں سُنا ہے کہ وکیل صاحب مذکور نے اپنی پارٹی کے خاص لوگوں سے کہا تھا کہ اس شخص کے علم کے سامنے سرنگوں ہو کر سجدہ کرنا چاہیئے تھا۔

خانقاہِ نقشبندیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریر

خانقاہِ نقشبندیہ میں حضرت شاہ صاحبؒ

---

[1] بڑا لعنتی [2] چھوٹا لعنتی۔

نے طویل تقریر ارشاد فرمائی۔ معترضین نے بہت سے سوالات کئے اور حضرت موصوف نے دلائل و براہین کی روشنی میں مسکت جواب دیئے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تقریروں میں چند علمی اور تحقیقی باتیں بھی بیان فرمائیں۔ علم دوست حضرات کی ضیافتِ طبع کے لئے مختصر الفاظ میں کچھ باتیں لکھی جاتی ہیں۔

مسلکِ امام ابو حنیفہؒ کی اصلی بنیادیں اور مآخذ

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت امام العالمؒ کا یہ ارشاد بروایاتِ صحیحہ و ثابتہ مشہور جلیل القدر محدث حضرت امام بیہقیؒ نے کتاب المدخل میں نقل کیا ہے: "مَا جَاءَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَعَلَی الرَّأْسِ وَالْعَیْنِ وَمَا جَاءَ عَنِ الصَّحَابَۃِ نَخْتَارُ مِنْہُمْ وَمَا جَاءَ عَنِ التَّابِعِیْنَ فَہُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ وَفِی رِوَایَۃٍ زَاحَمْنَاہُمْ"۔ یعنی جو کچھ (دین کے بارے میں) ہم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہونچا ہے وہ ہمیں بسر و چشم تسلیم ہے۔ ہم اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ جو کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ہم تک پہونچا ہے ہم ان سے اس بارے میں اپنے لئے واضح اور راجح راہِ عمل اختیار کریں گے اور جو کچھ حضرات تابعین رضی اللہ عنہم سے ہم تک پہونچا ہے اس میں بنیادی بات یہ ہے کہ وہ بزرگانِ دین بھی تابعی ہونے کا شرف رکھتے ہیں اور ہم بھی الحمد للہ اس شرف سے مشرف ہیں۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ ہم ان (تابعین کرام) سے (راجح و مرجوح کے پرکھنے اور صحتِ روایات وغیرہ اصولِ دین کے سلسلے میں بشرطِ ضرورت اور بقدرِ حاجت) مزاحمت بھی کریں گے۔ (کیونکہ شرفِ تابعیت کی وجہ سے علمی و دینی معلومات میں ہمارے اندر یہ اہلیت بھی موجود ہے)

قرأت خلف الامام کے متعلق تحقیق

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ قرأت خلف الامام

پر بولتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اس مسئلے میں سب سے مقدم اور مافوق یہ ارشادِ الٰہی ہے وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ یعنے جب قرآنِ مجید پڑھا جائے تو اس کے سُننے کے لئے خاموش رہو، توقع اور امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا قَالَ اَحْمَدُؒ اِجْتَمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰی اَنَّهَا نَزَلَتْ فِی الصَّلٰوةِ یعنے حضرت امام احمدؒ حنبل[1] رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ آیتِ کریمہ نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے۔ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرتِ عارفِ کامل مولانا جلال الدین رومیؒ کا یہ شعر بھی پیش کیا۔

اَنْصِتُوْا را گوش کُن خاموش باش
چوں زبانِ حق نگشتی گوش باش

یعنے ارشادِ الٰہی اَنْصِتُوْا (قرآن سننے کے لئے خاموشی اختیار کرو) پر گوش و ہوش سے متوجہ ہو کر خاموش رہو۔ اگر تم زبانِ حق نہیں بنتے (کہ پیش امام بن کر قرآن پڑھتے) تو (مقتدی بن کر) کان ہی بنو یعنی سُنتے جاؤ۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس شعر میں زبانِ حق سے مراد امام اور گوش سے مراد مُقتدی ہے۔ امام کا مقتدیوں پر مقدم ہونا اور مقتدیوں کا صف بصف امام کے پیچھے کھڑا رہنا اس میں یہی خاص بات ہے کہ نماز میں امام ہی قرآنِ عزیز پڑھے اور مقتدی امام کی قرأت کو خاموش ہو کر سُنتے رہیں آپ نے علامہ ابن القدامہؒ حنبلی کی کتاب المغنی کے حوالہ سے حضرت امام احمد حنبلؒ کا یہ قول نقل فرمایا: قَالَ اَحْمَدُ مَا سَمِعْنَا اَحَدًا یَقُوْلُ مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ وَلَمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْکِتَابِ لَا تَجُوْزُ صَلٰوتُهٗ۔ یعنے ہم نے کسی (اہلِ علم) کو یہ کہتے ہوئے نہیں سُنا

---

[1] حضرت امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) کی تالیفات میں مسندِ احمد کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے جس میں تیس ہزار حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ (کوندوی عفی عنہ)

کہ جو شخص امام کی اقتداء میں نماز پڑھتا ہے اور سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتا ہے اس کی نماز جایز نہیں۔ مطلب یہی ہے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھنے والے پر قرأت واجب ہی نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اکثر ائمہ جہری نمازوں میں وجوبِ قرأت خلف الامام بلکہ جواز کے بھی قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ حضرت امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ھٰذا النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم (اشارہ ذہنی ہے) وھٰذا مالکؒ من المدینۃ وھٰذا سفیانؒ من الکوفۃ وھٰذا الاوزاعی من الشام وھٰذا لیث بن سعد من مصر ما قالوا لرجل صلی خلف رجل ولم یقرأ خلفہٗ لا تجوز صلوٰتہٗ یعنے حضرت امامؒ کا ارشاد ہے کہ یہ ہیں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہ ہیں مدینۂ طیبہ کے امام مالکؒ اور یہ ہیں کوفہ کے امام سفیان ثوریؒ اور یہ ہیں شام کے امام اوزاعیؒ اور یہ ہیں مصر کے لیث بن سعدؒ۔ ان میں سے کوئی بھی اس بات کا قائل نہیں کہ جو شخص کسی امام کا مقتدی ہو اور اقتداء کی حالت میں قرأت نہ پڑھے تو اس کی نماز جائز نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت امام شافعیؒ کی کتاب الاُم" اور "کتاب الامام" میں وجوب قرأت کا کوئی ذکر نہیں۔ ہاں متأخرین شافعیہ کا کہنا ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ عمر شریف کے آخری دو سال میں وجوب کے قائل ہو گئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ حدیث میں وارد ہے مَنْ اَدْرَكَ الرُّكُوْعَ فَقَدْ اَدْرَكَ الرَّكْعَةَ یعنے امام کے ساتھ صرف رکوع پالنے

ؔ قال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہٗ امام فقراءۃ الامام قراءۃ لہٗ یعنی جو شخص امام کی اقتداء کرتا ہے تو امام ہی کی قرأت مقتدی کی بھی قرأت ہے (صرف منفرد تنہا نماز پڑھنے والا پر ہی قرأت پڑھنا لازم ہے) وقال صلی اللہ علیہ وسلم من صلّی رکعۃ لم یقرأ فیھا بأم القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام یعنے جس (منفرد) شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں ام القرآن (سورۂ فاتحہ) نہیں پڑھی اس نے نماز ہی نہیں پڑھی کیونکہ قرأت نہیں پڑھی۔ ہاں اگر امام کے پیچھے ہو تو قرأت نہ پڑھے۔ معلوم ہوا کہ امام کے پیچھے قرأت پڑھنی ہی نہیں چاہیے۔) منہ ۱۲

والا رکعت کو بھی پالیتا ہے۔ صاف بات ہے کہ اگر مقتدی کے لئے قرأت واجب ہوتی تو وہ صرف رکوع میں امام کے ساتھ بغیر قرأت کے شامل ہو کر کیسے اور کس طرح رکعت پالیتا۔

حضرت امام بخاری عطر اللہ مرقدہ کا ذکر جمیل

حضرت شاہ صاحب رحمہ نے فرمایا کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ امام المحدیث اگر اپنے دست مبارک بلند کریں تو باعتبار حدیث دانی کے عرش مجید تک پہونچا سکتے ہیں۔ آپ حضرت امام العالم امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے بواسطہ و بلاواسطہ شاگردوں مثل عبد اللہ بن مبارک، وکیع بن الجراح، ابوبکر بن شیبہ، یحیی بن معین، علی بن مدینی اور مکی بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہم کے شاگرد ہیں۔ حضرت امام بخاری رح نے جزء القراۃ کے نام سے ایک رسالہ تالیف فرمایا ہے جس کا اکثر حصہ قرأت خلف الامام کے مسئلہ پر حاوی ہے۔ میرے استاذ الاساتذہ زبدۃ المحدثین حضرت مولینا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رسالہ میں اس کا جواب باصواب لکھا ہے اور مضامین رسالہ پر محدثانہ کلام فرمایا ہے۔

حضرت شاہ صاحب رح نے علامہ قاضی شوکانی علیہ الرحمۃ پر جرح فرمائی کہ انہوں نے چند کتابوں کی عبارات میں اِدھر اُدھر ہیر پھیر کر کے بخیال خود احادیث پر تنقید کی ہے اور حضرت امام اعظم رح کی مؤید احادیث کو نظر انداز کر کے متعصبانہ روش اختیار کی ہے۔ قاضی مرحوم ادنی التحقیقات کے آدمی تھے، بیں فخریہ نہیں بلکہ اپنی وسعت معلومات و تحقیقات کی بناء پر کہتا ہوں کہ میری علمی تحقیقات ان کی تحقیقات سے بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہیں۔ میں نے ان کے اکثر وجوہ استدلال کے ایسے جوابات دئے ہیں کہ قاضی صاحب رح کی بات ہی نہیں بلکہ ان کے فرشتوں کو بھی ان کی

۵؎ حضرت مکی بن ابراہیم رح حضرت امام اعظم رح کے شاگرد رشید تھے اور حضرت امام بخاری عطر اللہ مرقدہ کے زمانہ تک زندہ رہے اور آپ کی شاگردی اختیار کی۔ یہ وہی مکی بن ابراہیم ہیں جن کے طفیل سے حضرت امام بخاری رح کو اکثر ثلاثیات کا افتخار حاصل ہوا ہے۔ ثلاثیات امام بخاری محدثین کرام میں مشہور ہیں اور امام بخاری رح ان کی بدولت مخصوص فضائل کے حامل ہیں۔
(تذکرۃ الحفاظ۔ حقیقۃ الفقہ)

اطلاع نہیں ہوگی۔"

بہرحال یہ شاہ صاحبؒ کی تقریروں کی خاص باتیں ہیں جو محض اہلِ علم کی ضیافتِ طبع کے لیئے درج کی گئی ہیں ورنہ ان مسائل پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا یا ان کو زیرِ بحث لانا ہرگز میرا مُدّعا نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا روحانی شعور بھی بہت تیز تھا۔ خانقاہِ اندرابیہ میں پہلی مرتبہ (غالباً) عصر کی نماز پڑھائی۔ نماز پڑھا کر دعاء کے لئے قوم کی طرف مُنہ کیا مگر پیٹھ ذرا جنوب کی طرف مائل تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پوری طرح قوم کی طرف مُنہ کر کے پُشت بقبلہ ہو کر بیٹھ گئے۔ دُعاء سے فارغ ہوئے تو حاضرین سے دریافت فرمایا کہ اِدھر جنوب کی طرف کون بزرگ مدفون ہیں۔ حاضرین نے عرض کیا کہ یہ سیّد السّادات شیخ وسیّد میر محمد میرک اندرابی رحمۃ اللہ علیہ کا مزارِ پُرانوار ہے۔ اس کے بعد کبھی اُس طرف پیٹھ کر کے نہیں بیٹھے۔

حضرت مخدوم شیخ حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرقدِ مُبارک کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے بڑا مجمع ساتھ تھا جنہیں اہلِ علم وفضل بھی شامل تھے جوں ہی بالائی ڈیوڑھی میں قدم رکھا فوراً جوتے اُتار دیئے۔ آپکی تقلید میں تمام مجمع نے بھی جوتے اُتار دئے۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بصیرتِ قلبی اور روحانی کمالات سے بھی مالا مال تھے۔

جھیل ڈل کی سیر اور مثنوی کا درس

حضرتؒ کے قیامِ سری نگر کے دوران ایک دن سری نگر کی مشہور لمبی چوڑی جھیل (ڈل) کی سیر کا پروگرام بنا۔ بڑے بڑے اہلِ علم و فضل خصوصًا بزرگانِ میر محلہ ملارٹہ ساتھ تھے۔ جھیل کے وسط میں پانی کی لہروں، خودرو آبی نباتات، آس پاس اور دور و نزدیک اُگائی ہوئی گوناگوں

سبزیوں، سرسبز و شاداب پودوں اور مثمر و غیر مثمر درختوں، جھیل کی چاروں طرف نظر آنے والی کچھ برف پوش، کچھ ننگی اور کچھ سرسبز پہاڑیوں، مغل باغات کی تعمیرات کے ماحول میں نظر فریب آبشاروں اور قدرت کے دلکش و دل ربا نظاروں کے ساتھ ساتھ جاذب نظر صناعیوں کی بے مثال کشش اور بحیثیت مجموعی ان تمام مناظرِ قدرت کے عارفانہ مطالعہ سے آنکھوں میں نور اور دلوں میں سرور پیدا ہو رہا تھا کہ ایک بزرگ نے کمالِ متانت کے ساتھ باوقار سریلی آواز میں مثنوی کے دو تین اشعار پڑھے۔ پہلا شعر یہ تھا ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
واز جدائیہا شکایت می کند

سی شعر کی تشریح میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زبان کھولی اور مسلسل تین چار گھنٹے تک دُر افشانی فرماتے رہے۔ حاضرین ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے اور حضرت اقدس (شاہ صاحبؒ) درس دیتے رہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ درس کیا تھا، صاف معلوم ہوتا تھا کہ دینِ حق اور معرفتِ الٰہیہ کے دریا بہہ رہے ہیں۔ حاضرین میں اکثر علماء اور مشائخ کرام تھے جو اس قدر محظوظ ہو رہے تھے کہ گویا علوم دین اور معارف راہِ یقین کی بدولت ان کے قلوب اسرار الٰہی (جلّ مجدہٗ) و انوارِ محمّدی (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) سے معمور معرفت کے شرابِ طہور سے متلذذ و مخمور اور عوارفِ انوریہ سے مسرور ہو رہے تھے۔ میں اُن دنوں ایک معمولی لکھا پڑھا لڑکا تھا تاہم یہی سمجھ رہا تھا کہ علم و عرفان کا ایک بڑا شیریں چشمہ اُبل پڑا ہے۔ واقعی حضرت شاہ صاحبؒ عارفِ کامل حضرت مولائے روم قدس سرہٗ سے بھی روحانیۃً مکمل فیضیاب تھے۔

اُمّۃ المسلمین کے ساتھ حُسنِ ظن

ایک دن صبح سویرے مُنہ اندھیرے کہیں تشریف لے گئے۔ کئی آدمی ساتھ تھے۔ خصوصًا ایک شخص خواجہ

محمد اکبر اگو بھی بالکل ساتھ ساتھ تھے۔ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ کر واپس (پیدل) تشریف لا رہے تھے۔ راستے میں نقض وضو کیا اور محمد اکبر اگو مرحوم کے ہمراہ ایک مسجد کے طہارت خانہ میں گئے۔ استنجاء کے بعد وضوء کیا اور مسجد میں تحیۃُ المسجد والوضوء کے لئے داخل ہوئے۔ اب چاشت کا وقت بھی ہو گیا تھا، آس پاس کے لوگ حسبِ عادت سو کر اُٹھے تھے اور مسجد میں فجر کی نماز (قضاء) پڑھ رہے تھے۔ جب حضرت شاہ صاحبؒ محمد اکبر مرحوم کے ہمراہ میر محلہ کی طرف چل پڑے تو ان سے فرمایا۔ "یہ لوگ بڑے صالح ہیں کہ کافی تعداد میں نمازِ چاشت پڑھنے کے لئے مسجد میں آتے ہیں"۔ یہ عام مُسلمانوں کے ساتھ اُن کا حُسنِ گمان تھا۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی اُردو تصانیف

چونکہ میرا موضوع "حضرتِ شاہ صاحب کا قیام سرینگر" تک محدود ہے۔ میں نے اسی موضوع کے تحت کچھ عرض کیا ہے۔ اگرچہ کچھ مزید معلومات بھی فراہم کر سکتا تھا مگر میں نے یہی مُناسب سمجھا کہ اپنی یادداشت اور حضرت کی تقریروں سے ضروری باتیں عرض کر کے حضرت شاہ صاحبؒ کے کمترین خُدام میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کروں۔ اللہ تعالیٰ عزیز دوست عبدالرحمٰن صاحب کونڈو کو جزائے نیک دے کہ انہوں نے یہ موقع فراہم کیا، جو خوش قسمت حضرات حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبتِ با برکت سے فیضیاب ہو چکے ہیں وہ یہی یقین رکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب اپنے علمی و عملی کمالات میں انفرادیت رکھتے تھے۔ آپ کے شیوخ و اساتذہ کو بھی آپ پر بڑا فخر اور ناز تھا۔ قوتِ حافظہ میں آپ بے شک فردِ احد تھے۔ وَرع و تقویٰ میں اونچا مقام رکھتے تھے اور معارف علم حدیث میں آپ کو لاثانی مقام حاصل تھا۔ آپ کی اکثر تصانیف عربی زبان میں اور کچھ فارسی زبان میں طبع ہو کر تشنگانِ علوم کو برابر سیراب کر رہی ہیں۔ ان تصانیف پر اہلِ علم حضرات تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ میں اس پر اتنا ضروری اضافہ

کرتا ہوں کہ حضرتؒ کے تین مندرجۂ ذیل رسائل اُردو زبان میں میرے پاس موجود ہیں :-

۱- خطبۂ صدارت جمعیۃ علماءِ ہند دہلی (سال اور سنہ محفوظ نہیں)

۲- دعوتِ حفظِ ایمان ع۱

۳- دعوتِ حفظِ ایمان ع۲

دعوتِ حفظِ ایمان کے رسالے مرزا قادیانی اور ان کے چیلے چانٹوں کی تردید میں لکھے گئے ہیں۔ میرا غالب خیال ہے کہ دعوتِ حفظِ ایمان کے کچھ مزید نمبرات بھی شائع ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ مرزائی تحریک کی سرکوبی کو جزءِ ایمان یقین کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرتؒ نے یہ سلسلہ سادہ لوح مسلمانوں کی ایمانی دولت کو مرزائی کُفریات و واہیات سے بچانے کے لئے شروع فرمایا تھا۔ میں اسی پر اپنی اس ناچیز تحریر کو ختم کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت شاہ صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور بزرگانِ دین کے صدقے مجھ نامہ سیاہ و سراپا گناہ کی مغفرت فرمائے۔ سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؁

حضرت شاہ صاحبؒ کی نظرِ عنایت

از جناب سید مبارک شاہ گیلانی فطرتؔ

شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کشمیریؒ شہر کے چند اہلِ علم اور فضلاء کی دعوت پر ایک مذہبی تقریر ارشاد فرمانے کے لئے سرینگر تشریف لے آئے تھے۔ اور غالبًا یہ ۱۹۲۵ء تھا۔ آپ اپنے آبائی مسکن موضع وَرنو (لولاب) سے تشریف لاکر خانقاہِ معلّٰی کے سلطان خانہ کے بالائی حصّے میں فروکش ہوئے۔ لوگ بکثرت حاضر تھے۔ آپ نے ایک جمِ غفیر کو مذہبِ حنفیہ کے اصول و فروع سے آگاہ فرمایا۔ شہر کے علماء و فضلاء نے آپ کی تقریر دلپذیر سے حظِ وافر حاصل کیا۔ اس موعظہ میں حضرت نے خاص طور پر قادیانی عقاید کی تردید فرمائی اور اکثر تعلیم یافتہ حاضرین نے آپ کی اس تقریر کو قلمبند بھی کیا۔

میرے برادر مرحوم مُبلّغ اسلام سید یاسین گیلانی آپ کے خاص الخاص معتقدین میں امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ راقمُ الحروف ان دِنوں عربی مُتعلّم تھا۔ اِکتسابِ علم کا بے حد شوقین تھا۔ حضرت شاہ صاحب جب خانقاہِ معلّٰی کی مجلسِ تقریر سے فارغ ہوئے تو میر سید یاسین صاحب گیلانی کی دعوت قبول فرماکر ہمارے فقیر خانہ (خانقاہِ معلّٰی) میں تشریف لے آئے۔ مہمانوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے مکان کا کوئی کمرہ خالی نہ تھا۔

بہرحال آپ کی نظرِ انور اِتفاقًا مجھ حقیر پر پڑی اور میرے برادرِ محترم یاسین صاحب سے فرمانے لگے کہ "یہ عزیز آپ کا کیا لگتا ہے؟" آپ نے عرض کی کہ "حضرت! یہ میرا برادرِ خورد ہے۔ ہم اپنے والدِ ماجد

کے صرف دو ہی فرزند ہیں۔ میرا یہ بھائی ذہین تو ہے مگر شوخ طبع اور شعر و شاعری کا دلدادہ ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ اپنی توجہ زیادہ سے زیادہ مذہبی تبلیغ کی طرف متوجہ کرے۔"

حضرت نے فرمایا کہ شعر حسن بُرا تو نہیں ہے۔ اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰن۔ اِنَّ فِی الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً۔ اچھا اس کا نام کیا ہے؛ آپ نے عرض کی کہ حضرت! یہ تو نام کا مبارک ہی ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔

حضرت مولینا نے نہایت ہی مشفقانہ انداز میں فرمایا کہ اِن شاء اللہ المستعان کام کا بھی مبارک ہو گا۔ ہاں اس کو کسی عرصہ کے لئے وَرنو (لولاب) بھیج دیجئے۔ گو میں عدیم الفرصت ہوں لیکن علماء دیوبند میں سے میرے ایک ساتھی عزیز الرحمٰن صاحب ایک صوفی منش بزرگ ہیں۔ کسی مدت کے لیئے اُن کی صحبت میں رہ کر آپ کا بھائی ضرور محظوظ ہو گا۔ اور اگر فرصت ملی تو میں اپنے برادرِ صغیر مولوی سیف اللہ شاہ کے ساتھ اس کو بھی پڑھاؤں گا۔ یقیناً یہ تو مولینا کا فرمان واجبُ الاذعان تھا کہ مجھ میں حضور انور سے استفادہ کا شوق دامنگیر دل و دماغ ہوا اور میں آپ کی واپسی کے چند ہی دنوں کے بعد وَرنو (لولاب) روانہ ہوا۔

میں سیدھے مولینا کے کاشانۂ علم و ادب میں داخل ہوا۔ میرے ساتھ آپ کے بھائی حکیم عبداللہ شاہ صاحب تھے۔ جو بسم اللہ شاہ" کے عرف سے معروف تھے۔ آپ نے میرے لئے سفارش کی۔ حضرت مولینا مرحوم نے فرمایا کہ یہ سفارش کے بغیر ہی میرے منظورِ نظر ہیں۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ میں مصروف ہوں۔"

بہر حال حضرت نے اپنے دوسرے بھائی مرحوم سلیمان شاہ صاحب سے فرمایا کہ آپ اسے مولینا عزیز الرحمٰن سے ملا ئیے اور ان کو تاکید کیجئے کہ فی الحال سیف اللہ شاہ اور مبارک شاہ کو مشکوٰۃ شریف کا درس دیں۔

دوسرے دن ہم دونوں اکٹھے مولانا عزیز الرحمن صاحب کے گھر پر حاضر ہوئے۔ جو موضع کاواڑی میں سکونت پذیر تھے۔ جونہی میری نظر آپ کے نورانی چہرہ پر پڑی۔ میں آپ کا شیفتہ ہوا۔ آپ پہلے درجہ کے متقی اور زاہد تھے۔ اپنے ہاتھ سے اپنی زمین میں مکئی بوتے اور کاشت کا کام خود کر لیتے تھے۔ اسی پیداوار سے آپ کی غذای حلال تھی۔ آپ ایک بھینس بھی پالتے تھے اور اسی کے دودھ وغیرہ کے ساتھ مکئی کی روٹی تناوُل فرماتے تھے۔ آپ نے شاہ صاحب کا فرمان بسرو چشم قبول کیا اور ہم دونوں (سیف اللہ شاہ مرحوم اور راقم الحروف) ان سے درسِ حدیث مع اسناد حاصل کرتے رہے۔ میں نمبردار دہ رحیم میر ورنو ولدِ کریم میر مرحوم کے گھر میں سکونت پذیر ہوا۔ یہ نہایت ہی مخلص اور علم دوست آدمی تھا۔

بہر حال میں روزانہ مولانا عزیز الرحمن صاحب دیوبندی سے درسِ حدیث لے لیتا تھا۔ شام کو حضرت شاہ صاحبؒ کی صحبت میں رہ کر تذکرۃ العلماء کے حظِ وافر سے محظوظ رہتا تھا۔

غالباً دو مہینے یہی سلسلہ جاری رہا بعد میں حضرت شاہ صاحبؒ کو دیوبند سے اچانک بُلاوا آیا۔ اور وہ دیوبند تشریف لے گئے۔ اور پھر میں بھی آپکی غیر حاضری میں وہاں پر مطمئن نہ رہ سکا۔ اور چونکہ اسی اثناء میں مولانا عزیز الرحمن کی صحت بھی خراب ہوئی۔ اس لئے میں واپس اپنے گھر کو سرینگر روانہ ہوا۔

از درِ شاہ چگویم بچہ سامان رفتم
ہمہ ذوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رفتم

بہر کیف یہی وجہ ہے کہ مجھے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی کے ساتھ بے انتہا عقیدت ہے۔ ع

"شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"

حضرت ممدوحؒ ہی سے راقم کو ایک لاینحل مسئلہ طے ہوا۔ میں طالبعلمی کی وجہ سے اور اَلعِلمُ حجابُ الاکبر کے بموجب استمداد مِن ارواح الانبیاء وَالاَولیاء کے بارے میں مُشتبہ عقیدہ کا تھا۔ آپ نے فرمایا — بچّہ! ہر عمل کا دارومدار نیت پر ہے۔ اِنّما الاعمالُ بالنّیات اگر عقیدتاً یا حقیقتاً انبیاء و اولیاء سے اِستمداد کیا جائے تو کفر ہے۔ خبردار اس بارے میں نیت کو صاف و پاک کیا جائے۔ ورنہ ع

"چو کُفر از کعبہ بر خیزد کجُا ماند مسُلمانی"

اور آپ خاندانِ نبویؐ سے نِسبت کے مُدّعی ہیں لہٰذا آپ سے زیادہ احتیاط مطلوب ہے"۔

اس کے علاوہ حضرت کی صحبت میں ہمارے حنفی عقائد کے بہت سے پیچیدہ مسائل بھی حل ہوئے۔ صلوٰتُ اللہ وسلامُہٗ علی النبی عرض کرنے کے وقت سرینگر میں لوگ دونوں ہاتھ دُعا کے طور پر اُٹھاتے تھے ہم نے آپ سے عرض کی کیا صلوٰۃ و سلام کے وقت ہم اپنے ہاتھوں کو نماز کی طرح ادب سے باندھیں گے یا بصورتِ دُعاء دونوں ہاتھ پھیلائیں گے ؛ حضرتؒ نے جواباً فرمایا۔ ادب سے ہاتھ باندھو تو عینِ ادب ہے۔ پھر مولینا عارف رومیؒ کا یہ شعر زبان پر لایا ؎

کردم از عقل سوالے کہ بگو ایمان چیست
عقل در گوشِ دِلم گفت کہ ایمان ادب است

خاص کر رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے بارے میں ادب کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبی است

اور اگر کوئی دُعاء کی نیت سے ہاتھ اُٹھائے تو الصّلوٰۃ علی النّبیِ دُعاء" یعنے سرورِ کائنات پر درود پڑھنا دعا ہے"۔ قرآنِ حمید میں آیا ہے اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ آپ کی صلوٰۃ یعنے دُعاء مؤمنوں کے لئے طمانیتِ قلب ہے۔

اسی طرح آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ کشمیر میں حضرت سیّد عبدالرحمٰن بلبل نے سب سے پہلے اسلام پھیلایا۔ وہ خود حنفیُ المذہب تھے۔ آپ کے بعد جناب امیر کبیر میر سیّد علی ہمدانی نے بھی اس ملک میں حنفی عقیدت ہی کی تعلیم فرمائی۔ حالانکہ وہ خود شافعیُ المسلک تھے۔ کیونکہ جب کسی جماعت نے اپنا ایک مذہب مقرر کیا تو پھر اس میں دوسرا مذہب ٹھونسنا فتنہ و فسادات کا باعث ہے۔ اور قرآنِ عزیز بھی اس سے منع کرتا ہے۔ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔

غرض احقر نے آپ کی صحبت میں تمام مذہبی شکوک رفع کئے ہیں۔ اس کوتاہ مضمون میں ان کا اندراج طولِ کلام ہوگا۔ اَلْكَلَامُ مَا قَلَّ وَدَلَّ۔

حضرت شاہ صاحب کے متعلّق یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ آپ حضرت بابا مسعود نروری کی اولاد امجاد میں سے ہیں۔ اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ لوگوں میں کانیں ہیں۔ جس طرح کہ سونے اور چاندی کی کانیں ہیں۔ اس حدیثِ شریف کی رو سے آپ اپنے جدِّ بزرگوار کی علمی کان کے ایک امانتدار تھے۔ شیخ علی مُتّقی مُحدّث ایک آیہ کریمہ کے اقتباس کی شرح میں فرماتے ہیں کہ صَلَاحِيَّةُ الْاَبِ تُوْرَثُ لِلْوَلَدِ وَلَوْطَغٰی۔ یعنے باپ کی بزرگی اولاد کو ورثہ میں ملتی ہے۔ اگرچہ وہ (بالفرض) نافرمان

ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی دلیل و ثبوت یہ ہے کہ وَکَانَ اَبُوْھُمَا صَالِحًا
یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ و السّلام اور حضرت خضرؑ کی
ملاقات کے سلسلے میں قرآنِ کریم میں مذکور ہے۔

غرض حضرت بابا مسعود نوری ؒ اس قسم کے مُتّقی، عارف اور صوفی صافی تھے کہ حضرت میر سیّد میرک اندرابی ؒ نے اپنی صاحبزادی کا عقد اُن سے باندھا۔ حالاں کہ شیخ مسعود آلِ صوری نہیں تھے۔ مگر آلِ معنوی ضرور تھے۔ کیونکہ کُلُّ تَقِیٍّ آلِیْ۔ باوجود اس کے حضرت شاہ صاحب کی تقویٰ شعاری کا یہ مقام تھا کہ اسی مضمون کے ماتحت کسی اخبار نویس نے آپؒ کے اسمِ گرامی کے ساتھ "سیّد" لکھا۔ یہ ہمارے ہی وقت کا واقعہ ہے کہ حضرت نے اس بارے میں ایک بیان اخباروں میں بھیجا کہ :-

"میں رسولُ اللہؐ کی اولاد کا غلام ہوں، مُحِبِّ عترت ہوں، سیّد نہیں ہوں۔"

آپؒ سے کوئی اِستفتاء کرتا تو ہرگز کوئی اُجرت نہیں مانگتے اور نہ ہی لیتے۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ آپ کے والدِ بزرگوار مولانا مُعظم شاہ صاحب کی خدمت میں اکثر لولاب کے لوگ اِستفتاء کے لئے آتے رہتے اور ہدیہ کے طور پر کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور ساتھ لے آتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے کچھ سیب لائے۔ شاہ صاحبؒ کی نظر جب اُس شخص پر پڑی تو سخت رنجیدہ ہوئے۔ اپنے والدِ ماجد سے کمالِ ادب سے عرض کی کہ فتویٰ لکھنے کے عوض کوئی تحفہ نہ لیا کریں۔ ہاں ہدیہ لینا کوئی ناجائز امر نہیں۔ تھادوا تحابوا حدیث صحیح ہے۔ ہدیہ دینے سے محبّت بڑھتی ہے مگر فتویٰ لکھتے وقت ہدیہ قبول

کرنا مشتبہ امر ہے۔[لہ]

آہ کایں قمریٔ فردوس مکان آمد و رفت
بلبل آسا بگلستانِ جہاں آمد و رفت

آہ کایں ماہِ منوّر چو شہِ انور بود
ہمچو نور قمری آہ چساں آمد و رفت

پرتوِ مہرِ درخشان بجہانے بنمود
صبح وش بر سرِ ما نور فشاں آمد و رفت

گرچہ خفاش صفت ماند ز نورش محروم
ہمچو خورشید ضیا لیک عیان آمد و رفت

مرہم زخمِ جگر داروی دردِ دلہا
چوں مسیحا بمریضان گمان آمد و رفت

فطرتؔ ایں پیش روِ زمرۂ اہلِ ایقان
زین خراباتِ جہاں سوئے جناں آمد و رفت

ﭼ

لہ "آج کل کے جو فتویٰ فروش مفتی اور شکم پرست نیم ملّا فتویٰ لکھنے سے پہلے ہی مستفتی سے چکا مکا کر اُجرتِ فتویٰ حاصل کرتے ہیں، انکی ضمیر کی آنکھیں کھولنے کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد سرمۂ بصیرت ہونا چاہیئے"۔ کوندو

نمونۂ
ملفوظاتِ انور ؒ

۱۔ علم سے (صرف) معاش کا کام لینا اور اسی مقصد کے لئے اسے حاصل کرنا ایک بدترین مصیبت ہے۔ ان لوگوں کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو بازار سے ایک قیمتی شال اس لئے خرید کرتا ہے کہ وہ اس سے اپنے جوتے صاف کیا کرے گا۔
(بحوالہ تاریخ دیوبند صنہ ۴)

۲۔ "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" کے وقت انگوٹھا چومنا بے اصل ہے سوا ایک اثر کے جسے حضرت ابوبکرؓ سے ملّا علی قاریؒ نے موضوعات میں ذکر کیا ہے لیکن وہ منکر وضعیف ہے۔ مولینا عبدالحیؒ نے السعایہ (حاشیہ شرح وقایہ) میں بسیط بحث کی ہے۔ (فیضُ الباری جلد ۲ ص ۶۶)

۳۔ میلاد کا قیام بدعت ہے۔ تاریخ ابن خلکان میں ہے کہ ملک اربل نے اسے رائج کیا۔ ابن وحیہ نے میلاد کی کتاب لکھی تھی۔ سید یحییٰ اور ابنِ حجر قُوْمُوْا لِسَیِّدِکُمْ" سعد ابن معاذ پر قیاس کر کے اجازت دیتے ہیں مگر قیاس مع الفارق اور قیاس المحقق علی الموہوم ہے۔ (فیض الباری ج ۲ ص ۳۱۹)

۴۔ مولینا شمس تبریز خان صاحب آروی رسالہ "دار العلوم" (جولائی ۱۹۶۷ء) میں مقدمہ مشکلات القرآن کے حوالہ سے رقمطراز ہیں:۔

"آپ کی (یعنے حضرت شاہ صاحب کی) رائے تھی کہ قرآن کا اسلوب تالیف و ترتیب کا نہیں بلکہ خطیبانہ اسلوب ہے جو سامعین کا لحاظ

رکھتا ہے اور حسب موقع گفتگو کا رُخ بدلتا رہتا ہے۔ کیونکہ عرب کا مزاج ایسا ہی تھا، آپ کا کہنا تھا کہ قرآن واقعات کی کھتونی اور حیات و ممات کا رجسٹر نہیں بننا چاہتا، بلکہ اس کا مقصد تذکیر و نصیحت اور عبرت و موعظت ہے اس لئے واقعات کا بھی اسی حد تک ذکر کرتا ہے اور اجمال و تفصیل سے کام لیتا ہے۔ آپ کا خیال تھا کہ قرآنی بیانات کی تکرار قند مکرر کا لطف دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن خود اپنی تفسیر و تشریح بھی کرتا ہے جس سے موضوع کی اہمیت بھی کھل جاتی ہے۔ جیسے نماز کا ذکر ۹۰ مرتبہ سے زیادہ آیا ہے۔ مولانا حمیدالدین فراہیؒ (صاحب نظام القرآن) کی طرح شاہ صاحب بھی ربطِ آیات اور قرآن مکمل، منظم اور مربوط ہونے کے قائل تھے۔ فرماتے تھے کہ ہم اپنی کم فہمی سے وہ ربط نہیں سمجھ پاتے، مگر فقہاء کے مرتب کلام کی طرح ہر بات کسی اصل اور قاعدے کے تحت ہوتی ہے۔ نسخ قرآن کے وہ قائل نہ تھے۔ سیوطی بیسؔ آیتوں اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ پانچ آیتوں میں نسخ کے قائل ہیں۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ بظاہر منسوخ آیتوں کا حکم بھی کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔ وہ قرآن میں کسی زائد حرف کے بھی قائل نہ تھے بلکہ ایسے حروف کو کسی مزید فائدہ پر مشتمل سمجھتے تھے۔ (مقدمہ مشکلات القرآن ص ۷۶–۸۰)

۵۔ "عالم برزخ یہی زمین و آسمان کے درمیان کی فضا ہے"۔

(بحوالہ حیاتِ انور ص ۱۹)

۶۔ احادیث مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں قیامت تک عالم برزخ میں رہیں گی۔ جنت یا دوزخ میں داخلہ قیامت کے روزِ حساب و کتاب کے بعد ہوگا۔ قیامت تک جنت یا دوزخ کے آرام یا تکلیف ان روحوں پر پہنچتے رہتے ہیں۔ اور وہ ان

اثرات کی راحت یا اذیت محسوس کرتی رہتی ہیں۔

(بحوالہ حیات انور ص ۱۹)

۷۔ (ایک دفعہ عقلی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے فرمانے لگے:)
"ذرا ان منطقیوں کی حماقت ملاحظہ کیجیئے کہ درخت ایک مرکب حقیقت ہے، جڑ، تنا، شاخیں، برگ و بار سب ہی اس کے اجزاء ہیں. فرض کیجئے کہ کوئی ہلکا سا پتّا گر گیا تو منطقی کہدیگا کہ درخت باقی نہ رہا اس لئے کہ جُزء کا اِرتفاع کُل کے اِرتفاع کو مستلزم ہے۔

(دار العلوم مئی ۱۹۷۱ء ص ۱۲)

۸۔ حافظ ابن حجر سے فجر کی سُنّتوں کے بارے میں حدیث کی مراد سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ حالانکہ فجر کی سنتوں کے بارے میں ترمذی ص۵۷ پر ہے۔ "مَنْ لَمْ یُصَلِّ رکعتی الفجر فلیصلیھا ما تطلع الشمس".
یہ حدیث مسند احمد اور دار قطنی میں پانچ طریقوں سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ تینؔ سُنَنِ بیہقی، دو صحیح سُنَن ابن حبان، دوؔ مستدرک اور ایک طبقات ذہبی کی سُنن کبریٰ اور طحاوی میں ہیں ان سب کا مدار حدیث قتادہ ہے۔ (العرف الشذی علیٰ جامع الترمذی ص ۹۲، ۹۴ مطبع القاسمیۃ)

۹۔ "اگر آدمی صحیح بصیرت کے ساتھ احادیث میں غور و فکر کرے تو اس کو معلوم ہوگا کہ اکثر و بیشتر احادیث قرآن کے اجمال کا بیان اور اس کے اشارات کی توضیحات ہیں بلکہ کثرت سے ایسی احادیث ہیں جن میں تعبیراتِ قرآنی کے لطیف اشارے ملتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مُطالعہ کے لئے سیوطی کی دُرِّ منثور بہت مُفید کتاب ہے۔" (مقدمۂ مشکلات القرآن از مولینا محمد یوسف صاحب بنوری ص ۱۴)

۱۰۔ کُل اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ناروا الفاظ کہنے والا کافر ہے۔ اور جو شخص اُس کے کفر میں شک کرے، وہ بھی کافر ہے"۔

(اکفارُ الملحدین فی ضروریاتِ الدین ص۴۳)

۱۱۔ فلسفۂ قدیم اَبعَد عن الاسلام ہے۔ اور فلسفۂ جدید اَقرب الی الاسلام ہے، حق تعالیٰ کی مشیت ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جن عُقلاءِ زمانہ نے اسلامی چیزوں معجزات و روحانیت وغیرہ کا اِنکار کیا تھا، ان ہی کے فلسفہ، ریسرچ اور تحقیقات سے وہ سب چیزیں دُنیا والوں کے لئے ثابت و مشاہد ہو جائیں۔

(چنانچہ روح اور روحانیت کا اِقرار وہ کر چکے، خوارق و عادات بھی تسلیم ہو چکے جن سے معجزاتِ اِسلام کا استبعادِ عقل ختم ہُوا۔

قرآنِ مجید میں ہے کہ اہلِ جنت و اہلِ جہنم آپس میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، پہچانیں گے اور باتیں کریں گے حالانکہ ان کے درمیان بہت غیر معمولی فاصلہ ہو گا، تو اب ٹیلیفون، لاسکی، ٹلغراف، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی ایجادات نے اس کو بھی قریبِ عقل و مشاہدہ کیا ہے۔

اَصوات و اعمال کا ریکارڈ مستبعد سمجھا جاتا تھا مگر گراموفون کی ایجاد نے اس سے بھی مانوس کر دیا کہ حق تعالیٰ نے زمین اور اس کے متعلقات میں بھی اخذ و ریکارڈ کا مادّہ ودیعت فرما دیا تھا۔ جس کو ہم یورپ کی ان ایجادات سے پہلے عقل و مشاہدہ کی رُو سے نہ سمجھ سکتے تھے۔)

(نُطقِ انور حصّۂ اوّل ص ۱۱ از مولینا سید احمد رضا صاحب بجنوری)

۱۲۔ آخرت میں اعمال کا ثمرہ جو ملے گا وہی عمل ہونگے۔ ان کی ایک صورت ہے عالم دنیا کی اور دوسری عالمِ آخرت کی، عمل ایک ہی ہے لیکن

مکان کے اعتبار سے فرق ہے کہ وہی عمل وہاں جزاء کی صورت میں ہو گا۔ اور اس کی دلیل آیتِ قرآنی وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ہے۔ جس کے ایک معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ ملیگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ بعینہٖ اپنے کئے ہوئے اعمال ہی کو آخرت میں موجود پائیں گے۔ اور یہ مفہوم دوسری آیات و احادیث سے بھی مُؤیّد ہوتا ہے۔ (نطقِ انور حصّہ اوّل ص ۹۰)

۱۳۔ حضرت شیخ محی الدّین ابن عربیؒ کا کشف ہے کہ "محشر میں پہنچنے کے وقت داہنی طرف اللہ اکبر، بائیں طرف سُبحانَ اللہ، پچھلی طرف الحمدُللہ اور سامنے سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یہ چاروں کلمات رفیق ہوں گے۔"

یہ ترتیب اسی لئے ہے کہ اللہ اکبر اعلان کی چیز ہے، چنانچہ نعرۂ تکبیر جہاد وغیرہ میں ہے اور یہ علمِ جہاد بھی داہنے ہاتھ میں ہوتا ہے، لہٰذا داہنی جانب مُناسب ہے۔

سُبحانَ اللہ تسبیح ہے نقائص و عیوب سے اور صفتِ سلبی ہے۔ لہٰذا ڈھال کی جگہ (بائیں طرف) مُناسِب ہے۔ الحمدُ للہ یہ آخر میں اور ہر کام کے پیچھے ہُوا کرتا ہے، جیسے کھانے کے بعد، اور ترازو میں بھی آخر میں ہو گا، لہٰذا پیچھے ہونا مُناسِب ہے۔ اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ چونکہ ہادی اور راہنما ہے اس کا سامنے ہی ہونا مُناسِب ہے۔ (نطقِ انور حصّہ اوّل ص ۹۲)

۱۴۔ حضرتِ آدم علیہ السّلام کی خلافت کی وجہ علم زیادہ ہونا ملائکہ سے بتلایا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک چونکہ حضرت آدمؑ کی خلقت ہی میں عبدیت زیادہ تھی بہ نسبت ملائکہ کے، اس لئے وہ

خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں کیونکہ خلافت عطا فرمانے کی بات، اور اس پر ملائکہ کی طرف سے عرض و معروض پہلے ہی ہو چکی تھی، پھر جب یہ مکالمہ (یا مناظرہ) ختم ہو چکا تو حق تعالیٰ نے ایک کرشمہ بھی دکھایا کہ حضرت آدمؑ کو علم عطا فرما کر ظاہر میں حجت بھی قائم فرمادی یعنے ارشادِ خداوندی عطا و منصب خلافت پر ملائکہ نے بنی آدم کے ظاہری احوال سے "سفکِ دما" و "فساد فی الارض" کا اندازہ لگا کر جو بے محل سوال کر دیا تھا حق تعالیٰ نے صرف اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ فرما دیا، اور فرشتے بھی اپنے بے محل سوال پر نادم ہو گئے، پھر بعد کے واقعات نے ظاہر کر دیا کہ حضرت آدمؑ نے ہر موقع پر جناب باری میں نہایت عاجزی، غایت تذلل اور تضرع و ابتہال ہی کا اظہار کیا، اور کوئی بات بھی بجز عبودیت کے ظاہر نہ فرمائی، حالانکہ وہ بھی حجت و دلیل اور سوال و جواب کی راہ اختیار کر سکتے تھے، چنانچہ جب حضرت موسیٰؑ سے مناظرہ ہوا تو حضرت آدمؑ نے ایسی قوی حجت پیش فرمائی کہ حسبِ ارشادِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر غالب آ گئے، ظاہر ہے کہ یہی دلیل وہ حق تعالیٰ کی جناب میں بھی پیش کر سکتے تھے مگر وہاں ایک حرف بھی بطور عذر گناہ نہیں کہا، بلکہ اس کے برخلاف اپنی قصور ہی کا اعتراف فرما کر مدتِ دراز تک توبہ و استغفار، عجز و نیاز اور گریہ و زاری میں مصروف رہے، میرے نزدیک یہی عبودیت اور سراپا طاعت و نیاز مندی کا وہ مقام تھا جس کی وجہ سے حضرتِ آدمؑ خصوصی فضیلت اور خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوئے ہیں، پھر اس کے بعد جو حق تعالیٰ نے حضرتِ آدم علیہ السلام کے وصفِ علم کو اس موقع پر نمایاں کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کا وصف ظاہر تھا، جس کو

سب معلوم کر سکتے تھے، اس لئے نہیں کہ وہ مدارِ فضیلت تھا، بخلاف وصفِ عبودیت کے کہ وہ مشہور و پوشیدہ وصف تھا، جس کو معلوم کرنا دشوار تھا۔ الخ (نُطقِ انور حصۂ اوّل ص ۱۶۶-۱۶۷)

۱۵۔ امام شافعیؒ چونکہ فقیہ النفس تھے اس لئے انہوں نے امام محمدؒ کی کما حقہٗ تعریف کی ہے۔ کبھی فرماتے ہیں کہ امام محمدؒ دل اور نگاہ دونوں کو بھر دیتے ہیں (کیونکہ خوب صورت تھے اور علم بھی اچھا تھا) کبھی فرماتے ہیں کہ جب امام محمدؒ گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وحی نازل ہو رہی ہے، ایک بار فرمایا کہ میں نے ان سے دو اونٹوں کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا۔

جہاں تک محدثین کی بات ہے تو ان میں جو لوگ فقیہ نہیں ہیں انکو امام محمدؒ کی قدر و منزلت معلوم نہیں اس لئے ان لوگوں سے امام محمدؒ کے بارے میں تعریفی کلمات منقول نہیں ہیں۔ محدثین کی ناپسندیدگی کی وجہ یہ ہے کہ امام محمدؒ پہلے شخص ہیں جس نے فقہ کو حدیث سے الگ کیا۔ ان سے پہلے تصنیف کا انداز یہ تھا کہ حدیث اور فقہ کو ایک ساتھ مخلوط کر کے ذکر کرتے تھے۔ بہرحال چونکہ انہوں نے محدثین کے انداز کے خلاف کیا، اس لئے ان لوگوں نے اس بارے میں ان کو مطعون کیا حالانکہ آخرکار تمام مذاہب والوں کو ان کی اتباع کرنی پڑی اور سب نے انہیں کا طریقۂ کار اختیار کیا۔ (فیض الباری ج ۱ صـ ۱۵۲ - صـ ۱۵۳)

۱۶۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے فرمایا کہ فلاسفہ میں سے کوئی بھی عالم کے قدیم ہونے کا قائل نہیں ہے، افلاطون بھی عالم کو حادث کہتا تھا یہاں تک کہ رسوائے زمانہ ارسطو آیا اس نے عالم کے قدیم ہونے کا اعتقاد قائم کیا لیکن یہ اعتقاد بالکل غلط ہے، اس کا قائل کافر ہے[۱]۔

تمام آسمانی مذاہب بھی عالم کے حادث ہونے پر متفق ہیں۔ ہاں بعض

۱ؔ کیونکہ اس کا فلسفہ چند بنیادی مسائل میں اسلامی عقائد سے متصادم ہے۔ کوندو

صوفیاء کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے بعض چیزوں کو قدیم مانا ہے۔ مثلاً شیخ اکبرؒ، علامہ شعرانی شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عبارتیں بعد کی ملائی ہوئی ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ شیخ اکبر بعض مسائل میں منفرد ہیں چنانچہ انہوں نے فرعون کے ایمان کا اعتبار کر لیا ہے اگر اس نے توبہ نہ کی ہوگی تو اس کو اس کے اعمال کی سزا ملیگی مگر شیخ اکبر کے نزدیک وہ ہمیشہ جہنّم میں نہیں رکھا جائیگا۔ بحر العلوم نے شیخ اکبر کی طرف بعض اشیاء کے قدیم ہونے کو منسوب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نسبت صحیح ہے لیکن دوانی نے ابن تیمیہ کی طرف عرش کے قدیم ہونے کی جو نسبت کی ہے یہ درست نہیں ہے۔ (فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۶)

۱۷۔ جان لو کہ فلاسفہ میں کوئی حدوث ذاتی کا قائل نہیں تھا، ابن سینا نے اگر یہ اصطلاح ایجاد کی اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام اور فلسفہ کے درمیان بیچ کا راستہ نکال لے۔ فلاسفہ یونان افلاک اور عناصر کو شخصی طور پر قدیم مان رہے تھے اور موالید ثلثہ (جمادات، حیوانات، نباتات) کو نوعی اعتبار سے قدیم مانتے تھے، میں نے اپنے رسالہ میں اس عقیدہ کے بطلان کو واضح کیا ہے۔ ابن رشد نے تہافت التہافت نامی ایک کتاب لکھی ہے جس کے اندر امام غزالی پر اعتراضات کئے ہیں، میں نے غزالی پر کئے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ لکھا ہے مگر اب تک اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ میرے خیال میں ابن رشد ابن سینا سے زیادہ ماہر ہے اور ارسطو کا کلام ابن سینا سے زیادہ سمجھتا ہے۔

(فیض الباری ج ۱ ص ۱۶۶)

حضرت شاہ صاحب کے عربی کلام کا نمونہ

حضرت شاہ صاحبؒ نے "اِکفَارُ المُلحِدِین فی شیئٍ من ضروریاتِ الدِّین"
کے نام سے ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے، جس میں مسائلِ اجماعیہ وقطعیہ کے منکرین
اور ضروریات دین یعنی متواتراتِ شرعیہ میں تاویلیں کرنے والوں کی تکفیر کا
مسئلہ کافی اور وافی دلائل کے ساتھ نہایت شرح وبسط سے واضح فرمایا ہے۔
اس رسالہ میں حضرتِ ممدوحؒ نے ایک قطعۂ اعجازیہ بھی نظم فرمایا ہے جو اُمتِ
محمدیہ اور بالخصوص علماء کی خدمت میں بطورِ استدعاء کے ہے اس میں مرزا قادیانی
علیہ ما علیہ کی کفریات (جن کی وجہ سے وہ کافر قطعی قرار پایا) کی تردید میں دلائل
دئے گئے ہیں۔

حضرت موصوف قُدِّسَ سرُّہٗ کے ارشد تلمیذ حضرت مولینا سید محمد ادریس صاحب سکروڈوی
مرحوم نے ان اشعار کا اُردو ترجمہ بہ تکمیل حوالہ جات ضروری تشریح کے ساتھ

"صَدْعُ النِّقَابِ عَنْ جَسَّاسَةِ الفَنْجَاب"

نام کے رسالہ میں شائع کیا ہے۔ یہ رسالہ ۱۹۲۵ء میں مطبع قاسمی دیوبند سے
شائع ہوا ہے اور آج کل نایاب ہے۔

اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ ترجمہ کتنی ہی قابلیت سے کیا جائے پھر بھی اس میں
"اصل" کی تمام تر خوبیوں کا برقرار رہنا ممکن نہیں اسلئے ہم حضرتِ موصوفؒ کی عربی نظم
بھی ترجمے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ قارئین کرام کی خدمت میں مختصر حواشی کے ساتھ
ہماری یہ پیشکش تبرّک کا بھی ہے اور بطورِ نمونۂ کلامِ حضرتِ ممدوحؒ بھی۔

کوندو عفی عنہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ○

أَلَا يَا عِبَادَ اللّٰهِ قُومُوا وَقَوِّمُوا خُطُوبًا أَلَمَّتْ مَا لَهُنَّ يَدَانِ [1]

خبردار اے خدا کے بندو تیار ہو جاؤ اور جو ناقابلِ برداشت مصائب ٹوٹ پڑے ہیں اُنکو درست کردو

وَقَدْ كَانَ يَنْقَضُّ الْهُدٰى وَمَنَارُهُ وَيَنْزَحُ خَيْرٌ مَّا لِذَاكَ تَدَانِ [2]

بہت قریب ہے کہ ہدایت اور نشانِ ہدایت گر جائیں اور خیر دور ہو گئی ہے جو پھر نزدیک ہونے کو نہیں ہے

يُسَبُّ رَسُولٌ مِّنْ أُولِي الْعَزْمِ فِيكُمْ تَكَادُ السَّمَا وَالْأَرْضُ تَنْفَطِرَانِ [3]

ایک اولوالعزم رسول تمہارے سامنے ذلیل کیا جارہا ہے۔ قریب ہے کہ آسمان اور زمین پھٹ پڑیں۔

وَطَهَّرَهُ مِنْ أَهْلِ كُفْرٍ وَلِيُّهُ وَأَبْقٰى لِنَارٍ بَعْضَ كُفْرٍ أَمَانِي [4]

جس رسول کو حق تعالیٰ نے کافروں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک کیا اور محض دوزخ کے لئے بعض کفر جھوٹی نبوّت کی خیال بندیوں کا چھوڑ دیا۔

وَحَارَبَ قَوْمٌ رَبَّهُمْ وَنَبِيَّهُ فَقُومُوا لِنَصْرِ اللّٰهِ إِذْ هُوَ دَانِ [5]

ایک قوم نے اپنے خدا اور نبی سے لڑائی باندھی۔ پس تم اللہ کی مدد پر کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے قریب ہے

وَقَدْ عِيلَ صَبْرِي فِي انْتِهَاكِ حُدُودِهِ فَهَلْ ثَمَّ دَاعٍ أَوْ مُجِيبٌ أَذَانِي

خدا کی حدود توڑی جانے کی وجہ سے میرا صبر مغلوب ہو گیا۔ پس ہے کوئی اس جگہ بلانے والا یا میری آواز کا جواب دینے والا؟

وَإِذْ عَزَّ خَطْبٌ جِئْتُ مُسْتَنْصِرًا بِكُمْ فَهَلْ ثَمَّ غَوْثٌ يَا لَقَوْمِ يُدَانِي

اور جب مصیبت حد سے بڑھ گئی تو میں تم سے مدد چاہنے آیا۔ پس اے قوم ہے کوئی فریادرس جو میرے نزدیک ہو

---

[1] اس شعر میں حضرت شاہ صاحبؒ کی غرض اُمّتِ مرحومہ اور بالخصوص جماعت عُلماء کو قادیانی فتنہ کی طرف توجہ دلانا ہے۔

[2] ہدایت اور نشانِ ہدایت گر جانے سے آیاتِ قرآنی میں دخل فصل اور انبیاء علیہم السلام کی توہین و تذلیل کئے جانے کی طرف اشارہ ہے۔

[3] رسول اور اولوالعزم سے مراد یہاں حضرت عیسیٰؑ ہیں جنکی توہین و تذلیل میں مرزا قادیانی نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

[4] اس شعر میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے جسمیں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے ہاتھوں سے مامون رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

[5] قوم سے مراد یہاں ملاحدہ اور شیاطین کی ایک مخصوص جماعت قادیانی گروہ ہے۔

لَعَمْرِیْ لَقَدْ نَبَّھْتُ مَنْ کَانَ نَائِمًا — وَاَسْمَعْتُ مَنْ کَانَتْ لَہٗ اُذُنَانِ

قسم ہے مجھے کہ میں نے سوتے کو جگایا — اور جس کے کان تھے اُس کو سُنایا

وَنَادَیْتُ قَوْمًا فِیْ فَرِیْضَۃِ رَبِّھِمْ — فَھَلْ مِنْ نَصِیْرٍ لِیْ مِنْ اَھْلِ زَمَانِ

اور قوم کو اُس کے خدا کی فرض کی طرف بلایا۔ — پس ہے کوئی زمانہ میں جو میرا مددگار ہو؟

دَعُوْا کُلَّ اَمْرٍ وَاسْتَقِیْمُوْا لِمَا دَھٰی — وَقَدْ عَادَ فَرْضُ الْعَیْنِ عِنْدَ عِیَانِ ؁۶

سب کو چھوڑ دو اور جو فتنہ در پیش ہے اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اگر آنکھ کھول کر دیکھے تو ہر شخص پر فرض عین ہو گیا ہے۔

فَشَانِئُ شَانِ الْاَنْبِیَاءِ مُکَفِّرٌ — وَمَنْ شَکَّ قُلْ ھٰذَا لِاَوَّلَ ثَانٍ ؁۷

انبیاء کی توہین کرنے والا کافر ہے — اور جو اُس کے کفر میں شک کرے وہ پہلے کا دوسرا ہے

وَاَکْفَرُ مِنْہُ مَنْ تَنَبَّأَ کَاذِبًا — وَکَانَ انْتَھَتْ مَا اَمْکَنَتْ بِمَکَانِ

اور اُس سے بھی بڑھ کر وہ شخص کافر ہے جس نے جھوٹا دعوایٔ نبوت کیا۔ حالانکہ نبوت ختم ہو چکی تھی۔

وَمَنْ ذَبَّ عَنْہُ اَوْ تَاَوَّلَ قَوْلَہٗ — یُکَفَّرُ قَطْعًا لَیْسَ فِیْہِ تَوَانِ ؁۸

اور جس نے اس کے قول کی تاویل یا طرفداری کی — وہ بھی یقیناً بلا توقف کافر کہا جائے گا۔

کَاَنِّیْ بِکُمْ قَدْ قُلْتُمُوْا لِمَ کُفْرُہٗ — فَھَاکُمْ نُقُوْلًا جُلِّیَتْ لِمُعَانِ ؁۹

غالباً تم مجھ سے پوچھو گے وہ کیوں کافر ہے؟ تو تم لے لو نقلیں اُس کے کفر کی جو باتوفیق کیلئے ظاہر ہیں۔

؁۶ ان اشعار میں اس فتنہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام فتنوں سے بڑھ کر یہ فتنہ ہے۔ اس کے انسداد کی فکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔

؁۷ اس شعر میں مرزا کے کفر کی وجوہات میں سے ایک وجہ کفر سمجھایا گیا ہے یعنی اُس نے انبیاء علیہم السلام کی توہین و تذلیل کی ہے جو اس کے کفر کی علت اور سبب ہے اور اُس کے کفر میں شک کرنے والی ایک دوسری جماعت (لاہوری) کے کفر کی بھی تصریح فرمائی ہے۔

؁۸ کسی مُدعی نبوت کے قول میں تاویل کرنا یا اس کے قائل کی تحسین کرنا بھی ویسا ہی کفر ہے جیسا کہ اُس کلمۂ کفر کا کہنا کفر ہے۔ ؁۹ اس شعر میں علامہ مرحوم کا مقصد اس امر کا سمجھانا ہے کہ آئندہ اشعار میں جھوٹے مدعیان نبوت کے واقعات اور انکے متعلق علماء اُمت کے فیصلہ جو نظم کئے گئے ہیں وہ مرزا کے کفر کے نظائر ہیں جن سے مرزا کے لئے بھی فتویٰ لیا جائے۔

فَمَا قَوْلُکُمْ فِیْ مَنْ حَبَا مِثْلَ ذٰلِکُمْ ۔۔۔ مُسَیْلِمَۃَ الْکَذَّابَ اَھْلَ ھَوَانٖ

تمہارا اُس شخص کے حق میں کیا عقیدہ ہے، جس نے مُسیلمۂ کذّاب (مدّعی نبوت) کے حق میں ایسی مہربانی کی جو مُسیلمہ ذلیل اور رسوا ہے

فَقَالَ لَہُ التَّاوِیْلُ اَوْ قَالَ لَمْ یَکُنْ ۔۔۔ نَبِیًّا ھُوَ الْمَھْدِیُّ لَیْسَ بِجَانٖ

پس وہ کہنے لگا کہ مسیلمہ کے لئے بھی تاویل ہے یا کہا کہ مُسیلمہ نبی نہ تھا وہ تو مہدی تھا مجرم نہیں ہے۔

وَھَلْ ثَمَّ فَرْقٌ یَسْتَطِیْعُ مُکَابِرٌ ۔۔۔ وَحَیْثُ ادَّعٰی فَلْیَاْتِنَا بِبَیَانٖ

اور کیا کوئی مُنہ زور مُسیلمہ اور اس جھوٹے نبی میں فرق کرسکتا ہے اور اگر کوئی مدّعی فرق ہے تو بیان کرے

وَکَانَ عَلٰی اَحْدَاثِہٖ وَجْہُ کُفْرِہٖ ۔۔۔ تَنَبُّؤُہٗ مَشْھُوْدَ کُلِّ اَوَانٖ

مُسیلمہ کے کفر کی وجہ باوجود اور بہت سے مخترعات کے دعوایٔ نبوّت ہی مشہور وجہ ہر وقت ہوتی ہے۔

کَذَا فِیْ اَحَادِیْثِ النَّبِیِّ وَبَعْدَہٗ ۔۔۔ تَوَاتَرَ فِیْمَا دَانَہُ الثَّقَلَانٖ

احادیثِ نبی میں اور اُس کے بعد تمام جن و انس میں دعوایٔ نبوت ہی اُس کے کُفر کی وجہ متواتر رہی۔

فَاِنْ لَمْ تَکُنْ اَوْ قَدْ وُجُوْہٌ لِکُفْرِہٖ ۔۔۔ فَاَکْبَرُھَا دَعْوَاہُ تِلْکَ کَمَانِیْ[۱]

مُسیلمہ کے کفر کی وجوہ اور ہوں یا نہ ہوں مگر بڑی چلتی ہوئی مشہور وجہ دعوایٔ نبوت ہے جیسے مانی (کذاب) کے کفر کی وجہ دعوایٔ نبوت تھی۔

وَاَوَّلُ اِجْمَاعٍ تَحَقَّقَ عِنْدَنَا ۔۔۔ لَقِیْہِ بِاِکْفَارٍ وَّسَبْیِ عَوَانِیْ[۲]

اور سب سے پہلا اجماع جو ہمارے علم میں ثابت ہوا ہے وہ مُسیلمہ کی تکفیر اور اُنکی عورتوں کو اسیر کرلانے میں ہوا ہے

---

[۱] مانی کذّاب مدّعی نبوت کی طرح مُسیلمۂ کذّاب کی تکفیر کا سبب بھی اِدّعایٔ نبوت ہوا ہے اور دونوں باتّفاق اُمّت دعوایٔ نبوت کی بنا پر کافر قرار دئے گئے اور قتل کئے گئے۔

[۲] مُسیلمہ نبی کریمؐ کے آخری زمانہ میں مُدّعی نبوت ہوا اور آنجنابؐ کی وفات کے بعد سیّدنا ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ وقت نے مُسیلمہ پر چڑھائی کی اور نُصرت و کامیابی کے ساتھ قتال کیا اور اُنکی عورتوں کو اسیر کرکے لائے۔

وَكَانَ مُقِرًّا بِالنُّبُوَّةِ مُعْلِنًا لِخَيْرِ الْوَرىٰ فِي قَوْلِهٖ وَاَذَانٖ [12]

باوجودیکہ مسیلمہ نبی خیر البشر کی نبوّت کا اپنے قول اور اذان میں اعلان اور اقرار کرتا تھا۔

وَمَا قَوْلُكُمْ فِي الْعِيسَوِيَّةِ اَقِرُّوْا رَسُوْلًا لِاُمِّيِّيْنَ خَيْرَ كِيَانٖ [13]

تمہارا کیا فتویٰ ہے فرقۂ عیسویہ میں جو یہ کہتا ہے کہ نبی خیر الکائنات کی رسالت صرف امیوں ہی کیلئے ہے

وَهَلْ ثَمَّ مَا لَا فِيْهِ تَاْوِيْلُ مُلْحِدٍ وَمَنْ حَجَرَ التَّاْوِيْلَ رَهْمِیْ لِسَانٖ

اور کون سی جگہ ہے جہاں ملحد تاویل نہ کر سکے۔ اور کون ہے جو تاویل کرنیوالے کی زبان ہالکی بند کردے

وَهَلْ فِي ضَرُوْرِيَّاتِ دِيْنٍ تَاَوُّلٌ بِتَحْرِيْفِهَا اِلَّا كَكُفْرِ عِلَانٖ

اور کیا ضروریاتِ دین میں تحریف کر کے تاویل کرنا صریح کفر نہیں ہے؟

وَمَنْ لَمْ يُكَفِّرْ مُنْكِرِيْهَا فَاِنَّهٗ يَجُرُّ لَهُ الْاِنْكَارَ يَسْتَوِيَانٖ

اور جو ضروریاتِ دین کے منکر کی تکفیر نہیں کرتا وہ انکارِ ضروریات کو اپنے سر لیتا ہے۔

وَمَا الدِّيْنُ اِلَّا بَيْعَةٌ مَعْنَوِيَّةٌ وَمَا هُوَ كَالْاَنْسَابِ فِي السَّرَيَانٖ [14]

دین تو صرف ایک بیعتِ معنویہ ہے۔ وہ نسبوں کی طرح چلنے والا نہیں۔

---

[12] مسیلمہ بھی نبی کریم کی نبوّت کو مانتا تھا۔ مگر یہ کہتا تھا کہ مجھے بھی نبوّت میں شریک کیا گیا ہے۔ چنانچہ اُس نے جو خط نبی کریم کی خدمت میں بھیجا تھا اس میں لکھا تھا (رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی خدمت میں یہ ہے کہ میں امر میں شریک کیا گیا ہوں یعنی مجھ کو نبوّت میں خدا کی طرف سے شریک کیا گیا ہے)

[13] عیسیٰ اصبہانی ایک شخص کا نام ہے جس کی طرف نسبت کر کے یہودیوں کی ایک جماعت کو عیسویہ کہا جاتا ہے اس شخص کا خیال تھا کہ جناب محمد رسول اللہ رسولِ برحق ہیں مگر آپ کی بعثت اور رسالت صرف امیوں ہی کی طرف ہوئی ہے۔ ہمارے لئے رسول بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ [14] ان دو شعروں میں مرزا اور اُس کے ماننے والی جماعت کے کفر کی تیسری وجہ بیان کی گئی ہے۔ ختم نبوّت، ختم رسالت اور ختم شریعت کا مسئلہ ایک اجماعی اور قطعی اور ضروریات و متواترات فی الدین سے مانا گیا ہے جس کا منکر ماؤّل قطعاً کافر ہے۔

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ فَاتْلُهَا — وَلٰكِنْ بِاٰيَاتٍ مَآلَ مَعَانِيْ [۱۵]

مشرکین بھی نبی کریم ؐ کی تکذیب نہیں کرتے تھے۔ پڑھ لو ولکن الظّٰلمین الخ مگر خدا نے مآل اور انجام کے اعتبار سے اُن کو منکر قرار دیا۔

تَنَبَّأَ اَنْ لَا يُمْتَرٰى بِبَطَالَةٍ — كَحَجَّامِ سَابَاطٍ صَرِيْعِ غَوَانِيْ [۱۶]

ساباط کے رہنے والے حجام کی طرح ایک نازنینوں کے پچھاڑے ہوئے نے بیکاری سے بچنے کیوجہ سے دعوایٔ نبوت کیا۔

وَمُعْجِزَةٌ مَنْكُوْحَةٌ فَلَكِيَّةٌ — يُصَادِفُهَا فِيْ رُقْيَةِ الْكَرَوَانِ [۱۷]

اور اس کا معجزہ ایک منکوحہ آسمانی ہے جس کو منتر اطرق کری ان النعامۃ فی القریٰ کہہ کر پانے کی اُمید کرتا ہے۔

وَمَنّٰى لَهُ الشَّيْطَانُ فِيْهَا بِخِيْبَةٍ — رِفَاءً وَّوَصْلًا خِطْبَةً وَّتَهَانِيْ

اور اس منکوحہ کے قصہ میں شیطان نے مرزا کو اپنی وحی سے آسائش اور منگنی اور وصل کی آرزو دلائی۔

فَفَضَّحَهُ رَبُّ السَّمَاءِ بِحَوْلِهٖ — وَقُوَّتِهٖ وَاللّٰهُ فِيْهِ كَفَانِيْ

ربُّ السمٰوات نے اپنی طاقت و قوت سے اس کو خوب ہی رسوا کیا اور اس میں ہم کو اللہ کافی ہوا۔

---

[۱۵] اس شعر میں اس آیت کا اقتباس ہے:- فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ یعنی اے محمدؐ! کفار تیری تکذیب نہیں کرتے لیکن وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ گو کفارِ مکہ نے نبی کریم ؐ کو جھوٹا نہ کہا یا آپ کے مقولوں کو نہ جھٹلایا کیونکہ آپ کی راست بازی اور سچائی کو ہر ایک جانتا تھا لیکن انھوں نے خدا کی آیتوں سے جحود کیا اور خدائی احکام کو بالآخر نہ مانا۔ اس لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے اُن پر کفر کا الزام ہُوا اور انجام کار ان کو آیتوں کا منکر قرار دیا۔ مؤلف کی غرض اس میں مرزا کے کفر کی چوتھی وجہ بیان کرنی ہے کیونکہ اُس کی نبوت سے خدا کی آیتوں کا انکار لازم آتا ہے۔

[۱۶] ساباط ایک جگہ کا نام ہے، یہاں ایک حجام رہتا تھا جس کی عادت تھی کہ اپنی ماں کو چوراہے پر

(باقی صفحۂ آئندہ پر)

وَكَانَ ادَّعىٰ وَحْيًا سِنِيْنَ عَدِيْدَةً ۔ فَجَاءَ يُحَاكِيْ فَعْلَةَ الظَّرِبَانِ

مرزا اس معاملہ میں مدتوں وحی کا دعوی کرتا رہا۔ اور بالآخر وہ مثل حرکت ظربان کے نکلی۔

وَدَلَّاهُ شَيْطَانَاهُ فِيْ ذَاكَ بُرْهَةً ۔ وَلَمْ يَدْرِ شَيْطَانَانِ لَا يَفِيَانِ [18]

مرزا کو دو شیطانوں نے ایک زمانہ تک پھسلایا اور اُس نے یہ نہ جانا کہ اس میں دو شیطان وفا نہیں کرینگے۔

وَمَاذَا اَبَ فِي الْعُمْرِ الطَّوِيْلِ لَهُ فَذَا ۔ هِجَاءُ خِيَارِ الْخَلْقِ غِبَّ لِعَانِ

اور اس کو تو اپنی طویل زندگی میں سوائے برگزیدہ لوگوں کی ہجو اور لعنت کرنے کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

تَفَكَّهَ فِيْ عِرْضِ النَّبِيِّيْنَ كَافِرٌ ۔ عُتُلٌّ زَنِيْمٌ كَانَ حَقَّ مُهَانِ [19]

کافر فحش گو اصیل بنے ہوئے نے انبیاء کی آبروریزی میں خوب مزہ درست کیا جو خود ہی حقیقی معنی سے

نفس الامر میں ذلیل تھا۔

يَلَذُّ لَهُ بَسْطُ الْمَطَاعِنِ فِيْهِمْ ۔ وَيَجْعَلُ نَقْلًا عَنْ لِسَانِ فُلَانِ

اس کو انبیاء علیہم السلام پر طعن کرنے میں لذت آتی ہے اور طریقۂ طعن دوسروں کی زبانی بنایا ہوا ہے۔

بٹھا کر اس کی حجامت بنایا کرتا تا کہ کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ہو کہ یہ بیکار ہے اور اس کے پاس کوئی حجامت بنوانے نہیں آتا

اسی طرح مرزا کو بھی سوجھی کہ مدعی نبوت ہی بن جاؤ۔ اس وہم میں آ کر مخلوق خدا پھنس جائے گی۔

۱۷ منکوحۂ آسمانی سے محمدی بیگم کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس پر مرزا صاحب کی رال ٹپک گئی تھی۔ اور بہت سی تدبیریں کیں کہ کسی طرح یہ شکار ہاتھ آئے۔ کبھی اس کے والد کو خطوط لکھے اور کبھی معجزہ کی دھمکی دی۔ مدتوں الہامات میں نکاح کے مدعی رہے۔ اس کے بعد وعید کا بھی خوف دلایا۔ نکاح ہونے کو قضاء مبرم بھی ٹھہرایا۔ بہرحال آخر کار مرزا اس حسرت و آرزو کو اپنے ساتھ ہی لے گئے۔

۱۸ دو شیطانوں سے مراد اس کے دو مرید ہیں جن کو دو فرشتے کہتا تھا۔

۱۹ مرزا کی ساری زندگی برگزیدہ لوگوں کی ہجو میں گذری اور ہمیشہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی توہین کر کے مزہ اٹھایا۔

يَصُوغُ اُصْطِلَاحًا اَنَّ هٰذَا مَسِيحُكُمْ　　كَمَا سَبَّ اُمًّا هٰكَذَا اَخَوَانِ

مرزا مسیح ابن مریم پر اصطلاحیں گھڑ گھڑ کر طعن کرتا ہے کہ اے نصاریٰ! یہ جو تمہارا مسیح ہے جیسے دو حقیقی بھائی ایک دوسرے کو گالی دیں دوسرے کی ماں کہہ کر۔

وَهٰذَا كَمَنْ وَافٰى عَدُوًّا يَسُبُّهُ　　بِجَمْعٍ اَشَدَّ السَّبِّ مِنْ شَنَآنِ

اور یہ اس شخص کی طرح ہے جو اپنے دشمن کے سامنے آیا ایسے حال میں کہ وہ ایک جماعت کے رو برو اُس کو سخت گالیاں عداوت سے دے رہا تھا۔

فَصَيَّرَهٗ رُؤْيَا وَقَالَ بِاٰخِرٍ　　اِذِ انْفَتَحَتْ عَيْنِيْ مِنَ الْخَفَقَانِ

پس اُس دشمن گالیاں دینے والے نے اس کو خواب کی صورت میں ڈھال دیا اور کہا پھر آخیر میں میری نیند سے آنکھ کھل گئی۔

وَقَدْ يَجْعَلُ التَّحْقِيقَ ذٰلِكَ عِنْدَهٗ　　اِذَا مَا خَلَا جَوٌّ كَمِثْلِ جَبَانِ

اور کبھی نامرد کی طرح میدان خالی دیکھ کر ان ہی امور کو (جو دوسروں کے حوالے سے نقل کرتا تھا) واقعی اور تحقیقی بنا لیتا ہے۔

وَيَنْفِثُ فِيْ اَثْنَاءِ ذٰلِكَ كُفْرَهٗ　　وَيُعْرِبُ فِيْ عِيْسٰى بِمَا هُوَ شَانِيْ

اور اس اثنا میں مرزا کفر اگلتا ہے اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کی شان میں بغض دلی کو ظاہر کرتا ہے۔

وَكَانَ هُنَا شَيْئٌ لِتَحْرِيْفِ عَهْدِهِمْ　　فَصَيَّرَهٗ حَقًّا لِخُبْثِ جَنَانِ

حال یہ ہے کہ نصاریٰ کے عہد قدیم و جدید کے مُحرّف ہونے کی وجہ سے ایک شے تھی جس کو مرزا نے اپنے خبث باطنی سے حق بنایا۔

وَقَدْ اَخَذُوْا فِيْ مَالِكِ بْنِ نُوَيْرَةٍ　　بِصَاحِبِكُمْ لِلْمُصْطَفٰى كَادَانِيْ[۲۰]

صحابہ کرامؓ نے مالک بن نویرہ کو نبی کریمؐ کی شان میں لفظ صاحبکم ادنیٰ درجہ کا لفظ کہنے پر گرفت کرکے قتل کیا۔

۲۰ حاشیہ اگلے صفحہ پر

وقصّة دُبّاءٍ رأى القتلَ عندھا | أبو یُوسفَ القاضی وَلَاتَ أوانٍ[٢١]

امام ابو یوسفؒ نے ایک شخص کو یہ کہنے پر قتل کر دیئے جانے کا حکم دیا کہ مجھے کدو پسند نہیں اور وہ وقت معافی کا نہ تھا۔

وَقَدْ أعْمَلَتْ حُکْمَ الشَّرِیعَۃِ فِیھِمْ | حُکُوْمَۃُ عَدْلٍ لِلْأمِیْرِ أمَانٍ[٢٢]

امیر امان اللہ خان جلالت مآب کی عادل حکومت نے اس مسئلہ میں حکم شریعت پر عمل کر کے فیصلہ کیا۔

تَحَطَّمَ فِی جَمْعِ الحُطَامِ وَنَیْلِھَا | وَبَسْطِ المُنٰی فِی حَاصِلَاتِ مَجَانیْ

مرزا بوڑھا ہو گیا دُنیا کے خس و خاشاک جمع کرنے میں اور تمنائیں پوری کرنے میں چندہ کی رقمیں جمع کر کر کے۔

وَکُلُّ صَنِیعٍ أوْدَھَاءٍ فَعِنْدَہٗ | لِنَیْلِ المُنٰی بِالطَّرْدِ وَالدَّوَرَانِ

اور جو تدبیر یا مکر ہے اُس کے یہاں اُلٹا سیدھا کر کے اپنے مطلب ہی حاصل کرنے میں ہے۔

أھٰذا مَسِیْحٌ أوْ مَثِیْلُ مَسِیْحِنَا | تَسَرْبَلَ سِرْبَالًا مِنَ القَطِرَانِ

کیا یہی ہے مسیح یا مثیلِ مسیح | جس نے کرتہ پہن لیا گندھک کا۔

---

[٢٠] مالک بن نویرہ ایک شخص تھا جس نے حضرت نبی کریمؐ کی شان میں لفظ "صاحبکم" (جو ادنیٰ اور گھٹیا درجہ کے لوگوں کے حق میں استعمال کیا جاتا تھا) استعمال کیا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اُس کے اس لفظ پر گرفت کی اور قتل کر دیا۔ [٢١] امام ابو یوسفؒ ایک مرتبہ حدیث بیان فرما رہے تھے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کدو کو پسند فرمایا کرتے تھے اور رغبت سے کھایا کرتے تھے اس پر ایک شخص جماعت میں سے اُٹھا اور بہت اونچی آواز اور سخت لہجہ سے کہنے لگا کہ مجھے تو پسند نہیں۔ جس پر امام موصوف نے اُس کے قتل کا حکم دیا اور بالآخر اس نے توبہ کی جس سے اُس کی معافی ہوئی۔

[٢٢] اس شعر میں نعمت اللہ خاں مرتد کے قتل کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق حکومت افغانستان کی طرف سے قتل کا فیصلہ دیا گیا تھا اور قرآن و حدیث کے مطابق اس فیصلہ کا نفاذ ہوا ہے۔ مرزائی جماعت نے بہت شور و غل مچا کر اس فیصلہ کو خلافِ تعلیمِ قرآن بنانے کی کوشش کی۔

وَكَانَ عَلَىٰ مَا قَالَ مَاجُوجُ اَصْلُهُ   فَصَارَ مَسِيحًا فَاعْتَبِرْ بِقِرَانِ

مرزا اپنی تحقیق کی بنا پر ماجوج کی نسل سے تھا۔   پھر بن بیٹھا مسیح پس عبرت لو اس جوڑ سے

نَعَمْ جَآءَ فِي الدَّجَّالِ اِطْلَاقُهٗ كَذَا   فَقَدْ اَدْرَكَتْهُ خِفَّةُ السَّرَعَانِ [۲۳]

ہاں دجال پر بھی مسیح کا اطلاق آیا ہے۔ پس مرزا کو غلطی لگی اوچھے پن سے جلد بازوں کی۔

اَلَمْ يَهْدِ لِلْقُرْاٰنِ يَحْفَظُهٗ وَلَمْ   يَحُجَّ لِفَرْضٍ صَدَّهُ الْحَرَمَانِ

کیا مرزا کو قرآن حفظ کرنے کی ہدایت نہ ہوئی۔ اور حج کا فرض ادا نہ کیا۔ حرمین نے اسے روک دیا۔

فَيَسْرِقُ فِي اَلْفَاظِهٖ بَاطِنِيَّةً   وَقَرَامِطَةً وَحْيٌ اَتَاهُ كَدَانِي

چراتا ہے اپنے الفاظ میں فرقہ باطنیہ اور قرامطہ سے۔ یہ وحی ہے اس کی دوغلی یا کادیانی۔

وَتَابَعَهٗ مَنْ فِيهِ نِصْفُ تَنَصُّرٍ   وَمَنْ فِيهِ كُفْرٌ مُوْدَعٌ بِهَبَانِ

مرزا کی متابعت ایسے لوگوں نے کی جو پہلے سے نیم نصرانی تھے اور جن کی سرشت میں کفر ودیعت رکھا تھا۔

وَكَفَّرَ مَنْ لَمْ يَعْتَرِفْ بِنُبُوَّةٍ   لَهٗ وَهُوَ فِي هٰذَا الْاَوَّلُ جَانِ

اور مرزا نے اس شخص کی تکفیر کی جس نے اس کی نبوت کو نہ مانا اور حال یہ ہے کہ وہ خود اس میں اول مجرم ہے یا اول پھل پانے والا ہے۔

اَلَا فَاسْتَقِيمُوا وَاسْتَهِيمُوا الدِّينِكُمْ   فَمَوْتٌ عَلَيْهِ اَكْبَرُ الْحَيَوَانِ

خبردار درست ہو جاؤ اور اپنے دین پر سرگشتہ ہو جاؤ اور دین پر مرنا ہی بڑی زندگی ہے۔

---

۲۳ یعنی احادیث میں مسیح کا لفظ دجال اور مسیح میں مشترک تھا جس اشتراک سے مرزا کو غلطی ہوئی۔ یعنی تھا تو وہ حقیقت میں مسیح دجال اور بن گیا مسیح بن مریم۔

وَعِندَ دُعَاءِ الرَّبِّ قُومُوا وَشَمِّرُوا　　حَنَانًا عَلَيْكُمْ فِيهِ أَثَرُ حَنَانِ

اور خدا کی آواز پر لبیک کہہ کر تیار ہو جاؤ　　اس میں خدا کی تم پر مہربانیوں پر مہربانی ہے

وَكُنْ رَاجِيًا أَنْ يَظْهَرَ الْحَقُّ وَارْتَقِبْ　　لِأَوْلَادِ بَغْيٍ فِي السُّهَيْلِ يَمَانِي

اور حق کے غالب ہونے کی خدا سے اُمید رکھو اور برساتی کیڑوں کے مِٹ جانے کا بوقتِ طلوع (ستارۂ) سہیل اِنتظار کرو۔

وَلِلْحَقِّ صَدْعٌ كَالصَّدِيعِ وَصَوْلَةٌ　　وَطَعْنٌ وَضَرْبٌ فَوْقَ كُلِّ بَنَانِ

حق صبحِ صادق کی طرح ظاہر ہوتا ہے اور حق کے لئے صولت، نیزہ اور مار ہے ہر سرِ انگشت پر۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلَّذِي　　لِنُصْرَةِ دِينِ الْحَقِّ كَانَ هَدَانِي

اور آخری پکار ہماری یہ ہے کہ حمد کی مستحق وہی ذات ہے جس نے دینِ حق کی حمایت میں ہم کو ہدایت کی۔

وَصَلّٰى عَلٰى خَتْمِ النَّبِيِّينَ دَائِمًا
وَسَلَّمَ مَا دَامَ اعْتَلَى الْقَمَرَانِ

اور خدا کی رحمتیں حضرت خاتم الانبیاءؐ پر نازل ہوتی رہیں جب تک چاند اور سورج بلند ہوتے رہیں۔

نوٹ: پوری نظم کے ۷۳ اشعار ہیں جن میں صرف ۶۱ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ پوری نظم کے لئے ملاحظہ ہو اِکفار الملحدین صہ ۸۶۔ صہ ۹۰۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے فارسی کلام کا نمونہ

مُربّع نعتیہ فارسی

حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی تصنیف "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسیٰ علیہ السلام" کے آخر میں اپنا ایک نعتیہ قصیدہ فارسی زبان میں شامل فرمایا ہے جس سے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ اُن کی والہانہ عقیدت اور عربی کے علاوہ فارسی میں بھی اُن کی قادرُ الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔

بطورِ نمونۂ کلام اور تبرّکاً یہ نعت ہدیۂ ناظرین ہے۔

کوندہ عفی اللہ عنہ

دوش چوں از بے نوائی ہم نوائے دِل شدم
عہدِ ماضی یاد کردہ سوئے مستقبل شُدم
از سفر وا ماندہ آخر لبِ منزل شُدم
کز تگا پو سو بسو تا مِ غریباں در رسید

دشت و گلگشت و بہارستان و خارستان ہم
فکر و ہم ہمدم نفس اندر قفس زادِ رہم
پیش و پس بانگِ جرس از کارواں در ہر قدم
دیدۂ عبرت کشودم مخلصے نامد پدید

تا سروشِ غیب از الطاف قدسم یاد کرد
رحمتِ حق ہم چو مَن در ماندہ را امداد کرد
مأمنِ خیر الورٰی بہرِ نجات ارشاد کرد
مقصدِ ہر طالبِ حق آں مُرادِ ہر مُرید

قبلهٔ ارض و سما مرآتِ نورِ کبریا سید و صدرِ علیٰ شمسِ ضحیٰ بدرِ دجیٰ
شافعِ روزِ جزا و آنگه خطیبِ انبیاء صاحبِ حوض و لواءِ ظلِّ خدا روزِ عتید

صاحبِ خلقِ عظیم و مظهرِ جودِ عمیم آیتِ رحمت که شانِ او رئوف است و رحیم
رحمةٌ للعالمین خواندش خداوندِ کریم خَلق و خُلق و قول و فعل و هُدیٰ و سمتِ او حمید

دستِ او بیضا ضیا اجود تر از بادِ صبا حبّذا نفحتِ عطر ابرِ سخا آبِ بقا
وقفِ امرِ عالمے بر ضحکِ آں رحمت لقا عامِ اشهب از جمالِ طلعتش عیدِ سعید

داغِ مهرِ او چراغِ سینهٔ اہلِ کمال شورِ عشقش در سرِ عمار و سلمان و بلال
ثبت بر ایمائے وے لقمان و مالک بے خیال والہِ آثارِ وے معروف و شبلی بایزید

از حدیثِ وے سمر در حیطهٔ اصلِ اثر مسلم و مثلِ بخاری وقف بر وصلِ سیر
سنتِ بیضائے وے نورِ دلِ ہر با بصر اتقیاء را اسوهٔ اقدامِ وے تقلیدِ جید

سیدِ عالم رسول و عبدِ ربُّ العالمین آں زماں بوده نبی کآدم بُد اندر ماء و طین
صادق و مصدوق وحیِ غیب و مامون امین در ہر آں چیزے که آورد ست از وعد و وعید

منبرِ او سدره و معراجِ او سبع قباب در مقامِ قربِ حق بر مقدمِ او فتحِ باب
کاندر آنجا نورِ حق بود و نبُد دیگر حجاب دید و بشنید آنچه جز وے کس نشنید و ندید

مدحِ حالش رفعِ ذکر و شرحِ وصفش شرحِ صدر او امامِ انبیاء صاحب شفاعت روزِ حشر
همگناں زیرِ لوائش یومِ عرض و نیست فخر سیدِ مخلوق و عبدِ خاصِ خلاقِ مجید

اَنخیرِ و خیرِ الوریٰ خیر الرّسل خیر العباد — قدوهٔ اہلِ ہدایت اُسوهٔ اہلِ رشاد
نفحۂ از ہمّت او خلق را زادِ معاد — عالم از رشحاتِ انفاسِ کرمش مستفید

انتخابِ دفترِ تکوینِ عالم ذاتِ او — برتر از آیات جملہ انبیاء آیاتِ او
مشرقِ صبحِ وجودِ ما سِوا مشکوٰۃ او — مستنیر از طلعتِ او ہر قریب ہر بعید

دینِ او دینِ خدا تلقینِ او اصلِ ہدیٰ — نطقِ او وحی سما حقا نجومِ اہتدا
صاحبِ اسرارِ او ناموسِ کبر برملا ! — علم او از اولین و آخرین اندر مزید

مولدش اُمّ القریٰ ملکش بشام آمد قریب — خاکِ رہِ طیبہ از آثارِ وے بہتر ز طیب
شرق و غرب از نشرِ زینِ مستطابش مستطیب — اُمّتش خیر الاُمم بر امتاں بودہ شہید

خاص کردش حق باعجازِ کتابِ مستطاب — حُجّت و فرقان و محبر محکم و فصلِ خطاب
نجم نجمش در براعت ہست برتر ز آفتاب — حرف حرف او شفا ہست و ہدیٰ بہرِ رشید

الغرض از جملہ عالم مصطفیٰ و مجتبیٰ — خاتمِ دورِ نبوّت تا قیامت بے مرا
افضل و اکمل ز جملہ انبیاء نزدِ خدا — نعتِ اوصافِ کمالِ او فزوں تر از عدید

تا صبا گلگشتِ گیہاں کردہ می باشد مدام — بوئے گل بر دوشِ وے گردد بعالم صبح و شام
یاد بر وے از خدائے وے درود و ہم سلام — نیز بر اصحابش آل و جملہ اخیار عبید

وز جنابِ وے رضا بر احقرانِ مستہام — خاصہ آں انور کہ افقر ہست از جملہ انام
مستغیث است الغیاث اے سرورِ عالی مقام — در صِلہ از بارگاہت در رسید ایں قصید

حضرت شاہ صاحبؒ کے اردو کلام کا نمونہ

دُنیا کی بے ثباتی

عام طور پر حضرت شاہ صاحبؒ عربی زبان میں ہی مشقِ سخن فرماتے تھے اور کبھی کبھی فارسی میں بھی نعتیہ کلام وغیرہ لکھ دیا کرتے تھے۔ اردو زبان میں آپ کے رشحاتِ قلم چنداں مشہور نہیں ہیں۔ لیکن مشہور مصنّف و مؤرّخ مرحوم منشی محمد الدین فوق (جو حضرت شاہ صاحب کے بے تکلّف دوست اور محبِّ خاص تھے) نے اپنی کتاب "تاریخ اقوامِ کشمیر" جلد دوم مطبوعہ لاہور جولائی ۱۹۴۳ء میں حضرت شاہ صاحب کی ایک اردو نظم "دُنیا کی بے ثباتی" کے بارے میں نقل کی ہے جو بجائے خود اردو زبان میں آپ کی قادر الکلامی اور روانی کا شاندار ثبوت ہے اس لئے حضرت موصوف کی یہ نظم بھی بطورِ نمونہ کلام قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کی جا رہی ہے ؛

کوندو

سفر کی منزل ہے دارِ دُنیا، ذرا تو اس کا خیال سا کر
سدا نہیں ہے یہ دیس تیرا، ضرور جانا ہے دِن نبھا کر

کبھی تامّل سے داہنے بائیں، آگے پیچھے کو دیکھ لینا
کِدھر کو جاتے ہیں دوست پیارے، کہاں وہ رہتے ہیں یاں سے جا کر

وہ چل بسے سارے باری باری، یہ باقی خلقت بھی چل بسے گی۔
تو چشمِ عبرت سے دیکھ غافل، کبھی تو اپنی نظر اُٹھا کر

چلے ہی جاتے ہیں قافلے سب یہاں کا ٹھہرا ہوا ہے یہ ڈھب
کسی کا آنا کسی کا جانا، کبھی ہنسا کر کبھی رُلا کر

کبھی نکل کر تو جنگلوں میں، خدا کی قدرت کا دیکھ جلوہ
کہیں ہے اونچا کہیں ہے نیچا، کہیں اندھیرا ہے جگمگا کر

کسی کا اقبال زور پر ہے، کسی پر ادبار چھا رہا ہے
کوئی ہے آتا کما کما کر، کوئی ہے جاتا لٹا لٹا کر

کوئی ہے دکھیا کوئی ہے سکھیا، کوئی ہے خنداں کوئی ہے گریاں
یہ غمزدہ غم گھٹا گھٹا کر، وہ خوش ہے خوشیاں منا منا کر

غرض یہاں ہیں سب آتے جاتے، دن اپنے اپنے نبھاتے جاتے
نہیں ہے رہنا یہاں کسی کو، کہ کوچ اک دن ہے مٹ مٹا کر

اگر ہوں اعمال اپنے اچھے، بری نہیں ہے یہ زندگانی
فرشتے اعمال نیک والے، نکال لیں گے بچا بچا کر

نماز پڑھنا، قیام کرنا، رکوع کرنا، سجود کرنا
کبھی کھڑے ہو کے گاہ جھک کر، زمین پہ ماتھا ٹکا ٹکا کر

جو خوابِ غفلت میں مست سوتے ہیں، بے خبر عاقبت سے اپنی
جگا کے ان کو بھی ہوش میں لا، یہ نظمِ انور سنا سنا کر } کوندو

٭

الرِّثَاء

لمولينا محمد ادريس الكاندهلوي رحمة الله عليه
صاحب التعليق الصبيح على مشكوٰة المصابيح

سلامٌ على حفظِ الكتابِ وسنّةٍ ‌ ‌ ‌ وحفظٍ وضبطٍ بعدَ شيخٍ مبجّلِ
أريدُ به نورَ الهدايةِ أنورا ‌ ‌ ‌ كبدرٍ مبينٍ في دجى اللّيلِ أليلِ
فقد كانَ إعجازاً لدينِ نبيّنا ‌ ‌ ‌ كمثلِ البخاري أو كنحو ابن حنبلِ
وكان إماماً لحافظاً ومحدّثاً ‌ ‌ ‌ إليه انتهى شدُّ المطايا وأرحلِ
وقد كان فرداً حافظَ العصرِ جامعاً ‌ ‌ ‌ معارفَ أعلامِ الهدى والتفضّلِ
بكى عالمُ الاسلامِ طرّاً وأعولا ‌ ‌ ‌ لخطبٍ جليلٍ قد أناخَ بمنزلِ
بكاهُ مقامُ الدّرسِ والوعظِ حاسراً ‌ ‌ ‌ بكتهُ نواحي الارضِ والفلكُ العلي
فقد كانَ رمحاً سمهريّاً مثقّفاً ‌ ‌ ‌ لمثلِ مسيحِ الكاديانِ المخبّلِ
وابيضُ هنديّاً لكلِّ مسيلمٍ ‌ ‌ ‌ وكلِّ مساغٍ في نبوّةِ مرسلِ
توفّيتَ يا رأسَ التقى وتركتني ‌ ‌ ‌ لفقدِكَ أرويهِ بدمعٍ مسلسلِ
شرحتَ لنا الآثارَ إذ هي أشكلت ‌ ‌ ‌ وفسّرتَ آياتِ الكتابِ المفصّلِ
وعطّرَ أفواهَ الارضِ من عرفكَ الشذي ‌ ‌ ‌ يباري شذاه روح منكَ مندلِ
عليكَ سلامُ اللهِ يا قبرَ أنورٍ ‌ ‌ ‌ ورحمتُهُ تترى كودقٍ مجلجلِ

بفضلک یا مولی الوریٰ قل لروحہٖ
ایا روح عبدی ہذہٖ الجنّۃ ادخلی

فارسی مرثیہ

دوازدہ بند

از پیر عبدالقادر شاہ آثمؔ مرحوم

کشمیر میں فارسی شاعری بیسویں صدی کی پہلی تہائی تک دانشوروں کے اظہارِ خیال کا مؤثر ذریعہ تھی۔ سرینگر کی جامع مسجد کے چاروں طرف صدیوں سے علماء و فضلاء پیدا ہوتے چلے آئے ہیں، خاصکر محلہ ملارٹہ جو پانچ سَو سال سے اہلِ علم کا مرکز چلا آیا ہے سرینگر کا "شیراز" کہلانے کا مستحق ہے۔ اس آخری دَور میں بھی جامع مسجد کے گرد و نواح اور ملارٹہ اور پاندان وغیرہ محلوں میں فارسی شاعری کی شمعیں روشن تھیں۔ پیر عبدالقادر شاہ آثمؔ زبان و بیان پر اُستادانہ قدرت کے لحاظ سے ان سب میں ممتاز تھے۔ ایران کے مُتاخرین شعراء میں حبیب قاآنی کی روانی کشمیر میں مرحوم آثمؔ صاحب کے حصّے میں آئی تھی۔ آپکا سارا کلام اس حقیقت کا گواہ ہے، اور حضرت علّامہ کشمیریؒ کی وفات سے متاثر ہو کر آپنے بارہ ترکیب بند کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ ہر لحاظ سے قاآنی کے قصائد کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ حقائق اور جذبات و تاثرات کا یہ شاہکار ذیل میں ہدیۂ ناظرین ہے

پیر عبدالقادر شاہ آثمؔ مرحوم (ولادت ۱۳۱۵ھ وفات ۱۳۶۴ھ) کا شجرۂ نسب

حضرت خواجہ مسعود پانپوری تک منتہی ہوتا ہے جو دسویں صدی ہجری کے مشائخ میں مشہور و معروف گذرے ہیں۔

(کوندو)

فلک از دیدۂ انجم شدہ خونبار چرا ۔ روز گردیدہ مبدّل شبِ تار چرا
دِہ بدِہ شہر بشہر اینچہ عزا رو داد است ۔ حلقۂ ماتمیان کوچہ و بازار چرا
غنچۂ خونین جگر و پیرہنِ گُل چاک است ۔ گشتہ پامالِ خزان رونقِ گلزار چرا
پائے رفتار نماندہ است درین رہروان ۔ زدہ اند آئینہ سان پشت بدیوار چرا
ہر یکے نوحہ کنان نعرہ زنان جامہ دران ۔ عیش کم غصہ فزون سینۂ پُر افگار چرا
اشک آبی است چسان آتش سوزندہ شد ۔ نالہ آہی است زآہی رَوشِ خار چرا
عجمی و عربی عالم و جاہل یکسان ۔ رفتہ از صبر و سکون اند بیکبار چرا

ہر کجائے نگرم دیدہ گریانی ہست
ہر کجا گوش نہم نالہ و افغانی ہست

کاروان ماندہ بِرہ قافلہ سالار برفت ۔ از تنِ قوم سرافتاد کہ سردار برفت
حُجۃ اللہ امام عرفاء و عُلماء ۔ وارثِ شاہِ رُسُل صاحبِ اسرار برفت
یادگارِ سلف آں خازنِ اخبارِ نبی ۔ افتخارِ خلف آن مخزنِ آثار برفت
کانِ دین جانِ یقین حضرت استاذ زمان ۔ حامیٔ شرعِ مبین عمدۂ اخیار برفت
سیّدی مُعتمدی شاہ محمدؐ انور ۔ بگلستانِ جنانِ طوطیٔ طیّار برفت
مطلعِ نورِ رُخِ انورش اللہ اللہ ۔ عالم افروز شدہ عالمِ انوار برفت

خلق محمود حسن داشت آں رُشدِ رشید
یافت زان قاسمِ فیضِ نبوی دین تجدید

آنکہ مہرِ فلکِ مذہب نعمانی بود — حرف حرفش ادب و حکمتِ لقمانی بود
آنکہ تحقیقِ حقایق بدقایق میکرد — آنکہ در علم و عمل یکتن و لاثانی بود
آنکہ گر منتہی روے بدو آوردے — پیشِ او مبتدی و طفلِ دبستانی بود
آنکہ در فتنۂ تاویل بعصرِ حاضر — پشتِ اسلام و مددگارِ مسلمانی بود
آنکہ در طےِ مقاماتِ باطوارِ سلوک — گوئیا ثانیٔ آن شبلیؒ و خرقانیؒ بود
نظرش بر قدم و ہوش بدم گوش بحق — خلوتش جلوتیٔ محفلِ عرفانی بود
بضیا پاشی انوارِ علومش نازم — انجم انجمنِ ملکِ خدادانی بود

صورتش مشرقِ انوارِ ولیٔ اللّٰہی
سیرتش آمرِ معروف وز منکر ناہی

در غمش فقہ جدا گریہ و تفسیر جدا — منطق و فلسفہ و سُلّم و تحریر جدا
محشرستان نہ ہمیں ضلعِ سہارنپور است — چین جدا ہند جدا خطۂ کشمیر جدا
بیقرار است چو سیماب ازیں ماتمِ سخت — خطۂ خاک جدا و فلکِ پیر جدا
سایہ اش تا ز سرِ از ہر و انظر برخاست — خونفشان سیف جدا و پدرِ پیر جدا
آہ و خارفت بنا گاہ و دریغا دردا — ہے ز غم چارہ جدا نالہ و تدبیر جدا
ماہِ ما مشعلِ دین آہ نہان شد بحجاب — شاہِ ما کرد ز ما بازیِ تقدیر جدا
مرگ خوابیست کہ ہر فردِ بشر مے بیند — خوابِ مرگِ علماء داشتہ تعبیر جدا

مرگِ عالم ہمگی ظلمتِ دنیا باشد
مرگِ عالم بیقین محشرِ کبریٰ باشد

وقت آن است اگر روحِ بخاری گرید
ترمذی آمدہ چوں ابرِ بہاری گرید

نسائی وار مُسلِم غم او مسلم راست
نووی عود نوا گشتہ بزاری گرید

آہ تقریرِ مُصفّاہیِ موطا کہ کُند
عبد بر شام و سحر بر درِ باری گرید

وائے آلودہ باندوہ ابوداوُد است
عونِ معبود و بصد سینہ فگاری گرید

دلِ مشکوٰۃ ہمی سوزد و مرقات اُفتد
بغوی زار ہمینالد و قاری گرید

بحرِ مواج رسد کز پئے آن عین العلم
زندہ رودی کشد از سرِ مژہ جاری گرید

صدمۂ رحلتش از طبری و رازی پرسید
شیوۂ قاضی بیضاست نہ باری گرید

باز خواہم کہ بیانے ز تو آغاز کند
باشارات لبش شرح شفا باز کند

کردی ہر گاہ بیان نکتۂ قرآنی را
مے شنیدیم از و نغمۂ رحمانی را

چوں بگفتار ہمے آمدی آن کانِ حدیث
میزدی مہر خموشی لبِ شوکانی را

ہر کجا تاختی آن ضیغمِ باطل افگن
لرزہ افتادے بر تن زمرۂ شیطانی را

بخلافت شدہ ممتاز چو از شیخ الہند رح
داد ترویج اتم مذہبِ نعمانی را

نسبتش بود بارباب سلاسلِ محکم
حرزِ ایمان سخنش طالبِ حقانی را

توتیا دیدہ و ران کردہ ز خاکِ قدمش
کہ نہ بُد خاصیتش کحلِ صفاہانی را

روشنم خود نشدے عالمِ ربانی چیست
گر نہ من دیدمے آن عالمِ ربانی را

طلعتِ فرخ او سیر ندیدیم و برفت
شربتے از لبِ لعلش نچشیدیم و برفت

کے بود کے کہ دگر بزمِ حدیث آراید رگرہِ مُشکلِ اربابِ خرد بگشاید
کے بود کے کہ سر آید سخنے از لبِ نوش رونما جان ستد و چہرہ بما بنماید
بہرِ سرکوبیٔ دجال پرستانِ مُضِل کے بود کے کہ دگر بارہ بکشمیر آید
حلقۂ درسِ بخاریش زیادم نرود صدر این تخت ہمو بود و ہمو می باید
پدرانِ علوی مویہ کنان می گویند ہم چو فرزند ندانیم کہ مادر زاید
آسمان اے ہمہ بیداد بدہ بارے داد مخزنِ علم کفن پوش بدفن نشاید
باز آن صیقل آئینہ دلان را خوانم باشد از خاطرِ ما زنگِ اَلَم بزداید

صدر ایوانِ بہشت ازچہ بہشتی ما را
سردمہری نسزد گرم دگر کُن جا را

ایکہ بودہ است ہمہ فقر و فنا شیوۂ تو تا فتن روز غنا بہرِ خدا شیوۂ تو
دل مُستغنیٔ تو فخر ہمی کرد بفقر بذل و احسان و کرم جود و سخا شیوۂ تو
صوفیِ صاف درون عارفِ بے لاف و گزاف کس ندیداست بجز صدق و صفا شیوۂ تو
گہ ز آئینہ ضمیرِ تو مکدّر نشدی صد خطا شیوۂ ما بود و عطا شیوۂ تو
طلعتِ پاکِ تو تصویرِ توکّل سر و پا بر قضا آمدہ تسلیم و رضا شیوۂ تو
فضلاء پیشِ تو زانوے ادب تہ کردند بود تا بود تمکین و حیا شیوۂ تو
شرحِ اوصافِ تو ہر چند مطوّل گویم مختصر کے شود یک شمہ ادا شیوۂ تو

بزم بگذاشتہ در کُنجِ خمول ازچہ شدی
چہ خطا سرزدہ از ما تو ملول ازچہ شدی

بصفر رختِ سفر بستہ بختی دلِ ما — برق جولان تو آتش زدہ در حاصلِ ما
روضۂ خلد شد آراستہ از مقدمِ تو — مید مکد خارِ مغیلان ہمہ از منزلِ ما
ساقیٔ مصطبۂ علم کفن پوش شدی — جامِ بشکستی و برہم زدۂ محفلِ ما
اے ہما زود پریدی زلبِ بامِ جہان — زاغِ طبیعم مگر وائے دلِ غافلِ ما
نیست امکان کہ رود مہر تو بیرون از سر — کہ سرشتند وفائے تو در آب و گلِ ما
زندۂ زندۂ جاوید بماندی از نام — مرگ تعبیر اگر کرد دلِ جاھلِ ما
باز آ باز کہ سر در قدمت اندازیم! — تابِ ہجرِ تو ندارد جگرِ بسملِ ما

آب آہن کنم و رخنہ بخارا افگنم
دیدہ دریا کنم و صبر بصحرا افگنم

سحرے گر برِ ما ہم چو صبا مے آئی — غم زدا عیش فزا عقدہ کشا مے آئی
بملا اے عزیزان و یتیمان بالے — چہ شود گر زرہِ لطف و عطا مے آئی
خوب دانم کہ ترا پاسِ پدر بسیار است — بہرِ او باز بیا گر نہ بما مے آئی
بکشا چشمِ خدا بینِ اَلِم اخوان بلین — چشم دارند بعزیاد و ندا مے آئی
اللہ اللہ کہ چہا غافل و نادانم من — چقدر ہرزہ سرایم تو کجا مے آئی
رخت افگندۂ دربارگہِ خاصُ الخاص — کے بدین عالمِ فانی ز بقا مے آئی
نزدِ خود خواند ترا سیدِ لولاکِ لقب — کے از ان شمسِ ضحیٰ سوئے نما مے آئی

سایۂ طوبیٰ و تسنیم ترا خوش آمد
دولتِ سرمدِ دیدارِ خدا خوش آمد

ای مئے فیضِ تو پُر کردہ ایاغِ عالم ہست از عرفِ شذی مست دماغِ عالم
کرد تبلیغ بلیغت مددِ ملّت و دین رفت در خوابِ فنا فتنۂ لاغِ عالم
ظلمت آباد شد از رفتنِ تو عرصۂ دہر شمعِ ایوانِ جہان چشم و چراغِ عالم
ما ہمہ سینہ فگاریم بداغِ غمِ تو از طبیبان کہ کند مرہمِ داغِ عالم
بکجا جویمت اے لالۂ نعمانی را بے تو پژمردگی افتاد براغِ عالم
عندلیبان خبر از قمری و طوطی پرسند بکجا رفتہ بہار و گلِ باغِ عالم
چارم ماہِ صفر چہرہ نہفتی گہِ شام سالِ بشمرد دلم — "آہ چراغِ عالم" ١٣٥٢ھ

بر تو نازل ہمہ دم رحمتِ دادار شواد
قبرِ پاکت ہمگی مہبطِ انوار شواد

تا بکے اشک از ین واقعہ گریان باشی وز پئے خرمنِ دل آتشِ سوزان باشی
تا بکے از اثرِ تیرِ جگر دوز فغان رخنہ انداز درین گنبدِ گردان باشی
تا بکے لالہ صفت غرقہ بخون داغ بدل ہم چو سنبل ہمہ جا سخت پریشان باشی
تا بکے لوحِ رُخ از اشک بشوئی صدبار دین اَلِف ہا بکشی طفلِ دبستان باشی
فاتحہ از رہِ اخلاص برو ہدیہ بیار تا کہ از صدق و صفا جمعِ محبان باشی
کُلُّ نفس ہمہ آمدہ توقیعِ قضا بہتر آن است خبردار ز فرمان باشی

بر رضا کوش در آئینِ قضا بود ہمین
صبر کن صبر کہ تقدیرِ خدا بود ہمین

آہ اے شیخ الحدیث!

(اردو مرثیہ)

(از مولینا قاری جمال الدین صاحب لبیب)

مولینا قاری جمال الدین صاحب المتخلّص بہ لبیب جن دِنوں جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بحیثیتِ طالبعلم تھے تو حضرت شاہ صاحبؒ کی اچانک رحلت پر ایک تعزیتی جلسہ میں موصوف نے مندرجہ ذیل نظم پڑھی تھی۔

اپریل ۱۹۷۰ء میں یہ نظم ماہنامہ "دارالعلوم" دیوبند میں شائع ہوئی تھی اور اب مُدیرِ "دارالعلوم" کے شکریہ کے ساتھ پھر ہدیۂ ناظرین ہے ٭ کوندو

آہ اے شیخ الحدیثِ جامعہ فخرِ زمن
حامیٔ دینِ متین اور ماہرِ ہر علم و فن
تیرے جانے سے ہر اک محفل کا رنگ جاتا رہا
اور خصوصًا جامعہ کا ہوگیا سونا چمن

تھا ترا ہر لفظ مومن کے لئے آبِ حیات
اور ہر نکتہ تھا باطل کے لئے دار و رسن
ان کی رحلت سے بشیرُ الدین مرزا خوش نہ ہو
اُن کا ہر شاگرد ہے تیرے لئے دنداں شکن

وہ ترا درسِ بخاری اور تحقیقِ انیق!
جس میں مانا تھا تجھے دُنیا نے یکتائے زمن

جس کی برکت سے نہ کچھ معمور ہے ہندوستان
بلکہ ہے مرہونِ منّت آج تک چین و یمن

یوں تو دنیا میں بہت آئے محدّث اور فقیہ
لا نہیں سکتا مگر ثانی ترا چرخِ کُہن

مدّتوں سے ہم نے چھوڑا تھا وطن جس کے لئے
اور یہاں رہ کر اُٹھائے سینکڑوں رنج و محن

آہ وہ سیراب گاہِ تشنہ کامانِ علوم
سو رہا ہے قبر میں باندھے ہوئے سر سے کفن

اس مری آہ و فغاں پر غیب سے آئی ندا
تو فراقِ شاہ میں اس طرح سے مجنوں نہ بن

تیری تسکیں کے لئے کافی ہیں شبیر[1] و سراج
اپنے اپنے طرز میں ہر ایک ہے دُرِّ عدن

اور وہ حضرات[2] با برکات، جن پر مدّتوں
فیضِ انور شاہ کشمیری رہا سایہ فگن

شیخ سے قلبی محبّت ہے اگر تجھ کو لبیب
پھر دُعائے خیر کا پابند رہ سرّ و علن

٭

---

[1] شبیر و سراج یعنی حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت مولینا سراج احمد رشیدیؒ۔

[2] مولینا بدرِ عالم میرٹھی، مولینا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولینا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولینا محمد ادریس کھروڑوی، مو[illegible] علی تھانوی، مولینا سعید احمد صاحب اکبرآبادی سابق اساتذہ جامعہ ڈابھیل (یہ سب حضرت شاہ صاحبؒ کے تلامذہ ہیں)۔

تتمات

تتمہ ۱

حضرت شیخ الہند ؒ

(ولادت ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء ۔ وفات ۱۳۳۹ھ / ۱۹۲۰ء)

شخصیات کے تذکرے صرف ان کے اپنے کارنامہ ہائے ُجات کو فراہم کر دینے سے ہی مکمل نہیں ہو جاتے۔ جن ہستیوں نے ان کی علمی اور روحانی تربیت کی، اور فیوض و برکات کے جن چشموں نے ان کے کمالات کی آبیاری کی ہے قاری کو ان سے متعارف کرانا بھی تذکرہ نگار کے فرائض میں شامل ہے۔

حضرت شاہ صاحب ؒ کا نسبی تذکرہ کسی حد تک آپ کے حالات کی ابتداء میں مرقوم ہو چکا اور تتمہ ۲ میں حضرت الشیخ مسعود نروری ؒ اور اُن کی ذریات کے مشاہیر کی صورت میں مزید تفصیلات بھی آ رہی ہیں لیکن شاہ صاحب ؒ کی ذات ستودہ صفات کو سمجھنے کے لئے نسبی پس منظر سے بھی زیادہ حسبی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کتاب ہذٰا کے مختلف عنادین کے تحت ہم نے کوشش کی ہے کہ آپ کے اساتذہ کے حالات جس قدر بھی اور جہاں کہیں سے بھی میسر ہوں سمیٹ لئے جائیں لیکن اُن اساتذہ میں سے ایک عظیم ہستی زبدۃ العلماء والمحدثین حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن ؒ کی بھی ہے، جن کی

حُسنِ تربیت و تعلیم نے شاہ صاحبؒ کے جوہرِ فطرت کو تابناکی بخشی۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ آجائے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے کمالات و حالات ایک بحرِ بے کراں ہیں جن کو بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی مُکتفی نہیں ہوسکتی۔ محض آپ کی ذاتِ گرامی کے تعارف کے طور پر ہم آپ کے پاکیزہ کوائفِ حیاتؒ کا مختصر سا خاکہ ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

خُلاصۂ حیات

حضرت شیخ الہندؒ دارالعلوم کے سب سے پہلے شاگرد ہیں، ان ہی کی نسبت کہا گیا ہے کہ جس نے (مدرسۂ دیوبند کے قائم ہونے پر اس درسگاہ کے) سب سے پہلے اُستاد ملا محمودؒ کے سامنے کتاب کھولی وہ محمودؒ تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ کی پیدائش ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں بریلی میں ہوئی، جہاں ان کے والدِ ماجد مولینا ذوالفقار علی سرکاری محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے (آپ بھی بانیانِ دارالعلوم دیوبند میں سے تھے)۔ (نونہال محمود نے) ابتدائی تعلیم اپنے مشہور عالم چچا مولینا مہتاب علی مرحوم سے حاصل کی، (فقہ میں) قدوری اور (منطق میں) شرح تہذیب پڑھ رہے تھے کہ دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا، آپ اسمیں داخل ہوگئے۔ نصاب دارالعلوم کی تکمیل کے بعد حضرت مولینا محمد قاسم نانوتویؒ کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تحصیل فرمائی فنون کی بعض اعلیٰ کتابیں اپنے والدِ ماجد سے پڑھیں، ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں حضرت نانوتویؒ کے دستِ مبارک سے دستارِ فضیلت حاصل کی۔ زمانۂ تعلیم ہی میں آپ کا شمار حضرت نانوتویؒ کے ممتاز تلامذہ میں ہوتا تھا، اور حضرت نانوتوی خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، چنانچہ انکی اعلیٰ علمی اور ذہنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر دارالعلوم کی مُدرّسی کے لئے اکابرِ مدرسہ کی

لے مولینا مُلا محمود (م ۱۳۰۴ھ) علوم حدیث و فقہ کے بہت بڑے عالم و فاضل تھے۔ ۱۲۸۳ھ میں جب حضرت نانوتویؒ نے اولاً چھتہ کی مسجد میں دارالعلوم کا مدرسہ قائم کیا تو اُسوقت مُلا محمود میرٹھ کے مطبع ہاشمی میں ملازم تھے۔ مُدرّسی کے لئے حضرت نانوتویؒ نے ملا محمود کو بُلایا۔ الغرض یہ دارالعلوم کے سب سے پہلے مُدرّس ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ مولینا محمود حسن نے چھتہ کی مسجد کے پاس ایک درخت کے نیچے ان ہی سے سب سے پہلا سبق پڑھا تھا۔ اللہ اللہ! استاد بھی محمود اور شاگرد بھی محمود۔ (کوثر)

نظرِ انتخاب آپ کے اوپر پڑی اور ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں مُدرّسِ چہارم کی حیثیت سے آپ کا تقرّر عمل میں آیا، جس سے بتدریج ترقی پاکر ۱۳۰۸ھ / ۱۸۹۰ء میں (دارالعلوم کے) صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوئے۔

ظاہری علم و فضل کی طرح آپ کا باطن بھی آراستہ تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے خلافت حاصل تھی، دارالعلوم میں صدارتِ تدریس کا مشاہرہ اس وقت ۷۵ روپے تھا مگر آپ نے ۵۰ روپے سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمائے، بقیہ ۲۵ روپے (ہر ماہ) دارالعلوم کے چندے میں شامل فرما دیتے تھے۔ آپ کی زبردست علمی شخصیت کے باعث طلبا کی تعداد ۲۰۰ سے بڑھ کر ۶۰۰ تک پہنچ گئی تھی۔ آپ کے زمانے میں ۸۶۰ طلبا نے حدیث نبویؐ سے فراغت حاصل کی، حضرت شیخ الہندؒ کے فیضِ تعلیم نے مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا منصور انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا سید اصغر حسین دیوبندی، مولانا سید فخر الدین احمد، مولانا محمد اعزاز علی امروہی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا احمد علی لاہوری جیسے مشاہیر اور نامور علماء کی جماعت تیار کی۔"

(تاریخ دیوبند از سید محبوب رضوی مطبوعہ علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء ص ۲۵۲ ص ۲۵۴)

شیخ الہند کی سیاسی جدوجہد

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس اللہ سرہٗ چودھویں صدی ہجری کے نصف اوّل کے اعلم العلماء اور اولیاءِ کاملین میں سے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ علم و فضل اور فرشتوں کے سے اوصاف تقویٰ و طہارت عطا کر رکھے تھے اور ان کمالات کے ساتھ ساتھ آپ کو میدانِ عمل کا شہسوار بھی بنایا تھا۔ آپ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کی صدارتُ المدرسین کی مسند پر رونق افروز ہو کر قال اللہ و قال الرسولؐ کی نہروں سے طالبانِ علوم دین کے قلوب کو سیراب کر رہے تھے اور دوسری طرف وطنِ عزیز یعنے برِّصغیر کو انگریزوں کے تسلّط سے آزاد کرانے کیلئے سیاسی جدوجہد میں اپنے زمانہ کے دیگر سیاسی رہنماؤں کے لیے عملی نمونہ تھے۔

برطانوی امپیریل ازم کے خلاف علم جہاد بلند رکھنا آپ کو اپنے اساتذہ اور پیران

طریقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے وراثت میں ملا تھا۔ اس وراثت کو آپ نے زندگی بھر سینے سے لگائے رکھا اور اسی جذبۂ جہاد کی وجہ سے آخری عمر میں اپنی علالت اور ضعفِ پیری کی پرواہ نہ کرتے ہوئے آپ نے ہجرت، پھر قید و بند اور جلائے وطنی اور ہندوستان سے پانچ ہزار میل دور سمندر میں "مالٹا" نامی ایک جزیرہ میں نظربندی و اسیری کو لبیک کہا اور ان تمام مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ آزادیٔ ہند کی تحریک کے لئے حضرت شیخ الہندؒ کی یہ قربانیاں آپ کے تلامذہ، ہندوستان کے دیگر علماء اور ان سرفروش مسلمانانِ ہند کے لئے ایک روشن نمونہ بن گئیں جنہوں نے کبھی مجلسِ خلافت، کبھی نیشنل کانگریس اور جمعیۃ العلماء ہند کے جھنڈے کے نیچے اور کہیں مسلم لیگ، مجلسِ احرار اور دوسری حریت پسند تنظیمات میں شامل ہو کر انگریزی حکومت کی قوتِ قاہرہ کے خلاف اس وقت تک جنگ جاری رکھی جب تک کہ سامراجی طاقت نے اپنا بوریا بستر باندھ کر ساحلِ بمبئی کو الوداع نہ کہہ دیا۔

عملی اقدامات ۱۹۱۴ء میں جب جنگِ عظیم چھڑ گئی تو آپ کی جماعت کے مرکز "یاغستان" میں آپ کے متعدد معتمد کارکن عرصہ سے تنظیمی کام انجام دے رہے تھے۔ ان سرفروش کارکنوں کو آپ کا حکم پہنچا کہ اب میدان میں آجاؤ اور سر بکف ہو کر کام شروع کرو۔ سرحد میں مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انگریزی فوج کی پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں۔ حضرت شیخ الہند کے پاس جہاد کی کیفیات کی خبریں برابر آتی رہتی تھیں۔ اسی اثنا میں کارکنانِ مراکز مجاہدین کا پیغام آیا کہ ہم رسد اور امیونیشن (AMMUNITION) ختم ہو جانے کی وجہ سے سخت مجبور ہیں جب تک ان دونوں چیزوں کا انتظام نہ ہو، جہادِ حریت جاری نہیں رہ سکتا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے دورانِ جنگ مجاہدینِ سرحد کی تائید و اعانت کا ایک مرکز کابل میں قائم کرنا چاہا اور ارادہ کیا کہ مولانا عبید اللہ سندھی[1] کو وہاں بھیجا جائے اور خود دنیا کے آزاد اور

---

[1] آپ سیالکوٹ میں ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئے اور دین پور میں ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء بمطابق ۱۳۶۳ھ کو (باقی بر صفحۂ آئندہ)

انگریزوں کے مخالف ممالک ترکی اور جرمنی وغیرہ سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ مولینا سندھیؒ کے پاس حکم پہنچتا ہے کہ "میں حجاز جاتا ہوں تم کابل پہنچو"۔

حضرت شیخ الہندؒ کا سفرِ حجاز

پہلی عالمگیر جنگ زور پکڑ گئی تھی، جرمنی اور ترکی جو آپس میں حلیف تھے اور برطانوی اقتدار کے خلاف دوش بدوش لڑ رہے تھے، ہندوستان کے عوام خاصکر مسلم عوام کی ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں سیاسی تحریکوں کو دبانے کے لئے امیر جنسی قوانین کا نفاذ کر کے مولینا آزاد، مولینا محمد علی، مولینا شوکت علی، لالہ لاجپت رائے اور اسی درجے کے رہنما ہر صوبے میں گرفتار کر کے اپنے گھروں سے دور مقامات میں نظر بند کر دئے۔ گرفتار کئے جانے والے لیڈروں کی جو فہرست وائسرائے ہند کے پولیٹیکل محکمہ نے مرتب کی تھی اس میں حضرت شیخ الہندؒ کا نام سرِ دفتر تھا، لیکن آپ گورنمنٹ کے فوری ارادوں سے بے خبر تھے اور حج وعمرہ کی نیت سے حرمین شریفین کے سفر کی تیاری میں مصروف تھے۔

حکومت کی عبرتناک ناکامی

دار العلوم میں صدر المدرسین کے منصب پر ذہن میں حضرت شاہ صاحب

(بقیہ صفحۂ گذشتہ) انتقال فرما گئے۔ آپ ایک سکھ خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اوائل عمر ہی میں مشرف باسلام ہوئے۔ آپ کے باپ کا نام رام سنگھ، دادا کا نام جسپت رائے اور ان کے باپ کا نام گلاب رائے تھا وطن اور نسل کے لحاظ سے آپ پنجابی تھے لیکن ابتدائی تعلیم و تربیت چونکہ سندھ میں حاصل کی تھی اس لئے عمر بھر "سندھی" کہلائے۔ دیوبند پہنچکر علوم کی تکمیل حضرت شیخ الہندؒ سے کی اور حضرت نے اپنے شاگرد کی بے چین اور انقلابی فطرت کے رجحانات کا اندازہ کر لینے کے بعد آپکو اپنے سیاسی منصوبوں کا ہمراز بنا لیا۔ آپ کے ارشاد پر ۱۹۱۵ء میں آپ "ریشمی خطوط" کی مہم کے سلسلہ میں وطن سے روانہ ہوئے۔ سات سال کابل میں رہے، سات مہینہ ماسکو (روس) میں، تین سال انگورہ (ترکی) اور پھر تقریباً بارہ سال مکہ معظمہ میں۔ انگریزی حکومت نے ہند میں آپکا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ جلائے وطنی کے پچیس برس گذرنے کے بعد مارچ ۱۹۳۹ء میں آپ ہندوستان واپس آئے۔

کو اپنی جانشینی کے لئے مقرر کر رکھنا بھی اسی سفر کی تیاری کا ایک حصہ تھا۔ اسی اثناء میں آپ کے ایک فدا کار مرحوم ڈاکٹر مختار احمد انصاری دہلوی کو اپنے ذرائع سے پتہ چل گیا کہ حکومت ہند نے حضرت شیخ الہند کی گرفتاری اور نظر بندی کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت شیخ الہند کو اطلاع دے دی لیکن حضرت شیخ الہند نے اپنے سفر کے پروگرام میں ذرہ بھر بھی تغیر و تبدل نہ کیا اور "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" کے مطابق آپ دیوبند سے ماہ شوال ۱۳۳۳ھ ستمبر ۱۹۱۵ء میں رخصت ہوئے اور دارالعلوم کی صدر مدرسی اور اپنی جانشینی کے لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا اعلان کر کے روانہ حجاز ہو گئے۔ اس اولوالعزمانہ اقدام سے حکومت ہند بوکھلا اٹھی اور اس کو حضرت شیخ الہندؒ کے عزائم کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔ چونکہ حکومت ترکی ان دنوں جنگ میں سخت الجھی ہوئی تھی اور حجاز پر ابھی ترکی خلافت کا تسلط موجود تھا، اس لئے حکومت ہند کو یقین ہو گیا کہ حضرت شیخ الہند وہاں جا کر ترکی اور جرمنی سے حریت ہند کے لئے امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لہذا ان کو روکنا اور گرفتار کر لینا ضروری ہے۔ چنانچہ آپ کی گرفتاری کے احکام فوراً جاری کر دئے گئے لیکن بمبئی تک ہر جگہ آپ کے دیدار اور زیارت کے مشتاق ہزارہا لوگوں کا بے پناہ اژدہام تھا اور آپ پر ہاتھ ڈالنے سے بڑے ہنگامے کا خطرہ تھا، اس لئے حکومت کی ہمت نہ پڑی کہ مولینا کو بمبئی کے راستے میں گرفتار کیا جائے۔ اب حکومت کی سکیم یہ تھی کہ بمبئی میں قیام کے دوران فوراً آپ کی گرفتاری عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ گرفتاری کے لئے گورنمنٹ بمبئی کے نام گورنر یو۔ پی نے ایک تار بھی بھیجا مگر وہ تار اس وقت پہنچا جب حاجیوں کا جہاز حضرت شیخ الہندؒ کو لے کر ساحل بمبئی سے روانہ ہو چکا تھا۔ پھر گورنر مذکور نے بواسطہ مرکزی سرکار عدن کے گورنر کو تار دیا کہ مولینا محمود حسن کو جہاز سے اتار لو۔ مگر یہاں بھی کامیابی نہیں ہوئی جب تک جہاز جدہ پہنچکر آپ کو مقدس سرزمین حجاز پر اتار چکا تھا اور حکومت ہند کی کوششوں کا جو سلسلہ دیوبند سے جدہ تک جاری رہا تھا وہ سب ناکام ہو گیا۔

امپیریل ازم کے لمبے ہاتھ

لیکن حکومت ہند نے حضرت مولینا کے ساتھ متعدد سی۔ آئی۔ ڈی بمبئی بلکہ پہلے سے

متعین کر دئے تھے جو بظاہر حاجیوں کے بھیس میں تھے تاکہ وہ تمام حرکات وسکنات کی نگرانی رکھیں مگر جہاز سے اُترتے ہی بعض لوگوں نے ترکی پولیس کو اطلاع کردی کہ فلاں فلاں اشخاص انگریزوں کے سی۔ آئی۔ ڈی ہیں ان کو پولیس نے گرفتار کرلیا اس کے باوجود کچھ مخفی لوگ پھر بھی باقی رہ گئے جو آپ کی گرفتاری کے وقت تک اپنے خبثِ باطن کی ڈیوٹی انجام دیتے رہے۔

مولانا مدنیؒ کی سیاست میں شمولیت مولانا سید حسین احمد مدنی کا ان دنوں مدینہ شریف میں مستقل قیام تھا اور آپ وہاں تعلیم وتدریس کے شغل میں مصروف تھے اسلئے ہندوستان کی سیاست میں ابھی باقاعدہ شریک نہیں ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے حجاز پہنچنے پر جب آپ کے تازہ ارادوں سے واقف ہوئے اور آپکے خیالات سے متاثر ہوئے تو عملی سیاست میں کود پڑے۔

قیام حجاز کی مصروفیات مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، طائف اور دیگر مقامات میں آزادئ وطن کی جدوجہد کے سلسلے میں حضرت شیخ الہند، مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر رفقاء نے کیا کیا اقدامات کئے، یہ ایک طویل اور دلچسپ باب ہے۔ حضرت شیخ الہند کا اس دوران قرآن شریف کے ترجمہ کے کام میں مصروف رہنا، دو بار حج بیت اللہ سے مشرف ہونا، مکہ میں وہاں کے گورنر غالب پاشا سے ملنا، ترکی کے وزیر جنگ اور مشہور ومعروف ہیرو غازی انور پاشا اور چوتھے ڈویژن کے کمانڈر جمال پاشا سے مدینہ منورہ میں ملنا، ان سے تحریرات حاصل کرنا، تحریرات کو نہایت رازداری سے وطن بھیجنا اور حضرت مولانا کا ترک اکابرین سے تحریک آزادئ ہند کی حمایت حاصل کرنا، طائف روانہ ہونا اور اسی اثنا میں شریف حسین (والی مکہ) کا انگریزوں سے سازباز کرکے ترک خلیفۃ المسلمین کے خلاف بغاوت کر دینا اور طائف میں حضرت مولانا کا محصور ہو جانا اس مدتِ قیام حجاز کی کچھ مختصر جھلکیاں ہیں۔

حرم مکہ میں گرفتاری اور قاہرہ میں سزا:- خلاصۂ کلام یہ ہے کہ

شریف مکہ نے انگریزی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حضرت مولانا کو مکہ مکرمہ میں گرفتار کر کے ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ کو آپ کے رُفقاء سمیت جدہ پہنچایا اور انگریزوں کی فوجی حراست کے سپرد کر دیا۔ آپ ۲۵ دن وہاں حراست میں رکھے گئے۔ ۱۰ ربیع الاول کو زیر حراست آپ سویز بھیجے گئے۔ ۲۲ ر کو وہاں سے گورہ فوج کی حراست میں آپکو قاہرہ بھیجا گیا اور مقام جیزہ کے سیاسی جیل "مُعْتَقَل"[1] میں داخل کر دئے گئے۔ جیزہ کے جیل میں تقریباً ایک مہینہ رکھنے اور بیانات لے لینے کے بعد امپریل ازم کے کارندوں نے فیصلہ کیا کہ آپ (حضرت شیخ الہند) اور آپ کے رُفقاء میں سے مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی، مولانا عزیز گل، حکیم نصرت حسین اور مولوی وحید احمد کو عالمگیر جنگ کے اختتام تک جلائے وطن اور نظر بند کر دیا جائے۔

مقام اسارت کیلئے مالٹا کا انتخاب

چونکہ ہندوستان، مصر اور عرب سب جگہ انگریز دشمن تحریکات چل رہی ہیں اور ان تینوں ممالک میں شیخ الہند کا اثر ورسوخ ہے اس لئے یورپ کے کسی انگریزی مقبوضہ مقام پر آپکو نظر بند رکھا جائے دہلی سے لیکر لندن تک مشوروں اور بہت ردوکد کے بعد انگریز حکام نے یہ طے کیا کہ شیخ الہند کو براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ کے بدلے براعظم یورپ میں نظر بند رکھا جائے۔ اس غرض کے لئے ملک ایطالیہ میں رومہ سے قریب ایک سمندری جزیرہ "مالٹا" کا انتخاب کیا گیا جس میں جنگ شروع ہونے کے وقت سے ترکی اور جرمنی کے وہ فوجی افسر، جنرل، کرنل اور انگریزوں کے بڑے بڑے مخالف لا کر نظر بند کئے جاتے تھے جو بدوران جنگ گرفتار کر لئے جاتے تھے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ÷ ہر بو الہوس کے واسطے دار و رسن کہاں؟

جزیرہ مالٹا کو حضرت مولانا محمود حسن اور آپ کے رُفقاء کی منتقلی کا فیصلہ ہو جانے

---

[1] مُعْتَقَل عقال کا اسم ظرف ہے، اس کا معنی ہے وہ جیل جس کے قیدیوں کو بیڑیاں اور زنجیریں پہنانا ضروری ہو۔

کے بعد ان کے پاسپورٹ مرتب کئے گئے۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ (۱۹ فروری ۱۹۱۷ء) کو ایک سمندری جہاز ان مقدس قیدیوں کو لیکر مالٹا کی طرف روانہ ہو گیا جو ۲۹ کو مالٹا پہنچ گیا۔

جزیرۂ مالٹا

جزیرۂ "مالٹا" نہایت سرد جگہ پر واقع ہے اور فروری کا مہینہ جس میں آپ وہاں پہنچے سرما کا ہی مہینہ شمار ہوتا ہے حضرت شیخ الہند ہندوستان کے ایک گرم صوبے یو۔پی کے رہنے والے تھے۔ سرد مقامات کی آب وہوا آپ کی صحت کے لئے ضرر رساں تھی۔ ابتداء میں آپ کو اور آپ کے رفقاء کو مالٹا میں کسی مکان کے بجائے خیموں میں ہی رکھا گیا تھا جو سرد ہواؤں کے جھونکوں سے ہر وقت پھڑپھڑاتے رہتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے تحریر فرمایا ہے کہ سردی خیموں کے باہر تو انتہائی درجہ کی پڑتی ہی تھی مگر اندر بھی اس قدر پڑتی تھی کہ باوجودیکہ لکڑی کی چارپائیوں پر نیچے گدہ اور اوپر دو کمبل ہوتے تھے، پھر بھی آدھی رات کے بعد سردی کی شدت سے نیند نہیں آتی تھی مگر حضرت حسب عادت ڈیڑھ دو بجے اٹھتے، پیشاب وغیرہ سے فارغ ہو کر ٹھنڈے پانی سے وضو کرتے۔ اور چونکہ (ضعیف العمری کے باعث) پیشاب کے بار بار آنے کی تکلیف لاحق تھی شب بھر میں کئی کئی مرتبہ ادرار کی ضرورت پڑتی تھی۔ لیکن چونکہ عادتِ شریف ہر وقت باوضو رہنے کی تھی اس لئے شدتِ سرما کے باوجود آپ ہر بار تجدیدِ وضو فرماتے اور ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے۔

رہائی اور واپسیٔ وطن

بہرکیف ۲ جمید الثانی ۱۳۳۸ھ کو تقریباً ۳ برس ڈیڑھ مہینہ مالٹا جیل میں رکھ کر وہاں سے روانہ کئے گئے۔ ۲۵ جمید الثانی کو اگن بوٹ اسکندریہ پہنچا۔ ۱۸ روز وہاں ٹھہرنے کے بعد ۱۲ رجب کو وہاں سے سویس کو روانہ کئے گئے۔ سویس میں اسیروں کے کیمپ میں (سنگیوں کے پہرہ میں) پونے دو مہینہ تک انہیں رکھا گیا۔ الغرض ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ (مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء) کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہنچ کر ان کو رہا کیا گیا۔

محبت وعقیدت کے مظاہرے

بمبئی میں مولانا شوکت علی اور

ہزاروں اشخاص وممبرانِ خلافت کمیٹی نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا اور نعرہ ہائے تکبیر سے فضا کو گونجا دیا۔ مولٰنا عبدالباریؒ فرنگی محلی لکھنؤ سے اور گاندھی جی احمد آباد سے آکر استقبال میں شریک ہوئے۔ بمبئی کے دو ڈھائی دن کے مختصر قیام میں خلافت کمیٹی اور اہالیانِ شہر کی طرف سے حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا گیا۔ آخرکار ۲۵ ر رمضان ۱۳۳۸ھ کو دہلی اور ۲۶ ر رمضان ۱۳۳۸ھ (۱۳ر جون ۱۹۲۰ء) کو آپ دیوبند پہنچ گئے۔

مُدتِ مدید کی اسارت کی مشقتیں برداشت کر کے جب حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان واپس تشریف لائے تو جذبۂ حریت اور انگریز دشمنی میں کوئی کمزوری یا کمی نہیں آئی بلکہ آپ کے سینہ میں آزادیٔ وطن کی مبارک آگ زیادہ بھڑکی اور آخر انگریز کے ساتھ ترکِ موالات کا فتویٰ دے دیا۔ جس سے ملک میں زبردست ہیجان پیدا ہو گیا تھا کہ ایک موقعہ پر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ تک کو لوگ بند کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

اپنے مرحوم رفیقِ سجن کی والدہ کی تعزیت

سفرِ حرمین اور مالٹہ کی قید میں جو لوگ حضرت شیخ الہندؒ کے رفیق تھے انہیں ایک بزرگ حکیم نصرت حسین صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب نہ صرف حضرتؒ کے شاگرد بلکہ مخلص خادم بھی تھے۔ باوجودیکہ حکیم صاحب حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک کے باضابطہ ممبر نہ تھے لیکن حُکّام برطانیہ نے بوکھلاہٹ میں آپ کو بھی شیخ الہند کے انقلابی رُفقاء میں شمار کر کے حجازِ مُقدس میں گرفتار کرلیا اور مالٹا لیجا کر حضرتؒ کے ساتھ ہی نظربند کر دیا۔ آپ وہیں پر بیمار پڑکر انتقال کر گئے۔ (رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)

حضرت شیخ الہندؒ نے وطن واپس آکر دیوبند میں چند دن قیام فرما کے ضروری سمجھا کہ مرحوم کے گھر واقع کوڑا جہاں آباد (ضلع فتحپور) میں جاکر حکیم صاحب مرحوم کی والدۂ محترمہ اور دیگر لواحقین کی تعزیت پُرسی کی جائے، چنانچہ حضرتؒ نے ایسا ہی کیا۔

دیگر مقامات کا سفر

کوڑا جہاں آباد کے سفر کے ساتھ ہی حضرت شیخ الہندؒ الہ آباد اور لکھنؤ وغیرہ مقامات پر بھی تشریف لے گئے۔ سخت علالت ہی میں ۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ (۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء) کو علیگڈھ میں مسلم نیشنل یونیورسٹی (جو کہ بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور علی گڈھ سے دہلی منتقل ہوئی)

کی بنیاد ڈالی۔

اس تقریب پر دعوت دینے والوں کے اصرار پر یہ فرما کر حضرت نے رضامندی ظاہر کی کہ "اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو جلسہ میں ضرور شریک ہونگا"۔

آپ ان دنوں اسقدر علیل تھے کہ ضعف و نقاہت کی وجہ سے خود چل بھی نہیں سکتے تھے دو شخصوں کے کندھوں پر ٹیک کر چلنا ہوتا تھا۔ آپ کی طرف سے خطبۂ صدارت آپکے فیض یافتہ مولینا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا، جس کے مندرجۂ ذیل فقرے قابل یادگار ہیں:۔

حضرت شیخ الہند کی یادگار تقریر

۱۔ "میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب و ضرب کا"۔

(پھر چند سطور کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:۔)

(۲) "اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڈھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڈھ کا رشتہ جوڑا"۔

(آگے چلکر اس خطبۂ مبارک میں ارشاد فرمایا:۔)

(۳) "آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں وہ جانتے ہونگے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی اجنبی زبان سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا"۔ الخ [۱]

---

[۱] حتیٰ کہ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنے زمانے میں فتویٰ دیا تھا کہ: "انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے"۔ (کوہ ندو)

جمعیۃ العلماء کی صدارت

علی گڈھ کے اس جلسہ میں شرکت اور جامعہ ملیہ کی سنگِ بنیاد ڈالنے سے فراغت کے بعد آپ واپس دہلی تشریف لائے اور وہاں ۷، ۸، اور ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ کو جمعیۃ العلماء ہند کے تاریخی اجلاس کی صدارت فرمائی اور آخر وہیں ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء) کو آپ نے اپنی جان حضرت جان آفرین کے سپرد کی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

رحلتِ شیخ الہند رح

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رح کا بیان ہے (جس کو مولانا حسین احمد صاحب نے نقل فرمایا ہے) کہ (رحلت فرمانے سے کچھ دیر پہلے) حضرت (شیخ الہند رح) نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ "مرنے کا تو کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں، تمنا تو یہ تھی کہ میں میدانِ جہاد میں ہوتا اور اعلاءِ کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاتے۔ اسکے بعد بلند آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا۔ آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔"

(نقشِ حیات ج ۲ ص۲۶۵)

حضرت شیخ الہند کی وفات حسرت آیات کی خبر شہر دہلی میں پھیل گئی تو آناً فاناً تمام دکانیں بند ہوئیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کی کوٹھی کے سامنے میدان میں ہزارہا مسلمانوں کی جماعت نے نمازِ جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد ریلوے اسٹیشن پر دوسری دفعہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی، پھر شہر میرٹھ اور چھاؤنی میرٹھ پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی گئی۔ ساڑھے سات بجے شام کو تابوت دیوبند اسٹیشن پر پہنچا۔ عقیدت مندوں کا جم غفیر حاضر تھا۔ دوسرے دن صبح کو نمازِ صبح کے بعد جنازہ دارالعلوم میں پہنچایا گیا، جہاں حضرت شیخ الہند رح کے برادرِ مکرم مولانا حکیم محمد حسن صاحب نے نمازِ جنازہ پڑھائی ۹ بجے صبح کا وقت تھا جب بقول مولانا سید حسین احمد مدنی رح "شریعت و طریقت کے (اس) آفتابِ عالمتاب کو (حضرت نانوتوی رح کی قبر مبارک کے قریب) ہمیشہ کے لئے نظروں سے چھپا دیا گیا۔"

مولانا مدنی رح نے نقل فرمایا ہے کہ (اس وقت) ایک غمزدہ کی زبان نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا ؎

مٹی میں کیا سمجھ کے چھپاتے ہو دوستو!
گنجینۂ علوم ہے، یہ گنجِ زر نہیں

تصانیف

حضرت شیخ الہند رح نے بے شمار فیض یافتہ علماء و فضلاء یادگار چھوڑے

ان کے علاوہ قرآنِ مجید کا اردو ترجمہ، جہدُ المقل، احسن القریٰ، ادلۂ کاملہ، ایضاح الادلہ، الابواب والتراجم، مختلف فتاویٰ اور متعدد سیاسی خطبات حضرت ممدوح کی تصنیفی یادگار ہیں۔

خراجِ تحسین

"جو جانبازی حضرت شیخ الہند رح نے دکھائی وہ تو کوئی اور کیا دکھائے گا۔" (مولینا انور شاہ کشمیری رح)

(بحوالہ "دارالعلوم دیوبند جولائی ۱۹۶۲ء مقالہ مولینا لاہپوری)

حضرت شیخ الہند رح صرف تفسیر وحدیث، فقہ و اصول، منطق اور فلسفہ، حساب اور مساحت، ہیئت اور معقولات کے ہی بحرِ ذخار نہیں تھے بلکہ ان کو ادبیاتِ عربیہ وفارسیہ واردو شعر وسخن، اساتذۂ فن کے مقالات اور قصائد، غزلیات اور مثنویاں وغیرہ اس قدر یاد اور ازبر تھیں کہ سننے والا حیران ہو جاتا تھا اور تعجب کرنے لگتا تھا کہ ان کے حافظہ میں کس قدر بے شمار علوم اور محفوظات کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔"

مولینا سید حسین احمد مدنی رح (بحوالہ نقشِ حیات جلد ۱ ص ۱۳۲)

"میں نے حضرت شیخ الہند رح سے حضرت مولینا محمد قاسم رح کی حجۃ الاسلام پڑھی، کتاب پڑھتے ہوئے کبھی کبھی یوں محسوس کرتا کہ جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔"

مولینا عبید اللہ سندھی رح

(بحوالہ "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" ص ۲۹۶)

"حلقۂ درس کو دیکھ کر سلف صالحین اور اکابر محدثین کے حلقۂ حدیث کا نقشہ نظروں میں پھر جاتا تھا، قرآن وحدیث حضرت کی زبان پر تھا اور ائمۂ اربعہ کے مذاہب ازبر، صحابہ وتابعین، فقہاء مجتہدین کے اقوال محفوظ، تقریر میں نہ گردن کی رگیں پھولتی تھیں، نہ منہ میں کف آتا تھا، نہ مغلق الفاظ سے تقریر کو جامع الغموض اور بھدی بناتے تھے، نہایت سبک اور سہل الفاظ بامحاورہ اردو میں، اس روانی اور جوش سے تقریر فرماتے کہ معلوم ہوتا کہ دریا اُمنڈ رہا ہے، یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے، ہزاروں دیکھنے والے موجود ہیں کہ دبی منحنی اور منکسر المزاج ایک مُشتِ استخوان، ضعیف الجثہ مردِ خدا جو نماز کی صفوں میں ایک معمولی مسکین طالب علم معلوم ہوتا تھا، مسندِ درس پر تقریر کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک شیرِ خدا ہے جو قوت وشوکت

کے ساتھ حق کا اعلان کر رہا ہے، آواز میں کرختگی آمیز بلندی نہ تھی لیکن مدرسہ کے دروازے تک بے تکلف قابلِ فہم آواز آتی تھی، لہجے میں تصنع اور بناوٹ کا نام نہ تھا، لیکن خدا تعالیٰ نے تقریر میں اثر دیا تھا، بات دلنشین ہو جاتی تھی اور سننے والا بھی یہ سمجھ کر اٹھتا تھا کہ وہ جو فرماتے ہیں حق ہے۔"

مولانا میاں اصغر حسین دیوبندی

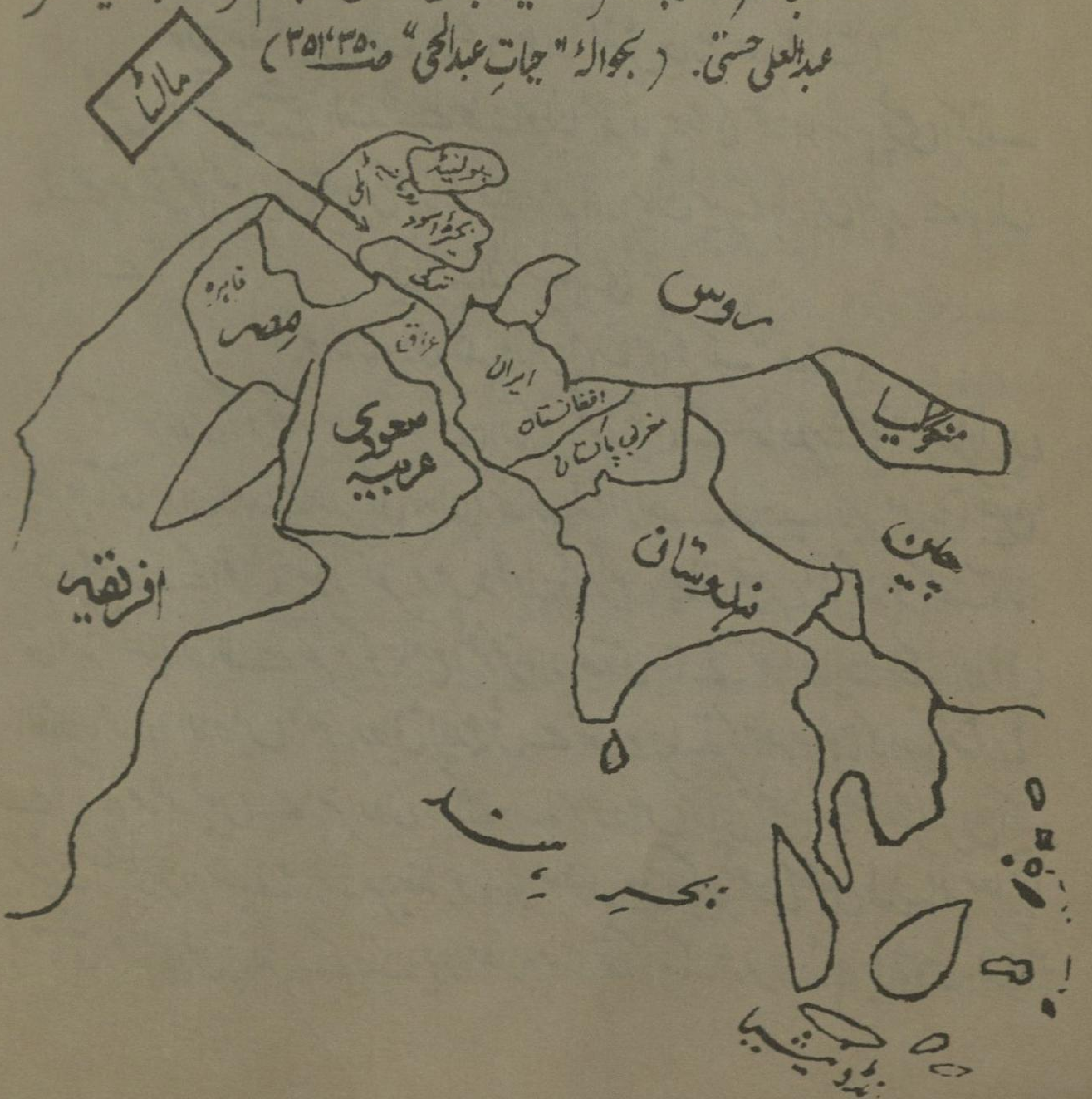
(حیات شیخ الہند بحوالۂ تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۲۵۴، ۲۵۵)

۱۔ "مولانا محمود حسن صاحب کی صحبت مغتنمات میں سے ہے۔

۲۔ بخاری شریف مولانا محمود حسن صاحب سے پڑھنا۔

۳۔ مولانا محمود حسن صاحب کی ذاتِ قدسی نمونہ اسلاف ہے۔ انکے اخلاق کا مطالعہ رکھو۔"

اقتباساتِ مکتوب حضرت مولانا عبد الحی لکھنوی رح۔ بنام فرزند ارجمند مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی۔ (بحوالۂ "حیاتِ عبد الحی" ص ۳۵۰، ۳۵۱)



تتمہ ۲

حضرت الشیخ بابا مسعود نروری رح

آپ کا زمانۂ ولادت

جہاں تک آپ کی تاریخ پیدائش کا تعلق ہے کشمیر کی وہ تاریخی کتابیں جن میں آپکا تذکرہ آتا ہے خاموش ہیں۔ اندازاً آپ کی ولادت دسویں صدی ہجری کے ربع اول میں ہونی چاہیئے۔ آپ نے حضرت میر سید احمد کرمانی سہروردی رح کے دست مبارک پر بیعت کرنے لینے کے بعد دنیاوی تعلقات ترک کردئے۔ ذہنی انقلاب اور ترک دنیا سے قبل آپ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت میں شہرت عام حاصل کرچکے تھے۔ اپنے ہم پیشہ تاجروں اور امراء دربار پر اپنی شخصیت کا سکہ اس حد تک بٹھا رکھا تھا کہ تاجر لوگ آپ کو "ملک التجار" کے لقب سے پکارنے لگے تھے اور امراء دربار میں سے ایک بڑے فوجی امیر ملک علی چک نے (جو آگے چل کر بادشاہ بھی بنا اور علی شاہ چک کہلایا) اپنی بیٹی آپ کے عقد میں دے دی تھی۔ (آپکے دو مشہور ترین فرزند الشیخ بابا عبد اللہ رح اور الشیخ بابا حاجی رح اسی زوجہ محترمہ کے بطن سے تھے) مال و دولت، کاروبار، تجارت کی یہ ترقی، اپنے زمانہ کے روساء و امراء میں اثر و رسوخ اور حصول وجاہت کے لئے زندگی کے تجربات اور پختہ سن و سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان واقعات کو ملا کر تاریخ نہ سہی مگر زمانۂ پیدائش کا اندازہ کرلینا مشکل نہیں۔

حضرت میر سید احمد کرمانی رح کا کشمیر میں اس وقت ورود ہوا ہے جب سلاطین کشمیر میں سے محمد شاہ اور فتح شاہ امراء دربار کی سازشوں سے یکے بعد دیگرے بار بار معزول اور بار بار تخت نشین ہوتے تھے۔ (یہ ڈرامہ کئی سال تک چلتا رہا اور اس میں محمد شاہ پانچ بار اور فتح شاہ تین بار تخت نشین ہوئے)۔ اس لئے حضرت کرمانی رح کی کشمیر میں رونق افروزی ۹۴۵ھ کے ماقبل یا مابعد زمانہ ہی متعین ہوتی ہے۔ یہی زمانہ حضرت شیخ بابا مسعود رح کے ترک دنیا،

انابت الی اللہ اور سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت و تربیت حاصل کرنے کا ہے۔ اگر اس موقعہ پر آپ کی عمر تیس۳۰ سال بھی مان لی جائے تو آپ کی پیدائش لگ بھگ ۹۰۵ھ سے ۹۲۰ھ کے مابین متصور ہوگی۔

آپ کے ذہنی انقلاب کے عوامل

یہ امر محقق ہے کہ ہر انقلاب کے اسباب اور عوامل ہوتے ہیں اور ذہنی انقلاب تو زیادہ سے زیادہ موثر عوامل کا تقاضا کرتا ہے۔ یوں ہی بیٹھے بٹھائے کوئی دولتمند تاجر اور بڑا امیر شخص اپنی دولتِ دنیا کو لات نہیں مار سکتا۔ جب حضرت مسعود نروریؒ نے دولت وحشمت سے بیزار ہو کر فقیری اختیار کی اور پھر صوفیائے کرام کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ اس وقت کشمیر کے شاہمیری سلاطین کا اقتدار چراغِ سحری تھا۔ دیگر اہلِ بصیرت کی طرح آپ نے بھی کشمیر کی سیاسی بساط پر محمد شاہ اور فتح شاہ کے مہرے پٹتے ہوئے دیکھے اور ان کے جانشینوں سلطان ابراہیم، سلطان شمس الدین، اسماعیل شاہ، ابراہیم شاہ ثانی، نازک شاہ اور اسماعیل شاہ ثانی کی ڈگمگاتی ہوئی حکومتیں اور نازک شاہ کے دور میں مرزا حیدر کاشغری کی سربراہی وغیرہ سب کچھ دیکھا تھا اور امراءِ سلطنت کے ایک گروہ کا تشیّع کی طرف جھک جانا اور پھر حبیب شاہ پر اس کے حقیقی ماموؤں کے ہاتھوں شاہمیری سلاطین کا خاتمہ اور چکوں میں سے غازی چک، حسین چک اور علی چک اور آخر الذکر کے بیٹے یوسف شاہ چک اور اس کے بیٹے یعقوب چک کا یکے بعد دیگرے کشمیر میں بادشاہت کرنا اور ان کی حکومت کا دولتِ مستعجل ثابت ہونا اور مغلِ اعظم جلال الدین اکبر کا کشمیر کو سلطنت ہندوستان میں شامل کر لینا۔ یہ تمام عبرتناک تغیرات ہیں جو حضرت مسعودؒ نے بچشم خود دیکھے۔ مسعود صاحب کے حساس قلب کے لئے یہ واقعات عبرت و موعظت کا ایک دفتر اپنے اندر لئے ہوئے تھے۔ اس لئے یہ تاریخی احول آپ کے ذہنی انقلاب کا سب سے مؤثر سبب اور عامل تھا۔

خلاصۂ بیانات

کشمیر میں دسویں صدی ہجری کے صوفیاء کرام کو آج کے مجاوروں اور گدی نشینوں پر قیاس کرنا اپنے آپ کو بڑے مغالطے میں ڈالنا ہوگا۔ اس دور کے صوفی، ریشی اور مشائخ حسب مراتب قوم کے اجتماعی امور میں رہنمایانہ پارٹ ادا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سیاسی امور سے بھی وہ لاتعلق نہ رہتے تھے۔ اسلئے

حضرت مسعودؒ بھی اجتماعی زندگی سے واسطہ رکھتے تھے۔ قوم کی اجتماعی زندگی میں آپ کے سرگرم حصہ لینے کے حالات اور آپ کی زندگی کے اہم واقعات سے آپ کا زمانہ بھی بالکل متعین ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ۹۵۰ھ میں آپ ایک باوجاہت تاجر ہیں تو ۹۶۰ھ میں تارکُ الدنیا، زاہد و عابد ہیں اور ۹۷۰ھ میں شیخ وقت ہونے کے لحاظ سے سلسلۂ سہروردیہ کے عظیم الشان پیرانِ طریقت حضرت سید احمد کرمانیؒ اور سید محمد مسافر کرمانی کی خلافت کا تاج زیب سر کئے ہوئے ہیں۔ ۹۸۰ھ اور ۹۹۰ھ میں آپ دیگر مشائخ وقت حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہؒ، حضرت الشان علامہ شیخ یعقوب صرفیؒ، حضرت مخدوم احمد قاریؒ اور حضرت بابا داؤد خاکیؒ وغیرہم کے دوش بدوش اُن خراب حالات کی اصلاح کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں جو چک خاندان کے پہلے اور دوسرے تشدد پرست حکمرانوں نے شیعیت کو آڑ بنا کر سیاسی اغراض برآری کے لئے پھیلائے تھے اور جن کی وجہ سے کشمیر کے عوام ہرج و مرج میں مبتلا تھے اور ملک میں عدل و انصاف اور امن و امان کا فقط نام ہی باقی رہ گیا تھا۔

حضرت شاہ کرمانؒ سے بیعت

حضرت مسعودؒ کے ذہن میں جو انقلاب آیا تھا اس نے ترک دنیا کی صورت اختیار کرلی۔ آپ اپنی تجارت کے شغل کو ترک کر کے اور "دست از ہمہ شستیم و قلندر گشتیم" کے مطابق اپنی قیمتی جائیدادیں چھوڑ کر مرشد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آپ کی جائے سکونت واقع نروره سے جڈیبل کا محلہ بالکل قریب تھا، نہ آپ کے کانوں تک میر شمس الدین عراقی کی شہرت بھی پہنچ چکی تھی۔ چونکہ میر عراقی ابتداءً مستور الحال تھے اور بعضوں کو آپ پر کج روی کا گمان بھی تھا اس لئے شاذ و نادر ہی کسی کو معلوم تھا کہ آپ شیعیت کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ حضرت مسعودؒ نے بھی میر عراقی کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن وہاں جانے سے قبل ہی آپ کو کسی غیر معمولی اشارے سے اصلیت معلوم ہو گئی اور آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا لیکن روح کی پیاس بجھانے کے لئے آپ نے اس پر بھی تلاش جاری رکھی۔ آخرکار تقدیر الٰہی رہبر بنی اور آپ محلہ بلبل لنکر میں حضرت سید السادات شاہ کرمان میر سید احمد کرمانیؒ کی خدمت میں پہنچ گئے چند ابتدائی امتحانات سے مرشد روشن ضمیر کو حضرت مسعودؒ کی استعداد کا اندازہ ہو گیا اور پھر بیعت اور سلوک کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور تربیت و ریاضت کی منازل طے کر کے آپ اپنے

مُرشد کے محبوب ترین مُرید اور دستِ راست بن گئے۔ اور نہ صرف بذاتِ خود اس مشن کی تکمیل میں وقف ہو گئے جس کے لئے حضرت کرمانی نے کشمیر کو اپنا وطن بنا لیا تھا بلکہ اپنے بیٹوں کو بھی آبائی شغل تجارت اور کاروبار کی بجائے علمِ دین حاصل کرنے پر کمربستہ کیا اور اس طرح سے انکی زندگیاں بھی دین کی حفاظت و اشاعت کی نذر کر دیں۔

حضرت مسعودؒ کے تین مُرشد

علمِ سلوک کی رو سے طالب کے ایک پیرِ بیعت و تربیت ہوتے ہیں، ایک پیرِ صحبت اور پیرِ خلافت۔ بعض اوقات تینوں مرحلے ایک ہی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرت بابا مسعودؒ کو ان تین مرحلوں میں تین بزرگوں سے واسطہ رہا۔ حضرت میر سید احمد کرمانیؒ آپ کے وہ مُرشد تھے جن سے آپ بیعت بھی ہوئے اور جنہوں نے آپ کی تربیت بھی فرمائی لیکن مُرشد کی ہدایت کے مطابق آپ نے مُرشد کے ایک بڑے خلیفہ حضرت سید جلال الدین کے ساتھ سالہا سال تک صحبت رکھی اس لئے سید جلال الدین آپ کے پیرِ صحبت تھے۔ حضرت میر سید احمد کرمانیؒ کے فرزند سید محمد مُسافر کرمانیؒ تھے جو آپ کے خلیفۂ اعظم بھی تھے۔ حضرت میر نے اپنے فرزند کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ سلسلۂ سہروردیہ کرمانیہ کی خلافت الشیخ مسعود کو عطا کر دینا چنانچہ سنہ ۹۷۴ھ میں حضرت سید محمد مسافر کرمانیؒ نے حضرت الشیخ بابا مسعود نروریؒ کو مسندِ خلافت پر بٹھا دیا۔

آباء و اجداد

حضرت مسعودؒ کے والد کا نام جُنید تھا اور جُنید کے والد قاسم تھے جن کو تجارتی اور کاروباری حلقوں میں "قاسم میمون" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ قاسم کے والد عبداللہ تھے۔ اس امر کی وضاحت پہلے بھی آ چکی ہے۔ اور خود حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کی تحریرات سے بھی اس کی تائید پیش ہو چکی ہے کہ یہ خاندان کشمیر میں لاہور سے، لاہور میں ملتان سے اور ملتان میں بغداد سے منتقل ہوتا ہوا چلا آیا تھا، ہر نئے وطن میں کئی کئی پشتیں گذرتی تھیں۔ اس لئے یہ سفر کئی سو برس میں پورا ہوا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مسعود کی اولاد کی دوسری شاخوں کے اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ "حضرت مسعودؒ کا نسب نامہ اوپر جا کر حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت امام صاحبؒ کے مشہور فرزند حمادؒ تھے اور

حماد کے دو بیٹے تھے اسماعیل اور ابو حیان۔ حضرت مسعود کا نسب نامہ ابو حیان سے متصل ہوتا ہے۔" دوسری روایت یوں ہے کہ امام ابو حنیفہ رح کے دادا کا نام بھی نعمان تھا۔ اس نعمانِ اوّل کے دو فرزند تھے۔ ثابت بن نعمان زوطی (امام صاحب رح کے والد ماجد) اور حارث بن نعمان زوطی۔ حضرت امام ابو حنیفہ رح تو ثابت کی اولاد ہیں مگر حضرت شیخ مسعود نروری کے آباءِ کرام حارث کی اولاد ہیں۔

ان روایات کے علاوہ مسلسل شجرہ ہائے نسب بھی اکثر شاخوں میں منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں جو نظریاتِ بالا کے مؤید ہیں۔ واللہ اَعلَمُ بالصّواب وَالَیہِ المرجعُ وَالمآب۔

اولاد اکثر تواریخ کشمیر میں حضرتِ مسعود کے حسبِ ذیل چار فرزندوں کا تذکرہ آتا ہے۔

(۱) الشیخ بابا عبد اللہ الحاجی :- آپ کا شمار اپنے زمانہ کے علماء و اتقیاء میں ہوتا ہے۔ نصف سے زیادہ مسعودیانِ کشمیر کا سلسلہ آپ ہی کے ذریعہ حضرت مسعود تک پہنچتا ہے۔

(۲) **الشیخ بابا حاجی** :- اس وقت نروره میں مسعودیوں کے جو گھر آباد ہیں، ان کی اکثریت حضرت حاجی کی اولاد سے ہیں۔

(۳) **الشیخ بابا ابراھیم** :- آپ کی اولاد ضلع اسلام آباد کے آکھرن، دُلگام وغیرہ دیہات میں آباد ہے۔

(۴) بابا یحییٰ :- آپ کی اولاد کھرو، شار میں آباد ہے۔

(۵) بابا یوسف :- آپ کا تذکرہ صرف ایک تاریخی کتاب "خوارق السالکین" مصنفہ مُلّا احمد بن عبد الصبور ہادی میں ملتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ان سب حضرات کو کشمیر کے تذکرہ ہائے صوفیاءِ کرام میں مؤرخین نے اپنے وقت کے صالحین، اور اولیاءِ کرام میں شمار کیا ہے۔

حضرتِ بابا مجنون نروری رح

آپ بابا حاجی کے فرزند تھے اپنے علمی کمالات اور روحانی درجات میں آپ اپنے بنی اعمام سے ممتاز تھے۔ آپ نے تعلیم کی تکمیل سرینگر کے بعد سیالکوٹ، لاہور اور دہلی میں جاکر کی جو گیارھویں صدی ہجری میں مشہور علمی مراکز تھے۔ تفسیر و حدیث اور

فقہ کے علاوہ علم طب یونانی بھی آپ نے حاصل کیا اور کشمیر میں آپ طب یونانی کے بانی اور اُستادِ اوّل ثابت ہوئے۔ قریباً تین سَو یا ساڑھے تین سَو سال تک وادیٔ کشمیر میں لاکھوں لوگوں کے علاج کا دارومدار طبِ یونانی پر رہا جو بابا مجنون کے احسانات میں شمار ہوتا ہے۔ ظاہری علومِ ادیان اور علومِ ابدان کے جامع ہونے کے باوجود حضرت بابا مجنون کی سب سے زیادہ توجہ علمِ سلوک کی طرف تھی۔

صاحبِ اسرار الابرار محدث بابا داؤد مشکوتیؒ بابا مجنونؒ کے شاگردوں اور فیض یافتگان میں نمایاں تھے۔ جب مجنون صاحب کے فرزند اور خلیفہ بابا محمد آبرو آپ کی حیات میں ہی وفات پا گئے تو آپ نے حضرت مشکوتیؒ کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کیا۔ ۱۰۶۲ھ میں آپ نے رحلت کی اور اپنے بزرگوں کے پہلو میں محوِ استراحت ہو گئے۔

حضرت مسعودؒ زوّاج تھے

اسرار الابرار میں علامہ داؤد مشکوتیؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت سلطان العارفین مخدوم شیخ حمزہ کشمیریؒ اور حضرت بابا مسعود نروریؒ کے درمیان باہم مجالست و موانست بہت زیادہ تھی اور ایک دوسرے کے کمالات سے واقف تھے۔ مگر دونوں میں ایک فرق تھا۔ حضرت مخدوم صاحبؒ مجرّد تھے اور تجرّد و تنہائی کو تأہّل پر ترجیح دیتے تھے لیکن حضرت بابا مسعود متأہّل تھے، چار بیبیوں کے شوہر اور کثیر الاولاد تھے۔ حضرت مخدوم صاحبؒ حضرت مسعودؒ کے روحانی کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ:-

"بابا مسعود نوروریؒ اگر زوّاج یعنی متعدد بیبیوں کے شوہر نہ ہوتے تو مشائخِ کشمیر میں اُن کے مرتبے کو کوئی بھی نہ پہنچ سکتا۔"

حضرت مسعودؒ کا مدفن

حضرت مسعود نروریؒ اور آپ کے بڑے دونوں فرزندوں اور آپ کے پوتے بابا مجنون اور آپکے ایک خلیفہ بابا اسحاق کا مدفن و مزار نرورہ میں زیارت علم صاحب کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ کشمیر کے دیگر مشائخ کے برعکس ان بزرگوں کے مقابر پر کوئی تعمیر یا سقف نہیں ہے یہ فلک نیلی فام کی کھُلی چھت کے سایہ میں آرام فرما ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

تحریکِ حریّتِ کشمیر اور مسعودیانِ محلہ نرورہ

کشمیر کی سیاسی

تحریک میں وادی بھر کے مسعودیوں کی طرح نروره کے مسعودیوں نے بھی نمایاں حصّہ لیا ہے۔
سیاسی تحریک ۱۹۳۱ء میں ابتداءً جموں اور سرینگر کے دو شہروں کی تحریک تھی۔ پریس اور اخبارات کا اس زمانے میں وجود ہی نہ تھا اور دیہاتی علاقوں میں تعلیم بھی معدوم تھی۔ ایسے حالات میں کشمیر میں گاؤں گاؤں اور گھر گھر تک پھیلا ہوا پیری مریدی کا سسٹم تحریک کے حق میں آبِ حیات ثابت ہوا۔
کشمیر میں پیری مریدی کا رواج آٹھویں صدی ہجری سے مسلسل چلا آرہا ہے۔ اس کے مطابق گاؤں کے ہر گھر کا موروثی پیر سال میں دو بار یا کم از کم ایک بار گاؤں کا دورہ کرتا ہے اور چند دن اپنے مریدوں کے گاؤں میں رہ کر اپنی علمیت اور قابلیت کے مطابق وعظ و نصیحت، تبلیغ و تعلیم اور تعویذ و تلقین کے ساتھ ساتھ نذر و نیاز بھی حاصل کرتا ہے۔ ۱۹۳۱ء کی سیاسی تحریک میں چونکہ علماء اور پیرزادگان طبقہ پیش پیش تھا اس لئے قریباً تمام پیر صاحبان تحریکِ حرّیت کے نہایت موثر مبلغ ثابت ہوئے۔ یہ دیہات میں پھیل کر اپنے مریدوں میں سیاسی تحریک کو مقبول بنانے میں ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دے گئے۔ ان میں ساداتِ گیلانی، اندرابی و بیہقی، بخاری و قادری و نقشبندی اور پیرزادگان مخدومی، مسعودی، رفیقی، ہمدانی، کاملی و ریشی اور خاندان واعظان، مفتیان و مولویان کا حصہ اس قدر نمایاں رہا ہے کہ اس کی تفصیلات کے لئے ایک الگ کتاب ہونی چاہیئے۔
محلہ نروره سرینگر کے مسعودیوں میں سے حافظ کلام اللہ پیر قمر الدین (م ۱۳۷۳ھ) پیر سلام الدین (م ۱۳۷۵ھ)، پیر خلیل اللہ شاہ (م ۱۳۹۲ھ)، حافظ پیر قاسم شاہ (م ۱۳۹۴ھ) اور پیر سیف الدین صاحب وغیرہ ابتداء تحریک سے ہی مبلغینِ دعوت آزادی بن کر دیہات کے لوگوں میں جاگیرشاہی کے خلاف کام کرتے رہے اور قومی مطالبات کو گاؤں کے بے خبر لوگوں کے ذہنوں پر نقش کر کے ان کو قومی جد و جہد کے دھارے میں صف آرا ہو جانے کے لئے تیار کرتے رہے۔

مرشد مسعودؒ میر سیّد احمد کرمانیؒ

کرمان، ملکِ ایران کا قدیم سے ایک مشہور شہر ہے۔ اور اس علاقے کا مرکز رہا ہے۔ جو آج کے بلوچستان کے جنوب مغربی ضلع قلات کی سرحدوں سے ٹکراتا ہے۔ سادات کے بعض خاندان دوسری یا تیسری صدی ہجری میں ہی کرمان میں

آباد ہو گئے تھے۔ ان میں بڑے بڑے مشہور عالم، عارف اور تاجر پیدا ہوئے۔ ساتویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل میں سیّد محمود اور سیّد احمد دو بھائی تجارت پیشہ تھے جن کے اونٹوں کے قافلے کرمان سے ایرانی، عراقی اور عربی مال لیکر ملتان سے گذرتے ہوئے لاہور تک آتے تھے۔ ملتان اسوقت سلسلۂ سہروردیہ کا مرکز تھا۔ حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے سب سے بڑے خلیفہ حضرت مخدوم بہاؤ الدین زکریاؒ ملتانی کی ذات مرجع خاص و عام تھی یہ کرمانی سید بھی ملتان میں آپ کے سلسلہ میں داخل ہو گئے۔ چونکہ سلسلۂ سہروردیہ کے ہی ایک بزرگ حضرت سید شرف الدین بلبل شاہؒ نے ۷۲۵ھ میں سب سے پہلے سرزمین کشمیر میں اسلام کا پُر ثمر درخت نصب کیا اس لئے آٹھویں، نویں اور دسویں صدی ہجری میں جو علماء، فقراء اور اولیاء اس درخت کی آبیاری کے لئے کشمیر آتے رہے ان میں سلسلۂ سہروردی کی مختلف شاخوں کے ساتھ تمسّک کرنے والوں کی اکثریت ہے۔ دسویں صدی ہجری کے حضرت سیّد احمد کرمانیؒ کی شخصیت تو مشہور و معروف ہے۔ آپ سے قبل آئے ہوئے کرمانی سادات میں سے کئی ایک "سیّد احمد کرمانی"، "سیّد محمد کرمانی" اور "سیّد محمود کرمانی" ہیں جو وادئ کشمیر کے متعدد علاقوں میں اپنے مشن یعنی تبلیغ دین اور اصلاح خلق کا فریضہ ادا کر کے محو خواب ہیں۔ سب کرمانیوں کے نام کتب تواریخ میں کہاں یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

بایں ہمہ نواکدل کے مقبرہ میں سیّد محمد کرمانی اور سیّد احمد کرمانی، بچھ گام میں سیّد احمد کرمانی اور سیّد محمد کرمانی اور مقبرۂ ملا نازک تاشوانی، اندرون قلعہ سرینگر، مقبرہ سازگری پورہ سرینگر اور موضع بانی گام علاقہ دسو پور ہر ایک میں کم از کم ایک ایک محمد کرمانی کی موجودگی کا تذکرہ آج بھی اوراقِ تواریخ کشمیر کی زینت ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر میں اسلام کو پھیلانے کی مہم پر سادات کرمانی کا جو لشکر مصروف کار رہا۔ اس میں کرمانی سادات کی کتنی بڑی تعداد شامل تھی۔ ان کرمانی سادات میں سے اکثر کا تعلق سہروردیت اور کبرویت سے تھا اور کشمیر کو آتے ہوئے ملتان اور لاہور ان کی پہلی منزلوں کا کام دیتے تھے۔ کشمیر میں کرمانی سادات کا نام جس عظیم الشان شخصیت کے وجود سے روشن تر ہوا وہ ہیں حضرت میر سیّد احمد کرمانی سہروردیؒ

دسویں صدی ہجری کے نصفِ اوّل تک کشمیر کے مسلمان صرف اہلسنت والجماعۃ کے مسلک پر تھے۔ سلطان فتح شاہ کے زمانہ میں امامیہ مذہب یا شیعہ مسلک کا چرچا پہلی بار ہوا، جب ایران کے صفوی داعیوں میں سے ایک داعی میر شمس الدین عراقی نے اس مسلک کی اشاعت کے لئے سرینگر کے محلہ جھڈی بل میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس وقت حضرت میر سید احمد کرمانیؒ ملتان، لاہور، دہلی اور رام گڑھ وغیرہ میں اہل سنت والجماعۃ کے طریقہ کی حمایت میں سرگرم تھے، جب آپ کو معلوم ہوا کہ کشمیر میں شیعہ سنی اختلافات نے سر اٹھایا ہے تو آپ کشمیر چلے آئے اور بلبل لنگر میں حضرت بلبل شاہ صاحبؒ کی خانقاہ میں بیٹھ کر سنیت کی حمایت کا فریضہ انجام دینے لگے۔ اس کے بعد کشمیر کو آپ نے اپنا مستقل مرکز بنالیا اور تاحیات یہیں رہ کر علمی اور روحانی فیوض کے دریا بہاتے رہے اور وفات کے بعد مقبرۂ سلاطین میں مدفون ہوئے اس مقبرہ کے جنوب مشرقی گوشے میں آپ کا مرقد شریف زیارت شاہ کرمان کے نام سے مشہور ہے۔ (جبکہ جنوب مغربی گوشے میں حضرت شیخ بہاؤالدین صاحبؒ کا مزار ہے) زیارت شاہ کرمان کی چھت کے نیچے تین قبریں ہیں۔ ایک خود حضرت میر سید احمد کرمانیؒ کی دوسری آپ کے فرزند میر سید محمد مسافرؒ کی اور تیسری آپ کے خلیفہ سید جلال الدینؒ کی۔ حضرت شاہ کرمان کی وفات ۹۷۰ھ یا اس سے کچھ قبل متصور کی جاتی ہے۔

مسعودی مشاہیر

حضرت الشیخ بابا مسعود نروریؒ کا تذکرہ آپ کی اولاد کے مشاہیر کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ مشاہیر قریباً پانچ سو سال کی مدت کے طویل زمانہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں علماء و صلحاء کی اتنی بڑی تعداد شامل ہے کہ ان سب کو تلاش کرنا اور سمیٹ لینا بہت مشکل ہے۔ اور چونکہ کتاب کا موضوع بھی ان میں سے شخص واحد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ذات ہے اس لئے دیگر مشاہیر مسعودیہ کا استیعاب اپنی حدود سے تجاوز کا سبب ہوسکتا ہے۔ بایں ہمہ ہم نے بطور "مشتے نمونہ از خروارے" چند ایک ایسے حضرات کا تعارف یہاں پر مختصر ترین الفاظ میں کرادیا ہے جو زمانۂ قریب میں عوامی زندگی پر اپنے علم، عمل

اور اقدامات سے اثر انداز ہوتے رہے ہیں

حضرت بابا عبدالغفورؒ

(م ۱۱۰۵ھ)

بارہ مولہ سے دریای جہلم وادی کو چھوڑ کر سرسبز پہاڑوں کے ایک گہرے درے میں داخل ہو جاتا ہے اور قصبۂ مظفر آباد تک جنگلات سے ڈھانپی ہوئی اونچی دیواروں کے درمیان شور مچاتا ہوا تیزی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ بارہ مولہ سے کوئی سات میل آگے جاکر جہلم کے دائیں کنارے پر اوڑی تحصیل کے علاقہ میں پیر نیاں نام کے گاؤں میں ایک زیارت گذشتہ تین سو سال سے مرجع عوام چلی آتی ہے۔ یہ بابا عبدالغفورؒ ابن بابا عبدالرحیمؒ ابن بابا علیؒ، ابن بابا عبداللہ ابن حضرت الشیخ بابا مسعود نروریؒ کی زیارت ہے۔ جو پہلے سلسلہ سہروردی کے کاملین میں سے تھے اور ملتان جاکر حضرت الشیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ کے خلفاء سے فیضیاب ہوئے تھے۔ بعد ازاں حضرت بو علی قلندرؒ سے متاثر ہو کر بقیہ زندگی مجذوبانہ اور قلندرانہ کیفیت میں بسر کی۔ آپ کی اپنی اولاد میں سے کوئی بلوغ کو نہیں پہنچا۔ آپ کے برادر کی اولاد ہمیشہ آپ کے فیض کی وارث رہی ہے۔ اسی شاخ میں سے موجودہ سجادہ نشین پیر محمد مقبول فرزند پیر سیف الدین ہیں۔ حضرت بابا عبدالغفورؒ کی کرامات جو اس علاقہ میں زبان زدِ خاص و عام چلی آتی ہیں ان کو ایک طرف چھوڑ کر آپ کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ اس علاقہ کے دیہات کے عوام میں اسلام کی محبت اور دین کی پابندی اب تک نمایاں طور پر قائم ہے۔

قاضی شاہ عبدالکبیرؒ

(وفات تقریباً مابین ۱۲۵۰ھ و ۱۲۶۰ھ)

آپ نے کشمیر پر لاہور کی خالصہ حکومت کے زمانہ میں لولاب سے دل برداشتہ ہو کر علاقہ دراوہ (نیلم) کی سکونت اختیار کر لی، اسوقت اس علاقہ پر ایک نیم آزاد جاگیردار راجہ منصور خان حکمران تھا جس نے آپ کے علم و تقویٰ سے متاثر ہو کر آپ کو اپنی قلمرو کا قاضی مقرر کر دیا۔ آپ زندگی بھر اس منصب پر فائز رہے، درمیانی عمر ہی میں وفات پائی اور اپنے بعد محمد شاہ، منصور شاہ،

محی الدین شاہ، مکرم شاہ، موسےٰ شاہ اور معظم شاہ چھ بیٹے چھوڑ گئے، جن سے آپ کی ذریات وادیٔ نیلم اور وادیٔ لولاب میں پھیلی۔ آپ کے سب سے چھوٹے بیٹے مولینا معظم شاہ واپس لولاب آئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک سے ایک قابل فرزند عطا کئے، جن میں سے امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کو خدا تعالیٰ نے عالمگیر شہرت کا مستحق بنایا۔

بابا نعمت اللہ صاحبؒ

دودھ وَن (کپواڑہ) کے مسعودی پیروں کے جدِ امجد پیر نعمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ ریاضت کیشی، قلندری اور مجذوبیت کا عجیب معجونِ مرکب گذرے ہیں۔ آس پاس کے پہاڑوں میں مسلسل بارہ سال تک خلوت گزین رہنے کے بعد واپس متاہل زندگی کی طرف رجوع کیا تو خدا تعالیٰ نے آپ کو آٹھ فرزند عطا کئے، جو علم و عمل میں نمونۂ آباءِ کرام تھے۔ حضرت بابا مسعود نروریؒ تک بابا نعمت اللہ کا شجرۂ نسب یوں ہے :۔

بابا نعمت اللہ ابن بابا کمال، ابن بابا شکر الدین، ابن بابا غلام نبی، ابن بابا عبد اللہ ثانی، ابن بابا مومن، ابن شیخ بابا تقی الدین، ابن شیخ بابا عبد اللہ، ابن حضرت شیخ بابا مسعود نروریؒ۔ اس علاقہ کے دیہات، دودھ وَن، ملکرہی، ہیری، گگلگام، میرناگ، ہائی ہامہ، ڈودی پورہ مقام اور ترہگام وغیرہ کے مسعودی پیر اِن ہی پیر نعمت اللہ صاحب کی اولاد ہیں۔ نعمت اللہ کا مزار جنگلوں کے درمیان ایک اونچی اور پُر فضا پہاڑی پر واقع ہے۔

پیر شاہ محمد صالحؒ

(م قریباً ۱۳۲۰ھ)

آپ لولاب کے موضع سایہ وَن میں پیدا ہوئے۔ حضرت بابا مسعود نروریؒ تک آپکا سلسلۂ نسب اس طرح ہے :۔ شاہ محمد صالح ابن شاہ عبد الشکور، ابن بابا عبد الرزاق، ابن بابا غلام رسول، ابن بابا صدیق اللہ، ابن بابا عمر، ابن بابا علی، ابن الشیخ بابا عبد اللہ، ابن الشیخ بابا مسعود نروریؒ۔ ضروریات دین کی تعلیم کے بعد آپ عبادت اور ریاضت میں مصروف تھے، نو عمری میں ہی متاہل بھی ہو گئے۔ زراعت کو ذریعۂ معاش بنایا۔ اسی اثنا میں ۱۲۳۴ھ میں کشمیر

پر لاہور کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ زراعت پیشہ لوگوں کے لئے زمین کا قبضہ عذابِ جان بن گیا۔ پیداوار کا اکثر حصہ حکومت کو دے کر نہ جان محفوظ تھی اور نہ عزت۔ اکثر لوگ گھر بار چھوڑ کر وادیٔ کشمیر کو خیر باد کہنے لگے۔ شاہ محمد صالحؒ بھی ترکِ وطن کر کے ضلع مظفر آباد کے علاقہ دراوہ میں لوات نام کے گاؤں میں چلے گئے اور جنگل کاٹ کاٹ کر نئی زرعی زمین حاصل کی۔ وہاں آپ کو خدا تعالیٰ نے بہت ذہین بیٹے عطا کئے جن کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے مشاہیرِ وقت کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ مولوی مختار شاہ، پیر رحمت اللہ شاہ، قاضی عبدالاحد شاہ اور پیر احمد شاہ اپنے معاصرین کے لئے قدم قدم پر قابلِ رشک ثابت ہوئے۔ اپنے علم و عمل سے دین کی بھی خدمت کرتے رہے اور دنیوی وجاہت سے بھی بہرہ ور رہے۔ جب نیا زمانہ آیا تو شاہ محمد صالحؒ کے پوتوں نے کشمیر کی سیاسی تحریکات میں پہلی صف میں پہنچ کر تاریخی رول ادا کیا۔ شاہ محمد صالحؒ نے ۱۳۲۰ھ سے کچھ قبل لوات ہی میں وفات پائی۔

پیر سیف اللہ شاہ دودھ وَنیؒ

جناب پیر سیف اللہ شاہ فرزند پیر نور الدین ابن شکر الدین آپ بابا نعمت اللہ کے بنی اعمام میں سے تھے۔ اپنے علم اور زہد و تقویٰ کے لئے مرجعِ خلائق تھے۔ آپ ہی کی دختر بلند اختر "مال دیدی" صاحبہ تھیں جن کو فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہؒ کی والدۂ بزرگوار بننے کا شرف حاصل ہوا۔ سیف اللہ صاحب نے مدت تک حضرت شاہ صاحبؒ کو اپنی نگرانی میں رکھا اور اپنے گاؤں کے متصل سیہپورہ گاؤں کے مشہور معلم مولوی غلام محمد صاحب جندل سے آپ کو تعلیم دلواتے رہے۔ علامۂ جلیل حضرت شاہ صاحبؒ کی ذہنی ساخت جس سانچے میں ڈھالی گئی اُنکی تربیت میں آپ کے نانا پیر سیف اللہ شاہ مرحوم کا براہِ راست دخل تھا۔

مولوی سمند رشاہ (فاضلِ دیوبند)

مسعودیوں کی اسی شاخ سے پیر لسہ شاہ اور پیر حسین شاہ دو بھائی ڈولی پورہ گاؤں میں رہتے تھے۔ مؤخر الذکر کے ایک فرزند مولوی سمند رشاہ تھے جنہوں نے دیوبند میں تحصیلِ علوم کر کے امتیازی سندات حاصل کیں اور واپس آکر تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔

مگر ابھی اپنی سکیموں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے کہ بعالمِ جوانی ہی اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے:

حضرت پیر عبدالغفار شاہ رحمۃ اللہ علیہ

(م ۱۳۴۰ھ)

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحبؒ مسعودی لاہور میں مرجعِ خاص و عام تھے۔ حضرت شیخ مسعود نروریؒ تک پیر صاحب مرحوم کا سلسلۂ نسب بصورت ذیل ہے:-

پیر عبدالغفار شاہ ابن پیر احمد شاہ، ابن پیر مصطفےٰ شاہ ابن نور شاہ، ابن فاضل شاہ، ابن پیر عبدالوہاب، ابن بابا عبدالقادر، ابن بابا طاہر، ابن بابا یعقوب، ابن الشیخ بابا عبداللہ ابن الشیخ بابا مسعود نروری رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب مسعودیوں کی اس شاخ کے گلِ سرسبد تھے جو کامراج ضلع بارہمولہ کے گاؤں ترگہ پورہ میں مقیم ہے۔ حضرت بابا عبدالقادر اس گاؤں میں مقیم ہو گئے تھے۔ ترگہ پورہ کے علاوہ چک شنگلو پورہ اور آس پاس کے بعض دوسرے دیہات میں بھی اس خاندان کے افراد آباد ہیں۔ ملحقہ علاقوں کے لوگ ان کے موروثی مرید ہیں۔ بابا عبدالقادرؒ کے ایک فرزند بابا صالحؒ کھوئی ہامہ کے کوئیل مقام گاؤں میں تھے، خود تو لاولد تھے لیکن آپ کے بھائی بابا عزالدین کی اولاد اب بھی اس گاؤں میں آباد ہے جن میں پیر لسہ شاہ مرحوم ماضی قریب میں اور پیر حکیم طیب شاہ زمانۂ حال میں غیر معمولی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔ خود بابا صالح لار کے موضع بینگورہ کے اوپر پہاڑ کے دامن میں مدفون ہیں۔

کشمیر سے باہر سب سے اوّل پیر عبدالغفار صاحب کے دادا پیر مصطفےٰ شاہ گئے جو ابتدائے عمر میں حصولِ فیضِ باطنی کے لئے بغداد و ملتان، وغیرہ مراکز کا دورہ کرتے رہتے تھے اور آخر عمر میں لاہور سے قریب باٹی علاقہ میں مقیم ہو گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ان کے بعد ان کے فرزند پیر احمد شاہ ترگہ پورہ چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور محلہ تکیہ سادھواں میں مقیم ہو گئے۔

پیر عبدالغفار شاہ نوعمری میں ہی باپ کے ہمراہ لاہور گئے، وہیں آپ کی تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے اور وہیں آپ کی شادی بھی ہو گئی لیکن بیوی کوئی دو سال کے بعد ایک بیٹا (محمد اشرف)

چھوڑکر وفات پاگئی۔ اس کے بعد پیر صاحب عمر بھر مجرّد رہے اور اپنا سارا وقت عبادات و ریاضتِ شاقہ میں صرف کرنے لگے۔ جب عوام کا رجوع آپ کی طرف ہو گیا تو آپ نے مدرسۂ غوثیہ کے نام سے لاہور میں ایک دارالعلوم قائم کر دیا جس میں تفسیرِ قرآن، حدیث نبوی اور فقہ حنفی کی تعلیم بہت اعلیٰ پیمانہ پر دی جاتی تھی۔ آپ کی ساری زندگی اس قدر پاکیزہ اور مثالی زندگی تھی کہ لاہور جیسے نکتہ چیں شہر کے لوگ آپ کے گرویدہ تھے۔ درودِ شریف اور نعت نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے مجموعے مرتب کرنا اور چھاپ چھاپ کر عوام میں بلا قیمت تقسیم کرنا آپ کا محبوب شغل تھا۔ پابندیٔ سنّت اور تقویٰ میں آپ سلفِ صالحین کا نمونہ تھے۔ آپ کا لباس ایک ملے کرتے، تہ بند اور کشمیری ٹوپی تک محدود تھا اور کھانا اس قدر سادہ اور قلیل کہ حیرت ہوتی تھی آپ اس پر زندہ کیسے ہیں۔ طویل عمر پاکر آپ نے ۱۳۴۲ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت مولٰنا محمد انور شاہ صاحبؒ دیوبند سے آپ کی تقریباتِ فاتحہ میں شمولیت کے لیے لاہور تشریف لے گئے تھے۔ لاہور میں پیر عبدالغفار شاہ صاحب کی وفات کے بعد آپ کا فرزند پیر اشرف شاہ آپ کا خلیفہ بنا جس نے کئی سال کے بعد آپ کا تابوت سابق قبر سے نکالکر لاہور کے باہر مغل بیگم کے باغ علاقہ مزنگ میں منتقل کر لیا اور وہاں اس پر روضہ تعمیر کر کے خود بھی وہیں رہائش اختیار کر لی۔ پیر عبدالغفار شاہ صاحب کے علمی فیضان کو آپ کے برادر زادہ فاضلِ اجل پیر عبد اللہ شاہ (فرزند رسول شاہ) نے جاری رکھا۔ آپ لاہور کی مسجد قاضی خان کے خطیب بھی تھے۔ ترگہ پورہ اور چک شلوہ میں پیر صاحب کے اقرباء میں بہت سے حضرات نے علمی ترقی اور شہرت نیک حاصل کی ان میں سے مرحوم مولٰنا پیر عبدالکبیر شاہ مسعودی فاضلِ دیوبند (سابق استاذ جامعہ مدینۃ العلوم حضرت بل) اور پیر غلام حسن شاہ صاحب ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس کشمیر وحال ویجلنس کمشنر قابلِ ذکر ہیں۔

پیر احمد شاہؒ

(م ۱۹۶۵ء)

شاہ محمد صالحؒ کے فرزند پیر احمد شاہ صاحب نے سیاست میں سرگرم حصّہ لینے کی ذمہ داری اپنے بیٹوں خاصکر مولٰنا محمد سعید مسعودی اور مولوی محمد انور مسعودی پر ڈال

رکھی تھی اور بذاتِ خود بزرگِ خاندان کے طور رہتے تھے ۱۹۴۷ء تک سیاست میں آپ کے بیٹوں کے حصّہ لینے کی وجہ سے آپ کی ذات پر حکومت نے کبھی اعتراض نہیں کیا لیکن ۱۹۴۷ء میں جب آپ کے گاؤں موضع لوات پر قبائلیوں کا قبضہ ہو گیا تو آپ سے اس بات پر باز پرس کی گئی کہ آپ کے دو بیٹے محمد سعید اور محمد انور کیوں سرینگر میں کشمیر کی اس حکومت کا ساتھ دے رہے ہیں؛ چنانچہ قبائلیوں نے اس بناء پر پیر احمد شاہ صاحب کو حراست میں لیا اور اپنے ہیڈ کوارٹر پر لے جا کر سترہ دن تک نظر بند رکھا۔ جب آپ کو واپس اپنے گھر جانے کی اجازت دی گئی تو آپ نے بیٹوں اور بھتیجوں کو گرفتار شدہ اور سارے عیال کو خوف زدگی اور پریشانی میں پایا۔ آخر کار آپ نے ترکِ وطن کا فیصلہ کیا اور زمین، مکانات، مال و مویشی اور ہر قسم کی جائداد چھوڑ کر راتوں رات گھر کے سب چھوٹے بڑے انسانوں کو اپنے ساتھ لیکر نکلے اور دریائے کشن گنگا کو عبور کر کے سیز فائر لائن کے اس طرف آئے، وادیٔ کشمیر میں پہنچ کر ترہگام کے پاس گوگلوسہ نام کے ایک گاؤں میں مقیم ہو گئے، جہاں قریباً اٹھارہ سال مزید رہ کر ۱۹۶۵ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

مولینا غلام مصطفٰے مسعودی

آپ پنجاب یونیورسٹی کے مولوی فاضل اور منشی فاضل تھے۔ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی آپ کو شرفِ تلمذ حاصل تھا اور دیوبند و ڈابھیل میں کئی سال تک آپ کی صحبت میں رہے تھے۔ اس دوران آپ نے تفسیر و حدیث میں خاص حذاقت پیدا کی۔ شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد کشمیر چلے آئے، عملی سیاست میں حصّہ لیا۔ ۱۹۳۴ء میں سال بھر کے لئے ریاست سے جلائے وطن کئے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں مظفر آباد سے کشمیر اسمبلی کے ممبر چنے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں قبائلیوں نے آپ کو اپنی برادری کے چار دیگر افراد (مولوی محمد یوسف شاہ ابن پیر امیر شاہ، مولوی عزیز الرحمن ابن پیر عبداللہ شاہ، پیر موسیٰ شاہ فرزند قاضی عبدالکبیر، فیروز شاہ ابن پیر احمد شاہ) سمیت گرفتار کر کے صوبۂ سرحد میں اٹک کے مشہور قلعہ میں سال بھر قید رکھا۔ جنوری ۱۹۴۹ء میں وہاں سے رہا ہو کر جموں پہنچے اور جموں سے ہوائی جہاز میں سرینگر آ رہے تھے کہ بانہال کے پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی سے یہ جہاز ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ کا شکار ہونے والے ۲۵ مسافروں

میں تین مسعودی علماء (مولینا غلام مصطفےٰ، مولوی عزیز الرحمن اور مولوی محمد یوسف) بھی تھے۔ تینوں فضلائے پنجاب یونیورسٹی اور تینوں ہی تحریکِ حریت کشمیر کے سرگرم مجاہد تھے۔

مولینا غلام مصطفےٰ صاحب ایک آتش بیان مقرر تھے۔ عوامی جلسوں کے علاوہ ان کی ہنگامہ خیز تقریروں سے قانون ساز اسمبلی کے ایوان میں سناٹا چھا جایا کرتا تھا اور سر این گر جیسا مغرور وزیر اعظم بھی آپ کی جرأت، دلیری اور صداقتِ بیان کا لوہا مانتا تھا۔ آپ کا اکلوتا فرزند عبداللہ شاہ کشمیر کے محکمہ بجلی میں ملازم ہے۔

مفکرِ کشمیر حضرت مولینا محمد سعید مسعودی مدظلہ العالی

حضرت الشیخ بابا مسعود نروری رح کی اولاد میں سے چند مشاہیر کو جب اس تتمہ میں شامل کرنے کا ارادہ ہوا تو میں نے چاہا کہ تحریکِ حریت کشمیر کے ایک عظیم مجاہد اور علم و فضل کی ایک مثالی شخصیت مولینا محمد سعید مسعودی قبلہ کے حالات بھی اس میں شامل کیے جائیں مگر وہ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اس پر راضی نہ تھے اور بار بار اپنی نسبت کچھ لکھنے سے منع کرتے رہے۔ آخر بہت کچھ حیل و حجت اور میرے اصرار سے مجبور ہو کر آپ نے ایک نشست میں اپنی زندگی کے مختصر حالات خود بیان فرمائے جن کو نہایت اختصار کے ساتھ درج کیا جاتا ہے:-

پیر احمد شاہ صاحب مسعودی رح کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ آپ کے پانچ فرزند ہیں جو سبھی زندہ ہیں موضع لوات دادی نیلم میں ماہِ شوال ۱۳۲۱ھ جنوری ۱۹۰۳ء میں آپ کا پہلا بیٹا پیدا ہوا جس کا نام آپ نے محمد سعید رکھا۔ اس زمانہ میں علاقہ بھر میں کہیں سکول کا وجود نہ تھا۔ محمد سعید کے اولین استاد اُن کے ماں اور باپ تھے۔ قرآنِ پاک اور فارسی کے مدارج تک کتابیں والدِ ماجد اور والدہ محترمہ نے پڑھائیں۔ بعض اسباق اپنے عمِ محترم مولوی مختار شاہ، اپنے نانا پیر لسہ شاہ اور اپنے ماموں پیر عبدالجبار شاہ مرحوم سے بھی پڑھے۔ لوات سے قریب ایک دوسرے گاؤں کٹھہ پیراں میں ایک درس گاہ تھی جس میں مولوی ظہور الحق اور مولوی محمد اسرائیل (فاضل دیوبند) درس دیتے تھے جن سے صرف، نحو اور فقہ کی بعض کتابیں پڑھیں۔ تعلیم کی دوسری منزل ضلع ہزارہ کے مانسہرہ، دانہ اور بھوئی گاڑاں کی درسگاہیں تھیں جن کے بعد لاہور کا رُخ کیا اور اچھرہ کے مدرسہ قمریہ اور لاہور کے مدرسہ نعمانیہ سے منطق و فلسفہ اور فقہ و اصول کی تکمیل کے بعد ۱۳۴۲ھ ۱۹۲۲ء میں اورینٹل کالج لاہور کے رجسٹر

مولوی فاضل میں شامل ہوئے اور ۱۹۲۴ء میں وہاں سے فراغت حاصل کرلی۔ ۱۹۲۵ء میں واپس وطن آکر متاہل زندگی شروع کی۔ ۱۹۲۷ء میں مظفرآباد ہائی سکول میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۲۸ء میں پرنس آف ویلز کالج جموں میں، ۱۹۲۹ء میں ایس۔ پی کالج سرینگر میں اور ۱۹۳۰، ۱۹۳۱ء میں ہری سنگھ ہائی سکول رعناواری سرینگر میں تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد فروری ۱۹۳۲ء میں ملازمت سے استعفاء دیا اور کشمیر کی تحریکِ آزادی سے وابستگی اختیار کرکے سنٹرل جیل کی راہ لی اور بقول ان کے "یہ ریاست کا نشہ کچھ اس بری طرح سے سر پر سوار ہوا کہ ہمیشہ کے لئے ساست سے چپک کر رہ گئے"۔ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کے بانیوں اور ممتاز رہنماؤں میں شمار ہوتے رہے۔ نیشنل کانفرنس کے قیام ۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۳ء تک مسلسل پندرہ۱۵ سال اس کے جنرل سیکرٹری رہے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کشمیر میں شاید ہی کوئی ایسا پرائم منسٹر ہوا ہوگا جس کے دور میں آپ جیل نہ گئے ہوں۔ بعد کے زمانہ میں کبھی کشمیر اسمبلی کے ممبر کبھی ہند کی کانسٹی چیونٹ اسمبلی کے ممبر اور کبھی ممبر پارلیمنٹ رہے۔ نیز کئی اخباروں کے مدیر بھی رہے اور بھی نہ جانے کون کون سے پاپڑ بیلے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد بخشی وزارت کے زمانہ میں ۳ سال، صادق وزارت کے حکم سے ساڑھے تین سال اور قاسم وزارت کے آرڈر سے صرف دو۲ ماہ قید میں رہے۔ جب آپ کی عمر ۷۰ سال سے متجاوز ہوئی تو یہ سب ہنگامے ختم ہوگئے، اور زمانہ کی بے رخی کو دیکھ کر اب آپ نے ۱۹۷۲ء سے گوشہ نشینی اور خاموشی کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے اور بس۔

آپ کے چار بھائیوں میں سے مولوی محمد انور شاہ مسعودی (سابق ایم۔ ایل۔ اے) اور مولوی نذیر احمد (سکریٹری محکمہ جنگلات) سیزفائر لائن کے اس طرف ہیں اور مولوی فیروز شاہ و مولوی محی الدین شاہ موضع لوات علاقہ دراوہ میں ہیں جو آزاد کشمیر کا ایک حصہ ہے۔

مولانائے محترم مسعودی صاحب کے دو۲ فرزند بشیر احمد اور شبیر احمد ہیں۔ دونوں ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی ہیں۔ کوئی ۲۰ سال ہوئے بشیر احمد مسعودی امریکہ چلے گئے۔ وہاں نیویارک یونیورسٹی سے مزید تعلیمی سندات حاصل کرنے کے بعد اسی ملک کو اپنا وطن بنا کر وہیں رہ پڑے اور آج کل

ریاست "انڈیانہ" میں سوشل ایڈوائزری بورڈ کے ڈائریکٹر ہیں۔ ایک امریکن نومسلم پروفیسر "زبیدہ جوسے" کے ساتھ شادی بھی وہیں کی ہے اور اب ایک بیٹے (عمر سعید) اور بیٹی (حنیفہ) کے باپ ہیں۔ شبیر احمد کشمیر ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں اور گاندربل میں مقیم ہیں۔ پیشہ وکالت کے ساتھ ساتھ متاہل زندگی بسر کر رہے ہیں"۔

سطور بالا اس وقت میں نے سپرد قلم کی تھیں جب کتاب ہٰذا کا پہلا ایڈیشن زیر ترتیب تھا اور ان دنوں مولینا نے گوشہ نشینی اور خاموشی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا یا تھا۔ لیکن اب اپریل ۱۹۷۷ء میں قریباً پانچ سال کی عزلت نشینی کے بعد مولینا دوبارہ سیاست میں سرگرم عمل ہوئے مولینا کن حالات میں اور کن وجوہات کی بنا پر از سر نو میدان عمل میں آئے ان تفصیلات میں جانا اس وقت طول کلام ہو گا۔

مولینا اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ آپ کی ذات گرامی پر مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس لئے ان سطور میں آپ کی ہمہ پہلو ہستی کا کیا حق ادا ہو سکے گا! آپ ایک وسیع النظر محقق اور مفکر ہیں۔ سیاسی میدان کے آزمودہ کار اور بے لوث رہنما ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ خاندان انوری کے ایک مایۂ ناز عالم اور بزرگ ہیں۔ بقول مولینا سعید احمد اکبرآبادی — "آپ حضرت شاہ صاحبؒ کے لئے صاحب البیت ہیں"۔
کشمیری عوام کے لئے بالعموم اور اولاد شیخ مسعودؒ کے لئے بالخصوص آپ کا وجود گرامی مغتنمات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ پورے غیر منقسم ہندوستان کے ارباب علم وفضل آپکے تفکر و تدبر کے معترف ہیں۔

مولوی محمد انور شاہ مسعودی

آپ پیر احمد شاہ مسعودی مرحوم کے دوسرے فرزند ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والدین سے اور کٹھ پیراں کی درسگاہ کے علاوہ بڑے بھائی سے حاصل کی۔ متاہل ہو جانے کے بعد محکمہ جنگلات کی بعض غیر سرکاری فرموں میں

ملازم رہے۔ اسکے بعد تجارت کا شغل اختیار کیا۔ ۱۹۳۲ئہ میں کشمیر کی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں گرفتار اور سزایاب ہوئے۔ اسکے بعد سیاست سے لگاؤ پیدا ہو گیا، مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی مظفرآباد ضلع کی شاخیں ہمیشہ آپکی سرگرم اعانت کا فائدہ اُٹھاتی رہیں۔ انتخابات کے وقت تنظیمی امیدوار کی کامیابی آپ کی دماغی کاوشوں کی مرہونِ منت تسلیم کی جاتی تھی۔ قبائلی حملے اور قبضے کے وقت آپکو گھر بار ترک کرکے وادی میں منتقل ہونا پڑا۔ جب پیر احمد شاہ صاحب اور کُنبہ کے سب لوگ جلائے وطن ہو کر سیزفائر لائن کے اِس طرف آ گئے تو آپ انکی پا بجائی، از سرِ نو بحالی اور پرورش کے لئے وقف ہو کر رہ گئے۔ یہی زمانہ تھا جب آپکو اپنے والدِ بزرگوار کی خدمت کرنے اور دُعائیں لینے کا خاص موقعہ مُیسّر ہوا۔ ۱۹۵۱ئہ سے ۱۹۵۸ئہ تک آپ کشمیر اسمبلی کے اور اس کے بعد اَپر ہاؤس کے ممبر رہے۔ آپکی عوامی مسائل پر بے لاگ تقریریں سب سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہیں۔ مُدت سے آپنے سیاسی سرگرمیوں کو خیرباد کہہ دیا ہے اور حج سے واپسی کے بعد اپنا زیادہ وقت تلاوت اور عبادت کی نذر کرتے ہیں۔ آپکا صرف ایک فرزند پیرزادہ مطیع اللہ دسلمہ ہے جو ابھی تک مصروفِ تعلیم ہے۔

مولوی نذیر احمد مسعودی

پیر احمد شاہ صاحب کے سب سے چھوٹے اور پانچویں فرزند مولوی نذیر احمد ہیں جو ۱۹۲۲ئہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں ملی اور اس کے بعد مظفرآباد ہائی سکول اور رعناواری ہائی سکول میں پڑھتے رہے۔ ایس۔ پی کالج سرینگر سے بی۔ ایس۔ سی پاس کرنے کے بعد ڈیرہ دون کے جنگلات کالج سے ڈی، ڈی، آر کیا اور جنگلات میں رینجر ہو گئے۔ قبائلی حملہ کے زمانہ میں انڈین افواج اور عوام کے درمیان لیزان کے طور سے فرائض انجام دئے۔ پھر کئی سال ڈپٹی کنسرویٹر رہے اور چند سال سے کنسرویٹر جنگلات کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ محکمہ کے تجارتی شعبہ مبرنگ ڈیپارٹمنٹ کے جنرل منیجر کے فرائض انجام دینے کے بعد اب اس محکمہ کے سب سے

بڑے منصب یعنی چیف کنسرویٹر جنگلات کے عہدہ پر فائز ہو چکے ہیں۔

طالبعلم کی حیثیت میں آپ نے مُسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی جدوجہد میں براہِ راست حصہ لیا اور سٹوڈنٹ لیڈر کی حیثیت سے ۱۹۳۸ء میں گرفتار ہو کر سزا یاب ہوئے۔ لیزان آفیسر کی حیثیت سے جو کام کیا وہ بھی بڑی حد تک سیاسی نوعیت کا کام تھا۔

مولوی مفتی عبدالجبار شاہ

آپ تاحیات جامع مسجد سوپور کے خطیب اور امام رہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے جب بارہ مولہ میں مدرسۂ فیضِ عام قائم کیا تو اس کے اوّلین طلباء میں عبدالجبار صاحب بھی تھے۔ اگرچہ تعلیم کی تکمیل کا موقعہ نہ مِلا تھا لیکن اپنی محنت، ریاضت اور اوصاف کے ذریعہ اسکی کمی پوری کر لی تھی۔ شمالی کشمیر میں آپ کا فتویٰ حکمِ آخر کا درجہ رکھتا تھا۔ زندگی بھر حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ اپنا علمی تعلق قائم رکھا۔

مولوی غلام محمد حنفی سوپور

آپ کشمیری زبان کے شاعر تھے۔ حنفی آپ کا تخلّص تھا۔ آپ کا بڑا کارنامہ قرآنِ شریف کا بزبانِ کشمیری ترجمہ تھا، جو افسوس ہے کہ چھپ نہ سکا۔ اسکے علاوہ بھی آپکے اقرباء کے پاس آپکی کچھ غیر مطبوعہ کتابیں ہیں۔

مولانا محمد یٰسین شاہ

آپ مولوی غلام محمد حنفی کے بے حد ذہین فرزند تھے۔ آپ دارالعلوم دیوبند اور امرتسر کے بعض مدارس کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۹۳۱ء میں جب کشمیر کی سیاسی تحریک نے جنم لیا تو مولانا یٰسین صاحب نے اپنی شعلہ بار تقریروں سے قصبۂ سوپور اور شمالی کشمیر کے دیہات میں ایک زلزلہ پیدا کر دیا۔ مُسلم کانفرنس کو عوام میں جو ہر دلعزیزی نصیب ہوئی اسمیں آپ کی فصیح و بلیغ تقریریں سب سے زیادہ ذمہ دار تھیں۔

الحاج پیر غلام حسن شاہ

حضرت الشیخ بابا مسعود نروری رح کی اولاد میں سے الحاج پیر غلام حسن شاہ ریاست جموں وکشمیر کے ایڈیشنل انسپکٹر جنرل پولیس (جو آج کل انٹی کرپشن مہم میں ویجلنس کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں) ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک ہیں۔ مسلیودیوں کی جو شاخ ترگہ پورہ اور اس کے قرب وجوار کے موضعات چک شنگلوپرہ وغیرہ میں آباد ہے، آپ اس کے لئے موجب فخر ہیں۔ لاہور کے مشہور اہل اللہ بزرگ حضرت پیر عبدالغفار شاہ مرحوم (جن کا مختصر تذکرہ کتاب ہذا کے صفحہ ۷۰۱، ۷۰۲ پر ہے) آپکی والدۂ محترمہ سروہ خاتون (متوفی ۱۹۳۵ء) کے عم محترم تھے۔ پیر عبدالغفار صاحب کے دوسرے بھائی پیر رسول شاہ صاحب آپ کے نانا تھے۔ آپکے والد ماجد پیر محمد مقبول شاہ (متوفی ۱۹۴۳ء) اپنے علاقے میں نہایت ہی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ علاقہ کا ہراج بالخصوص ترگہ پورہ، چک شنگلوپرہ اور اس سے ملحق دیہات کے جن لوگوں نے پیر محمد مقبول صاحب مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ آپ علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے لحاظ سے اپنے اسلاف کرام کا نمونہ تھے۔ قرآن، حدیث اور فقہ پر آپ کی گہری نگاہ تھی۔ علم حدیث میں آپ کو علاقہ سوپور کے مشہور عالم مولینا احمد صاحب سیلو سے باضابطہ شرف تلمذ حاصل تھا آپ کو امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب رح کی ذات گرامی کے ساتھ بے پناہ عقیدت تھی۔ حضرت شاہ صاحب جب دیوبند سے کشمیر تشریف لاتے تھے تو حضرت شاہ صاحب رح کی وعظ و تلقین کی مجالس میں شریک ہونا آپ سعادت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری چند سالوں میں جب حضرت شاہ صاحب رح فتنۂ قادیانیت کی سرکوبی کے لئے کمربستہ ہوئے تو کشمیر کی ضرورت کے پیش نظر آپنے "دعوت حفظ ایمان" نام سے چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ مرتب فرمائے تھے۔ وادی کشمیر کے اطراف و اکناف میں حضرت شاہ صاحب رح کے جو محب و معتقد ان رسالوں کی تقسیم کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان میں پیر محمد مقبول صاحب

مرحوم بھی پیش پیش تھے۔

مولوی حفیظ اللہ[1] شاہ، محمد مظفر[2] شاہ، غلام حسن[3] شاہ اور محمد لیسین[4] شاہ آپ کے چار فرزند ہیں۔

پیر غلام حسن شاہ کی پیدائش کا سال ۱۹۲۶ء ہے۔ جدید تعلیم کے منازل طے کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں جب کہ وادئی کشمیر کے عوام قبائلی حملہ کے نتیجہ میں اُجڑے ہوئے اور تباہ حال تھے اور اپنی از سرِ نو آبادی کے لئے نوجوانانِ قوم کی اعانت اور امداد کے محتاج تھے۔ پیر غلام حسن شاہ صاحب نے محکمۂ پولیس میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آپ نے پولیس میں سب انسپکٹر کے چھوٹے عہدے سے ابتداء کر کے محض اپنی محنت، دیانت اور ذہانت کے بل بوتے پر ترقیات کی منزلیں اپنے معاصرین کے مقابلے میں حیرت انگیز تیز رفتار کے ساتھ طے کیں۔ آپ جس طرح کلکتہ انسٹی ٹیوٹ میں پولیس آفیسرز کی ٹریننگ کے موقعہ پر ہندوستان بھر کے اُمیدواروں میں ممتاز رہے تھے۔ اسی طرح اپنے محکمہ میں بھی قدم قدم پر امتیازات نے آپ کا ساتھ دیا۔

قومی خدمات میں آپ کے تاریخی کارناموں میں سے سوپور شہر کو قحبہ خانے کی لعنت سے نجات دلانا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس شہر کے "واتُں دوب" نام کے محلہ کو زمانۂ دراز سے چکلہ اور قحبہ خانہ جات کے طور سے استعمال کیا جا رہا تھا۔ آپ نے اپنے چند ایک دوسرے خدا ترس ہمنواؤں بالخصوص خواجہ غلام رسول صاحب لون (مالک نیو لائٹ ہوٹل سوپور) کی اعانت و اشتراک سے ایک ایسی اصلاحی مُہم چلائی کہ اس ناپاک مرض کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا۔ اہلِ سوپور نے بھی آپ کے اس کارنامہ کی یہ قدر کی کہ اس محلے کا نام تبدیل کر کے آپ کے شکریہ کے طور آپ کے نام پر اسکو "شاہ آباد" کے نام سے پکارنے لگے اور وہاں سکول اور مسجد تعمیر کر کے اس آبادی کی کایا ہی پلیٹ دی۔

۱۹۶۳ء میں پیر غلام حسن شاہ صاحب زیارتِ حرمین شریفین اور فریضۂ حج کی ادائیگی سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۴ء سے ریاست میں رشوت ستانی کا خاتمہ کرنے کے لئے حکومت نے آپکو ویجلنس کمشنر مقرر کر رکھا ہے۔ اور اب تک آپ سینکڑوں راشیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا چکے ہیں۔

تتمہ ۳

حضرت شاہ صاحبؒ اور مسئلۂ سیادت

از عبدالرحمٰن کوندو

وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۚ (الحجرات - ۱۳)

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے اپنے اقوال و تحریرات، آپ کے والدِ ماجد کے ارشادات اور کشمیر کی معتبر ترین تاریخ کی ورق گردانی کے بعد حقیقت اور صداقت کے متلاشی سوانح نگار کو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی چیز مانع نہیں رہتی کہ آپ لفظ "سید" کے مروّج مشہور اصطلاحی معنوں میں "سیّد" نہ تھے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو بے نقاب واقعات کے ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہ کرنا کھلا مکابرہ ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کے نکات پر نظر رکھنی چاہیئے:۔

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی بعض تصنیفات کے خاتمہ پر اپنے نام کے ساتھ اپنے آباؤ اجدادِ کرام کا شجرۂ نسب حضرت شیخ مسعود نوریؒ تک اپنے قلم سے بصورتِ ذیل تحریر فرمایا ہے:۔

"محمد انور شاہ بن مولینا محمد معظم شاہ بن شاہ عبد الکبیر بن شاہ عبد الخالق، بن شاہ محمد اکبر بن شاہ حیدر بن شاہ محمد عارف بن شاہ علی بن شاہ عبد اللہ بن الشیخ مسعود

النروہی الکشمیری الحنفی"۔

اس طرح سے آپ نے اپنے شجرۂ نسب کو دسویں صدی ہجری کے کشمیری مشائخین اسلام میں سے ایک بزرگ حضرت شیخ مسعود نروری رح تک ثبت جریدہ (RECORD) کرکے کسی قسم کی تاویل اور کھینچا تانی کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہنے دی۔

(۲) حضرت شیخ مسعود نروری رح کو تذکرۃ الاولیاء کشمیر کے تمام مصنّفین نے اُن اولیاء کرام ومشائخ عظام میں شمار کیا ہے جو نسباً سیّد نہ تھے، ملاحظہ ہوں:۔

(۱) اسرارُ الابرار مصنفہ حضرت بابا داؤد مشکواتی رح (م ۱۰۹۷ھ) (۲) خوارقُ السالکین مصنّفہ مُلا احمد بن عبدالصبور ہادی (م ۱۰۹۰ھ) (۳) واقعاتِ کشمیر مصنّفہ خواجہ اعظم دیدہ مری (م ۱۱۷۹ھ) (۴) خمسۂ مُلا بہاؤ الدین متو (م ۱۲۲۸ھ) (۵) اسرارُالاخیار (تاریخ کشمیر کی جلد ثالث) مصنفہ پیر حسن شاہ کھویہامی (م ۱۳۱۶ھ) (۶) تحائفُ الابرار المعروف تاریخ کشمیر مصنفہ حاجی محی الدین مسکین سرائے بلی (تاریخ تصنیف ۱۳۲۱ھ) (۷) تاریخ اقوام کشمیر از منشی محمد دین فوق (م ۱۳۶۲ھ) (۸) تاریخ اقوام پونچھ از منشی محمّد دین فوق۔

حضرت شیخ مسعود نروری دسویں صدی ہجری کے خاتمہ کے بزرگ ہیں اور آپکے تذکرہ نگار فاضل مورّخین وہ لوگ ہیں جن کا سلسلہ گیارہویں، بارہویں، تیرہویں اور چودہویں صدی یعنی پوری چار صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ جب حضرت مسعود نروری رح کو معتبر ترین مصنفین نے چار سو سال تک کشمیر کے ان مشائخ میں شمار کیا جو سادات نہ تھے اور حضرت موصوف کے بیٹوں، پوتوں وغیرہ فضلاء نے ان تحریرات کو مُسلّم ٹھہرایا، نہ کبھی ان کی تردید میں کوئی حرف لکھا اور نا ہی کبھی دعوایِ سیادت کیا تو آج اس کے خلاف اِدعا کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔؟

یہ وہ مصنف ہیں جو ذاتی تقویٰ، صداقت بیانی اور تاریخ وانساب کے علوم میں مہارتِ تامہ کے لحاظ سے مرتبۂ عُلیا پر تسلیم کئے گئے ہیں۔ خاصکر کتاب ۱ اسرارُ الابرار کے مُصنف حضرت علاّمہ بابا داؤد مشکواتی رح اپنے وقت کے اکابر محدّثین و فقہاء میں سے تھے۔ مشکوٰۃ شریف متناً و سنداً ازبر کرلینے اور نوکِ زبان ہونے کی وجہ سے "مشکواتی" آپ کا لقب بن گیا تھا۔ آپ حضرت شیخ مسعود نروری کے پوتے یعنی حضرت بابا مجنون نروری کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ اس لئے اکابر

خاندانِ مسعودیہ کے حسب نسب سے آپکی واقفیت براہِ راست تھی۔ جب حضرت مشکواتیؒ نے حضرت بابا مسعود نروریؒ کا، بابا عبداللہ کا، بابا حاجی کا اور بابا مجنون کا تذکرہ مشائخ وعلماء کے اس باب میں لکھا جو سادات میں سے نہ تھے، اگر کوئی اور اس کے برعکس تصور کرے تو یہ محض جرأتِ بے جا ہوگی۔

(۳) کشمیر کے مشائخین، عرفاء اور علماء کے تذکرے تحریر کرنیوالے مصنفینِ کرام کا متفقہ اصول یہ ہے کہ یہ اپنی کتابوں میں جب کشمیر کے بزرگانِ دین کے حالات لکھنا شروع کرتے ہیں تو ساداتؔ، غیر ساداتؔ مشائخ، ریشیانؔ، علماء اور شعراء کے طبقات قرار دیکر الگ الگ ابواب میں الگ الگ طبقات کے حالات لکھتے ہیں۔ پہلا باب مشائخ سادات کے لئے، دوسرا باب غیر سادات مشائخ کے لئے، تیسرا باب کشمیر کے ایک مخصوص صوفی سلسلہ کے لئے ہے جس کو ریشیوں کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ چوتھا باب عام علماء کے لئے اور پانچواں شعراء کے لیے مخاص کر دیا جاتا ہے۔ ان سب کتابوں کا گہرے غور وخوض کے ساتھ مطالعہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر مصنف نے حضرت شیخ مسعود نروریؒ کا تذکرہ اور علماء وصلحاء میں سے آپکے فرزندوں اور پوتوں کا تذکرہ پوری احتیاط اور پابندی کے ساتھ اپنی کتابوں کے ان ابواب میں کیا ہے جو غیر سادات مشائخ وعلماء کے لئے مخصوص ہیں۔ ان مصنف حضرات نے حضرت مسعودؒ کی بزرگی کے جو دیگر نکات ہیں وہ پوری فراخ دلی سے لکھے ہیں اور اگر سیادت کا کوہِ نور بھی آپ کے تاجِ ولایت کی دولت میں شامل ہوتا تو یہ مصنفین جو آپ کے عقیدتمند اور مداح ہیں، اس حقیقت کو آشکار کرنے سے ہرگز غافل نہ رہتے۔ فَتَدَبَّرُوْا وَلَا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْن۔

(۴) حضرت شیخ مسعود نروریؒ کی اولاد کو کشمیر میں دسویں صدی ہجری کے نصفِ ثانی سے آج چودہویں صدی کے آخر تک ساڑھے چار سو سال کی مدت میں غیر معمولی پھیلاؤ نصیب ہوا ہے۔ اس طویل مدت میں علم وفضل اور دینی وروحانی پیشوائی کے امتیازات کا تسلسل جہاں اس نسل پر خدا تعالیٰ کی عنایات میں سے ہے وہاں انکی کثرتِ تعداد بھی عطیۂ قدرت ہے اور وادی کے شہری ودیہاتی علاقوں میں حضرت مسعود کو اپنا جدِ امجد ماننے والے اس وقت تقریباً پانچ ہزار افراد ہیں۔ ان میں سینکڑوں ہیں جو قدیم وجدید ہر قسم کے علوم

کے زیور سے آراستہ ہیں۔ فضلاءِ دیوبند، پنجاب یونیورسٹی، کشمیر یونیورسٹی اور علی گڈھ یونیورسٹی سے عربی، فارسی اور اُردو زبانوں کے فضلاء بی اے، ایم اے، بی ایس سی، بی ٹی، ایل ایل بی، ایم بی بی ایس وغیرہ وغیرہ) سیاسی لیڈر، سماجی کارکن، واعظ، مُفتی، خطیب، وکیل، ڈاکٹر، حکیم، پروفیسر، تاجر، مُدرّسین، ایڈیٹر، صحافی، سرکاری عہدوں کے منصب دار وغیرہ۔ غرض زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن اس بات پر یہ سب لوگ متفق ہیں کہ حضرت شیخ مسعود نروری ؒ سیّد نہ تھے۔ اب غور فرمائیے کہ جس دُنیا میں آج کل حقیقی سیادت کے علاوہ بعض اوقات مصنوعی طریقوں سے دعوایِ سیادت کر کے لوگ اپنی شہرت اور وجاہت کا ذریعہ بناتے رہتے ہوں۔ اس دُنیا میں ان ہزاروں مسعودیانِ کشمیر کا یہ کہنا کہ "ہم سیّد نہیں ہیں بلکہ ہم خاکِ پائے اہلبیت ہیں۔" اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

(۵) حضرت شاہ صاحب ؒ کے والدِ بزرگوار مولنا معظم شاہ صاحب ؒ کی علمی وُسعت صرف تفسیر وحدیث، فقہ اور دینی علوم تک ہی محدود نہ تھی۔ بلکہ علمِ تاریخ اور علمِ انساب وغیرہ میں بھی آپ کی مہارت مُسلّم تھی اور ان امور میں بھی آپ کی تحقیقات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی۔ آپ ہمیشہ اپنی اور تمام اولاد حضرت شیخ مسعود نروری کی سیادت کا انکار کرتے رہے اور حضرت شیخ مسعود نروری کے خاندان کی سیادت وعدمِ سیادت کی بحث پر آپ بغیر کسی لگی لپٹی کے فرمایا کرتے تھے کہ "نروری پیر صاحبان کا ادّعائے سیادت (اگر کہیں ہو تو) بالکل غلط ہے۔" اس سلسلہ میں جو خط آپ نے مورّخ منشی محمد دین فوق مرحوم کے سوالات کے جواب میں لکھا تھا وہ کچھ آگے جا کر مُلاحظہ کیجئے۔

(۶) حضرت شاہ صاحب ؒ کو دیکھنے والوں اور بقدرِ وُسعت آپ کے ارشادات ومواعظِ حسنہ سے استفادہ کرنے والوں میں سے سرینگر کشمیر میں ہمیں ایک عُمر رسیدہ اور علم دوست بزرگ الحاج سیّد مبارک شاہ گیلانی صاحب فطرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہُوا۔ آپ نے بیان کیا کہ: ایک بار کسی اخبار نویس نے حضرت شاہ صاحب ؒ کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظِ "سیّد" لکھا تھا تو حضرت ؒ نے اسکی تردید میں مقامی اخباروں میں ایک بیان بھیجا، جس

کے الفاظ یہ تھے کہ : "میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی آل و اولاد کا غلام ہوں اور محبِ عترت ہوں مگر سید نہیں ہوں۔" اس سے بعض لوگوں کا آپ کو سید کہنا اور آپ کا سید ہونے سے انکار کرنا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں۔

(۷) مشہور مؤرخ و مصنف منشی محمد دین فوق نے حضرت شاہ صاحبؒ کے زمانۂ حیات میں ہی آپ کے حالات پہلے اخبار کشمیری لاہور میں اور بعد ازاں اپنی کتاب "مشاہیر کشمیر" (مطبوعہ لاہور ۱۹۳۰ء) میں سپردِ قلم کئے تھے۔ کئی سال بعد جب فوق صاحب "تاریخ اقوامِ کشمیر" مرتب کر رہے تھے تو آپ نے اس میں بھی "خاندانِ مسعودیہ انوریہ" کے عنوان کے تحت چند صفحات حضرت شاہ صاحبؒ کے ذکرِ جمیل کے لئے وقف کئے اور حضرت شاہ صاحبؒ کے محامد و مناقب کے ساتھ ساتھ بعض تاریخی حقائق کی بھی نقاب کشائی کی۔ اس موقعہ پر سیادت کے بارے میں فوق صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"کشمیر میں شیخ مسعود نروریؒ بہت بڑے اہلُ اللہ بزرگ گزرے ہیں۔ وہ حضرت شیخ المشائخ میر سید احمد کرمانیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے حالات کشمیر کی تاریخوں میں درج ہیں بلکہ اکثر کتب میں ان کے تبرکات کا بھی ذکر ہے لیکن شیخ مسعود کی ذریات جو سرینگر، لولاب، بجہامہ، ترگہ پورہ، مظفر آباد، لاہور اور پونچھ وغیرہ مقامات میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ کے حسب و نسب کے متعلق بہت کچھ اختلاف رکھتی ہے اور مصیبت یہ ہے کہ پرانے تذکرہ نویسوں نے بھی اس امر کے متعلق کوئی خاص توضیح نہیں کی اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی ان کو سید بتاتا ہے، کوئی قریشی اور کوئی نومسلم۔

زمانۂ موجودہ میں شیخ مسعود کی اولاد سے ایک عظیم الشان اور فاضل اجل بزرگ شیخ الحدیث مولانا محمد انور شاہ کشمیری دیوبندی گزرے ہیں جو ہندوستان کے دارالعلوم عربیہ دیوبند اور ڈابھیل کے صدر مدرس بھی تھے۔ آپ نے اپنی اکثر تصانیف عربیہ میں اپنا شجرہ شیخ مسعود نرورویؒ تک لکھ کر یہ تحریر فرمایا ہے کہ "ان کے (یعنی شیخ مسعود نرورویؒ کے) بزرگ بغداد سے ملتان، ملتان سے لاہور اور لاہور سے کشمیر آئے تھے۔" انہوں نے (یعنی شاہ صاحبؒ نے) کسی بزرگ کے نام کے ساتھ "سید" کا لفظ نہیں لکھا۔ البتہ لاہور کی جو

شاخ آپکو سیّد لکھتی ہے اس نے شیخ مسعود نروری کے فرزند الشیخ عبداللہ کو سیّد عبداللہ لکھا ہے۔ جیسا کہ شجرہ سے معلوم ہوگا۔ شیخ عبداللہ کے تین بیٹے تھے۔ بابا علی[1]، بابا رضا[2] اور بابا یعقوب[3]۔

بابا علی کی ذُریات سے مولٰنا انور شاہ شیخ الحدیث ہیں جنہوں نے نہ کبھی اپنے نام کے ساتھ "سیّد" کا لفظ لکھا اور نہ کبھی سیّد کہلوانا پسند کیا۔ اس لئے نہیں کہ خدانخواستہ وہ اس لفظ کو اچھا نہ سمجھتے تھے بلکہ اس لئے اور صرف اس لئے کہ وہ حضرت علیؓ کی ذُریات سے نہیں تھے۔ لیکن بابا یعقوب یعنی بابا علی کے بھائی کی اولاد کی ایک شاخ[ا] ڈنکے کی چوٹ اپنے آپ کو سیّد الحسنی الحُسینی لکھتی اور کہلواتی ہے۔ میں نے اس بارہ میں مولٰنا محمد انور شاہ شیخ الحدیث مرحوم کے والدِ محترم پیر محمد معظم شاہ اور مولٰنا مرحوم کے بھائی پیر محمد سلیمان شاہ کو ایک خط ۸ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو لکھا جس کا جواب مجھے ۲۴ر دسمبر کو ملا۔ اس خط سے چونکہ بہت سے حالات پر روشنی پڑتی ہے اس لئے اس کا اندراج مناسب معلوم ہوتا ہے:۔

مولٰنا معظم شاہ کا مکتوب[ب]

"پیرزادگانِ کشمیر کے چار فرقے ہیں۔ اوّلاً سیّد جو کشمیر میں مختلف خطابوں اور عرفوں سے بھی مشہور ہیں۔ فرقہ ثانیہ، پیرزادگانِ کرمانیہ، جو شیخ مسعود نروری کی اولاد سے ہیں۔ چونکہ آپ حضرت سیّد احمد کرمانیؒ کے فیضِ باطنی سے بہرہ اندوز اور انکے

[ا] پوری شاخ نہیں بلکہ صرف لاہور میں ایک گھر ہے۔ حضرت پیر عبدالغفار شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے فرزند پیر محمد اشرف شاہ نے اپنے نام کے ساتھ سید لکھنا شروع کیا۔ پیر عبدالغفار صاحب کے یکجدی پیروں کی اولاد تحصیل ہندوارہ کے مواضعات ترگہ پورہ، چک شتلومہ وغیرہ میں آباد ہے۔ کشمیر بھر کے باقی مسعودیوں کی طرح ان کو بھی سیادت کا کوئی دعوٰی نہیں ہے۔ خود پیر عبدالغفار شاہ صاحب مرحوم نے بھی اپنے آپ کو کبھی سیّد نہیں کہلوایا ہے۔ (کوندو)

[ب] یہ خط مولٰنا معظم شاہ صاحبؒ نے اپنے فرزند پیر سلیمان شاہ صاحب مرحوم سے لکھوایا ہے۔ (کوندو)

خلیفۂ خاص تھے۔ اس لئے انکی اولاد کو پیرزادگانِ کرمانیہ کہتے ہیں۔ فرقہ ثالثہ، مخدومی۔ یہ فرقہ حضرت سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی بابا علی رینہ کی اولاد میں شمار ہوتا ہے۔ فرقۂ رابعہ خطائی، اس کی نسبت تحقیق معلوم نہیں۔ غالباً ان کے اسلاف شہر خطا سے آئے ہوں گے۔

"بابا" کا لفظ کسی خاص ذات سے وابستہ نہیں۔ یہ بزرگی اور احترام کا لفظ ہے جو ہر صالح اور خداپرست بزرگ خصوصاً عمر رسیدہ کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے لیکن کشمیر میں جن آدمیوں کے علاوہ باباغربا و مساکین کے باپ یعنی مرد سخی و فیاض کو بھی کہتے ہیں۔ بلکہ "ببٕ" کا لفظ بھی جس کے معنی کشمیری میں "باپ" کے ہیں، بابا سے نکلا ہے۔ (مثلاً) بارہ مولہ کے خواجہ عزیز جو ککرو جو رئیس الرؤسا تھے، اپنے لنگرِ عام کی وجہ سے "عزہ بابا" کہلاتے تھے۔ آج کشمیر میں جو باب زادے یعنی بابا فرقہ کے لوگ ہیں انکی ذاتیں اور گوتیں دراصل مختلف ہیں۔

کرمانی پیرزادگان یعنی شیخ مسعود کی اولاد کا تعلقِ رشتہ داری فرقہ سادات سے بھی ہے۔ چنانچہ شیخ مسعودؒ کی ایک بی بی سید زادی تھیں۔ نیز شیخ الحدیث مولانا انورشاہ کا نکاح بھی گنگوہ ضلع سہارنپور کے ایک سید گھرانہ میں ہی ہوا تھا۔ مخدومی پیرزادگان کے ساتھ بھی کرمانی پیرزادگان کے تعلقاتِ مناکحت پائے جاتے ہیں۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ کرمانی پیرزادگان یعنی اولادِ شیخ مسعود سید ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق تحقیق شدہ امر یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث شاہ صاحب مرحوم کے پاس پنجاب اور ہندوستان کے بعض اقطاع کے لوگوں نے اس کے متعلق جب کبھی گفتگو کی تو انہوں نے نہ اپنے آپ کو سید کہلانا پسند کیا اور نہ کسی کا کہنا اس بارہ میں مانا۔ اور نہ اپنی کسی تصنیف میں اپنے سلسلۂ نسب کو سادات سے منسلک کیا۔ بلکہ ہر ایسے شخص پر جو غیر سید ہو کر سید کہلاتا یا کہلانا چاہتا تھا، اپنی علانیہ ناراضگی کا اظہار کیا کرتے تھے۔

الغرض شیخ مسعود کی ذریت جہاں کہیں بھی ہے وہ سید نہیں ہے۔ اغلب اور اکثر دجوہ

یہی ہیں کہ شیخ مسعود امام العالم ابو حنیفہ رح کی اولاد سے ہیں۔ جیساکہ قبلہ والد کے مرتبہ شجرہ سے جو اُن کے فرزندِ اکبر حضرت شاہ صاحب مرحوم کا صحیح شدہ ہے اور جس کی ایک نقل ارسال کر رہا ہوں، سے معلوم ہوگا۔ جس قدر حضرت شاہ صاحب مرحوم کو علم تواریخ اور روایات کی صحت اور انکے ضعف پر عبور تھا۔ اس کو عرب و عجم ہر جگہ قبولیت حاصل ہے۔ اس لئے یہ شجرہ بڑی محنت سے صحیح کیا گیا ہے۔

حضرت والدِ ماجد کی رائے بھی یہی ہے کہ نزدوری پیر صاحبان کا ادعائے سیادت بالکل غلط ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے سوانح حیات فاضلِ اجل مولنا محمد یوسف (بنوری) استاذ جامعہ ڈابھیل نے بزبانِ عربی "نفحۃ العنبر من ھدی الشیخ الانور" نام سے ایک ضخیم کتاب میں لکھے ہیں۔ اس میں بھی صاحب مصنف نے حضرت کی "سیادت" کے متعلق وہی روش اختیار کر رکھی ہے، جو حضرت قبلہ نے اپنی تصانیف میں کی ہے"۔

فوق صاحب کا تبصرہ

آگے چل کر فوق صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت قبلہ شیخ الحدیث عموماً "شاہ صاحب" کے نام سے مشہور تھے، لیکن کشمیر میں یہ ضروری نہیں کہ شاہ کا لفظ صرف سیّد کے ساتھ ہی ہو۔ وہاں بابزادے اور بعض اور لوگ بھی "شاہ" کہلاتے ہیں جو در حقیقت سیّد نہیں ہیں مگر ہندوستان میں شاہ کا لفظ چونکہ سادات کے ساتھ ہی لکھا جاتا ہے اس لئے آپ کے اکثر تلامذہ (اہلِ کشمیر کے سوا) انکو (یعنی حضرت شاہ صاحب کو) اپنے خیال میں سیّد ہی سمجھتے رہے اور اسی بناء پر انکے صاحبزادے مولنا ازہر شاہ جو دیوبند ہی میں رہتے ہیں اور کشمیر کے حالات و رسومات سے عموماً ناواقف ہیں اپنے آپ کو اپنی تصانیف اور اپنی تحریروں میں "سیّد" لکھا کرتے ہیں حالانکہ ان کے والد (مرحوم) حضرت شاہ صاحب اور ان کے جدِ امجد مولنا پیر محمد معظم شاہ مرحوم اور ان کے چاروں چچاؤں نے جو بفضلِ خدا اس وقت بحالتِ حیات ہیں، کبھی سیادت کا دعویٰ نہیں کیا اور اسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر تاریخ "نگارستانِ کشمیر" کے مصنف نے جو حضرت شاہ صاحب مرحوم کے شاگرد ہیں،

نہ صرف شاہ صاحب کو "سید انور شاہ" لکھا بلکہ ان کے والد پیر محمد معظم شاہ کو بھی "سید معظم شاہ" اور ان کے جدِ اعلیٰ شیخ مسعودؒ کو بھی "سید مسعود" لکھ دیا ہے۔

(تاریخ اقوامِ کشمیر جلد دوم از ص ۲۰۶ تا ص ۲۱۰
از منشی محمد الدین فوقؔ مطبوعہ لاہور جولائی ۱۹۴۳ء)

یہ ہے مَالَہٗ وما عَلَیۡہِ اُس بحث کا جو حضرت شاہ صاحب کو "سید" کہنے یا لکھنے سے پیدا ہوئی ہے۔ اب مصنّف "نگارستانِ کشمیر" ہوں یا مصنّفِ "تاریخِ دیوبند" مولینا انظر صاحب ہوں یا مولینا ازہرؔ صاحب۔ غرض جو کوئی بھی حضرت شاہ صاحبؒ کو "سیّد" قرار دیتا ہے، اپنے فعل کا خدا تعالیٰ کے سامنے اور خلقُ اللہ کے سامنے خود جواب دِہ ہے ؁

کتابیات

(BIBLOGRAPHY)

۱۔ عربی، فارسی اور اردو

۱۔ آثار السنن۔ ظہیر حسن شوق نیموی۔ احسن المطابع عظیم آباد ۱۳۳۱ھ۔

۲۔ آثار الصنادید۔ سر سید احمد خان۔ سنٹرل بک ڈپو دہلی ۱۹۶۵ء۔

۳۔ آزاد کی تقریریں، انور عارف۔ نیو تاج آفس دہلی۔

۴۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ مرتبہ عبد الرزاق ملیح آبادی۔ دلی ۱۹۵۸ء۔

۵۔ ابو الکلام آزاد۔ پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند ۱۹۵۸ء۔

۶۔ ازالۃ الرین فی الذب عن قرۃ العین۔ مولینا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۳۰ھ۔

۷۔ الاضافات الیومیہ من الافاضات القومیہ مطبوعہ کراچی۔

۸۔ التصریح بما تواتر فی نزول المسیح۔ حضرت مولینا انور شاہ کشمیری۔ مطبوعہ دہلی ۱۳۴۲ھ۔

۹۔ العرف الشذی علی جامع الترمذی۔ مرتبہ مولینا محمد چراغ صاحب مطبوعہ دیوبند ۱۳۴۲ھ۔

۱۰۔ النور الفائض علی نظم الفرائض۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری۔ کتب خانہ فخریہ مرادآباد ۱۳۵۶ھ۔

۱۱۔ انوار الباری شرح صحیح بخاری ۱۳ جلد از مولینا سید احمد رضا بجنوری مکتبہ ناشر العلوم بجنور یوپی۔

۱۲۔ انوار المحمود فی شرح سنن ابی داؤد۔ مولینا محمد صدیق نجیب آبادی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۳۷ء۔

۱۳۔ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین۔ حضرت العلام مولینا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۵۰ھ۔

۱۴۔ انسائیکلوپیڈیا (اردو) فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۲ء۔

۱۵۔ البوادر النوادر۔ مولینا اشرف علی تھانوی۔ مطبوعہ ۱۳۶۵ھ۔

۱۶۔ الفاروق۔ مولینا شبلی نعمانی۔ آستانہ بک ڈپو دہلی۔

۱۷۔ البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع۔ قاضی محمد شوکانی طبع قاہرہ مصر۔

۱۸۔ الرحمۃ الغیثیۃ بالترجمۃ اللیثیہ فی مناقب سیدنا الامام اللیث بن سعد، از ابن حجر عسقلانی طبع میریہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ۔

۱۹۔ بسط الیدین لنیل الفرقدین۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ بجنور ۱۳۵۱ھ۔

۲۰۔ اختر درخشاں۔ از مولوی سید محمد باقر الموسوی الصفوی الکشمیری۔ ۱۳۹۰ھ۔

۲۱۔ پرانے چراغ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مکتبۂ فردوس مکارم نگر لکھنؤ۔

۲۲۔ تبرکات آزاد۔ غلام رسول مہر۔ عثمانیہ بک ڈپو حیدر آباد۔

۲۳۔ تاریخ اعظمی (واقعات کشمیر) خواجہ محمد اعظم دیدہ مری ۱۳۲۴ھ۔

۲۴۔ تاریخ بڈشاہی۔ محمد الدین فوق۔ ظفر برادرس لاہور۔ ۱۹۴۲ء۔

۲۵۔ تاریخ کبیر کشمیر۔ حاجی محی الدین مسکین سرائے بل ۱۳۱۰ھ۔

۲۶۔ تاریخ اقوام کشمیر۔ منشی محمد الدین فوق۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ء۔

۲۷۔ تاریخ اقوام پونچھ۔ منشی محمد الدین فوق۔ ظفر برادرس لاہور ۱۹۳۶ء

۲۸۔ تاریخ دیوبند۔ سید محبوب رضوی۔ علمی مرکز دیوبند ۱۹۷۲ء۔

۲۹۔ تزک بابری۔ ظہیر الدین بابر (بادشاہ) مطبوعہ دہلی ۱۹۲۴ء۔

۳۰۔ تاریخ نگارستان کشمیر قاضی ظہور الحسن ناظم سیوہاروی ۱۹۳۴ء۔

۳۱۔ تاریخ حسن مؤلفہ پیر غلام حسن کھویہامی، جلد اول، دوم وچہارم، شایع کردہ ریسرچ اینڈ پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ حکومت جموں و کشمیر۔

۳۲۔ تبلیغ رسالت جلد ہفتم مولفہ میر قاسم علی قادیان۔

۳۳۔ تذکرۂ الواعظ۔ مفتی محمد شاہ سعادت ۱۹۳۱ء۔

۳۴۔ تحیۃ الاسلام۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۱ھ۔

۳۵۔ تذکرۂ اولیاء کشمیر (ترجمۂ تاریخ حسن) مطبوعہ کوہ نور پریس سرینگر ۱۹۶۰ء۔

۳۶۔ ترجمان السنۃ۔ مولانا بدر عالم میرٹھی۔ دہلی ۱۹۴۸ء۔

۳۷۔ تفسیر ثنائی۔ مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری رح۔

۳۸۔ تذکرۂ شاہ ولی اللہ۔ مناظر احسن گیلانی۔ لاہور ۱۹۴۶ء۔

۳۹۔ تذکرۃ الرشید۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔

۴۰۔ تذکرۂ علماءِ ہند۔ رحمان علی، لکھنؤ ۱۹۱۴ء۔

۴۱۔ تذکرۂ ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ساہتیہ اکادمی ۱۹۶۸ء۔

۴۲۔ تحفۂ محبوبی (سوانح حضرت شیخ حمزہ کشمیریؒ) از خواجہ غلام محی الدین مالک و مدیر اخبار "کشمیر" امرتسر

۴۳۔ حُجۃ اللہ البالغہ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ حمایت الاسلام لاہور ۱۳۰۲ھ۔

۴۴۔ حسن العزیز (ملفوظات حضرت تھانوی) شائع کردہ تالیفاتِ اشرفیہ تھانہ بھون (یو۔پی)۔

۴۵۔ حیاتِ انور۔ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر۔ جید برقی پریس دہلی ۱۹۵۵ء۔

۴۶۔ حیاتِ عبدالحی۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۷۰ء۔

۴۷۔ حیاتِ شبلیؒ۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۴۳ء۔

۴۸۔ حیاتِ شیخ الہندؒ۔ اصغر حسین دیوبندی۔ دیوبند ۱۳۳۹ھ۔

۴۹۔ حدائق الحنفیہ۔ از مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی۔ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۶ء۔

۵۰۔ خاتمۃ الخطاب۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۹۰۲ء۔

۵۱۔ خاتم النبیین۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ مدینہ پریس بجنور ۱۹۵۳ء۔

۵۲۔ خزائن الاسرار۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۴ھ۔

۵۳۔ دعوتِ حفظِ ایمان حصہ اول و دوم۔ مولانا انور شاہ کشمیری ۱۳۵۱ھ۔

۵۴۔ دیوانِ حالی۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ دہلی ۱۹۵۰ء۔

۵۵۔ روشن مستقبل، طفیل احمد، دہلی ۱۹۴۵ء۔

۵۶۔ ذکرِ آزاد۔ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مطبوعہ کلکتہ۔

۵۷۔ روئداد دارالعلوم ۱۳۳۰ھ، مطبوعہ دیوبند۔

۵۸۔ روئدادِ چمن۔ مرتبہ محمد الحسنی ندوی۔ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۹۷۶ء۔

۵۹۔ روض الریاحین۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ دہلوی۔

۶۰۔ سوانح احمدی (سوانحِ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ) مولوی محمد جعفر تھانیسری۔

۶۱۔ سفرنامۂ شیخ الہندؒ (اسیر مالٹا) از مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ دینی بک ڈپو، اردو بازار دہلی ۱۹۴۷ء۔

۶۲۔ سوانحِ قاسمی۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، دیوبند ۱۳۷۳ھ۔

۶۳۔ سیرتِ انور۔ مسعود احمد قاسمی۔ ادارۂ ہادی دیوبند، یو۔پی۔

۶۴۔ سیرۃ النعمان حصہ اول۔ مولانا شبلی نعمانی۔ مفیدِ عام پریس آگرہ ۱۸۹۴ء۔

۶۵۔ سہم الغیب فی کبد اہل الریب۔ مولانا انور شاہ کشمیری، دہلی ۱۳۵۲ھ۔
۶۶۔ سیرت سید احمد شہید از مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ لکھنؤ ۱۳۶۸ھ۔
۶۷۔ سید احمد شہید۔ از غلام رسول مہر۔ لاہور ۱۹۵۴ء۔
۶۸۔ شاہ ولی اللہ اور انکی سیاسی تحریک (یعنی حزب ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ) از حضرت مولانا عبید اللہ سندھی۔ سندھ ساگر اکادمی لاہور ۱۹۴۲ء۔
۶۹۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے سیاسی مکتوبات۔ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۵۰ء۔
۷۰۔ صدح النقاب عن جساسۃ الفنجاب۔ مرتبہ مولانا محمد ادریس سکھروڑوی دیوبند ۱۹۲۵ء۔
۷۱۔ ضرب الخاتم علی حدوث العالم۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۴۵ھ۔
۷۲۔ عقیدۃ الاسلام فی حیوۃ عیسیٰ علیہ السلام۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ مجلس علمی کراچی ۱۳۸۰ھ۔
۷۳۔ علماء حق۔ مولانا سید محمد میاں دیوبندی کتب خانہ فخریہ مراد آباد ۱۹۴۶ء۔
۷۴۔ علماء ہند کا شاندار ماضی۔ مولانا سید محمد میاں۔ دہلی ۱۹۵۷ء۔
۷۵۔ فتاوای ثنائیہ۔ مرتبہ مولانا محمد داؤد راز۔
۷۶۔ فتاوای عزیزی۔ حضرت شاہ عبد العزیز دہلوی۔ مجتبائی پریس دہلی ۱۳۱۱ھ۔
۷۷۔ فتح الملہم بشرح صحیح مسلم۔ مولانا شبیر احمد عثمانی۔ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۲ھ۔
۷۸۔ فصل الخطاب فی مسئلۃ ام الکتاب مولانا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۴۸ھ۔
۷۹۔ فیض الباری علی صحیح البخاری۔ مرتبہ مولانا بدر عالم میرٹھی مطبع حجازی قاہرہ ۱۹۳۸ء۔
۸۰۔ فیصلہ مقدمہ بہاولپور مطبوعہ بہاولپور۔ جولائی ۱۹۳۵ء۔
۸۱۔ فتنۂ قادیانیت۔ مولانا صفوۃ الرحمن صابر۔ ادارہ اہلسنت و جماعت حیدر آباد۔
۸۲۔ کلیات اقبال۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۵۳ء۔
۸۳۔ کلیات شیخ الہند۔ مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ۔
۸۴۔ کشف الستر عن صلوۃ الوتر۔ مولانا انور شاہ کشمیری۔ دہلی ۱۳۵۳ھ۔
۸۵۔ کلیات شبلی، معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۳۰ء۔
۸۶۔ کتاب التعریفات۔ سید شریف علی جرجانی طبع مصر۔
۸۷۔ مبشرات دار العلوم دیوبند۔ مولانا انوار الحسن ہاشمی۔ دیوبند ۱۳۹۴ھ۔

۸۸۔ مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت۔ مولینا مناظر احسن گیلانی۔

۸۹۔ مشاہدات و معارف (ترجمہ فیوض الحرمین) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ۔
مترجم پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکادمی۔ لاہور۔ ۱۹۴۷ء۔

۹۰۔ مفتیِ اعظم کی یاد۔ مرتبہ حفیظ الرحمٰن واصفؔ، دہلی ۱۳۸۶ھ۔

۹۱۔ مولینا انور شاہ کشمیری۔ حیات اور علمی کارنامے۔ قاری محمد رضوان اللہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ۱۹۷۴ء۔

۹۲۔ مکتوباتِ شیخ الاسلام (مولینا حسین احمد مدنیؒ کے مکتوبات) ۴ جلدیں، مرتبہ مولینا نجم الدین اصلاحی۔

۹۳۔ مکمّل تاریخ کشمیر ۳ جلد از منشی محمد دین فوقؔ۔

۹۴۔ مشاہیرِ کشمیر محمد الدین فوقؔ۔ ظفر برادرز لاہور۔ جولائی ۱۹۳۰ء۔

۹۵۔ مکاتیبِ طیب (حکیم الاسلام مولینا قاری محمد طیب صاحب کے مکتوبات، مطبوعہ دیوبند)

۹۶۔ مرقاۃ الطارم لحدوث العالم۔ مولینا انور شاہ کشمیری۔ مدینہ پریس بجنور ۱۳۵۱ھ۔

۹۷۔ مشکلات القرآن۔ مولینا انور شاہ کشمیریؒ۔ جمال پریس دہلی ۱۳۲۷ھ۔

۹۸۔ مَعَارِفُ السُّنَن۔ مولینا محمد یوسف بنوریؒ۔ مجلس علمی کراچی ۱۳۸۳ھ۔

۹۹۔ مِصباحُ اللغات مرتبہ ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی۔ مکتبۂ برہان۔ دہلی ۱۹۵۵ء۔

۱۰۰۔ مِرقاۃُ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح مُلّا علی قاری۔ مطبع میمنہ۔ مصر ۱۳۰۹ھ۔

۱۰۱۔ منتخبُ التواریخ۔ عبدالقادر بدایونی، ۳ جلد کلکتہ ۱۸۶۸ء۔

۱۰۲۔ نقشِ حیات۔ مولینا سیّد حسین احمد مدنی۔ مطبوعہ دہلی ۱۹۵۴ء۔

۱۰۳۔ نُطقِ انور۔ مولینا سیّد احمد رضا بجنوری۔ مکتبہ ناشر العلوم بجنور۔ یو۔پی۔

۱۰۴۔ نیلُ الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین۔ مولینا انور شاہ کشمیری۔ مجلس علمی ۱۳۵۰ھ

۱۰۵۔ نفحۃُ العنبر من ھدی الشیخ الانور، مولینا سید محمد یوسف بنوری۔ مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۳۴ء۔

۱۰۶۔ نُزھۃُ الخواطر جلد ۸، مولینا سیّد عبدالحی لکھنوی، حیدرآباد ۱۹۴۷ء۔

۱۰۷۔ وِسادُ المُرشِدین باباداؤد خاکیؒ۔ مطبع محمدیؐ لاہور ۱۳۰۶ھ۔

۱۰۸۔ یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ۔ مولینا محمد ازہر شاہ قیصر دیوبند ۱۹۷۵ء۔

۱۰۹۔ یادِ رفتگان، طبع کراچی ۱۹۵۵ء۔

۲۔ مخطوطات

۱۔ اسرار الابرار۔ بابا داؤد مشکواتیؒ ۲۔ تاریخ کشمیر ملک حیدر چاڈورہ۔
۳۔ خوارق السالکین۔ اخوند ملا احمد بن عبد الصبور۔ ۴۔ فتحات الکبرویہ۔ شیخ عبد الوہاب کشمیری
۵۔ فتحات قادریہ۔ میر سید حسین قادری منطقی۔ ۶۔ خمسۂ بہائیہ، ملا بہاؤ الدین متو۔

۳۔ رسائل و جرائد

۱۔ ماہنامہ "الرشید" لاہور، فاضل حبیب اللہ (شاہِ عالم مارکیٹ لاہور) مارچ ۱۹۷۵ء۔
۲۔ ماہنامہ "الرشید" لاہور، دار العلوم دیوبند نمبر۔ نومبر ۱۹۷۶ء۔
۳۔ ماہنامہ "الانور" مولانا محمد نور الدین اختر کاشمیری (جون یا جولائی ۱۹۳۳ء غالباً)۔
۴۔ ماہنامہ "برہان" دہلی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (۱۹۷۳ء تا ستمبر ۱۹۷۷ء)۔
۵۔ ماہنامہ "تجلی" دیوبند۔ مولانا عامر عثمانی (مرحوم) ۱۹۶۸ء۔
۶۔ "چٹان" لاہور۔ شورش کاشمیری (مرحوم) ستمبر ۱۹۷۵ء۔
۷۔ ماہنامہ "دار العلوم" دیوبند۔ مولانا محمد ازہر شاہ قیصر (۱۹۶۴ء تا جولائی ۱۹۷۶ء)۔
۸۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ، شاہ معین الدین احمد، سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔ (جون ۱۹۳۳ء، مارچ ۱۹۷۹ء)
۹۔ "نقوش" لاہور، لاہور نمبر، محمد طفیل، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۶۱ء۔
۱۰۔ "نقوش" لاہور، شخصیات نمبر۔ ایضاً۔ ۱۹۵۶ء۔
۱۱۔ ماہنامہ "الفرقان" لکھنو۔ مولانا محمد منظور نعمانی۔ اپریل ۱۹۷۰ء تا دسمبر ۱۹۷۷ء۔

4- ENGLISH BOOKS

1. A History of Kashmir,
   by P. N. Koul Bamzai - Delhi - 1962.
2. A Holiday in the Happy Valley,
   by Major T. R. Swinburne - London 1907.
3. Beautiful Valleys of Kashmir and Ladakh,
   by Samsarchand Koul - 1942.
4. Early History and Culture of Kashmir,
   by Dr. Sunil Chandra Ray - 1957.
5. "Islam And Ahmadism"
   by Dr. Sir Moh'd Iqbal - Lucknow - 1974.
6. "KASHIR" by Dr. Ghulam Mohi-ul-Din Sufi-Delhi-1974.
7. Kashmir (An Historical Introduction),
   by James P. Ferguson-London- 1961.
8. Kashmir in Sunlight and Shade,
   by C. E. Tyndale Biscoe.
9. Kashmir under the Sultans.
   by Mohibbul Hasan - Calcutta - 1959.
10. The Encyclopaedia of Islam,
    by B. Lewish, Ch. Pellat and J. Schacht.
    Vol. II (C-G) Luzac and Co-London 1965.
11. The Jammu and Kashmir Territories,
    by Frederic Drew (London 1875).
12. The Reconstruction of Religious thought in Islam,
    by Dr. Sir Moh'd Iqbal- Lahore 1962.
13. The Valley of Kashmir,
    by Walter R. Lawrence (London -1895).
14. History of Srinagar (1846-1947), A Study in Socio-Cultural change, by Dr. Mohammad Ishaq Khan, (Under Publication).